لطیف ادب



ودھری برکت علی مرحوم

اے ہم نفسان محفل ما
رفتید و لے نہ از دل ما

مکتبہ اردو لاہور

ادبِ لطیف



ردھری برکت علی مرحوم

اے ہم نفسانِ محفلِ ما
رفتید و لے نہ از دلِ ما

مکتبہ اردو لاہور

مرحوم چودھری برکت علی

چند واقعات

پیدائش ۱۹۰۲

تعلیم اسلامیہ ہائی سکول، بھاٹی گیٹ، لاہور

گورنمنٹ کالج، لاہور

اس زمانے میں فٹ بال کے کھلاڑی کی حیثیت سے خاص شہرت حاصل کی۔

ایم اے (تاریخ) کے امتحان میں شریک ہونے کی تیاری کر رہے تھے کہ تحریک عدم تعاون کی وجہ سے تعلیمی سلسلہ منقطع کر دیا

۱۹۲۹ء میں پنجاب بکڈپو کی بنیاد ڈالی اور نہایت کامیاب درسی کتابیں شائع کیں۔

۱۹۳۵ء میں ماہنامہ ادب لطیف کا اجراء

۱۹۳۶ء میں مکتبہ اردو کا قیام

انہی دنوں انجمن احرار اسلام سے وابستہ ہو گئے اور دیسی بدیسی سرمایہ داروں کا خم ٹھونک کر مقابلہ کیا۔

ادب لطیف پر کئی بار مقدمہ چلا۔ ہر بار بخندہ پیشانی ضمانت دی۔

کچھ سال پیشتر تین ہائی سکولوں کا تمام نظم و نسق سنبھالا

پبلشرز یونائیٹڈ کی بنیاد انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

وفات - ۸ اگست ۱۹۵۲ء شام کے سوا آٹھ بجے

ادب لطیف

لاہور

ستمبر، اکتوبر سنہ ۱۹۵۲ء

جلد ۳۴ ——— شمارہ ۵، ۶

مینجنگ ایڈیٹر — ایڈیٹر

چودھری افتخار علی ○ میرزا ادیب

پاکستان میں

زرِ سالانہ:- آٹھ روپے ——— موجودہ شمارہ:- ایک روپیہ

غیر ممالک میں زرِ سالانہ:- بارہ روپے

مستقل خریداروں سے سالنامہ
اور افسانہ نمبر کی الگ قیمت نہیں لی جاتی

مکتبہ اردو ○ لاہور

ترتیب

غزل

خوشش ورخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

چودھری مرحوم کی یاد میں

پیرایۂ آغاز

۸؍ اگست کو شام کے قریباً آٹھ بجے میری آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اس پر اب تک یقین کرنے کو دل نہیں چاہتا۔

یہی وہ وقت تھا جب میں نے ایک بھرپور اور طویل قہقہے کو فضاؤں میں بکھر بکھر کر گم ہوتے ہوئے محسوس کیا ——— یہی وہ گھڑیاں تھیں جب میں نے زندگی کے ایک ہمہ گیر ولولے کو موت کے سائے میں دم توڑتے ہوئے پایا ——— اور یہی وہ لمحے تھے جب میں نے ایک حیات افروز شعلۂ بے تاب کو اندھیرے کے دامن میں سسک سسک کر ختم ہوتے ہوئے دیکھا۔

میں نے چودھری برکت علی کو ہمیشہ ایک قہقہہ، ایک امنگ اور ایک ولولے کی صورت میں دیکھا تھا۔ اور کبھی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ زندگی سے اتنی شدید محبت رکھنے والا، ہمہ حرکت، ہمہ جذبہ انسان کبھی زندگی سے منہ بھی موڑ سکتا ہے ——— کبھی بے حس و حرکت بھی ہو سکتا ہے ——— مگر ایسا ہو کر رہا ——— اور میں نے یہ الم ناک منظر اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لیا۔

زندگی میں کبھی کبھی ایسے واقعات بھی رونما ہو جاتے ہیں جنہیں ہم اپنے سامنے دیکھتے ہیں لیکن ان پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ——— چودھری برکت علی کا انتقال بھی ایک ایسا ہی ناقابلِ یقین واقعہ ہے۔

آج سے قریباً ساڑھے چار ماہ پیشتر میں حسبِ معمول دفتر میں پہنچا تو معلوم ہوا چودھری صاحب کی طبیعت رات سے کچھ خراب ہے، شاید دکان پر نہ آ سکیں۔ بالکل معمولی بات تھی۔ پہلے بھی کئی بار ایسا ہو چکا تھا۔ چودھری صاحب دو تین روز تک دکان پر نہیں آتے تھے اور جیسے ہی طبیعت ذرا سنبھلتی تھی، آمد و رفت شروع ہو جاتی تھی۔ معمولی بخار کو تو وہ خاطر میں لاتے ہی نہیں تھے۔ کہا کرتے تھے "مجھے خدا نے اس لئے پیدا نہیں کیا کہ بیماری کے نخرے دیکھتا رہوں"۔ تو اس روز بھی مجھے اور میرے ساتھیوں کو اس بات کا پورا پورا یقین تھا کہ چودھری صاحب کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی ہے جو وہ آج آنے سے قاصر ہیں۔ خیر دو تین روز تک آ جائیں گے۔

دو تین روز گزر گئے اور چودھری صاحب کی شکل نظر نہ آئی۔ مگر پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ دنیا میں کون شخص بیمار نہیں ہوتا اور چند روز تک اپنے فرائض ادا کرنے سے معذور نہیں رہتا!

چار پانچ روز اور گزر گئے اور چودھری صاحب ہم میں موجود نہیں تھے۔

مجھے اشاعتی پروگرام کے متعلق ان سے کچھ استفسار کرنا تھا اس لیے گھر پہنچا۔ نچلے کمرے میں لیٹے ہوئے تھے۔ گفتگو کے دوران میں پتہ لگا کہ پہلا روزہ افطار کرنے کے بعد پیٹ میں درد ہوا تھا اور اب بخار بھی آ رہا ہے۔

میں لوٹ آیا، اس توقع کے ساتھ کہ باقی گفتگو اس وقت کر لوں گا جب وہ کچھ دنوں کے بعد دفتر تشریف لے آئیں گے۔

دن گزرتے رہے اور ہم ہر روز ان کا انتظار کرتے رہے۔

پھر میں ایک روز پہنچا تو دیکھا کہ کافی نڈھال اور کمزور ہو گئے ہیں ——— لیکن ان کی آنکھوں کی چمک اور گفتگو کے "قہقہہ بردامانہ" میں قطعاً کمی

کی حالت نہیں ہوئی تھی، ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے اور باتیں کر کر کے ہنستے رہے۔

چند روز ہوئے ڈاکٹروں نے انہیں ملاقاتیوں سے زیادہ گفتگو کرنے سے روک دیا ہے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کچھ تشویش ہوئی واقعی انہیں ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ ہسپتال میں جب میں نے انہیں دیکھا تو میرے سامنے چودھری برکت علی کے قوی، توانا اور مضبوط جسم کی بجائے ایک نہایت کمزور اور زرد رنگ انسانی پیکر پڑا تھا ــــ وہ صرف دو تین باتیں کر سکے۔ حرارت کی شدت سے ان کا جسم پھنکا جاتا تھا۔

باہر آ کر میں نے استفسار سے کہا "دیکھا چودھری صاحب کو؟"

استاد سر جھکائے نہ جانے کیا سوچ رہا تھا ــــ اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا "چودھری صاحب کے گردے بالکل گئے ہوں گے؟"

یہ الفاظ سن کر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دماغ پر ایک بوجھ سا آ گرا ہے ــــ جیسے کسی سینے میں کوئی دور سے آتی ہوئی آواز سن رہا ہوں۔ میں نے اسے خواب ہی سمجھا تھا کیونکہ میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ بات نہیں مان سکتا تھا کہ زندگی کی یہ تب و تاب جس کا دوسرا نام چودھری برکت علی بھی ہے کسی وقت موت کے سامنے ہتھیار بھی ڈال سکتی ہے۔ کسی وقت وہ شمع خاموش بھی ہو سکتی ہے جس کی تجلیوں کے سیلاب سے زندگی کے در و دیوار روشن ہیں ــــ کسی وقت وہ نغمۂ حیات ختم بھی ہو سکتا ہے جسے سن کر زندگی سے بے حد محبت ہو جاتی ہے۔

زندگی گزرتی جا رہی تھی اور وہ منحوس گھڑی رینگتی ہوئی میو ہسپتال کے اس کمرے کی طرف بڑھ رہی تھی جہاں ایک کمزور، نحیف و نزار جسم موت سے آخری کشمکش میں مصروف تھا۔

چودھری برکت علی کی توانائی کا آخری اثاثہ بھی ختم ہو رہا تھا مگر اس کی جدوجہد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ اب بھی موت سے شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ اسے زندگی سے بے پناہ محبت تھی، اسے اپنے اصولوں سے بے پناہ محبت تھی ــــ موت پوری طرح اس کے گرد اپنے بازو پھیلا چکی تھی تاہم وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان بازوؤں سے اپنے آپ کو چھڑا لے، موت کو پیچھے دھکیل دے مگر پھیلے ہوئے بازو پیچھے نہ ہٹ سکے ــــ موت آ کر کبھی ناکام واپس بھی گئی ہے؟

میں نے کئی سال تک مسلسل چودھری مرحوم کے ساتھ کام کیا ہے، میں نے انہیں ہمیشہ ایک ہمدرد، صاف گو اور صاف دل انسان پایا ہے، ان کے ہونٹوں پر وہی کچھ ہوتا تھا جو ان کے دل میں ہوتا تھا۔ سخت سے سخت اور کڑوی سے کڑوی بات بھی وہ ہونٹوں پہ لے آتے تھے۔ کوئی چیز دل میں چھپاتے نہیں تھے۔ منافقت سے انہیں دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ اہل قلم کا ان کے دل میں بڑا احترام تھا اور میں جانتا ہوں کہ بعض ادیبوں کی تنگدستی میں انہوں نے کس طرح مالی مدد کی اور پھر ان کے احترام کو بھی برقرار رکھا۔ مجھے ان کے اس رویے نے بے حد متاثر کیا ہے۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی اپنے کسی ساتھی کی تہیدستی کا حال بتایا ہو اور انہوں نے کسی نہ کسی طرح اس کا ساتھ نہ دیا ہو۔ میری گذارش پر انہوں نے کئی ایسے مسودات خرید لئے تھے جو نامکمل تھے اور نامکمل ہی رہ گئے۔ مگر یہ خریدے محض اس لئے گئے تھے کہ ان مسودات کے لکھنے والوں کی مکتبۂ اردو سے کچھ توقعات وابستہ تھیں اور ان توقعات کو پورا کرنا چودھری مرحوم نے اپنا فرض سمجھا تھا۔

خیالات کے لحاظ سے چودھری صاحب ترقی پسند تھے۔ ان رجحانات کے ہمنوا تھے جو انسانیت کو آگے بڑھاتے ہیں۔ ادب کی ترقی پسند تحریک سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کا دوسرا سالانہ اجلاس کراچی میں ہونے والا تھا اس زمانے میں مرحوم کی حالت بڑی نازک تھی۔ نقاہت اس درجہ بڑھ چکی تھی کہ گفتگو بھی نہیں کر سکتے تھے۔ میں نے مرحوم کے صاحبزادے کے

بہرحال ان کی طرف ایک رقعہ بھیجا جس میں صرف یہ الفاظ لکھے تھے ۔۔۔ "ترقی پسند مصنفین کا اجلاس کہاں ہو رہا ہے ۔۔۔ کاش آپ علیل نہ ہوتے اور انجمن کے لئے کچھ کر سکتے" ۔۔۔ اس کے جواب میں انہوں نے دوسرے دن مجھے بلا بھیجا۔ [illegible] زبان میں اپنے بیان کے بارے میں چند اشارات کئے اور ایک معقول رقم انجمن کے لئے پیش کر دی۔

اس قسم کے کئی واقعات گنوا سکتے ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے بلا کر کہا "فلاں ادیب آج کل بیکار ہے، وہ بیمار ہے اور معلوم کیجئے ہم اس کے لئے کس حد تک تعاون کر سکتے ہیں؟" اور واقعی انہوں نے بیشتر ادیبوں سے پورے خلوص کے ساتھ تعاون کیا۔

آج چودھری صاحب زندہ نہیں ہیں مگر ان کی سالہا سال کی جدوجہد کا حاصل ہمارے سامنے موجود ہے ۔۔۔ میری اور ادارے کے ساتھیوں کی سب سے بڑی کوشش یہ ہے کہ مرحوم کے کارنامے زندہ رہیں ۔۔۔ اور ہمیں امید ہے کہ اپنے ہمدردوں کی امداد سے ہم انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گے۔

میرزا ادیب



پچھلے دنوں ایک اور المناک خبر اخباروں میں شائع ہوئی تھی۔ یہ خبر اردو کی مشہور و ممتاز افسانہ نگار ڈاکٹر رشید جہاں کے انتقال کے بارے میں تھی ۔۔۔!

ڈاکٹر صاحبہ کا ادب کی ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے ۔۔۔ وہ پہلی خاتون تھیں جس نے سماج کے شرمناک واقعات کے بیباکانہ اظہار میں جرأت پسندی کا ثبوت دیا تھا۔ مرحومہ ایک طرف اعلیٰ درجے کی افسانہ نگار تھیں تو دوسری طرف ایک ہمدرد اور قابل ڈاکٹر بھی تھیں ۔۔۔ ان کا انتقال اُردو ادب کے لئے ایک دردناک حادثہ ہے۔



ادبِ لطیف کا موجودہ شمارہ ستمبر اور اکتوبر کا مشترکہ نمبر ہے۔ آئندہ پرچہ بدستور سابق باقاعدگی کے ساتھ شائع ہوتا رہے گا۔ توقع ہے، اگلے شمارے میں ہم سالنامے کی تاریخِ اشاعت کا اعلان بھی کر سکیں گے۔



منتظمینِ پنجاب بک ڈپو، مکتبہ اُردو، ادبِ لطیف، ان تمام ہمدردوں کے تہہ دل سے شکر گذار ہیں جن کے مضامین یا تعزیتی پیغامات ادبِ لطیف میں شائع ہو رہے ہیں یا دفتر میں پہنچے ہیں اور عدمِ گنجائش کی وجہ سے ادبِ لطیف کے موجودہ نمبر میں شائع نہیں ہو سکے۔ ہم اپنے بہی خواہوں کو یقین دلاتے ہیں کہ انہوں نے جو توقعات ہم سے وابستہ کی ہیں، انہیں حتی الامکان پورا کریں گے!

ادارہ

کچھ غمِ جاناں، کچھ غمِ دوراں

زرد چہرے پہ بکھرتی ہوئی سوکھی سرسوں
روپ سے رنگ جدا، رنگ ہے خوشبو سے تہی
ایک پیتل کی ڈلی، جس میں نہیں کوئی گداز

پھر بھی بیٹھی ہے بازار میں کیسر بن کر
جل رہی ہے مگر اک شمعِ معطّر بن کر
بک رہی ہے زرِ نایاب کی ہمسر بن کر

اُف یہ چھلا ہوا موسم، یہ بسنتی پیکر
ہائے یہ جسم کی منزل کہ جہاں سستا کر
جن میں چکتے رہے سقا کی شب کے سودے

جن کے جادو سے کئی پیر و جواں گزرے ہیں
قافلے حرص کے بے نام و نشاں گزرے ہیں
آج پھر دل پہ وہ لمحات گراں گزرے ہیں

جب سنکتا ہے کوئی سرد ہوا کا جھونکا
یوں تصور پہ برستی ہیں پرانی یادیں،

دیر تک دل کے سلگنے کا گماں ہوتا ہے
جیسے برسات میں رم جھم کا سماں ہوتا ہے

دُور اس شہر کے گوشے سے بہت دور کہیں
جس کے جلووں میں جھلکتی ہوئی صندلی جنت
دیکھ کر جس کو گلِ اندامِ جوانی کی حیا

آرزوؤں کے گلستاں میں بہار آئی تھی
اپنے چہرے کو فریبوں سے نکھار آئی تھی
یک بیک جامۂ تقدیس اتار آئی تھی

وادیٔ حسن میں جذبات کے نورس غنچے
مرکزِ شوق کی حسرت میں پریشاں گیسو
دمِ بدم پیار کے گلزار بھی مہکے، لیکن

دستِ گلچیں کی مروت سے چٹکتے ہی رہے
بوسۂ آوارہ کی مانند بھٹکتے ہی رہے
دل میں کانٹے غمِ دوراں کے کھٹکتے ہی رہے

پروفیسر شور

خلّاقِ کائنات سے

یہ کرب میں ڈوبے ہوئے شہروں کے سویرے
صبحوں کے کفن، رات کے پُرہول اندھیرے

بجھتی ہوئی وہ دکانیں، سلگتے ہوئے بازار
فصلیں بھی دھواں دھار ہیں، خرمن بھی دھواں دھار

سِلتے ہوئے لب، زہر اُگلتے ہوئے سینے
طوفاں کے تراشیدہ کناروں پہ سفینے

چنگیز ہی چنگیز، قبا پوش و کلہ دار
زخموں کے بھی نیلام، سناؤں کے بھی بازار

کعبہ بھی سیہ پوش، کلیسا بھی سیہ پوش
طوفان ہی طوفان سفینوں سے ہم آغوش

سجدوں کی یہ ذلت، یہ وظیفوں کی کراہیں
اُٹھتے ہوئے سورج پہ یہ بھرپور نگاہیں

یہ بند و سلاسل میں مناجات کی تسکین
مرہم کی بھی توہین ہے، زخموں کی بھی توہین

یہ کلفتِ احساس تبسم سے فغاں تک
چھایا ہے اندھیرا ترا سورج ہے جہاں تک

ہو صبحِ اسیری تو ہیں یکساں عجم و چین
سونے کے درخشندہ جنازے ہیں سلاطین

ہیروں سے چمکتی نہیں "میری" ہو کہ "شاہی"
ہاتھوں سے ٹپکتی ہے ضمیروں کی سیاہی

دیتے ہیں دھواں لالہ و گل سے بھی نشیمن
شبنم کی خنک لَو سے بھی جل جاتے ہیں گلشن

اے انجم و مہتاب کے بھٹکے ہوئے راہی
کرنوں سے بھی آتی ہے اجالوں پہ تباہی

آدم ہو جہاں فکر و نظر کا بھی گنہگار،
بے طوق و سلاسل بھی ہے انسان گرفتار

اے خالقِ مہر و قمر و انجم و ناہید
اے وہ کہ چمکتا ہے ترے حکم سے خورشید

غم بھی مرا مجبور، مرا صبر بھی لاچار،
شعلوں میں بھی انگار ہے، شبنم میں بھی انگار

شمعوں پہ ہواؤں سے قیامت نہ گزر جائے
اُمڈتے ہوئے طوفان سے کہہ دے کہ ٹھہر جائے!

خرمن سے ہجومِ شرر و برق ہٹا دے
دہقان کے جلتے ہوئے اشکوں کو بجھا دے

کھیتی بھی کہیں خوشۂ گندم سے جلی ہے
کیا قادرِ مطلق ترا انصاف یہی ہے؟

○

تین چینی نظمیں

۱۔ جگنو سے!

بارش میں ترا یہ دیپ جلے
کبھی بجھ نہ سکے
جھکڑ جو چلے
تری جوت دبے نہیں اور بڑھے

او جگنو جا!
اور نیلے گگن کو جا کے بنا تو اپنا وطن
او جگنو جا!
اور چاند کے پاس پہنچ کے چمکتا تارا بن

لی پو (۶۲ - ۷۰۵ء)

۲۔ جوانی

دریا کے کنارے
گھاس اُگی ہے ــــــ ہری ہری
اور باغ کے اندر
بید کے پیڑ ہیں ــــــ گھنے گھنے
اک ناری اُدھر

جوبن کے نشے میں مست مگن
مینار کی کھڑکی میں ہے کھڑی —— غمگیں غمگیں
دیکھو تو سہی
گدرایا ہوا ذرا اس کا بدن —— گورا گورا
غازے سے ہے اس کا چہرہ عجب — گلگوں گلگوں
اور ہاتھ تو دیکھو
زرد زرد ——— کومل کومل
یہ رقاصہ تھی ناچ کیا کرتی تھی کبھی
اب بیوی ہے اک آوارہ سیلانی کی
اور سیلانی کہیں چلا گیا ہے — جانے کہاں
یہ چوڑا پلنگ اور تنہائی — جی مانے کہاں

(می شینگ۔ ۱۰۰ اق م)

۳۔ تنہائی

شام کا وقت ہے — دیکھو تو سنہرا سورج
گاؤں کی گلیوں پہ کس طرح چمکتا ہے ابھی

میری تنہائی کا عالم — مرے غمناک خیال
اور یہ ویران سڑک — جس پہ مسافر بھی نہیں
صرف پت جھڑ کی ہوائے غمگیں
کھیتیوں میں سے مری سمت بڑھی آتی ہے

(نامعلوم)

جانِ محفل

جانِ محفل! ترے مہکے ہوئے ہونٹوں کا فروغ
رنگ دیتا ہے مری زیست کے افسانوں کو
غم کے صحراؤں میں جھلسا ہوا احساسِ وفا
ڈھونڈتا ہے لب و رخسار کے پیمانوں کو
جرأت آموز ترا حسنِ پذیرائی ہے
چل نکلتا ہوں محبت کے صنم خانوں کو
کون سمجھائے مگر شیشہ گری کے آداب
شمع کی لَو پہ بکھرتے ہوئے پروانوں کو

بستۂ زلف نہیں عشق کی شوریدہ سری
کون اب روک سکے گا ترے دیوانوں کو
کون گرتی ہوئی دیوار کو اب تھامے گا
کون موڑے گا بپھرتے ہوئے طوفانوں کو

قمر اجنالوی

اے مری جانِ وفا!

تو اگر چاہے تو میں چھوڑ کے مزدور کے گیت
اپنے اربابِ ریاست کی تشفی کے لیئے
حسن و الفت کی حکایات قلم بند کروں

شہرِ فردوس کی حوروں کے فسانے لکھوں
چند بلور سے جسموں کے ترانے لکھوں
جن میں ہر شعر ہو مانندِ مئے ناب رواں

چاند کی وادیٔ پُر نور پہ یلغار کریں،
قصرِ ناہید پہ شعروں کی کمندیں پھینکوں،
رقص کرتے ہوئے تاروں کو گرفتار کروں

میں بھی دُہراؤں وہی کاکل و رخسار کے گیت
جن سے جل اُٹھتی ہے ہر بزمِ حسینانِ جہاں
میں بھی بُن سکتا ہوں اوہام وطلسمات کے جال
میرے شعلوں کو بھی مل سکتی ہے پھولوں کی زباں،

تو اگر چاہے تو الفاظ کے جادو کے طفیل
کشتِ دہقاں بھی خیاباں میں بدل سکتی ہے
بھوک بھی رزقِ دل و جاں میں بدل سکتی ہے
اور مزدور کی کٹیا میں سسکتی ہوئی شمع
یک بیک شمعِ شبستاں میں بدل سکتی ہے
ہیں مرے حلقۂ تخئیل میں مضمون کتنے،
جن سے کھل سکتے ہیں اشعار کے افسوں کتنے

میں بھی ایوانِ حکومت میں بلایا جاؤں
ہو مرے حال پہ بھی لطف و عنایت کی نظر
ایک آوارہ و درماندہ پہ شفقت کی نظر

میرے ہر شعر پہ ہنگامۂ فریاد اُٹھے
اور سرِ بزم ملے مجھ کو بھی تحسینِ غزل
میرے اشعار کی تشہیر کا ساماں ہو جائے
میں بھی لوگوں کی نگاہوں میں بڑا بن جاؤں
یعنی کچھ اور بھی شاعر کے سوا بن جاؤں

تو نہ چاہے گی مگر میرا تماشا ہونا
تو نہ چاہے گی شبِ تارِ غلامی کا فروغ

تجھ سے روشن ہے مرے دل میں وفا کی قندیل،
جانِ اشعار ہے تو، شعلۂ ایثار ہے تو
تو بھی اوروں کی مصیبت پہ تڑپ اُٹھتی ہے
عرصۂ دہر میں مجروح و دل افگار ہے تو
میرے ہاتھوں میں چھنکتی ہے جو زنجیرِ بلا
اُسی زنجیر کے حلقے میں گرفتار ہے تو

پر شبِ تارِ غلامی کی سحر دُور نہیں
اک نہ اک روز یہ زنجیرِ بلا ٹوٹے گی
حلقۂ کاکلِ ظلمت سے کرن پھوٹے گی

اور کچھ دیر غمِ گردشِ ایّام سہی
اور کچھ روز ابھی تلخیٔ آلام سہی

احمد ظفر

سخن گسترانہ

تُم کہتے رہو بہار کیا ہے
یہ حُسن یہ لالہ زار کیا ہے
ہم نے وہ چمن سجا دیئے ہیں۔
گُلچیں نہ جنھیں مٹا سکیں گے

تُم کہتے رہو کہ شب کا عالم
محفل میں یونہی رہے گا کم کم،
ہم نے بھی دیئے جلا دیئے ہیں
طوفاں نہ جنھیں بُجھا سکیں گے

تُم کہتے رہو کہ نسلِ انساں
رہتی ہے تمام عمر گریاں،
ہم لوگ کہ مُسکرا دیئے ہیں
صدمے نہ ہمیں رُلا سکیں گے

آنسو بھی، شرر بھی ہم چنیں گے
جو کچھ کہو گے تُم، سُنیں گے

خزاں ہوشیارپوری

جنازہ

کمیٹی کے مزدور افتاں وخیزاں
لئے جا رہے ہیں خزاں کا جنازہ
خزاں جس کی بے چارگی کے لبوں پر
کسی ماں کی شفقت کے بوسے نہیں ہیں
خزاں جس کی آنکھوں کے سوکھے کٹورے
تہی ہیں کسی باپ کے آنسوؤں سے
خزاں جس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے
خزاں جس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا
کرائے کے بے روح مزدور مل کر
خزاں کا جنازہ لئے جا رہے ہیں
مگر یہ خزاں کا جنازہ نہیں ہے
خزاں ایک شاعر ترانوں کا رسیا
سیہ پوش فاقے گلے سے لگائے
کلیجے میں دنیا کے گھاؤ چھپائے
بہت دیر پہلے سے ہی مر چکا ہے

خزاں جیسے بے دست و پا غم رسیدہ
خزاں کا جنازہ لئے جا رہے ہیں
مگر یہ خزاں کا جنازہ نہیں ہے
جنازہ ہے یہ اس حسیں نغمگی کا
جنھیں اس روپہلے تمدن کے وارث
جلاتے رہے دکھ کے آتش کدے میں
جنازہ ہے یہ اس تخیل کا جس کو
کچل ڈالا سرمائے کے قہقہوں سے

انھیں قہقہوں کی ہے وہ گونج جس نے
خزاں کا جنازہ اٹھایا ہوا ہے
انھیں قہقہوں کی ہے وہ گونج جس میں
ہزاروں خزاں اب بھی دم توڑتے ہیں

رباعیات

یہ دورِ مے و جام چلے یا نہ چلے
ڈر ہے کہ کہیں پھر یہ نظام چلے یا نہ چلے
ہم اہلِ خرابات سے لبریز ہے بزم
ساقی ترا کل نام چلے یا نہ چلے

آلامِ جہاں خواب نظر آتے ہیں
ظلمات کدے مہتاب نظر آتے ہیں
اک بزمِ خرابات ہے ایسی جس میں
اغیار بھی احباب نظر آتے ہیں

لفظوں میں فسانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
لمحوں میں زمانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ
تو زہر ہی دے شراب کہہ کر ساقی
جینے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں ہم لوگ

حالات کی دوپہر کڑی ہے ساقی
تقدیر پہ یہ سخت گھڑی ہے ساقی
کچھ دیر غمِ جہاں پہ آؤ ہنس لیں
ویسے تو زندگی پڑی ہے ساقی

احمد فراز

اثر لکھنوی

پھر وہی میر و غالب کا قضیہ!

ادبِ لطیف لاہور بابت ماہ مئی ۱۹۵۲ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب کا مضمون "میر و غالب کی ہم طرح غزلیں" میری نظر سے گزرا۔ مجھے جناب مصنف کے بعض اخذ کردہ نتائج سے اختلاف ہے۔ اسی کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب میر اور غالب کے یہ اشعار :-

میرؔ ؎ کیا طرح ہے آشنا گاہے، گہے نا آشنا ۔ یا تو بیگانے ہی رہیے، ہو جیے یا آشنا

غالبؔ ؎ خود پرستی سے رہے باہم دگر نا آشنا ۔ بے کسی میری شریک، آئینہ تیرا آشنا

نقل کر کے فرماتے ہیں کہ :-

"میر کا انداز حسبِ معمول نیم مجذوبانہ اور طرزِ گفتگو میں عاشقانہ سپردگی ہے۔ غالب کے شعر میں احساسِ انا اور خودنگری پائی جاتی ہے جو عشق میں بھی خودداری اور بالادست رہنے کے عزم سے پیدا ہوتی ہے۔ میر کے شعر میں بھی معمولی شکایتی اور احتجاجی رنگ پایا جاتا ہے۔ یہ ان کی شاعری کا مستقل رنگ ہے۔ 'یا تو بیگانے ہی رہیے، ہو جیے یا آشنا'۔"

میں باادب عرض کروں گا کہ ڈاکٹر صاحب کو میر کے مطلع کی صحیح معنویت کا ادراک نہیں ہوا۔ اس کے انداز میں تیکھا پن ہے۔ لگی لپٹی نہیں بلکہ دل کی بات زبان پر ہے۔ معشوق کے تلون کا گلہ۔ اور یہ اشارہ ہے کہ میں تیری بیگانگی جبراً و قہراً برداشت کر سکتا ہوں، مگر یہ دورنگی گوارا نہیں کہ کبھی آشنا ہے کبھی ناآشنا۔ شعر میں اپنے صدق، خلوص و خودداری و پاسِ وضع کا اظہار ہی نہیں بلکہ معشوق سے بھی اس کے متوقع ہیں۔ یہیں سے میر اور غالب کے نظریۂ عشق کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے۔ عربی الاصل میر محبت میں مساوات کا متوقع ہے۔ ایرانی شاعری کا پیرو غالب ؎

دے وہ جس قدر ذلت ہم ہنسی میں ٹالیں گے ۔ بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا

گو تاتل ہے بغیر میر کے شعر میں سپردگی کی چھاؤں بھی نہیں (یہ اور بات ہے کہ معشوق پر فیصلہ چھوڑنے کو "سپردگی" سے تعبیر کیا جائے)۔ شعر کے جو تیور ہیں وہ میر "سینہ و داغ" کے سوا کسی کے ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ نیم مجذوبیت نہیں عزتِ نفس ہے۔ خیال میں اس قدر آفاقیت ہے کہ مطلع ضرب المثل ہو گیا ہے۔

غالب کہتے ہیں کہ مجھے بے کسی سے فرصت نہ تھی کہ منت سماجت کر کے تجھے اپنی طرف ملتفت کرتا اور تجھے آئینے کے سامنے آرائش و زیبائش سے فرصت نہ ہوئی کہ مائل پرستش ہوتا۔ غالب کی خود پرستی "عصمت بی بی از بے چادری" کی مصداق ہے۔ بے کسی میں احساسِ انا ہونا، خودنگری کا پایا جانا، خودداری و بالادست رہنے کا عزم دور از کار باتیں ہیں اور مطلع کی خود پرستی کہنا غالب کی خود فریبی ہے۔ خود پرستی کا ٹکڑا نکال دیجیے تو شعر میں ایک گونہ کیفیت پیدا ہو سکتی ہے۔ مثلاً "ایسے عالم میں نہ کیوں رہتے ہم ناآشنا"۔ نیز "بے کسی میری شریک" سے "میری مونس بے کسی" بہتر ہوتا۔ مونس اور آشنا میں جو تناسب ہے شریک اور آشنا میں ہرگز نہیں۔ تعجب ہے کہ ایسے ناقص مطلع کو سراہا جاتا ہے۔ غالباً ایسی ہی کمزوریوں کے باعث دقیقہ رس نگاہوں نے اس کو انتخاب سے خارج کر دیا تھا۔ اب نسخۂ حمیدیہ سے اس کے وجود کا علم ہوا۔ یہ وجہ بھی ممکن ہے کہ اس کا

مطلع سے بھی بہتر ہیں شامل انتخاب ہے۔

وال وہ غرورِ عزّ و ناز، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع
راہ میں ہم ملیں کہاں، بزم میں وہ بلائے کیوں

غالب	میر
رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف	کیا کروں کس سے کہوں اتنا ہی بیگانہ یار
عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا	سارے عالم میں نہیں پاتے کسو کا آشنا
	جس سے کھوئی ... ان نے یہ کہا
	ہم تو کہتے گریباں ہم سے وہ ہوتا آشنا

ان اشعار کے تقابل میں ارشاد ہوا ہے کہ جو بات غالب نے ایک شعر میں نہایت بلیغ انداز میں بیان کر دی میر کے دو شعروں میں وہ بات پیدا نہیں کر سکے۔

غالب کے شعر کی خوبی تسلیم مگر سوال یہ ہے کہ کیا دونوں شاعروں نے ایک ہی بات کہی ہے؟ میر نے معشوق کی عام بیگانگی کا ذکر کیا ہے۔ غالب نے غیر سے اخلاص برتنے پر اظہارِ رشک و تاسف کے بعد اپنے دل کو یوں سمجھایا ہے کہ وہ بے مہر ہے کسی کا آشنا نہیں ہو سکتا۔ میر کے مطبوعہ کلیات میں پہلا مصرع اسی طرح درج ہے جس طرح ڈاکٹر صاحب نے نقل کیا لیکن میرے پاس جو قلمی نسخہ ہے اس میں یہ صورت ہے "کیا کروں کس سے کہوں اتنا ہوا بیگانہ یار" یعنی التفات کے بعد بیگانگی کا اظہار ہے۔ ایسی حالت میں کس کی عاشقی کا معیار بلند ہوا؟ اس کا جو معشوق کو یکایک اور بلا وجہ بیگانہ پاکر دوبارہ اتفاق یا اتحاد کا یہاں تک آرزو مند ہے کہ اسے آشتی پر مائل کر دینے کی یکسر یک سے کام لیتا کرتا ہے یا اس کا جو معشوق کو غیر سے مختلط دیکھ کر آتشِ رشک میں جلتا پھر اپنے دل کو سمجھاتا ہے کہ وہ بے مہر ہے۔ کسی کا آشنا نہیں ہو سکتا۔ میر کے دونوں اشعار میں جو وسعتِ معنی یار کے عالم ناآشنا ہونے سے پیدا ہوئی ہے، اور خیال کو مجاز سے حقیقت کی طرف منتقل کرتی ہے اس کی طرف بھی توجہ کیجئے۔ اشارہ کافی ہے، تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

میر —
بلبلیں پائیز میں کہتی تھیں ہوتا کاش کے | یک مژہ رنگِ فراری اس چمن کا آشنا
گل و لالہ کہاں سنبل سمن ہم نسترن | خاک سے یکساں ہوئے ہیں ہائے کیا کیا آشنا

ڈاکٹر صاحب نے "یک مژہ رنگِ فراری" کی بانکی ترکیب کو قابلِ اعتنا سمجھا اور فرمایا کہ غالب کی اس غزل میں ان اشعار کے معانی اشعار موجود نہیں مگر ایک اور غزل میں یہ مضمون پایا جاتا ہے:

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں | خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

کوئی شک نہیں کہ غالب کا یہ مطلع اس کے بہترین اشعار میں ہے اس میں "سب کہاں" کا ٹکڑا نہایت بلیغ ہے، مگر جب موازنہ ہم طرح غزلوں سے آگے بڑھنے لگا تو مجھے بھی میر کے دوسرے اشعار پیش کرنے کا حق ہے۔ حسنِ صورت کے ساتھ حسنِ صوت بھی ایک چیز ہے۔ آواز میں بھی جادو ہوتا ہے میر نے اپنے ایک شعر میں دونوں کو ہم آہنگ کر دیا ہے:

گل یادگارِ چہرۂ خوباں ہے بے خبر | مرغِ چمن نشاں ہے کسو خوش بیان کا

[illegible] واضح کر دیتا ہے؛

ہر قطعۂ چمن پہ ٹک انداز سے نظر کر — بگڑیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بنے ہیں

جمال کے مقدمہ سے تیر کے موخر الذکر شعر کو غالب کے مطلع پر ترجیح ہے کیونکہ اس نے اس عمل کی نفسیاتی تکمیل اور کیمیاوی تجزیہ بھی کر دیا، جس سے یہ شکلیں ننگی نمایاں ہیں کہ پھولوں کا خمیر اور سامان کا بیولیٰ یا خاکہ تیار کرتی ہیں اور اس طرح کائنات فطرت میں تنوع کے ساتھ یکسانی بھی۔ قدرتی تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ کوئی دو جسمانی انسان ایک ہی صورت شکل، ناک، نقشے، چہرے مہرے کے نہیں ہوتے مگر ایک ہی قسم کے پھول جب مرجھاتے ہیں تو ان کے پھول اپنے پیچھے ہی وہ مادہ سرشاخسار دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ پھولوں میں حسن کا جو ہر ہی حل نہیں بلکہ ان کی سرشت حسن سے پیدا ہوئی ہے۔ غالب نے انہیں میں سے بعض صورتوں کو جو خاک میں پنہاں ہو گئیں دوبارہ لالہ و گل میں نمایاں کر دیا ہے۔ تیر کی فکر رسا نے اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں۔ تیر نے تجزیہ میں ہزار شکلیں ذکر کرتا ہے کہ بعد حسینوں کی بدلی ہوئی شکلوں کو پھولوں کے روپ میں دوبارہ ظہور پذیر ہونے کے مختلف مدارج ملاحظہ کیجئے نزاکت، وقامت، رنگینی یا سادگی، شگفتگی یا نکیلا پن وغیرہ۔

ــہ تیر شاعر بھی زور کوئی تھا — دیکھتے ہو نہ بات کا اسلوب؟

ڈاکٹر صاحب کا یہ دعویٰ میری سمجھ میں نہ آیا کہ تیر فطرت کے عام مواد کو سامنے رکھ کر اس سے مضمون پیدا کرتے ہیں۔ غالب تجربات و مشاہدات کو فکر کی کٹھالی میں پگھلا کر ایک تصور یا ایک نظریہ بنا کر پیش کرتے ہیں، یہیں سے تیر کی تفصیل اور غالب کے اجمال کے راستے جدا ہو جاتے ہیں:

تعجب ہے کہ ڈاکٹر صاحب ما بعد فکر مضمون آفرینی کو تیر سے منسوب کرتا ہے۔ حالانکہ یہ خصوصیت در اصل کلام غالب کی ہے جو زندانی یا مستقبل یوسف و یعقوب کی سفیدی پھیرتے اور بلبل کے کاروبار پر خندہ ہائے گل کا اعلان کرتے ہیں یعنی وہ حسین الفاظ پر تخیل کی بنیاد رکھ کر مضامین آرائی کی دعوت دیتے ہیں۔ نیز کیا میں دریافت کر سکتا ہوں کہ غالب کے ان متعدد قطعات مشمولہ غزلیات کے متعلق کیا ارشاد ہوتا ہے جن میں اجمال کے بجائے شرح و بسط ہے۔ خصوصاً وہ قطعہ بند غزل جو اس مطلع سے شروع ہوتی ہے ــہ

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی؛

جو غالب کے قلم سے یہ مقطع لے کر نکلتی ہے ــہ

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ — شاہ دیندار نے شفا پائی

لطف یہ ہے کہ اسی زمین میں تیر کی بھی قطعہ بند یا مسلسل غزل موجود ہے جس کا مطلع ہے:

بات کیا آدمی کی بن آئی — آسماں سے زمین نپوائی

اس نے شاہ دیندار کی شفا پانے کے سے غیر متعلق و تملق آمیز خیال سے غزل کو سطحی یا مجروح نہیں کیا۔

یہ امر بھی قابل غور ہے کہ جب تیر واعظ شاعری میں جذبات و کیفیات و واردات قلب کی نگارش میں تفصیل سے کام لیتا ہے تو اس کی حیثیت کیا ہوتی ہے۔ نیز کیا مضمون آفرینی ایسے یا اس قبیل کے اشعار پیش کر سکتی ہے:

کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو — ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو

آہ کس طرح ہو ملیے کم کم — شوق حد سے زیاد ہے ہم کو

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ہم فقیروں سے بے ادائی کیا
آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

عالم عالم عشق و جنوں ہے دنیا دنیا تہمت ہے
دریا دریا روتا ہوں میں صحرا صحرا وحشت ہے

نہیں ہے چاہ بھلی اتنی بھی دعا کر میر
کہ اب جو دیکھوں اسے میں بہت نہ پیار آئے

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

ہجرانِ یار ایک مصیبت ہے ہم نشیں
مرنے کے حال سے کوئی کب تک جیا کرے

ہمیشہ چشم ہے نمناک ہاتھ دل پر ہے
خدا کسو کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

خوش نہ آئی تمہاری چال ہمیں
یوں نہ کرنا تھا پائمال ہمیں

اب کہتے ہیں یہ کہتے یہ کہتے جو وہ آتا
یہ کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

استخواں کانپ کانپ جلتے ہیں
عشق نے آگ یہ لگائی ہے

اور نہ معلوم کتنے ایسے ایسے جواہر پارے اس کے کلام میں بکھرے ہوئے ہیں۔ کیا یہ مضمون آفرینی ہے۔ خیالی گل بوٹے بنانا ہے جو رنگ و بو سے خالی ہیں۔ یہ حقیقت نگاری ہے یا غالب کی طرح زمین و آسمان کے قلابے ملانا ہے۔

میر بیشک حسن فطرت کا دلدادہ تھا، بلکہ یہ حیران کن لفظ طرز عجب عجب کا۔ مگر فطرت کا دلدادہ مضمون ہتھیانے کے لئے اس کی جیب ٹٹولے گا۔ فطرت کے عام جلوہ کو سامنے رکھ کر اس سے مضمون پیدا کریگا۔ یا نظارۂ جمال میں ایسا کھو جائے گا کہ ناطوعاً فطرت اپنا راز آشنا پا کر اس سے ہم کلام ہوگی، اپنے اسرار کے خزانے اس پر کھول دے گی اور زبانِ شعر و نغمہ میں اپنے رموز و حقائق بیان کرنے کی صلاحیت عطا کرے گی۔

کیا مندرجہ ذیل اشعار اور اسی قبیل کے بیسیوں اشعار میں فطرت کی ترجمانی نہیں بلکہ محض تعلّی یا مضمون آفرینی ہے؟

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات
کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

چلتے ہو تو چمن کو چلیے کہتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

سحر ہوا اٹھی گل زرد پھولی ہے سرسوں
ہوا ہے عشق ہی گل زرد کھلا ہے آج

بہار آئی شگوفے گل کے نکلے ہیں گلابی سے
نہالِ سبز جھومے ہیں گلستاں میں شرابی سے

آ گئے تھے دستِ گلچیں و دامانِ گل بہم — صبحِ چمن نمونۂ یوم الحساب تھا

کھِلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

کر سیرِ جذبِ الفتِ گلچیں نے کل چمن میں — توڑا تھا شاخِ گل کو نکلی صدائے بلبل

یک رنگیوں کی راہیں طے کر کے مر گیا ہے — گل میں رگیں نہیں یہ، ہیں نقشِ پائے بلبل

پیدا ہے روزِ مشرقِ نو کی نمود سے — نکلے ہے کوئے یار سے بچ کر آفتاب

فطرت کا ہر فن اس شاعری کی مشاقی سے اس کے مناظر کو آراستہ و پیراستہ کر کے ایک نہیں کہ ریا نقاب کے پس پردہ پیش کر کے کیفیتِ ملاحت اندوز ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ بقدرِ ظرف سیراب ہونا ذوقِ نظارہ و دیدۂ نظارگی پر منحصر ہے۔

میر کی غزل کا ایک دوسرا قطعہ ہے:

یوں سنا جاتا ہے کہ کرتا ہے سفر کا عزم جزم — ساتھ اب بیگانہ وضعوں کے ہمارا آشنا
شعر صائب کا مناسب ہے ہماری اور سے — سامنے اس کے پڑھے گر یہ کوئی جا آشنا
"تا بجاں ما ہمرہیم و تا بمنزل دیگراں — فرق باشد جانِ ما از آشنا تا آشنا"

بقول ڈاکٹر صاحب غالب کی اس غزل میں میر کے مماثل اشعار موجود نہیں۔ مگر ایک اور غزل میں یہ مضمون ادا ہوا ہے:

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر غالب — وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

اور اس کی تعریف میں یوں رطب اللسان ہوئے ہیں:

"غالب کے ایک شعر میں جو ایجاز یا اعجاز ہے میر کے پورے قطعے میں صائب کے شعر کے باوجود وہ اثر پیدا نہ ہو سکا۔ غالب کے شعر میں جو یاسیت، جوشِ رشک، اضطراب و اضطرار اور کمالِ تغزل موجود ہیں۔ میر کے یہاں معاملہ، کہانی، اور وہی نیم مجذوبانہ لولِ کلام پایا جاتا ہے جو ان کی غزل کا خاصہ ہے۔"

ڈاکٹر صاحب نے یہ غور نہیں فرمایا کہ میر کا مقصد صائب کے شعر کو تضمین کرنا تھا۔ لہٰذا اس کے مفہوم سے لپٹا رہنا لازم تھا۔ تاہم عزتِ نفس کا اتنا لحاظ رہا کہ خود معشوق کے پاس نہیں جاتا بلکہ یہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ میری جانب سے کوئی اس کو صائب کا یہ شعر سنائے۔ تضمین کی خوبی میں کوئی شک نہیں۔ اور مندرجہ اشعار کو اسی روشنی میں پرکھنا چاہیئے۔

اب میں میر کا ایک دوسرا شعر پیش کرتا ہوں:

عشق ان کو ہے جو یار کو اپنے دمِ رفتن — کرتے نہیں غیرت سے خدا کے بھی حوالے

یہ ہے جذبۂ رشک و غیرت کی صحیح مصوری۔ یہ نہیں کہ معشوق کو غیر بھگائے لئے جاتا ہے یا معشوق غیر کے ساتھ بھاگا جاتا ہے۔ غالب کو غور سے دیکھئے اور ہاتھ مل مل کے کہتے ہیں: قیامت ہے الخ

یہ عرض کر دوں کہ "عشق ان کو ہے" کے معنی ہیں "ان کو آتا ہے"۔

بزمِ شوق نیرنگو: غالب کا مندرجہ ذیل شعر ان کے انفرادی رنگ اور تخیل کی نادرہ کاری کا شاہکار نمونہ ہے۔ اس کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے ؎

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے　　گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

دنیا کو باعتبار تغیرات و تماشا آمادگی میخانۂ نیرنگ اور ذروں کو جو تغیر و فنا کی نشانیاں ہیں ساغرِ میخانۂ نیرنگ کہنا پھر اس طلسم آبادی و ویرانی یا آبادی و ویرانی کو گردشِ مجنوں سے تعبیر کرنا اور چشمکہائے لیلیٰ (اشارہ مشیت) کا رازداں کہہ کر جوشِ رقص و مستی و میخانہ آرائی دکھا دینا اور لفظِ چشمک کا کرتال سم پیدا کر دینا حسنِ تخیل و جولانیٔ فکر کا حیرت انگیز کرشمہ ہے۔ شعر و حکمت و فلسفہ و تصوف کا وہ بدیع امتزاج ہے کہ شاید۔ اور اختلافِ مذاق دیکھئے کہ ڈاکٹر صاحب نے اس شعر کی تعریف میں ایک لفظ بھی سپردِ قلم نہیں کیا۔

دونوں استادوں کی غزلوں کے جو اشعار میرے انتخاب میں آئے ہیں پہلو بہ پہلو درج کرتا ہوں۔

میر	غالب
کیا طرح ہے آشنا گاہے گاہے ناآشنا	رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف
یا تو بیگانے ہی رہیے ہو جیے یا آشنا	عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا
پائمالِ صد جفا ناحق نہ ہو اے عندلیب	شوق ہے ساماں طرازِ نازشِ اربابِ عجز
سبزۂ بیگانہ بھی تھا اس چمن کا آشنا	ذرہ صحرا دستگاہ و قطرہ دریا آشنا
کون سے یہ بحرِ خوبی کی پریشاں زلف ہے	میں اور اک آفت کا ٹکڑا وہ دلِ وحشی کہ ہے
آتی ہے آنکھوں میں میرے موجِ دریا آشنا	عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا
داغ ہے تاباں علیہ الرحمہ کا چھاتی پہ میر	ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا	گردشِ مجنوں بہ چشمکہائے لیلیٰ آشنا

باقی ماندہ موازنہ اس تمہید سے شروع ہوتا ہے "میر و غالب کی دو ادھم طرح غزلیں ایسی ہیں جن میں غالب بعض ظاہری خصوصیات کی بنا پر میر سے زیادہ قریب معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ذیل کی غزل میں سلاست اور صفائی بیان زیادہ ہے۔ اس لئے میر کے عام رنگ سے مماثلت بھی زیادہ ہے؟

میر	غالب
مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر	کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر	جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر
افسوس ہے کہ منتظر اک عمر تک رہے	آتش پرست کہتے ہیں اہلِ جہاں مجھے
پھر مر گئے ہیں تیرے تئیں اک بار دیکھ کر	سرگرمِ نالہ ہائے شرربار دیکھ کر
ناخواندہ خطِ شوق لگے چاک کرنے تو	کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
قاصد تو کہیو ڈھنگ کہ ستمگار دیکھ کر	رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر

میرؔ

کانی بھی دم رہا ہے تو آنکھوں میں پھرتا ہے اب
کرتا ہے ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر

دیکھیں جدھر وہ قتلِ جہاں پیشِ چشم ہے
حیران رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

تیرے خرامِ ناز پہ جاتے ہیں جی چلے
رکھ ٹک قدم زمیں پہ ستمگار دیکھ کر

کاہے سے چشم پوشی یہاں تک کی ہم نشیں
چھپتا ہے مجھ کو دور سے اب یار دیکھ کر

جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میرؔ
پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

غالبؔ

آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر

وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ
لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

زنار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہیں راہ کو ہموار دیکھ کر

کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے
طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

سر پھوڑنا وہ غالبؔ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

ڈاکٹر صاحب کا فیصلہ ہے کہ مرزا غالب کی یہ غزل ان کی بہترین غزلیات میں سے ہے۔ اس کا ہر ہر شعر میرؔ کے اشعار پر بھاری ہے ماسوائے اس شعر کے ؎

جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے   آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

میرؔ کے کسی شعر میں وہ گرمی اور تاثیر نہیں جو غالبؔ کے ہر ہر شعر میں پائی جاتی ہے۔ غالبؔ کا سا لطفِ بیان اور ندرتِ اسلوب، شعلۂ جذبات میرؔ کی غزل میں نظر نہیں آتا۔ میرؔ کے کلام میں دیوار سے متعلق تصورات عموماً موثر ہوتے ہیں۔ مگر غالبؔ نے اس غزل میں دو مرتبہ دیوار کے مضمون میں وہ خوبی اور تاثیر پیدا کی ہے کہ اس خاص موضوع میں بھی وہ میرؔ سے کسی طرح کم نہیں:

(ڈاکٹر صاحب دو مرتبہ نہ معلوم کس بنا پر تحریر فرما گئے۔ دیوار کا قافیہ صرف غالبؔ کے مقطع میں ہے)

موازنے کی دو صورتیں ہیں (۱) کون قافیہ کس نے اچھا کہا۔ (۲) ایک غزل کا دوسری غزل سے من حیث المجموع تقابل۔

پہلے ہم قافیہ اشعار لیجئے:

میر

مرتے ہیں تیری نرگسِ بیمار دیکھ کر
جاتے ہیں جی سے کس قدر آزار دیکھ کر

غالب

کیا آبروئے عشق جہاں عام ہو جفا
رکتا ہوں تم کو بے سبب آزار دیکھ کر
وا حسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ
ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر

میر کہتے ہیں کہ ایک تو عشق ہی آزار ہے، دوسرے نرگسِ بیمار (چشمِ معشوق) کے عشق کا آزار بالائے آزار ہے۔ [illegible] مر رہے ہیں۔ خیال میں ایک گونہ تازگی کے باوصف جاذبیت نہیں۔

غالب کے پہلے شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کی جفا خاص و عام پر یکساں بلا تفریق ہے۔ لہٰذا میں کھنچا رہتا ہوں کیونکہ عشق کی شان میں بٹہ لگنے کا ڈر ہے۔ شعر [illegible] کا گھر رہا ہے اور بس۔ اگر عشق کے محرمِ راز ہوتے تو ایسی حالت میں معشوق کو یوں مخاطب کرتے۔

کچھ ہو رہے گا عشق و ہوس میں بھی امتیاز   آیا ہے اب مزاج ترا امتحان پر   میر

غالب کا دوسرا شعر خوب ہے۔ معشوق کی شوخی و ستم ظریفی کی عمدہ مثال ہے۔ جہاں تک آزار کے قافیے کا تعلق ہے، پلا غالب کے ہاتھ رہا۔

میر

کوئی جو دم رہا ہے سو آنکھوں میں ہے پر آب
کریو تنک ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر

غالب

کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھ کر
جلتا ہوں اپنی طاقتِ دیدار دیکھ کر

میر کے شعر میں ردیف کے لطف کے سوا کوئی کشش کوئی خوبی نہیں۔ غالب کے مطلع کے الفاظ شاندار ہیں، بندش چست ہے گر حال کے لحاظ سے مصرع اس کی ساری [illegible] لفظ جلنے کے دُہرے معنی ہیں، ایک تو جلنا سوختن، دوسرے جلنا مجازاً بمعنی رشک۔ معشوق کی تابشِ رخسار دیکھی مگر جل کے خاکستر نہ ہوئے۔ اب اپنی طاقتِ دیدار پہ رشک آ رہا ہے۔ ایسی تک بندی اہلِ نظر کو مرعوب نہیں کر سکتی۔ جہاں تک قافیے کا تعلق ہے نہ ایں را شکست نہ آں را ظفر۔

اس مفہوم کے واضح کرنے کو محض الفاظ کے ہیر پھیر سے وہی مضمون کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ میر کے اس شعر کا ۔

کوئی جو دم رہا ہے سو آنکھوں میں ہے [illegible]   کریو تنک ایک وعدۂ دیدار دیکھ کر

خود میر ہی کے دوسرے شعر سے موازنہ کیجئے ۔

آنکھوں میں جی مرا ہے ادھر دیکھتا نہیں   مرتا ہوں میں تو ہائے رے صرفہ نگاہ کا

جس میں خیال مصور ہو کر تاثیر کا طلسم بن گیا ہے ؛

میر

جاتا ہے آسماں لیے کوچے سے یار کے
آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

غالب

سر پھوڑنا وہ غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے تری دیوار دیکھ کر

میر کا شعر ایک نشتر ہے جو دل میں پیرتا چلا جاتا ہے۔ خود اس کی بے کسی در و دیوار سے ٹپکتی ہے۔ اور ان کو اس کا ہمدرد بنا دیتی

ہے جس کا ایک نا ہونا زیادہ ہے جس کا شعر حسن و پاس ہی پیدا ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں غالب کا شعر بالکل مختلف ہے۔ ایک ... جو شاید ... مشترک ہے۔ غالب معشوق کی دیوار سے سر پھوڑ کے مرنے کے سلسلے میں ... کہتے ہیں ... اس میں کیفیات کا ... جس کی ڈاکٹر صاحب نے تعریف ... ہے۔ چونکہ ... تاخیر کا تعلق میر و غالب ... کیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کا قول ماننے کو تیار نہیں کہ ... باقی اشعار ہم قافیہ نہیں ... ہر شعر کو علیحدہ علیحدہ پرکھنا ... کی ... تعیین کرنی ہوگی۔ میر کا یہ شعر کمزور بلکہ بھرتی کا ہے ؎

تا صد تو ... شوق کے ... کر سنے تو قاصد کو ... کو سنگسار دیکھ کر

یہ اشعار ... دیکھے ہیں ؎

تیرے خرام ناز پہ جاتے ہیں ہی چلے رکھ تک قدم زمیں پہ سنگسار دیکھ کر

... چشم پوشی ... کی ہم نشیں چھپتا ہے ... کے ... دیکھ کر

یہ شعر خوب ہیں ؎

۱۔ افسوس ہے کہ خضر اک عمر تک رہے پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر

۲۔ دیکھیں جدھر وہ رشک پری چشم ہے حیراں رہ گئے ہیں یہ اسرار دیکھ کر

۳۔ جاتا ہے آسماں لئے کوچے سے یار کے آتا ہے جی بھرا در و دیوار دیکھ کر

۴۔ جی میں تھا اس سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

شعر نمبر ۱ تصوف کے مقام مشاہدہ و مکاشفہ کا آئینہ دار اور منزل حیرت کا رہنموں ہے۔ شعر نمبر ۴ تو خود غالب کو بہت مرغوب تھا، کیونکہ ایک سے زیادہ جگہ اس کا چربہ اتارنے کی کوشش کی ہے:

۱۔ منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں غالب یار لائے مرے بالیں پہ اسے پر کس وقت

۲۔ منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

میر انتظار کرتے ہے اور غالب بیمار پڑ کے مر رہے ہیں۔ دوسرے شعر میں لفظ بیمار موجود ہے، اور پہلے میں لفظ بالیں اس کا غماز ہے۔

اب غالب کے باقی اشعار دیکھئے:

آتش پرست کہتے ہیں اہل جہاں مجھے سرگرم نالہ ہائے شرر بار دیکھ کر

جو بیش کے ہاں اور نہ ہی ... کیفیت ... رعایت لفظی۔ اس کو غالباً ڈاکٹر صاحب نے شدت جذبات سے تعبیر کیا ہے، حالانکہ اگر اس میں ... آتش بازی کے ... جس کے منہ سے شعلے نکل رہے ہیں اور ... ہیں۔ سرگرم نالہ ہائے شرر بار کی یہی توجیہہ ہو سکتی ہے۔

آتا ہے میرے قتل کو پر جوش رشک سے مرتا ہوں اس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

اصل وجہ یہ ہے جو غالباً میر کے اس شعر سے الگ کرنے کا نتیجہ ہے ؎

جاتا ہے یار تیغ بکف غیر کی طرف اے کشتۂ ستم تری غیرت کو کیا ہوا

شعر غالب ؎ ثابت ہوا ہے گردن مینا پہ خون خلق لرزے ہے موج مے تری رفتار دیکھ کر

دوسرا مصرعہ بجائے خود ایک حسین شعر ہے اور اس قدر مقبول کہ عصرِ جدید کے ایک شاعر نے اسے بطور عنوان لیا ہے۔

؎ بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر

حقیقت سے ہم کنار اور فطرتِ انسانی کا آئینہ دار ہے۔

؎ زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال — رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

کھلی ہوئی کفر کی تلقین! اور اس سے بے خبر کہ اس طرح دوشوں کے بجائے پتھر ستو ناہموار ہوں گے۔

؎ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے — طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر

اسی کو سب ہی کی "[illegible]" کہتے ہیں

؎ گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے معترضہ غالب کا ایک شعر دیکھا ہر پہلو نظرانداز ہو گیا جو نہایت لطیف دلنشیں ہے ؎

ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

میر کے منتخب اشعار کہیں درج کر چکا ہوں غالب کے منتخب اشعار یہ ہیں:

ثابت ہوا ہے گردنِ مینا پہ خونِ خلق — لرزے ہے موجِ مے تری رفتار دیکھ کر
بک جاتے ہیں ہم آپ متاعِ سخن کے ساتھ — لیکن عیارِ طبعِ خریدار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریصِ لذتِ آزار دیکھ کر
گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر
ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا گیا تھا میں — جی خوش ہوا ہے راہ کو پرخار دیکھ کر

اب یا تو ڈاکٹر صاحب غالب کے ان اشعار میں حسن دکھائیں جن کی میں نے مذمت کی ہے ورنہ ان کا یہ دعویٰ باطل ہے کہ قابلِ تسلیم ہے کہ غالب کی اس غزل کا ہر ہر شعر میر کے اشعار پر بھاری ہے (ایک استثنا) اور میر کے کسی شعر میں وہ گرمی اور تاثیر موجود نہیں جو غالب کے ہر ہر شعر میں پائی جاتی ہے: اس شعر کے علاوہ جسے ڈاکٹر صاحب نے مستثنیٰ کر دیا ہے اگر مندرجہ ذیل اشعار میں تاثیر نہیں تو پھر تاثیر [illegible]

؎ افسوس وے کہ منتظر اک عمر تک رہے — پھر مر گئے ترے تئیں اک بار دیکھ کر

؎ جی میں تھا اس سے ملیے تو کیا کیا نہ کہیے میر — پر جب ملے تو رہ گئے ناچار دیکھ کر

مندرجہ ذیل غزل کے متعلق ارشاد ہوا ہے کہ اس میں بھی کلامِ غالب کی جلوہ انگیزیاں میر کے رنگِ حسن کو ماند کئے دیتی ہیں۔

میر	غالب
دل عشق کا ہمیشہ حریفِ نبرد تھا	دھمکی میں مر گیا جو نہ بابِ نبرد تھا
اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں آگے درد تھا	عشقِ نبرد پیشہ طلبگارِ مرد تھا

اک گرد راہ تھا پئے محمل تمام راہ
کس کا غبار تھا کہ یہ دنبالہ گرد تھا

دل کی شکستگی نے ڈرائے رکھا ہمیں
واں چیں جبیں پہ آئی کہ یاں رنگ زرد تھا

مانند حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا
دل بھی مرا جریدۂ عالم میں فرد تھا

تھا پشتۂ ریگ بادیہ اک وقت کارواں
یہ گردباد کوئی بیاباں نورد تھا

گزرا مدام اس کی جوانان مست بیچ
پیر مغاں بھی [illegible] کوئی پیر مرد تھا

عاشق ہیں ہم تو میر کے بھی ضبط عشق کے
دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا

دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب
اس رہگزر میں جلوۂ گل آگے گرد تھا

تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

احباب چارہ سازیٔ وحشت نہ کر سکے
زنداں میں بھی خیال بیاباں نورد تھا

جاتی ہے کوئی کشمکش اندوہ عشق کی
دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ڈاکٹر صاحب جو چاہے فرمائیں غالب کا مطلع میرے ذوقِ سماعت کو مجروح کرتا ہے۔ اس میں ایسے الفاظ جمع ہو گئے ہیں جن میں حروف و اصوات کی [illegible] ہے۔ میر کے مطلع کی عذوبت اور غنائیت اپنا جواب آپ ہے۔ اس میں عشق کے تمام مراحل کا نفسیاتی تجزیہ ہے۔ اور اس حقیقت کا انکشاف ہے کہ عشق کا حاصل درد اور درد کا سرمایہ داغ ہے۔ غالب کے مطلع میں بناوٹ ہے۔ میر کے مطلع میں لوچ اور نرمی ہے۔ خود [illegible] ہے۔ غالب کسی مدِ مقابل کی عدم موجودگی میں پینترے بدل بدل کے [illegible] دکھاتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ جوشِ بیان شکوہِ الفاظ سے بالکل علیحدہ چیز ہے۔ ان دونوں میں امتیاز نہ کرنا بہت سی غلط فہمیوں بلکہ گمراہیوں کا موجب ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ غالب جب میر کے انداز میں سچ مچ قلم اٹھاتے ہیں [illegible] کی معنویت کہنے سے قاصر ہیں، تو میر کے پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اور میرا دعویٰ ہے کہ [illegible] اسی غزل میں زرد کا قافیہ لے لیجیے۔ میر کے شعر میں دل کی شکستگی اور چیں جبیں کا [illegible] اور شعر کی [illegible] شاعری تحسین سے مستغنی ہے۔ غالب کا [illegible] میر کے اس شعر میں "مانند حرف صفحۂ ہستی سے اٹھ گیا"۔ دل بھی مرا جریدۂ عالم میں [illegible] سے نظم ہوا ہے۔ اور غالب [illegible] کہتے ہیں کہ [illegible] خیالات میں ترتیب و تسلسل پیدا نہیں ہوئے تھے۔ میں تالیف نسخہ [illegible] شاید اسی وجہ سے [illegible] گرفت گیا اور [illegible] آگے نہ بڑھ سکے۔

[illegible] اگر کسی کو [illegible] غالب کی [illegible] تحرک پسندی اور [illegible] دل جل گیا تھا اور نفس لب پہ سرد تھا۔ دراصل [illegible] جذبات کی آتش فروزی اور تاثیر کی گرمی ہے۔ [illegible] غالب نے اس کے تتبع میں [illegible] کا زور لگایا۔ مگر

شعر انداز میر میں کہنا
چاہتے ہیں سبھی، کہا بھی جائے

پھر بھی [illegible] کا یقین ہے کہ میر کے بعد اگر اردو نے کوئی شاعر پیدا کیا تو وہ غالب ہے:

میر و غالب سے اثر ہے گرمیٔ بزمِ سخن
وہ خدائی کر گیا اور یہ پیمبر ہو گیا

حسن منٹو

ادب کی دوامی قدریں

جہاں تک مستقل اور ابدی قدروں کے فلسفے کا سوال ہے۔ کوئی بھی باشعور ادیب اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ یہ ایک نہایت اہم بحث ہے [illegible] لیکن بحث کرنے سے پہلے ہمیں اس بات کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم قدر سے یہاں مراد کیا لیتے ہیں۔ اور اس سے ہمارے ذہن میں کون سا شعور پیدا ہوتا ہے۔ [illegible] ہر حال سمجھتے ہی ہیں کہ کسی چیز کی قدر اس چیز کو پرکھنے کی کسوٹی ہی ہوتی ہے۔ کسی ایک مخصوص چیز کے ساتھ جس کے تعلق سے انسان کے تجربے اور مشاہدے میں چند باتیں بنیادی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں، جن باتوں کو ہم اہم قرار دیتے ہیں چند کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ یہی بنیادی اور اہم باتیں اس مخصوص چیز کی کسوٹی ہوتی ہیں۔ اور اس اشیا سے اس کی کسوٹی بن جاتی ہیں۔ حرکت اور تغیر زندگی کی بنیادی قدر ہے ——— اسی کسوٹی پر ہم زندگی اور موت کو پرکھتے ہیں۔ جو شے متحرک اور تغیر پذیر نہیں وہ زندہ بھی نہیں ——— زندگی کی یہ قدر جس کا تذکرہ ہم نے ابھی کیا ہے، ایک ایسی بنیادی حیثیت رکھتی ہے کہ بغیر اس کے زندگی کا تصور ہی ناممکن ہو جاتا ہے۔ ایسی اقدار، قدر کی حدود سے نکل کر تعریف بن جاتی ہیں۔ یہ تعریف اپنے مفہوم کے اعتبار سے ہر دور میں تبدیل ہوتی رہتی ہے، لیکن یکسر تبدیل نہیں ہو جاتی۔ مثلاً ادب کی تعریف ہر دور میں مختلف ادیبوں کے نزدیک مختلف رہی ہے۔ لیکن تمام نقادانِ ادب ماضی کے ادب کو ادب ہی مانتے رہے ہیں۔ حالانکہ ماضی کے ادب میں وہ فن پارے بھی شامل ہیں، جن کے خالق فن کی یہ تعریف کرتے تھے کہ بہترین آرٹ کم سے کم لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے اور وہ بھی جو بہترین شعر کی تعریف یوں کرتے تھے کہ جو منہ سے نکلتے ہی سامع کے ذہن میں ہو بہو وہی تصور اور تاثر پیدا کر دے جو اس کے خالق کا مقصود ہے ——— وہ آرٹ بھی آرٹ ہی تسلیم کیا جاتا ہے جو سوائے آرٹسٹ کے بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آیا [illegible] جو ہر دیکھنے والے کو اس کے سبب حال معلوم ہوا ——— ادب کی تعریف کے سلسلے میں یہاں جو تضاد پیدا ہو جاتا ہے، در اصل اسی سے ادبی اقدار کی وضاحت ہوتی ہے۔

ادب یا کسی بھی دوسرے فنِ لطیفہ یا جمالیاتی شعبے کو لیجیے۔ اس کے متعلق ایک بات قطعی ہے کہ اس کا تعلق زندگی سے ہے اور اسی لیے [illegible] اقدار کے تعین کے لیے زندگی اور زندگی کی اقدار کو مدِ نظر رکھنا پڑتا ہے ——— زندگی ایک مسلسل ارتقا ہے، بعض قوتیں اس ارتقا کی مثبت قوتیں ہیں اور بعض اس کی مخالف ——— پہلی قسم کی قوتیں ترقی پسند کہلاتی ہیں، اور دوسری رجعت پسند ——— جو خصوصیات ایک طاقت کو ترقی پسند بناتی ہیں، وہ اسی کی اقدار کہلاتی ہیں، اسی طرح رجعت پسند اقدار کا تعین بھی کیا جا سکتا ہے۔ ادب میں بھی اچھی اور بری، صحت مند اور غیر صحت مند اقدار ہو سکتی ہیں۔ لیکن بنیادی طور پر [illegible] باوجود [illegible] کے باوجود ادب کی ادبی حیثیت قائم رہتی ہے۔ مثلاً یہ کہ غیر ترقی پسند ادب برا سہی لیکن ادب ضرور ہے ——— ادب کی وہ قدر جو اسے ادب بناتی ہے، بہرحال دائمی ہے، لیکن یہ ہماری بحث سے خارج ہے، کیونکہ ہم کہہ چکے ہیں کہ اس کی حیثیت قدر سے زیادہ ہے، یہاں ادب کا [illegible] صرف ان اقدار سے متعلق ہے، جو ادب کی صفات میں شامل ہیں۔ جو ادب کی خصوصیات ہیں، جو اچھے اور برے ادب کی، ترقی پسند اور رجعت پسند ادب کی کسوٹی ہیں۔

سب سے پہلے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ادبی اقدار کیسے جنم لیتی ہیں؟ کون سے عناصر ادب کی اقدار کا تعین کرتے ہیں۔ یہ بات اس [illegible] سے

[illegible] ہے کہ [illegible] ادب کی [illegible] مختلف [illegible] معین [illegible] ہیں۔

[illegible] زندگی کا، تخلیق ہر چیز کی [illegible] اس کے متعلق ایک بات تو یقینی ہے کہ [illegible] معاشرے [illegible]
[illegible] ہوتا ہے۔ البتہ معاشرے کے ساتھ مختلف ادیبوں کے مخصوص تصورات [illegible] زندگی کے [illegible]
[illegible] کر دیتا ہے ۔ ——— اب خالص [illegible]
[illegible] ادب کی بنیاد [illegible]
[illegible] اور [illegible] خیالات پر اپنے افکار کے [illegible]
[illegible] گیت [illegible] مساوات اور جمہوریت کا [illegible] ——— ہر حال [illegible]
[illegible] معاشرے کے مختلف [illegible] ادب [illegible] ——— [illegible] قسم کی
[illegible] مختلف [illegible] کی تخلیقات وغیرہ [illegible] زندگی سے متعلق ——

[illegible] بات [illegible] ——— ادب کی تخلیق کا ذریعہ زبان ہے، بغیر زبان کے ظاہر ہے ادب کا وجود ممکن نہیں ——— زبان [illegible] خیالات کا [illegible] ہے، لوگوں کے تجربات اور [illegible] کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے چنانچہ ادب بھی اظہار خیالات کا ایک [illegible] استعمال اس طرح کہ [illegible] کہنا چاہتا ہو، اس سے بہتر طور پر [illegible] کہ سکے، ادب میں شامل ہو جاتا ہے، یہ علیحدہ بات ہے [illegible] معاشرے کی ترقی کے بعد [illegible] کی طرح ادب نے بھی اپنی انفرادی حیثیت پیدا کر لی ہے، اور اس کے لئے مختلف قواعد و لوازم [illegible] ادب بہتر طور پر خیالات کو دوسروں تک پہنچانے اور انہیں متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے [illegible] اگر یہ بات نہ ہوتی اور ادب [illegible] کی [illegible] حیثیت کوئی نہ ہوتی، اس کو منظر عام پر لانے کی ضرورت محسوس نہ کی جاتی ——— [illegible] کہ ادب [illegible] خیالات ہے یہ بات زیادہ مضبوط ہو جاتی ہے کہ ادب زندگی کے ساتھ متعلق ہے، کیونکہ خیالات زندگی ہی کی بدولت پیدا ہوتے ہیں [illegible] زندگی کے حالات، تجربات اور مشاہدات ہی [illegible] ذہن کی ترتیب و تدوین کا باعث ہوتے ہیں انہی سے ہمارے شعور کی تخلیق ہوتی ہے ——— زندگی [illegible] منقسم ہے [illegible] کی مختلف سماجی صورتیں ہیں، اس لئے لازمی طور پر ادبی تخلیق اپنے مخصوص معاشرے کا پرتو ہوتی ہے ۔

[illegible] زندگی کی پیداوار ہے اور ایک سماجی عمل ہے تو یقیناً ادبی اقدار بھی زندگی ہی کی پیداوار ہوں گی یہ بھی سماج ہی کی مرہون منت ہوں گی۔ ——— زندگی [illegible] ایک [illegible] نہ چلتی رہی ہے نہ چلتی رہے گی۔ سماج ہمیشہ ایک نہیں رہی، ایک مسلسل تغیر زندگی کی بنیادی خصوصیت ہے۔ [illegible] زندگی کے مختلف مدارج مختلف سماجوں کی صورت میں ہمارے سامنے ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں، پتھر اور دھات کے زمانے کی سماج، [illegible] اور [illegible] آج کے معاشرے ایک دوسرے سے بنیادی طور پر مختلف ہیں۔ ظاہر ہے کہ پتھر اور دھات کے زمانے کی سماجی [illegible] اور اخلاقی اقدار آج کی اقدار سے مختلف ہوں گی۔ خود اس زمانے میں جبکہ پوری دنیا ایک وحدت کی طرف بڑھ رہی ہے، [illegible] سے زیادہ مضبوط ہو رہے ہیں۔ مختلف ممالک کی تہذیبیں ایک دوسرے پر اثر انداز ہو رہی ہیں ہمیں مختلف [illegible] اخلاقی اقدار میں گہرا فرق نظر آتا ہے، اگر ایک ملک میں جسم کی زیادہ سے زیادہ نمائش اور حسن و خوبصورتی کے مقابلوں کو جائز [illegible] تو دوسرے ملک میں [illegible] کی اوٹ سے گفتگو کرنا بھی اخلاقی اقدار کے منافی خیال کیا جاتا ہے ۔ اگر ایک ملک [illegible] زیادہ مردوں کے ازدواجی تعلقات قائم رہ سکتے ہیں۔ تو دوسرے ملک میں ایک مرد کئی کئی

جوروں سے ازدواجی تعلقات قائم کر لیتا ہے۔ ایک طرف دنیا کے ممالک نے خود جنگ و جدال تک کے متعلق قوانین نافذ کر رکھے ہیں [illegible]
سپہ سالار، بچوں، عورتوں، بوڑھوں، بیماروں کو مارنا خلاف انسانیت سمجھا جاتا ہے۔ جو انہیں جنگ کے خاتمہ کے لئے قواعد بنائے جاتے ہیں ——— اور دوسری
طرف ایسے قبائل اب بھی موجود ہیں جو فتح کے بعد تمام دشمنوں کا قتل اور انتقام ضروری [illegible]
ہیں اور پھر ایسے ہی قبائل ہیں [illegible] ہر شخص دشمنوں کے سروں کا ہار بنا کر گلے میں پہنتا ہے ——— لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں [illegible]
ملک کا سماجی نظام دوسرے ملک کے سماجی نظام سے مختلف ہے۔ وحشی قبائل کا معاشرہ اب بھی ارتقاء کی ابتدائی منازل میں ہے۔ [illegible]
ممالک میں ابھی تک نیم جاگیرداری اور قبائلی سماج کا دور دورہ ہے۔ [illegible] یورپ کے اکثر ممالک کی تہذیبی اقدار ان سے مختلف ہیں [illegible]
سرمایہ دارانہ اور سامراجی نظام ابھی تک زندہ ہے۔ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ایک ہی قسم کے سماجی نظام رکھنے والے مختلف ممالک میں کئی اقدار مختلف
مشترک ہیں۔ لیکن یہاں پر غلط فہمی پیدا نہ ہونی چاہئے کہ اقدار زندگی مطلقاً ایک مخصوص سماجی نظام ہی کی پیداوار ہوتی ہیں۔ ہر ملک کے مخصوص
معاشرے کے علاوہ اس ملک کی ماضی کی روایات اور مذہبی اثرات بھی ان اقدار کو ترتیب دینے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ [illegible]
ہیں کہ ——— اگر کوئی شخص تاریخ کی مادی تعبیر سے یہ نتیجہ اخذ کرے کہ صرف معاشی تحریکات ہی تاریخ کو مرتب کرتی ہیں، تو وہ بعید از عقل بات
کرتا ہے۔ آلات پیداوار اور پیداواری رشتے، معاشرے کو ترتیب دینے کے بنیادی عناصر ضرور ہیں۔ لیکن صرف یہی عناصر نہیں ہیں۔ بلکہ فلسفیانہ
خیالات، مذہبی اور سیاسی تصورات کو بھی سماجی کشمکش سے گہرا تعلق ہوتا ہے، اور بعض اوقات تو یہ سماجی جدوجہد کی شکل کا تعین بھی کرتے
ہیں ——— " دراصل یہیں سے ایک ملک کا قومی کردار پیدا ہوتا ہے، یہ قومی خصوصیات اپنی انفرادیت کے باوجود بین الانسانی زندگی کے ارتقاء
سے علیحدہ نہیں کی جا سکتیں۔ یہ بات اس چیز کو اور بھی زیادہ واضح کرتی ہے کہ صرف وہی قومی خصوصیات زندہ رہتی ہیں جن میں زندگی کے ساتھ قدم ملا کر
چلنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ جو تغیر و تبدل کو جذب کر سکتی ہیں۔ انسانی زندگی کے ارتقاء سے ہم آہنگ ہی قومی خصوصیات کو آفاقی خصوصیات کا حصہ
بنا دیتی ہیں۔ اور یہی چیز قومیت پرستی کے مجرد فلسفہ کا توڑ بن جاتی ہے)

تو بحث یہ تھی کہ اقدار اپنی تمام روایات سے فائدہ اٹھانے کے باوجود ہر سماج کے مطابق تبدیل ہو جاتی ہیں، نئے نئے مفہوم پیدا کر لیتی ہیں یا نئی
عملی صورتیں اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ اقدار زندگی بھی جنہیں بنیادی اور ازلی و ابدی مانا گیا ہے۔ اپنے مفہوم کے اعتبار سے ایک نہیں رہیں۔ اخلاق
حسن، سچائی، انصاف وغیرہ کا تذکرہ ہمیشہ سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور ہمیشہ کیا جائے گا۔ لیکن ان میں سے کسی بھی تصور کی اقدار متعین نہیں ہیں۔
اخلاق کے متعلق ابھی کہا گیا ہے کہ مختلف ممالک میں مختلف معاشروں نے مختلف اخلاقی اقدار کو جنم دیا ہے۔ یہاں ایک تاریخی واقعہ بیان کر دینا
مناسب رہے گا ——— لیگ آف نیشنز کے زمانے میں جنیوا میں لیگ کی طرف سے ایک عالمی کانفرنس طلب کی گئی، جس کا مقصد ایک بین الاقوامی
قانون کے ذریعے فحاشی کی روک تھام کرنا تھا۔ دنیا بھر کے عالم ایک عرصے تک بحث مباحثہ کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ تمام دنیا کے انسانوں
کے لئے فحاشی اور صالحیت کا ایک معیار یا ایک اصول وضع کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لئے ہر ملک کے مخصوص حالات کا جائزہ لینا پڑے گا اور انہی کے
مطابق اصول وضع کرنے پڑیں گے۔ انسان چاہے روس کا ہو چاہے امریکہ کا، چین کا ہو چاہے فرانس کا اپنی جبلت اور فطرت کے لحاظ سے ایک
ہے۔ پھر کون سے عناصر کی ترقی یافتہ اقدار کو اس کے خیالات اور تصورات کو دوسروں سے علیحدہ کر دیتی ہیں؟ اس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر
چکے ہیں۔ اسی طرح انصاف کے تصورات اور اس کی اقدار بھی ہمیشہ تبدیل ہوتی رہی ہیں۔ غلامی اور جاگیرداری سماج میں غلام اور مزارع کو معقول
معاوضہ دینا ناجائز حرکت نہ کرنا، وغیرہ ہی انصاف کا تقاضا تھا۔ آج غلامی اور جاگیرداری نظام ہی کا خاتمہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے بغیر

[illegible] کی عکاسی کرتی ہیں۔

[illegible] زندگی کا [illegible] کے مختلف شعبوں کی اقدار معاشرے ہی سے جنم لیتی ہیں۔ اور جب معاشرہ تبدیل ہو جاتا ہے، تو یہ اقدار بھی تبدیل ہو جاتی ہیں۔ لیکن ان میں تبدیلی اس تیزی سے رونما نہیں ہوتی، جس تیزی سے معاشرہ تبدیل ہوتا ہے۔ اس کی وجہ ماضی کے ساتھ تعلق، [illegible] اور [illegible] ایک مخصوص سماج کے ساتھ رابطہ ہے۔

اب یہ بات رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ازلی اور ابدی قدروں کا فلسفہ پیدا کیسے ہوا۔ ہم نے بتایا ہے کہ تغیر کا فلسفہ زندگی کے ارتقاء کے فلسفے سے پیدا ہوا۔ چنانچہ یہی فلسفہ ایک ترقی پسند اور صحت مند فلسفہ ہے۔ ایسا فلسفہ جو زندگی کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے، چنانچہ لازمی طور پر اس فلسفے کی ضد رجعت پسند فلسفہ ہوگا۔ یہ فلسفہ زندگی کو جامد اور ساکت بتاتے ہوئے ارتقاء کی نفی کرتا ہے اور اسی لئے قدروں کو غیر متبدل اور مستقل قرار دیتا ہے۔ ترقی پسند فلسفہ عوام کا فلسفہ ہوتا ہے۔ یہ اس طبقے کا فلسفہ ہوتا ہے جس کا مفاد مستقبل کے نئے معاشرے سے وابستہ ہوتا ہے۔ اور رجعت پسند فلسفہ اس طبقے کا فلسفہ ہوتا ہے جو نئے معاشرے سے خائف ہو اور جس کا مفاد موجودہ معاشرے ہی سے وابستہ ہو۔ چنانچہ تمام [illegible] کو ہر طبقاتی سماج کے حکمران طبقے نے پیدا کیا، مستقل قدروں کا فلسفہ بھی اسی حکمران طبقے کا فلسفہ ہے جو اپنی حکمرانی کو قائم رکھنا چاہتا ہے، وہ ہر چیز کو ازلی اور ابدی بتا کر طبقات کو فطری، استحصال کو لازمی اور اپنے اقتدار کو ابدی بنانے کی کوشش کریگا۔

جب انسانی ذہن نے زیادہ ترقی نہ کی تھی، جب زندگی کے بہت سے اسرار منکشف نہ ہوئے تھے۔ اس وقت اس فلسفے کا بہت زیادہ اثر تھا۔ لیکن جب زندگی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی بھی ہوئی۔ اور یہ شعور پیدا ہوا کہ زندگی متحرک ہے، حالات دائمی اور ابدی نہیں ہیں تو قدروں کو ثبات حاصل نہیں ہوتا۔ انسانی شعور اگرچہ خارجی زندگی ہی کا پرتو ہوتا ہے، لیکن ردِعمل کے طور پر وہ زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے [illegible] تو ایک نیا فلسفہ پیدا ہوا۔ جس کی بنیاد امید اور رجائیت تھی۔ جو مستقبل سے مایوس نہ تھا۔ وہم پرستی، جبر و قدر اور [illegible] جس نے انسان کو بے بس اور [illegible] بنا دیا۔ اسی وقت سے برسرِ اقتدار طبقے نے شعوری طور پر [illegible] فلسفہ کو بھی فروغ دینا شروع کیا [illegible] ایک طرف تغیر کا ترقی پسند فلسفہ [illegible] اور دوسری طرف مطلق اور آمرانہ اقدار کا فلسفہ بھی پنپتا رہا۔

معاشرے کے تمام شعبوں کی طرح ادب اور آرٹ میں بھی تغیر اور ثبات کے ان فلسفوں نے اپنا اثر دکھایا ہے۔ چنانچہ جہاں ہمیں ایسا ادب ملتا ہے جس میں [illegible] کا ذکر ہوتا ہے۔ وہیں ہمیں ایسا ادب بھی ملتا ہے جس میں حسن و محبت کا بدلتا ہوا تصور پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلی قسم کے ادب میں کوئی تبدیلی نہیں [illegible] سینکڑوں برس پیشتر کے ادب اور موجودہ ادب میں کوئی بنیادی فرق نہیں پائیں گے۔ مثلاً حسن و محبت کو عام طور پر ازلی، فطری [illegible] کہا جاتا ہے۔ اور جس کی اقدار ابدی بتائی جاتی ہیں۔ اس کا پرچار کرنے والے ادیب ہمیشہ ایک ہی قسم کی باتیں کہتے رہیں گے۔ چاہے وہ [illegible] چاہے بیسویں صدی سے۔ چاہے الف لیلہ میں طویل قصوں کا ہو چاہے مختصر کہانی کا۔ لیکن اس کے برعکس وہ ادیب [illegible] کو اپنے مخصوص سماج کے پس منظر میں دیکھتا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک ہی بات نہیں کہہ سکتا کیونکہ سماج ہمیشہ ایک نہیں رہا اور سماج کے ساتھ ساتھ حسن و محبت کے تصورات بھی تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

[illegible] اور [illegible] کے فلسفے سب سے پہلے چند مخصوص خیالات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ فطرت قادر ہے اور انسان مجبور اور بے بس ہے [illegible] زندگی کی اقدار مستقل اور ابدی قرار پائیں گی۔ [illegible] ایک مخصوص معاشرہ جس صورت میں بھی موجود ہے، اس کی تبدیلی کی بھی کوئی گنجائش نہ رہیگی۔ اور جب [illegible] انسان اور اس کا شعور معاشرے کے سامنے بے بس اور لاچار ہو کر رہ جائے گا: اسی طرح ایک اور رجحان جنسی اذیت پسندی کا ہے۔

جب حاکم کو حاکم، غلام کو غلام اور محکوم کو محکوم و مظلوم ہی رہنا ہو تو ظاہر ہے کہ بغاوت کا جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا۔ حالات کو بدلنے کا جذبہ کچھ ایسے مظلوم طبقے کے خاتمے کی خواہش پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اور اسی طرح اس بنا پر یہ جذبہ رجعت پسندی کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ ہم اس قسم کے فلسفے اور اس سے پیدا ہونے والے رجحانات پر یقین رکھنے اور ان کا پرچار کرنے کے باوجود جب اپنے لوگ اور فلسفی معاشرے کو تبدیل ہوتا دیکھتے ہیں۔ تو اسے بھی مشیتِ فطرت کہہ کر یہی کوشش کرتے ہیں کہ انسان اور انسانی شعور کو کمتر اور بے بس ثابت کیا جائے۔

اس وقت تک ہم نے جو بحث کی ہے، اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے، کہ چونکہ ادب زندگی سے تعلق رکھتا ہے، معاشرے کا عکاس ہے، اس لئے زندگی کے ارتقاء کے ساتھ اور معاشرے کی تبدیلیوں کے طفیل ادب اور ادبی اقدار کی تبدیلی بھی انتہائی ضروری ہے۔ البتہ ادبی اقدار میں تبدیلی کی رفتار نسبتاً سست ہوتی ہے۔ کیونکہ اس پر ماضی کی تمام روایات، مذہبی اور دیگر فلسفیانہ رجحانات کا بہت گہرا اثر ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ تغیر کا فلسفہ ترقی پسند فلسفہ ہے۔ کیونکہ یہ زندگی کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوتا ہے۔ یہ انسان اور شعور کی برتری کا قائل ہے۔ اور اس کے برعکس ادبی اقدار کے تسلسل کا فلسفہ ایک رجعت پسند فلسفہ ہے کیونکہ یہ ترقی کو روکتا ہے، بے بسی لاچاری، مقدر پرستی اور اذیت پسندی اپنے زندگی کش رجحانات کو پیش کرتا ہے ——— لیکن قدروں کے سلسلے میں اہم ترین بحث ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر قدریں مستقل نہیں تو ادب کیسے زندہ رہتا ہے۔ یعنی یہ کہ کیا ماضی کا ادب زندہ بھی رہتا ہے کہ نہیں ——— ؟

ادب بہرحال زندہ رہتا ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ہر دور کا تمام ادب زندہ نہیں رہتا۔ کچھ ادب اپنے زمانے میں ختم ہو جاتا ہے، کچھ ایک مخصوص نظام کی زندگی کے ساتھ زندہ رہتا ہے لیکن یقیناً ایسا ادب بھی موجود ہے جو مختلف سماجی تبدیلیوں کے باوجود بھی زندہ رہتا ہے۔ مثلاً یونانی ادب کا بہت سا حصہ ختم ہو گیا، لیکن ایسا بہت سا ادب اب بھی موجود ہے جو یونانی معاشرے کے خاتمے اور حتیٰ کہ اس زبان کے خاتمے کے بعد کہ جس میں وہ اصل میں تخلیق ہوئی تھی ابھی زندہ ہے۔ اس سے زیادہ بہتر مثال ہمیں شیکسپیئر کے ادب سے حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ صرف سرمایہ دارانہ دنیا میں بلکہ سوویٹ روس میں بھی شیکسپیئر بحیثیت ایک عظیم فنکار کے زندہ ہے۔ یہاں تک اندازہ لگایا گیا ہے کہ سوویٹ میں اس عظیم ڈرامانگار کے جتنے ڈرامے پیش ہوئے، وہ تمام یورپ کی مجموعی پیشکش سے کہیں زیادہ ہیں ——— ظاہر ہے شیکسپیئر کے زمانے کا معاشرہ اور روس کا معاشرہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ایک طبقاتی سماج تھا۔ دوسرا غیر طبقاتی ہے۔ پھر ایسی کونسی قدر ہے جو شیکسپیئر کے ادب کو آج بھی زندہ رکھتی ہے۔ اور پھر بقول سوویٹ نقادوں کے مستقبل میں اس کی حیثیت اور بھی زیادہ اہم ہو جائے گی اور اسے آج سے بھی زیادہ مقبولیت ہو جائے گی۔

یہاں پر ایک بات اگر ضمناً بیان کر دی جائے تو شاید ہمارے اس مسئلے کا حل زیادہ آسانی سے ہو سکے گا۔ آج سے کچھ عرصہ پیشتر بہت سے ادیبوں اور شعراء کو کوئی خاص اہمیت حاصل نہ تھی۔ لیکن اب انہیں دوبارہ زندہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ہمارے یہاں نظیر اکبرآبادی کو تقریباً فراموش کر دیا گیا تھا۔ لیکن نئی تنقید نے اسے پھر زندہ کر دیا ہے۔ نظیر کو فراموش کیوں کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ صاف ہے اور وہ یہ کہ نظیر عوام کا شاعر تھا۔ اس نے زندگی کے وہ موضوعات پسند کئے جو اس وقت کے برسر اقتدار طبقہ کے موضوعات نہ تھے۔ عوام کے شاعر کی حیثیت سے نظیر کو عوام کی زبان بھی استعمال کرنی پڑی۔ عوام کی زبان کو کمتر اور رذیل سمجھا جاتا تھا۔ اور اب نظیر کو جو زندہ کیا گیا ہے، تو یہ اس نئے شعور کی بدولت ہے جو عوام کی جدوجہد اور نئے معاشرے کے تصور نے پیدا کیا ہے۔ یہاں ایک بات طے ہو جاتی ہے۔ کہ جیسے جیسے قاری کا شعور اور تجزیاتی ذہن ترقی کرتا جائے گا ویسے ہی بہت سے ادب پارے زندہ ہو جائیں گے اور بہت سے فراموش ہو جائیں گے۔ وہ ادب پارے زندہ ہو جائیں گے جنہوں نے ترقی پسند رجحانات کا ساتھ دیا۔ اور وہ ختم ہو جائیں گے جنہوں نے رجعت پسندی کا پرچار کیا ——— یہ درست ہے کہ ہر دور کی ترقی پسند روایات ہی سے نئے تصورات

جز یقینی طور پر اس طرح ماضی کا کچھ نہ کچھ حصہ نئے تصور اور نئی روایت میں شامل ہو جاتا ہے، اور اسی وجہ سے ہم ماضی کے ادب میں بھی ترقی پسند روایات تلاش کر لیتے ہیں۔ غالب کا وہ کلام جس میں انہوں نے انسان دوستی کا اظہار کیا ہے، ہمیشہ زندہ رہیگا۔ اگرچہ انسان دوستی کا مفہوم نئے معاشرے میں تبدیل ہو جائیگا۔ لیکن یہ نیا مفہوم اسی بنیادی جذبے ہی کا مظہر ہوگا جس نے غالب کو انسان پرست بنایا ——— لیکن یہ تو اس ادب کی روایت ہوگی جو زندہ رہیگی۔ اس طور پر تو وہ صرف تاریخی اعتبار سے زندہ رہیگا یعنی یہ اپنے زمانے کی ترقی پسند روایات کے علمبردار کی حیثیت سے ——— تو کیا ہم آج ماضی کے ادب العالیہ کو محض تاریخی اعتبار سے یاد کرتے ہیں۔ کیا ہم شیکسپیئر کو محض اپنے عہد جس معاشرے کے مثبت، سند رجحانات کے علمبردار کی حیثیت ہی سے پڑھتے ہیں یقیناً ایسا نہیں ہے اگر ایسا ہوتا، تو ماضی کے ادب العالیہ اور ترقی پسند صحیفے میں کوئی فرق نہ سمجھا جاتا۔ دونوں ہم پر ایک ہی تاثر پیدا کرتے۔ ——— تو سوال پیدا ہوا کہ ترقی پسند روایات کے علاوہ ایسی کون سی قدر ہے جو شیکسپیئر کو اور ماضی کے بہت سے عظیم ادب کو ادب کی حیثیت سے زندہ رکھتی ہے۔ ادب کا طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ حسن کاری کا نمونہ ہوتا ہے۔ ادب میں جہاں اس کے مواد، نقطۂ نظر اور موضوع پر بحث کی جاتی ہے، وہیں اس کا طرز بیان اس کی ٹکنیک بھی ہمارے مدنظر رہتی ہے۔ اچھے اور برے ادب کی تمیز کا ایک یہ بھی ذریعہ ہے ——— تو ظاہر ہوا کہ ادب میں حسن کاری بھی اس کی زندگی کی ایک دلیل ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے ایسے شعر اور ادب پارے ہیں جو ابھی تک محض اس لئے متاثر کرتے ہیں کہ وہ حسین ہیں۔ اگرچہ ان میں سے کئی نظریاتی اعتبار سے صحت مند نہیں ہیں۔ لیکن محض حسن کاری ہی کسی ادب کو دوام نہیں بخش سکتی حسن کو زندہ رکھنے کے لئے کسی نہ کسی سماجی قوت کا ہونا بھی انتہائی ضروری ہے۔ وہ حسن جو زہر کا اثر کرے زندہ نہیں رہیگا۔ انسانی شعور اسے زندہ نہیں رہنے دیگا ——— اگر اب تک ایسی حسن کاری زندہ ہے، تو محض اس لئے کہ سماج میں وہ طبقہ موجود ہے، بلکہ برسر اقتدار ہے، جو زہریلے حسن کی پرورش کرتا ہے۔ سماجی قوت جو ادب کو دوام بخشیگی، وہ اس کے مواد میں ہے۔ اس مواد میں جو سماجی ترقی کا ضامن ہو رہا ہے۔

اس بحث سے ایک بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادب کی ابدیت دراصل اس کے مواد سے وابستہ ہے، لیکن اگر محض مواد ہی ابدیت کا باعث ہو اور فنی حسن مفقود ہو۔ تو پھر ادب بحیثیت تاریخ کے تو زندہ رہیگا۔ لیکن بطور ادب کے نہیں۔

ایک اور بات جو ادب کو ابدیت بخشتی ہے۔ وہ اس کی تہذیبی حیثیت ہے۔ ماضی کا ادب ماضی کی تہذیب کا پرتو ہوتا ہے۔ تہذیبیں تبدیل تو ہوتی ہیں، لیکن ہر تہذیب میں چند ایک خصوصیات ایسی ضرور ہوتی ہیں۔ جو کسی نہ کسی صورت میں نئی تہذیب میں رونما ہوتی ہیں۔ یہ خصوصیات وہی ہیں جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے اور جن کی بنا پر تہذیب کا قومی کردار پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ ادب میں جب ان قومی تہذیبی خصوصیات کا تذکرہ ہوتا ہے۔ تو تہذیبی ورثہ کی حیثیت سے اس کی زندگی کو بھی بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں یہ بات پہلے بھی کہی جا چکی ہے کہ یہ قومی خصوصیات چونکہ پوری انسانی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ قومی ہوتے ہوئے بھی ایک آفاقی حیثیت کی مالک ہوتی ہیں اسی لئے مختلف ممالک کا ماضی کا زندہ ادب نہ صرف ان ممالک میں ہی بلکہ تمام دنیا میں ایک جیسی حیثیت رکھتا ہے۔

اگرچہ انسانی فطرت کوئی ایسی چیز نہیں۔ جو تغیر قبول نہ کرے۔ لیکن ایک بات یقینی ہے کہ انسانی فطرت میں جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں وہ فطرت کو یکسر تبدیل نہیں کرتیں۔ ہماری فطرت کی کروڑوں سال کی جدوجہد کے بعد چند ایک چیزوں نے بنیادی حیثیت حاصل کر لی ہے جن میں مختلف معاشروں کے اثر سے وقتی تبدیلیاں تو پیدا ہو سکتی ہیں۔ لیکن قطعی ختم نہیں ہو جاتیں۔ مثلاً انسان دوستی کا جذبہ کبھی نہیں مر سکتا۔ اگرچہ اس کی صورتیں تبدیل ہو سکتی ہیں اور بعض اوقات اسے وقتی طور پر ختم بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر ماں کی مامتا کا جذبہ ہے۔ انسان کی جدوجہد اور تخلیق کا جذبہ ہے۔ محبت، اصلاح و آشتی کے جذبات ہیں۔ یہ تمام جذبات بنیادی ہیں۔ ان کے عمل اگر تبدیل ہو بھی جائیں۔ تو ہر جذبہ بحیثیت جذبے کے ان تمام عملی

صورتوں میں مشترک ہوتا ہے چنانچہ ادب میں جب بھی ان بنیادی جذبات کا ذکر کیا جائے گا۔ ادب کی حیثیت ابدی ہو جائے گی۔ لیکن یہاں شرط یہ فنی حسن کی ہے، کیونکہ اس کے بغیر فن، فن ہو ہی نہیں سکتا ——— حسن کے متعلق بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس کی اقدار تبدیل ہوتی ہیں۔ ہر زمانے کا حسن پچھلے زمانے کے حسن کے تصور سے مختلف ہو سکتا ہے۔ مثلاً ہیئت اور ٹیکنیک، اسلوب اور طرزِ بیان جو ادبی حسن کی اہم وجہیں ہیں ہمیشہ تبدیل ہوتی رہتی ہیں لیکن اس تبدیلی کے باوجود ماضی کا حسن مر نہیں جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو تاج محل آج حسن کاری کی بنا پر موجود نہ ہوتا۔ کیونکہ آج تاج محل ایسی عمارات تعمیر نہیں کی جاتیں۔ اور فنِ تعمیر کی اقدار میں بہت سی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو چکی ہیں۔ لیکن حسن کی تمام اقدار میں، صفائی، سادگی، توازن وغیرہ مشترک ہوں گی۔ یہ مشترک باتیں ہی حسن کو دوام بخشتی ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات پھر دہرانی پڑے گی۔ کہ حسن محض کوئی شے نہیں ہے۔ حسن کاری اگر افادیت سے خالی ہے، تو اس کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اور اگر حسن کاری سے انسانیت کشی کا کام لیا جائے۔ جیسے محبوب کی گھنی زلفوں کی چھاؤں سے ابدی نیند سو جانے اور تیرِ نظر سے گھاس کھود بیٹھنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔ تو یقیناً حسن کاری بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ کیونکہ مستقبل انسانی شعور کی ترقی کا ضامن ہے۔ اس وقت ادب کی کسی ایک خوبی کو نہیں بلکہ کلی طور پر ادب کو پرکھا جائے گا۔

ہماری اس تمام بحث سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ یہ ہے کہ ادب کو فقط دوام حاصل ہو سکتا ہے اور یہ کہ اسے زندہ جاوید بنانے میں بھی سب سے اہم اصول اس کے ترقی پسند اور صحت مند ہونے کا ہے۔ ایسے ادبی طور پر زندہ رکھنے کے لئے فنی حسن نہایت ضروری ہے چنانچہ ادب کی ایک ہی دوامی قدر مانی جا سکتی ہے۔ اور وہ یہ کہ زندہ ادب زندگی کے ترقی پذیر رجحانات کا ساتھ دیتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ رجحانات ہر نئے معاشرے میں نئی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لئے عملی طور پر یہ قدر بھی اس طرح دوامی نہیں ہے جس طرح کہ مستقل اور ابدی قدروں کے علمبردار ادیبوں کا یقین ہے ان کے خیال میں نہ صرف ادبی اقدار ہی مستقل ہیں بلکہ ان کے مفہوم بھی ابدی ہیں۔

دراصل اس تمام بحث کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی ہے کہ بعض ادیب جب ازلی اور ابدی قدروں کے رجعت پسندانہ فلسفے کی مخالفت کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو تاریخی شعور کے فقدان کے باعث ایک ایسے رجحان کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جو بظاہر بڑا انقلابی معلوم ہوتا ہے لیکن درحقیقت بہت خطرناک ہوتا ہے۔ یہ رجحان یہ ہے کہ چونکہ کسی بھی قدر کو ابدیت حاصل نہیں ہے۔ اس لئے ماضی کا تمام تر ادبی اور تہذیبی ورثہ بلکہ یوں کہئے کہ ماضی سے متعلق ہر بات رجعتی اور فرسودہ ہے اور اس سے نئی قدروں کا کسی طور بھی تعلق نہیں ہے۔ تاریخ اخذ کرنے کا یہ ایک میکانکی طریقہ ہے۔ اس میں مادے اور مادے کی تبدیلی پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن تاریخی شعور کے فقدان کا بھی مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ یہ درست ہے کہ معیار تبدیل ہوتے ہیں نظریئے بدلتے ہیں اور نئی قدریں جنم لیتی ہیں۔ لیکن نیا معیار، نیا نظریہ اور نئی اقدار پرانے معیار، پرانے نظریات اور پرانی قدروں ہی سے مواد حاصل کرتی ہے۔ ایک معاشرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور دوسرا اس کی جگہ لے لیتا ہے، لیکن نیا معاشرہ پہلے معاشرے ہی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے یہ پہلے معاشرے کی بہترین روایات اور صحت مند نظریات کو لے کر آگے بڑھتا ہے اور آگے بڑھتے میں ان روایات کو حسبِ ضرورت تبدیل کر لیتا ہے ——— ایک شمع جب دوسری شمع کو روشن کرتی ہے، تو اپنا شعلہ دوسری کے سپرد کر دیتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ ایک شمع بجھ جائے۔ اور دوسری خود بخود جل جائے۔ یہ انتہا پسندانہ فلسفہ ارتقاء کی نفی کرتا ہے۔ کیونکہ ارتقاء تسلسل کا نام ہے اور یہ رجحان تسلسل سے انکار کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو فلسفہ ارتقاء کی نفی کرتا ہے، وہ ترقی پسند فلسفہ نہیں ہو سکتا۔

ہزاروں جنتیں آباد ہیں تخیلِ اختر میں

اردو شاعری کی رومانی تحریک مرحوم اختر شیرانی سے کچھ اس طرح وابستہ ہو کر رہ گئی ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا ممکن نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اختر نے اردو شاعری کو وہی کچھ دیا ہے جو اٹھارہویں صدی کے رومانی انگریز شاعر کیٹس انگریزی شاعری کو دے سکا ہے۔ وہی خلوص وصمیمیت، وہی واقعیت وجذباتی شدت اور وہی وارفتگی وخود سپردگی حسرت موہانی کے بعد اختر دوسرے شاعر ہیں جن کے یہاں شعری افکار کے پس منظر میں طوائف کی بجائے ایک حقیقی جیتی جاگتی عورت کے خدوخال نظر آتے ہیں بلکہ عاشقانہ جذبات کی نوعیت واظہار میں وہ حسرت سے بھی کچھ الگ ہی نظر آتے ہیں۔ حسرت کی محبوبہ عام طور پر ایک "پابند رسوم وقیود عورت" ہے۔ اور کہیں کہیں تو وہ مثنوی زہرِ عشق کی ہیروئن بھی بن جاتی ہے۔ مگر اختر کا شعورِ عشق عربی اور ہندی شاعری سے متاثر ہے۔ یہاں عربی شاعری کی "بنت عم" کنارِ گنگ وجمن کی شاداب فضاؤں میں پہنچ کر ایک ایسا رومانی دوروپ اختیار کر لیتا ہے۔ جو اختر سے پہلے ہمیں کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ اختر کے ہاں عربی شاعری کی بیباکانہ جرأت اور والہانہ اظہار کے ساتھ ساتھ ایک ایسی مستقل طور پر سلگنے والی کیفیت بھی پائی جاتی ہے جو ہندی شاعری میں عام ہے۔ اختر کی یہ خصوصیت ایک ایسا موڑ ہے جہاں آکر اردو شاعری ایک نئی راہ اختیار کرتی ہے۔

جس زمانے میں اختر نے شاعری شروع کی اس زمانے میں شعر وسخن کی تمام فضائیں اقبال کے نغموں سے گونج رہی تھیں اردو کے اکثر شاعر کسی نہ کسی طرح اور کسی نہ کسی رنگ میں اقبال سے متاثر تھے۔ اس دور میں ہمیں صرف دو تین شاعر ہی ایسے نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنی شاعرانہ انفرادیت کو قائم رکھا۔ اور اس ہمہ گیر سیلاب نور کے درمیان بھی اپنے شعری افکار کے چراغوں کو "بے رونق" ہونے نہیں دیا۔ اختر اپنے دور کا بہت بڑا شاعر تھا اور ہر دور میں اس کی تاریخی اہمیت واضح رہے گی۔

اس جواں مرگ شاعر نے آج سے چار سال پیشتر ۹ ستمبر کو انتقال کیا تھا۔ ان چار برسوں میں قمر تسکین صاحب کی مخلصانہ کوششوں سے دو مرتبہ یوم اختر منایا گیا اور دونوں مرتبہ ان کی یادگار قائم کرنے کی قرار دادیں بھی منظور کی گئیں۔ مگر کوئی یادگار قائم نہ ہو سکی۔

پچھلے دنوں حکیم نیر واسطی صاحب نے اختر کے مقامی احباب کو اپنے ہاں بلایا تھا کہ اختر کی یادوں کے دیئے سے محفل کو کچھ دیر کے لئے روشن کیا جا سکے۔ حکیم صاحب اختر کے نہایت عزیز دوست تھے۔ اور انہی کی توجہ سے اختر کا بکھرا ہوا کلام شائع ہو کر محفوظ ہوا ہے۔ ہمیں توقع ہے حکیم صاحب ظہیر کاشمیری صاحب کی اس اہم تجویز کو ضرور عملی صورت دیں گے ——— کہ اختر کی شخصیت اور شاعری کے مختلف پہلوؤں سے متعلق ٹھوس مقالات فراہم کر کے انہیں کتابی صورت میں چھاپا جائے۔

(ایڈیٹر)



اختر شیرانی

چناروں کی چھاؤں میں

مرحوم اختر شیرانی نے اپنی زندگی میں کئی ایسی نظمیں کہی ہیں جو اردو ادب میں ہمیشہ زندہ رہیں گی۔ ذیل کی نظم میں گو وہ رومانی شدت موجود نہیں جو ان کی شاعری کا خاص رنگ ہے۔ مگر اسے اس لحاظ سے ضرور اہمیت حاصل ہے کہ یہ شاعر نے اپنی موت سے صرف چند روز پیشتر کہی تھی۔ اور اس میں اس تمنا کا اظہار کیا گیا ہے جو اس وقت ان کے سینے میں موجزن تھی۔ (ایڈیٹر)

کشمیر کی حسین بہاروں کی چھاؤں میں
شمشاد و سرو و گل کی قطاروں کی چھاؤں میں
شاخ و شجر کے نغز مرغزاروں کی چھاؤں میں
بدلی سے جھانکتے ہوئے تاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

امیدِ وصل ایک فریبِ خیال ہے
یہ دلنشین خلش، خلشِ بے مآل ہے
اس زندگی میں ساتھ رہیں ہم محال ہے
سفاک فتنہ ساز ستاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

چھایا ہوا ہے ابر، ہوا خوشگوار ہے
موسم ہے، بیخودی ہے، چمن ہے، بہار ہے
اس آخری خوشی کا فقط انتظار ہے
سرو و گل و سمن کے نظاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اچھے برے زمانے کا اب انتظار کیا
ہم غمزدوں کے حق میں خزاں کیا، بہار کیا
ہاں اعتبارِ ہستیِ بے اعتبار کیا
امید خس ہے غم کے شراروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

کہتے ہیں پُرسکوں ہے بہت محفلِ عدم
آزادیٔ کشاکشِ غم، حاصلِ عدم
آ چل پڑیں جہاں سے سوئے منزلِ عدم
اس کہکشاں کے راہ گزاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

آ جا کہ بعدِ مرگ تو آرام مل سکے
تسکینِ دردِ خاطرِ ناکام مل سکے
درمانِ جورِ گردشِ ایام مل سکے
اُس رس بھرے افق کے کناروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

اس خاکداں سے دور ہے اک خاکداں نیا
دنیا نئی، زمین نئی، آسماں نیا
چھوڑ اس جہاں کو چل کے بسائیں جہاں نیا
پروین و مشتری کے دیاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

زہرابۂ فراق کا پینا نہیں قبول
تیرے بغیر بادہ و مینا نہیں قبول
دُوری کے صدمے جھیل کے جینا نہیں قبول
مرنا قبول ہم کو بہاروں کی چھاؤں میں
آ مر رہیں حسین چناروں کی چھاؤں میں

غزل

یوں تو کس پھول سے رنگت نہ گئی، بُو نہ گئی
اے محبت! مرے پہلو سے مگر تو نہ گئی

مٹ چلے مری امیدوں کی طرح حرف مگر
آج تک تیرے خطوں سے تری خوشبو نہ گئی

فصلِ گل ختم ہوئی، رنگِ سمن خواب ہوا
میری آنکھوں سے مگر میری سمن رُو نہ گئی

کب بہاروں پہ ترے رنگ کا سایہ نہ پڑا
کب ترے گیسوؤں کو بادِ سحر چھُو نہ گئی

تیرے گیسوئے معنبر کو کبھی چھیڑا تھا
میرے ہاتھوں سے ابھی تک تری خوشبو نہ گئی

قاضی عبدالغفار

میرے دو دوست

قاضی عبدالغفار صاحب نے لکھا ہے :-

"دو گزرے ہوئے دوستوں کی یہ باتیں وصیّت کی طرح چند پرزوں پر لکھ رکھی تھیں کاغذ کے یہ پرزے پرانی ردّی میں گھل مل گئے تھے۔ لیکن اب جو ادبِ لطیف کے تقاضوں کا پانی سر سے گزرنے لگا تو میں نے انہی پرزوں کو اپنی کوتاہی کا تاوان بنا لیا۔"

قاضی صاحب نے ایک طویل عرصے کے بعد اپنے خاص رنگ کی ایک چیز لکھی ہے، اور یہ فخر ادبِ لطیف کو حاصل ہے کہ وہ اس چیز کو اپنے صفحات کے ذریعے منظرِ عام پر لا رہا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں اردو ادب کی یہ بھی ایک بدقسمتی ہے کہ اردو کے بعض اونچے درجے کے مصنف دو تین کتابیں یا چند مضامین اردو ادب کو دے کر اپنی [illegible]ت کو زندگی کی دوسری مصروفیتوں کی نذر کر دیتے ہیں۔ ہمارے ادب کو ابوالکلام آزاد، بخاری پطرس اور قاضی عبدالغفار سے اگر شکایت ہے تو اسے بیجا شکایت نہیں سمجھنا چاہیئے۔

ہم محترم قاضی صاحب کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ انہوں نے ہمارے تقاضوں کو قابلِ اعتنا سمجھا، مگر ادبِ اردو جو ان سے مسلسل اصرار کر رہا ہے اس کی طرف بھی انہیں توجہ دینی چاہیئے۔

قاضی صاحب کہہ سکتے ہیں کہ "میں ہندوستان میں اردو کو زندہ [illegible]شش کر رہا [illegible] اہم کام ہے" یقیناً اس کام کی اہمیت سے ہمیں انکار نہیں مگر ہم یہ [illegible] قاضی صاحب تخیل اور جدّتِ اسلوب کے ان جواہر پاروں سے بھی ادب کے خزانے میں اضافہ [illegible] جن سے ان کی زندہ جاوید تصنیف "لیلیٰ کے خطوط" کا دامن بھرپور ہے۔

ایڈیٹر

(۱)

کچھ لوگ دنیا میں تنہا آتے ہیں، وہ جب ماں باپ کی گود میں ہوتے ہیں تب بھی تنہا ہوتے ہیں۔ جب مدرسے میں ہم جماعتوں کے ساتھ ہوتے ہیں تب بھی تنہا ہوتے ہیں، جب جوانی کا گرم خون ان کی رگوں میں دوڑتا ہے تب بھی تنہا ہوتے ہیں اور جب [illegible] کی منزل قیام آتی ہے تب بھی وہ تنہا اپنے لمبے سفر کی تیاری کرتے ہیں۔ ان کی زندگی اہل و عیال کے ساتھ بھی تنہا گزرتی ہے۔ ان کی [illegible] کا ہر ایک دن بھی [illegible] طرح بسر ہوتی ہے۔ وہ مسرتوں کے جھگڑوں اور غموں کے ہجوم میں [illegible] تنہا رہتے ہیں۔ جب زندگی ہنستی ہے تو وہ بھی کبھی کبھی ایک فقرہ [illegible] ہیں جس کا مطلب کچھ نہیں ہوتا۔ اور جب دنیا روتی ہے تو ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیوں روتی ہے۔

(۲)

میرا وہ دوست [illegible] میں اس کا دوست تھا۔ اس بیچارے کے ذہن میں تو یہ قدریں جنہیں دوستی اور دشمنی کہتے ہیں موجود ہی نہ تھیں مگر مجھے
اس کی تنہائی اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ اپنے گاؤں میں کھیتوں کے کنارے ایک چھوٹے سے مکان میں رہا کرتا تھا [illegible] سے فارغ ہو کر سیدھا اس گاؤں میں
گیا تھا، اور پھر کبھی گاؤں کے باہر نہیں گیا۔ کچھ عرصہ بعد میں نے سنا کہ اس نے شادی کر لی۔ اور پھر یہ بھی سنا کہ وہ ایک بچے کا باپ بن چکا ہے۔ دوسری
[illegible] کے ہنگاموں کے بعد جب ذرا سکون نصیب ہوا تو وہ مجھے یاد آیا اور بے اختیار جی چاہا کہ پھر ایک دفعہ میں اسے اس کی گھریلو زندگی میں دیکھوں۔
وہ مجھے گاؤں کی جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا ملا۔ قریب ہی اس کی بیوی بچے کو لئے بیٹھی تھی۔ پہلی نظر میں میں نے دیکھ لیا کہ وہ دونوں ایک دوسرے
کے جتنے قریب تھے اتنے ہی دور تھے۔ میں کئی دن ان کے پاس ٹھہرا اور دیکھتا رہا کہ وہ شادی سے پہلے جس قدر تنہا تھا اسی قدر اب بھی تنہا ہے۔
میں [illegible] تو کہنے لگا "میں اپنی بیوی کو بہت پسند کرتا ہوں ــــ اس لئے کہ وہ بہت کم بات کرتی ہے ــــ لیکن میں اس سے محبت نہ
کر سکا۔ یہ ایک انسانی کمزوری ہے جس سے میری فطرت بیگانہ ہے۔ یا پھر میرا ضمیر ایسا ہے کہ اسے اس عورت کی محبت کا اجالا بھی کم نہ کر سکا۔
وہ جو دنیا کے اور میرے درمیان ایک اونچی دیوار کھڑی ہے اس میں کوئی ایک دریچہ بھی آج تک نہ بن سکا ــــ یہ میرا قصور ہے تو اسے میرا ہی
قصور سمجھا پھر بھی شادی کے بعد اتنا تو ضرور مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل و دماغ کی آزادی مجھ سے چھن گئی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی
میرے [illegible] خلوت خانے میں ہر وقت جھانکتا رہتا ہو۔ تم ہی بتاؤ ــــ اس نے کہا، اب میرے پاس کیا باقی رہا ــــ اس کے لہجے میں تلخی بالکل
[illegible] صرف ایک ناقابل بیان اداسی اور تھکن تھی، وہ کہنے لگا ــــ زندگی تو [illegible] ایک طویل فریب ہے۔ بہانہ بازی ہے، ایک بہلاوا ہے۔
میں [illegible] اپنے نفس کو دھوکہ دینے میں مصروف رہتا ہوں ــــ تم ہی بتاؤ یہ بھی کوئی زندگی ہے!

(۳)

دو سال بعد میں نے اس کے بچے کے مرنے کی خبر سنی، اور ایک ہی مہینے بعد میں اس کی بیوی کے جنازے میں شریک تھا۔ موت کی پرچھائیں
مرنے والی کے [illegible] سے پھیل رہی تھی۔ مگر میرا دوست خود اپنے غم کے سکون میں ایسا معلوم ہوتا تھا گویا ابھی ابھی کسی بارِ گراں کو اپنے کندھے سے
اتار کر [illegible]! اس کی کھوئی ہوئی تنہائی واپس آ گئی تھی۔ کہنے لگا "سنتے ہو، مرنا بھی اچھا جب آب و گل کے بندھنوں کو توڑ کر سکونِ کامل حاصل
ہو جاتا ہے۔ [illegible] انسان ایک ہی قدم اٹھا کر یہ سرحد پار کر لے اور اس دریا میں اس طرح ڈوبے کہ سطحِ آب پر ایک بھی لہر نہ بن پائے! ــــ سنتے ہو؟
میں [illegible] ہوں۔ سانس اور خون تمہارے جسم میں تھا مگر تم اپنے ساتھ زندگی نہیں لائے تھے۔ موت کو تم گود میں لئے پھرتے رہے۔ اور کسی دن
موت [illegible] گود میں سمیٹ کر لے جائے گی ــــ آخر آئے کیوں تھے، پیچھے کیوں گئے تھے، وہ اپنے سر کو ایک جھٹکا دے کر خاموش ہو رہا۔
ــــ [illegible] میں نے سنا کہ وہ دنیا سے گزر گیا۔

(۴)

وہ مجھے اب [illegible] میں نے کوئی گزرتی ہوئی پرچھائیں دیکھی تھی! وہ نہ اپنے سے محبت کر سکتا تھا نہ دوسروں سے۔ اس سنسار کی
زندگی میں [illegible] کے خاندان کا ہر فرد اپنے ایک خاندان سے بندھا ہوا ہے ــــ وہ بندھا رہنا چاہے یا نہ چاہے ــــ لیکن جب وہ ایسا نہ چاہے
تو ہمیشہ کی [illegible] ہوتا ہے جو میرے دوست کا تھا۔ ایسے لوگ نہ تو دوسروں سے کچھ لے سکتے ہیں اور نہ دوسروں کو کچھ دے سکتے ہیں ایک
غیر آباد [illegible] کی طرح وہ زندگی کے سمندر میں نامعلوم پڑے رہتے ہیں۔ تا آنکہ کسی دن طوفان کی کوئی موج انہیں غرق کر دیتی ہے، اور سمندر

اپنی نکل جاتا ہے۔ سمندر کے مسافر اور ملاح اس کے وجود سے بے خبر گزر جاتے ہیں۔ انہیں خبر نہیں ہوتی کہ کتنے ایسے جزیرے سمندر میں ڈوبے رہا کرتے ہیں۔ اور کتنے ہی ایسے جزیرے سمندر کے اندر سے ابھرتے بھی رہتے ہیں۔ وہ ابھریں تب اور غرق ہو جائیں تب انسانی زندگی کی قدروں میں ان کا شمار نہیں ہوتا وہ ایک ایسی اکائی ہوتے ہیں جو کسی دہائی کے قریب نہیں پہنچتی!

(۵)

ایک دفعہ بمبئی کے نواح میں سمندر کے کنارے میں ایک بستی میں اپنے کسی فلاسفر دوست کے پاس مقیم تھا۔ وہ ہر روز میرے لئے تفریح کا کوئی نہ کوئی بہانہ پیدا کیا کرتے تھے۔ ایک دن طے ہوا کہ ہم کشتی میں سمندر کی سیر کریں گے۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد تیز ہوا چلنے لگی اور سمندر میں تموج شروع ہو گیا۔ میں نے کہا اب تو یہ سیر بے لطف ہو گی اور ارادہ ترک کر دیا۔ بہت ہی تعجب کے ساتھ میرے دوست نے کہا کہ کیا اب نہ چلو گے؟ تم کہتے ہو کہ تموج بے لطف کر گیا۔ در میں کہتا ہوں کہ اب تو سمندر کی تفریح کا وقت آیا ہے۔ کیا بچوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ کہنے لگے کہ اگر کوئی کام کرنے کے قابل ہے تو پھر پوری طرح کرنے کے قابل ہے۔ سکون ہے تو بہرِ حال تموج بہتر چیز ہے۔ کوئی کام کرنے کا ہے یا نہ کرنے کا ہے، اس کا فیصلہ تو وہی شخص کر سکتا ہے جو کام کرنے والا ہو۔ جن لوگوں کی زندگی مستقل دھندلکا ہو، وہاں چراغ جلائیں تو تاریکی چراغ کو کھا جاتی ہے۔ اس پیمانے کو معلوم ہی نہیں کہ کوئی کام کہاں ہے جس کے متعلق یہ وہ فیصلہ کرے کہ اسے کرنا چاہیئے یا نہیں، وہاں تو ایک خلا سے لپیٹا ہے۔ جس کے پھیلاؤ میں تنہائی اور بے عملی کے سکون کا ایک ایسا فلسفہ پھیلا ہوا ہے جو جمود سے حرکت کی طرف جانے ہی نہیں دیتا۔ پھر کہنے لگے، کیا تم اتنی سی بات نہ سمجھو گے کہ سمندر کی سیر زیادہ ضروری تو اسی وقت ہو جاتی ہے جب سمندر طوفانی ہو جائے! یہی تو زندگی کی وہ بے چین قوت ہے جو سمندر کے طوفانوں میں سامانِ نشاط تلاش کرتی ہے، سانسوں کی قیمت مقرر کرتی ہے، اور غیر آباد جزیروں کو آباد کرنے کا ارادہ کرتی ہے کتنے ہی چراغ گل ہوتے رہیں وہ ہر چراغ کے بعد دوسرا چراغ روشن کرنے پہ اصرار کرتی ہے۔ اس کی کشتی کے تختے کتنے ہی پرانے اور کمزور ہوں، لیکن اگر وہ ایک لمحہ بھی کسی موج کا راستہ روک سکیں تو زندگی کا یہ ایک لمحہ بھی کیا کچھ کم ہے!

[illegible] قاسمی

چور

[illegible] ابھی [illegible] تھا کہ رحمان اس عالم میں ماری گئی جس کا نسخہ مغلی دیہاتوں نے ایشیائی مزاج کے لئے خاص طور سے تجویز کر رکھا تھا۔ باپ [illegible] ایک [illegible] میں اکڑ بکڑ گیا اور اس گاؤں اور ہسپتال کے درمیان چلتے چلتے دم توڑ بیٹھی۔ ہسپتال والے کہتے تھے کہ [illegible] ہسپتال میں داخل کی جاتی ہو گئی گی ایک دن خوش قسمتی سے شدید درد اٹھا تو وہ رحمان کو ساتھ لے کر ہسپتال کی طرف بھاگی مگر راستے ہی میں [illegible] کر لوٹنے اور چیخنے لگی۔ اور مرنے سے پہلے رحمان کا ایک احساس زور سے مروڑ اکر رحمان مارے غصے کے "اماں، [illegible] کر کے پیٹ گیا اور مرنے لگا۔"

[illegible] اس کے قریبی رشتہ داروں میں صرف ایک پھوپھی نصف [illegible] پردیس میں بیاہی گئی تھی، وہ اپنی بھابھی کے پرسے کے لئے [illegible] اپنے بھائی کی نشانی کو ساتھ لیتی گئی۔ رحمان کے پھوپھا نے اپنے گاؤں میں کپڑے اور چمڑے کی دکان کھول رکھی تھی۔ وہ روز [illegible] اور پھوپھی نے [illegible] چند روز بیوی سے کہتا رہا، کہ رحمان کو ایک روٹی سے زیادہ کھانا دینے کی ضرورت ہی کیا ہے! [illegible] سات آٹھ سال کا تو ہوتا ہے اور ندیدہ اتنا کہ روٹیوں کا ٹوکرا بھی بھر کر رکھو تو آن کی آن میں چٹ کر جائے، اس سے کہ دو کتا پیسے میں [illegible] دن بھر دکان میں بیٹھا تمہارے بھتیجے کے لئے سر نہیں کھپاتا رہتا ابھی میری بھی اولاد ہوگی، پیر دستگیر محبوب سبحانی کی برکت سے [illegible] رحمان نے یہ باتیں سن لی تھیں۔ اس روز وہ دن بھر بھوسے کی کوٹھڑی میں چھپا روتا رہا۔ شام کو بھوک لگی تو پھوپھی کے پاس یوں سہما ہوا آیا [illegible] روٹیاں چرا کر کھاتا رہا ہے۔ پھوپھی نے اس کے بالوں سے بھوسے کے تنکے چنے، پیار کیا اور نصیحت کی کہ وہ ایک روٹی سے زیادہ [illegible] اس کا معدہ بگڑ جائے گا اور وہ مر جائے گا۔ نصیحت کرنے کے بعد جب اس نے ایک بار پھر رحمان کے ماتھے پہ پیار کیا تو رحمان کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی پھوپھی کے ہونٹ قینچی کے پھل ہیں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگا۔ پھوپھی نے اسے تسلیاں دیں مگر وہ یوں روئے جا رہا تھا [illegible] اس کے کانوں تک پہنچتے پہنچتے گالی بن جاتی ہے۔ اس وقت اوپر سے پھوپھا آ گیا اور جب بیوی نے اسے بتایا کہ رحمان دن بھر [illegible] کوٹھڑی میں پڑا اپنی ماں کی یاد میں روتا رہا ہے، تو پھوپھا کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ "سالے ستر روپے کے بھوسے کا ناس مار دیا ہوگا [illegible] میں جانتا ہوں [illegible] تم چیتے کے گھر میں چند برس پال رہی ہو [illegible] رکھو، اگر تم نے پھر کبھی بھوسے کی کوٹھڑی میں قدم رکھا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ میرا ہاتھ بہت [illegible]" رحمان نے ڈر کر ایک ہی روٹی پہ اکتفا کر لی، اور بھوسے کی کوٹھڑی کی طرف بھولے سے بھی نہ دیکھا۔ لیکن ایک دن جب وہ شام کی ایک روٹی لینے کے لئے پھوپھی کے پاس گیا تو پھوپھا نے کڑک کر کہا۔ "پوچھو اس حرام زادے سے۔"

رحمان کو اس کی ماں نے بتایا تھا کہ گالی کے جواب میں گالی دینے والے کی زبان پر پھوڑا نکل آتا ہے اور جو گالی سن کر بدلہ نہ لے اس کے [illegible] آتی ہے۔ اور بدلہ لینے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ گالی دینے والے کا سر نوچ لو۔ ڈھیلا کھینچ مارو، لاٹھی چلا دو۔ بے شک ان [illegible] ایک بار اس کے جی میں آئی کہ چولہے میں سے جلتی ہوئی لکڑی اٹھا کر پھوپھا کے جبڑے پر دے مارے۔ مگر

اس وقت اس کی پھوپھی آئی اور اس کے پاس آکر بڑے پیار سے بولی "سچ سچ بتاؤ بیٹا۔ کہاں رکھے ہیں؟"

"کیا؟" رحمان نے حیران ہو کر پوچھا۔

"اور پھوپھا گرجا۔ تیری ماں کے خصم۔"

"دو روپے میرے بچے، دو روپے" اس کی پھوپھی نے فضا بدلی "سچ سچ بتا دو تو میں تمہیں ان میں سے ایک روپیہ دے دوں گی۔ کہاں رکھے ہیں؟ بھوسے کی کوٹھری میں تو چھپائے نہیں؟"

رحمان کچھ کہنے کے لئے اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹ ابھی کھول ہی رہا تھا کہ اس کا پھوپھا چارپائی پر سے اٹھا اور رحمان کو دھکا دے کر پیچھے دھکیل دیا۔ "یوں گھی کھیر نکالنے سے کام نہیں چلے گا۔ سن بے ولد شیطان، تو نے میری واسکٹ کی اندر والی جیب میں سے زیادہ تو کچھ نہیں، پیسے نکالے ہیں۔ وہ سیدھی طرح یہاں میرے ہاتھ پر رکھ دے ورنہ یہیں بھوسے کا بستر بنا دوں گا۔ بتا۔" اس نے رحمان کو تھپڑ مارنے کے لئے ایک ہاتھ تان لیا۔

رحمان بچوں میں پھنسا ہوا کاغذ کا پرندہ ہو رہا تھا۔ پلکیں پھڑپھڑا رہا تھا۔ جیسے آنکھوں میں مٹی گھس گئی ہے۔ ہونٹ کھلے تھے ویسے ہی۔ گلابی رنگ میں سے گلاب غائب ہو گیا تھا۔ صرف میل باقی رہ گیا تھا۔ بس اتنا کہہ سکا: "کون سی واسکٹ؟" اور پھر ایک دم اس کی اجڑی ہوئی آنکھوں میں آنسو پھیل گئے۔ اس کا نیچے والا ہونٹ ذرا سا لٹک گیا۔ ٹھوڑی میں چند شکنیں پیدا ہوئیں۔ نتھنے پھڑکے اور وہ زار زار رونے لگا۔

"کون سی واسکٹ!" پھوپھا یوں آگے بڑھا۔ جیسے اسے روند کر نکل جائے گا۔ "ابے وہی سیپ کے بٹنوں والی اور کون سی؟"

اور رحمان نے پھوپھی کی طرف دیکھ کر روتے ہوئے بہت اونچی آواز میں فریاد کی: "مجھے خدا کی قسم، مجھے نبی جی کی قسم، مجھے پیر دستگیر کی قسم پھوپھی۔ میں نے واسکٹ کو چھوا بھی ہو تو میرے ہاتھ ——————"

مگر پھوپھی ایک کمرے میں گئی اور اپنے شوہر سے بولی: "سیپ کے بٹنوں والی واسکٹ کہاں رکھی ہے؟ میں نے تو وہ کالی صوف والی واسکٹ دیکھی تھی۔"

پھر رحمان کو تنہا چھوڑ کر دونوں اندر چلے گئے۔ ذرا سی دیر کے بعد پلٹے تو پھوپھی کہہ رہی تھی: "خواہ مخواہ میرے بچے پر تہمت لگاتے ہو۔ تمہیں شرم نہیں آتی؟ اپنے روپے ایک بار پھر گن لو۔ ہمارے خاندان نے قتل کئے ہیں پر چوری کبھی نہیں کی۔ ہاں —————— ایک روپیہ ادھر لاؤ، یہ میرے بچے کا انعام ہے۔ خواہ مخواہ رلا دیا ہے بچارے کو۔ لے کے کھانا حرام کر ڈالا۔ ادھر لاؤ روپیہ۔"

رحمان ایک دم خاموش ہو گیا۔ آنسو اس کے گالوں پر بہے جا رہے تھے مگر اس کی سسکیاں اور ہچکیاں ختم ہو گئی تھیں۔

پھوپھی نے شوہر سے ایک روپیہ چھین لیا اور رحمان کی طرف بڑھی۔ پھوپھا بولا: "آج نہیں تو کل چرائے گا۔ نہ ہو تو بے جا ہے یتیم لڑکا تو ضدی ہوتا ہی ہے۔ اچھا ہے کسی ملک کے لاٹ صاحب کا لڑکا ہو۔"

پھوپھی نے رحمان کے پاس آ کر اسے اکٹھے بہت سے پیار کر ڈالے۔ پھر اس کی مٹھی کھول کر اس میں روپیہ رکھا اور اس کی انگلیوں کو مٹھی بنا کر اس کی بلائیں لیں۔ وہ دوسرے ہاتھ کی انگلی پکڑ کر اسے کوٹھے میں لے آئی، مجبور کر کے کھانا کھلایا۔ اور جب وہ دوسری روٹی میں سے ایک نوالہ توڑنے لگی تو رحمان پہلی بار بولا "نہیں پھوپھی۔ بس۔"

"کیوں؟" پھوپھی نے پیار بھرے غصے سے پوچھا۔

"پاخانہ بگڑ جائے گا۔" رحمان بولا۔

[illegible] کو گھٹنوں میں چھپا لیا۔

[illegible] بیٹھا رہا تھا۔ وہ اس کے پاس آیا اور [illegible] اس کی ماں ہے کہ کر رو دے۔ "میں نہیں لیتا۔"

[illegible] میں ٹھا لیا۔

[illegible] نہیں [illegible] آواز میں کہا اور پلٹ کر محل سے باہر چلا گیا۔

[illegible] کا دل نہ لگتا۔ کیونکہ وہ رات کی بات [illegible] سے نکلا اور کبھی [illegible] ایک کھیت کی میڑ پہ جا کر ذرا سا سستایا اور [illegible] ساتھ ہی کھیتوں پر دھوپ چمک رہی تھی اور سڑک پر ایک درخت کے شاخ پر ایک کوا بیٹھا چیخ رہا تھا۔ رحمان پہلے تو کوا اس پاس [illegible] لگا [illegible] "اماں، اماں" پکارنے لگا۔ کافی دیر تک رونے کے بعد اس نے غصے سے بھری ہوئی آواز میں کہا۔ [illegible] آنسو پونچھ لیے۔ کسانوں سے اپنے گاؤں کا پتہ پوچھتا ہوا شام سے پہلے گاؤں کی گلی میں داخل ہوا تو [illegible] بے اختیار اٹھنے [illegible] سے کسی نے [illegible] اسے پہچان رہا تھا۔ وہ اسے دلاسا دیتے، [illegible] نکل جاتے یا اس کے گرد بہت سے لڑکے جمع ہو گئے [illegible] بڑی ہمدردی سے دیکھتے اور پھر آپس میں سرگوشیاں کرتے۔ "یہ بچارے کی ماں مر گئی ہے نا پچھلے سال!" "ہاں تو بیری [illegible] تو ماں نہیں ہوتا!" "تمہارا تو باپ ہے نا، اس کا تو باپ بھی نہیں" "ہاں ہاں! اس بے چارے کا تو باپ بھی نہیں"۔ اور پھر بڑی ہمدردی سے رحمان کو دیکھنے لگتے جو اب زور زور سے ہچکیاں لینے لگا تھا اور آنسو پونچھتے پونچھتے اس کے گاؤں کی [illegible] شام کو اس کے پاس راجہ اللہ نواز کا سائیس آیا اور بڑے پیار سے بتایا کہ راجہ اللہ نواز نے اسے اپنے پاس بلایا ہے۔

راجہ اللہ نواز [illegible] کا خاص [illegible] تھا۔ زمینیں بھی خاصی تھیں، طب میں بھی کچھ درک حاصل تھا۔ اور مفت علاج کرنے کی وجہ سے وہ [illegible] دور دور سے [illegible] کرنے کے لئے اس کے پاس تبرک، تعویذ اور دم تھے، پھر وہ [illegible] تھا اور [illegible] قرآن پڑھتے [illegible] تو وہ [illegible] سمجھا جاتا تھا۔ اس کے اصطبل میں دو گھوڑے برسوں سے موجود تھے [illegible] تھا۔ لیکن ان گھوڑوں سے اسے اتنی محبت تھی، ان کے لئے کم از کم دو خدمتگار تو ہمیشہ موجود رہتے۔ رحمان جب راجہ اللہ نواز کے پاس آیا تو اس وقت [illegible] شام کی نماز پڑھ کر اس کی بیٹھک میں جمع ہو گئے تھے۔ سب کے سامنے اس نے رحمان کے سر پر ہاتھ پھیرا اور بولا۔ "دیکھو بیٹا۔ تم یتیم ہو [illegible] پھوٹ پھوٹ کر رو [illegible] خدا [illegible] اس گاؤں کو غرق ہی نہ کر دے، تمہارا باپ [illegible] گاؤں والوں کا کوئی قصور نہیں تھا۔ تمہاری ماں [illegible] تو بھی اس کی قسمت کا لکھا تھا۔ یہ سب کام خداوند تعالیٰ کے ہیں [illegible] اس لئے خدا کے [illegible] اس بے قصور گاؤں پر [illegible] تمہارے آنسو پونچھنے کو تیار [illegible] میرے اصطبل میں رہو، تمہاری نوکری [illegible] گھوڑوں کے [illegible] صاف رہیں، ادھر گھوڑے بیمار ہوں تو ادھر تم بھاگ [illegible] اصطبل کو آئینہ بنا دو۔ اس نوکری کے [illegible] شام کا کھانا تم میرے گھر سے کھانا [illegible] سال میں ایک [illegible] دو بار تمہیں میرے بچوں کی اترن بھی ملتی رہے گی، [illegible] صبح کا کھانا تو اس کا انتظام یوں ہو جائے گا کہ میرے خاندان کے جتنے بھی گھر ہیں، ان کے [illegible] سب [illegible] بیٹیاں ہیں۔ نائن میراثن [illegible] اسی وجہ سے یہ فائدہ ہوگا کہ [illegible] ہے۔ تم اس گاؤں کے بیٹے ہو اور تمہارے سر پر ہاتھ رکھنا میرا فرض ہے۔ کیوں بھئی! کیا غلط کہا میں نے؟"

[illegible] اس تمام [illegible] میں راجہ اللہ نواز کی سخاوت سے [illegible] متاثر ہو چکے تھے کہ بعض رقیق القلب لوگوں پر رقت تک طاری [illegible] ایک

سے راجہ اللہ نواز کو دانا اللہ نواز کہہ ڈالا۔ رحمان کو ایک شخص ایک طرف لے گیا۔ راجہ اللہ نواز کے گھر سے کھانا آیا تھا جس میں [illegible]
رحمان کی سمجھ سے بھی بڑی دو پیاز میں ماس سے آٹا گاٹا دیگیوں کا ملایا گیا تھا اور پھر بیٹھک میں جاکر راجہ اللہ نواز سے کہا۔ "جی میں نے [illegible]
لی ہے"۔

راجہ اللہ نواز بولا "بہت اچھا کیا۔"

رحمان نے بڑی معصومیت سے کہا۔ "جی میری نوکری ابھی سے لگ گئی کہ صبح لگے گی؟"

راجہ اللہ نواز اور دوسرے حاضری ہنسنے لگے۔ راجہ بولا "ابھی سے لگ گئی بیٹا۔"

اور رحمان نے اسی انداز میں کہا۔ "تو جی پھر یہ بتا دیجئے کہ پھاوڑا کہاں رکھا ہے۔"

حاضری اور زیادہ زور سے ہنسنے لگے مگر راجہ اللہ نواز سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے کندھے پر سے ہاتھ سا میلا سا رومال اتارا [illegible] جھک کر رحمان کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور بولا۔ "نہیں بیٹا۔ میں نے غلط کہا تھا۔ تمہاری نوکری صبح لگے گی۔"

مگر رحمان کی منطق کا سلسلہ جاری تھا۔ نواز بولا۔ "پر کھانا تو مجھے ابھی سے ملنے لگا ہے جی۔"

راجہ اللہ نواز کے ہونٹ اس کی داڑھی اور مونچھوں میں سے نکل آئے اور وہ زار زار رونے لگا۔ "لے جاؤ۔" اس نے رونے ہوئے کہا۔ "اس بچے کو لے جا کر سلا دو۔ ورنہ مجھے ڈر ہے کہ ابھی بھونچال آ جائے گا اور ہم سب دھرتی کے پیٹ میں اتر جائیں گے اور یہ حرام موت ہوگی۔ لے جاؤ اسے۔ جاؤ بیٹا، جاؤ، کلمہ پڑھ کر آرام سے سو جاؤ۔ بڑوں سے بہت دلیل بازی نہیں کرتے، خداوند تعالیٰ خفا ہو جاتا ہے۔"

رحمان نے سوچا کہ خداوند تعالیٰ اس سے خوش ہی کب تھا جو اب خفا ہوگا۔ اور جانے خداوند تعالیٰ بات بات پر بچوں کی طرح کیوں خفا ہو جاتا ہے۔ آخر رحمان نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ اس نے تو کبھی کسی کو گالی تک نہیں دی۔ اس نے تو زندگی میں صرف ایک بار چوری کی تھی اور وہ بھی ایک آنے کی پنسل کی۔ پھر جب استاد نے اس کی پانچ انگلیوں کے درمیان چار پنسلیں رکھ کر ان انگلیوں کو دبایا تھا تو اس نے چیخ کر سچ بول دیا تھا۔ "میری نہیں غلام یٰسین کی ہے!" پھر اس نے ماں تک کو ساری بات سچ سچ بتا دی تھی، اور ماں نے کہا تھا کہ اگر رحمان نے پھر کبھی چوری کی تو وہ اسے بتیس دھاریں نہیں بخشے گی اور جس بچے کو اس کی ماں بتیس دھاریں نہ بخشے وہ ساری عمر لوگوں کی ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ اس کے بعد آج تک اس نے کوئی چوری نہیں کی تھی، لیکن وہ لوگوں کی ٹھوکریں تو اب تک کھا رہا تھا۔ تو کیا ماں نے مرنے سے پہلے اسے بتیس دھاریں نہیں بخشی تھیں؟ "اماں، کہاں ہو اماں!" وہ غصے میں پکار اٹھا۔ اور پھر رونے لگا۔ اور یونہی روتے روتے سو گیا۔

صبح کو اصطبل میں پھاوڑے سے لید جمع کرتے ہوئے اسے ماں یاد آ گئی۔ ایک بار گھر کے پیچھے کے لئے جب وہ گارا بنانا چاہتی تھی تو اسے گوبر ڈھاکر نے کے لئے اس میں گھوڑے کی لید لانے کا خیال آیا۔ ٹوکرا سر پر رکھ کر وہ سارے گاؤں میں گھوم آئی تھی مگر اسے کہیں سے لید نہ ملی تھی۔ ہر جگہ سے یہی جواب ملتا تھا کہ آج وہ بھی گارا بنا رہے ہیں۔ بعض گھرانے تو لید کو خشک کر کے اس سے ایندھن کا کام لیتے تھے [illegible] آج رحمان کے پاس ڈھیروں لید جمع رکھی ہے مگر ماں نہیں جو گارا بنا سکے۔ ذرا اس کے ذہن پر اپنا کوٹھا ابھرا اور وہ پھاوڑا [illegible] لگا۔ جب وہ اپنے اس کوٹھے کے سامنے پہنچا جس میں اس نے زندگی کے سات برس گزارے تھے۔ تو یہ دیکھ کر اس کی باہر کی سانس باہر اور اندر کی اندر رہ گئی کہ کوٹھے کی چھت گر چکی ہے اور ٹوٹی ہوئی دیوار پر دو بلیاں آمنے سامنے بیٹھی دُمیں پھیلائے غرا رہی ہیں۔ ایک [illegible] اٹھا کر اس نے بلیوں کی طرف پھینکا اور چلایا "ہٹ جاؤ حرام زادیو، سؤر کی بچیو، اللہ کی پھٹکارو ——— بلیاں بھاگ گئیں مگر اسے یوں لگا جیسے اس کی زبان

میں [illegible] اور [illegible] بھوڑا اکل رہا ہے اس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر کسی طرح دونوں ہتھیلیوں کو پکڑ لائے اور انہیں [illegible] بیٹھا کر [illegible] کہ [illegible] اور مجھے معاف کرو۔ [illegible] محسوس ہوا جیسے اس کی ماں [illegible] سے لگی ہو [illegible] وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے [illegible] سے [illegible] کر بیٹھ گیا اور دیر تک روتا رہا۔ اور جب راجہ اللہ نواز کا [illegible] اس نے اپنا گریبان اٹھا کر اس [illegible] کی طرف بڑھا [illegible] کیوں رہے ہو بیٹا؟ [illegible] میں نے کان [illegible] ہے اور ماں کہتی تھی [illegible] بچے کا اس کی زبان میں [illegible] نکل آئے گا [illegible] بولا [illegible] ایک [illegible] اسے [illegible] کھول کر اس میں [illegible] کی اور کہا۔ اب بھوڑا [illegible] نہیں نکلے گا، لیکن تم نے کان [illegible]؟ رحمان [illegible] کو پکڑے [illegible] اور راجہ اللہ نواز [illegible] بے اختیار ہو کر ہنسا کہ رحمان تک کو ہنسی آ گئی اور وہ اصطبل میں جا کر [illegible] سے کھیلنے لگا۔

آہستہ آہستہ وہ اس زندگی کا عادی ہو گیا۔ وہ صبح کو راجہ اللہ نواز کے ہاں جا کر [illegible] ایک پیالہ پیتا، اور پھر اس کے گھر کا کوڑا ایک ٹوکرے میں [illegible] ایک گھوڑے پر پھینک آتا۔ راجہ کے خاندان میں سات گھر تھے، اور ٹوکرے کے یہ سات ٹوکرے ڈھونے کے بعد وہ اصطبل میں [illegible] استعمال لیتا، گھوڑے کے [illegible] پر [illegible] تاکہ [illegible] نہ پائے، اور پھر ایک خالی ناند کا سہارا لے کر اور چھت کو [illegible] رہتا [illegible] میں [illegible] بھڑیں [illegible] رہتی تھیں۔ جب کوئی بھڑ مکڑی کے جالے میں پھنس جاتی تو بھڑ اور مکڑی کی آپس میں خوب لڑائی ہوتی، مکڑی بھڑ کو [illegible] کے لیے [illegible] بڑھتی تو بھڑ [illegible] ڈنگ نکال کر مدافعت کرتی اور مکڑی جالے کے پرلے سرے تک بھاگ جاتی، پھر جب کبھی دو بھڑیں [illegible] میں [illegible] کر [illegible] گر [illegible] تو وہ ایک بھڑ کو سر کی طرف سے پکڑ کر اس کا ڈنگ توڑ لیتا اور اس کی ٹانگ میں دھاگا باندھ کر اسے اڑنے کے لیے چھوڑ دیتا [illegible] خوب ہنستا۔ پھر ایک دم اسے پھاوڑا استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی اور وہ اپنے کام میں جت جاتا۔ اب اس کی [illegible] بہت [illegible] آتی [illegible] اور یاد بھی آتی تھی تو رحمان کی آنکھیں نہیں ڈبڈباتی تھیں، وہ بس ذرا سا اداس ہو جاتا۔ تب اوپر چھت میں بھڑ اور مکڑی کی جنگ شروع ہو جاتی [illegible] ہو کر یہ تماشا دیکھنے لگتا۔

گرمیوں [illegible] کے [illegible] کا بوجھ [illegible] بڑھ گیا۔ راجہ اللہ نواز کے خاندان میں خوب تربوز کھائے جانے لگے اور ان کے موٹے موٹے چھلکوں [illegible] ایک ایک گھر کا کوڑا وہ دو بار [illegible] جب وہ چھلکوں کو گھورے پر پھینکتا تو اسے ان پر اتنی [illegible] اور اس کے [illegible] ہونے لگی۔ کئی چھلکوں پر تربوز کا گودا باقی رہ جاتا تھا۔ اور ان چھلکوں کو [illegible] ڈھیر پر پھینکتے ہوئے وہ سوچتا تھا کہ [illegible] تربوز کھانے کا سلیقہ تک نہیں آتا۔ اور ایک میری ماں تھی کہ گودے کو چھری سے یوں کاٹتی تھی کہ چھلکے پر گلابی رنگ کا ایک [illegible] نہیں [illegible] اور ایک یہ [illegible] معلوم ہوتا ہے ان کے گھروں سے ساری چھریاں چوری ہو گئی ہیں۔ پھر اس کے منہ میں [illegible] کا [illegible] اور اس کا [illegible] چاہتا کہ چھلکوں [illegible] سے بچے کھچے گلابی رنگ کو چاٹ [illegible] لیکن وہ ہمیشہ اس [illegible] سے [illegible]۔ [illegible] کو [illegible] سے [illegible] الٹ کر چھلکوں کو کرید کرید کر دیکھنے کی اسے عادت ہو گئی تھی۔ اب تربوزوں کے ساتھ خربوزوں کے چھلکے [illegible] لگے تھے۔ [illegible] کے [illegible] کی گٹھلیاں [illegible] نظر آنے لگی تھیں۔ اس وقت رحمان کے پیٹ میں [illegible] اس کی [illegible] تمام [illegible] چپٹ کر رہ گیا۔

ایک [illegible] اسے [illegible] کو کرید رہا تھا۔ جب اسے [illegible] ایک [illegible] انگریزی ٹوپی پہنے، ہاتھ میں کالے رنگ کی چھڑی لیے

[illegible] میں لیٹا ہوا گنے کو چوس رہا ہے۔ جیسے [illegible] دیکھ کر اسے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ گنے کو ایک [illegible]
وہ بھی [illegible] لگا اور دوسرے ہاتھ میں گنا لئے [illegible] گنا تو بھی [illegible] گنے کو [illegible]
اس سے کھا کر [illegible] سب کچھ [illegible] ایک دم اس کے [illegible]
تھا۔ راجہ اللہ نواز کے ہاں جا کر گنے کو اس کی بیوی کے سامنے رکھ دیا اور [illegible] راجہ اللہ نواز [illegible]
[illegible] شرارت [illegible] تھا [illegible] شاباش [illegible] تم نے چوری نہیں کی۔ تمہیں آج انعام ملے گا [illegible] ایک [illegible]
اٹھا لیا اور رحمان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

اصطبل میں آ کر وہ اس پھانک پر لیٹا اور چھلکے کی سفیدی [illegible] سخت سخت چھلکے نے اس کا تالو چھیل دیا۔ اور اس نے سوچا۔ اوپر بڑا راجہ بنا پھرتا ہے۔ انعام میں دیتا تھا تو گنا ہی دے دیتا۔ پھانک ایک پھانک میں کیا انعام ہے۔ [illegible] ایک پھانک [illegible] دے دیتا۔ ذرا سا تربوز کا پانی تو پی لیتے ہم واہ!

ایک روز بڑے زور کی بارش ہوئی۔ اور دوسرے دن جب رحمان چائے پینے کے لئے راجہ اللہ نواز کے ہاں جا رہا تھا تو اس نے دیکھا کہ گلی میں ہر طرف تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر لگے ہیں اور لوگ ٹوکرے بھر بھر کے خرید کے لے جا رہے ہیں۔ ایک لڑکے کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ بارش کے بعد تربوزوں اور خربوزوں میں پانی بھر جاتا ہے اور وہ گل جاتے ہیں۔ اس لئے کسانوں نے کھیت صاف کر دیئے ہیں [illegible] بیچ رہے ہیں۔ رحمان کو [illegible] راجہ اللہ نواز پر غصہ آ گیا۔ [illegible] لگتی ہے تو [illegible] ہیں۔ یہ بھی کیا کہ [illegible] دن بھر اصطبل صاف کرو، [illegible] اٹھاؤ اور بدلے میں [illegible] اور [illegible] اللہ کا شکر ادا کرو [illegible] ایک آدھ [illegible]
بچے ننگ پیٹ اور [illegible] سے چار چار پانچ پانچ خربوزے لئے بھاگے جا رہے تھے۔ اور وہ راجہ اللہ نواز کے ہاں سے چائے پی کر چلا تو ایک بچے کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور ایک خربوزہ گر کر دور لڑھک گیا۔ رحمان نے لپک کر خربوزہ اٹھایا اسے جھاڑا اور پھر [illegible] سونگھ کر اسے بچے کے حوالے کر دیا۔ خربوزے کی خوشبو اس کی ناک سے چمٹی چلی آتی تھی اور اس نے جی ہی جی میں کہا سو سو روپے شرط یہ خربوزہ [illegible] کی طرح میٹھا ہو گا [illegible]
[illegible] میں رہا کہ اس نے [illegible] کے پیچھے سے اپنا پیالہ اٹھایا اور [illegible] راجہ کی بیوی کے پاس آیا۔ چائے پی کر وہ [illegible] سا ہو گیا [illegible] جیسے اس نے خوب پیٹ بھر کر تربوز اور خربوزے کھانے کے بعد اوپر سے چائے پی لی ہے، اور اس کی ماں نے اسے بتایا تھا کہ اس طرح ہیضہ ہو جاتا ہے۔
پھر اس نے اپنی ناک کو ملا جس میں سے خربوزے کی بو کم بخت نکلتی ہی نہ تھی۔ اسے اپنے اس شبہے پر ہنسی آ گئی اور وہ گھوڑے کو [illegible] کر باہر چلا گیا۔
گھوڑے پر جا کر اس نے گوبر کو [illegible] کیا۔ چھلکوں کے نیچے کونوں کے فرش [illegible] ٹوٹی ہوئی جوتی [illegible] کے ٹکڑے تھے۔ راجہ اللہ نواز کے [illegible] جوتی [illegible] اور ——— رحمان سناٹے میں آ گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی جیسے گوڑے کے نیچے اس نے [illegible] دیکھ لیا ہے۔ پھر اس کے خشک ہونٹ ذرا سے پھڑکے اور وہ مسکرانے لگا۔ ہاتھ بڑھا کر کاغذ کا ایک پرزہ اٹھایا — یہ ایک روپے کا نوٹ تھا
نوٹ کو مٹھی میں بند کر کے اور گھوڑے کو وہیں چھوڑ کر وہ بھاگا اور اصطبل کے ایک کونے میں دبک کر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے [illegible] نوٹ کے [illegible] اور موقع پاتے ہی وہ چپکے سے اٹھ جائے گا۔ [illegible] کو ایک بار پھر سختی سے بند کر کے وہ لپکا اور گلی میں تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیروں کے پاس جا کر رکا۔ گدھوں پر [illegible] خربوزوں سے بھرے بورے لدے لائے جا رہے تھے۔ اور [illegible] جانے والے [illegible] لگ کر گزر رہے تھے۔

[illegible] چھوڑا اور ایک مدت سے کہ تو بنا ہوا ہو لے قرینے کے تھے اس نے ہونٹ کھول دیے یہ دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہو گیا اور کان کھڑے ہو گئے [illegible] اب یہاں کوئی [illegible] کا کھیل ہو رہا ہے [illegible] یہ نہیں تو [illegible] سیتا ہے کیا؟

[illegible] وہ اسی طرح تھوڑی دیر کے بعد پاس آیا اور نوٹ کو اس کے سامنے رکھ کر بولا "یہ [illegible] پوچھا گیا تھا"

راجا اللہ [illegible] بیوی کو [illegible] کہ سنا۔ اب مدد ہے [illegible] کرتے [illegible] مانگتے ہیں تم نے گھر کی [illegible] جہانگیری کی تو [illegible] کرتے [illegible] رحمان [illegible] یہ بے چارہ۔ کوئی اور ہوتا تو [illegible] ایک مدت ہے ہو گیا تھا۔ ادھر آؤ اسے کہیں سنبھال کر رکھ [illegible] پھر وہ رحمان سے مخاطب ہو کر [illegible] تمہیں اس کا اجر ملے گا۔ یہ تمہارے خاندان کی شرافت ہے۔ تمہاری جگہ کوئی کمین ہوتا تو سر پہ قرآن لے کر بھی انکار کر جاتا [illegible] اس نے [illegible] کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیر دیا۔

"لڑکا کہاں چھوڑ آئے؟" راجہ اللہ نواز کی بیوی نے پوچھا۔ وہ نوٹ کو اندر بڑے کوٹھے میں صندوقوں کی قطار کے اوپر ایک کٹورے کے نیچے رکھ رہی تھی۔

"جی گھر؟" رحمان نے کہا۔ "جی ہاں لڑکا۔" اس نے فوراً ہی جواب دیا اور جا کر لڑکے کو گھوڑے پر چڑھا دیکھ کر اس نے خدا کا شکر ادا کیا۔ اور [illegible] میں اٹھا لیا۔

آج اس نے باقی چھ گھروں کے لڑکے گھوڑے پالٹ دیئے مگر [illegible] وہ بہت نڈھال ہو رہا تھا۔ قدموں میں [illegible] بھر گیا تھا [illegible] گھٹنوں میں [illegible] دم [illegible] لڑکے کے بوجھ سے اس کا ایک کندھا جھکا ہوا تھا۔

[illegible] کے لیے وہ اصطبل میں آیا اور ناند کا سہارا لے کر بیٹھ گیا۔ [illegible] ڈھیریاں لگی تھیں مگر اس نے پہلا ڈھیر پاؤں سے پرے دھکیل دیا۔ اور آنکھیں بند کر لیں۔ کافی دیر کے بعد وہ اٹھا اور پاؤں گھسیٹتا راجہ اللہ نواز کے صحن میں داخل ہوا۔ گھر کے سب لوگ پرلی طرف سائے میں کھانے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ راجہ کی بیوی نے اسے دو روٹیوں پر دو پیازیں رکھ کر دیں۔ اور پھر بولی "ٹھہرو، پیازیں مجھے دے دو۔ آج تمہیں مرچ کا اچار دوں گی۔" اس نے پیازیں اٹھا کر روٹیوں پر دو مرچیں رکھ دیں۔ اور رحمان بڑے کوٹھے کے سائے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔

[illegible] اس کی رفتار بہت تیز ہو گئی۔ وہ روٹی کو چبانے کے بجائے نگلنے لگا اور آن کی آن میں صفایا کر کے اٹھ کھڑا ہوا [illegible] جھک کر پرلی طرف دیکھا سارا گھر کھانا کھانے میں مصروف تھا۔ وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر دبے پاؤں بڑے کوٹھے میں گیا۔ بلی کی طرح پلنگ پر چڑھا اور سب سے اوپر والے صندوق پر سے کٹورا اٹھا کر روپے کے نوٹ کو مٹھی میں بھینچ لیا۔ پلنگ پر سے اترا تو اس کے چہرے پر زردی کھنڈ چکی تھی۔ دروازے تک آیا تو [illegible] بجلی کی تیزی سے مڑ کر پلنگ کی چادر پر سے اپنے پاؤں کے نشانات کو جھاڑ دیا۔ باہر آ کر اس نے کنکھیوں سے پرلی طرف دیکھا۔ سب کھانے میں مگن تھے۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا جب صحن کے وسط میں آیا تو راجہ کی بیوی بولی۔ "رحمان!"

رحمان [illegible]

"[illegible] سب [illegible] کیا بچا؟" بیوی نے پوچھا۔

"[illegible] تمہاری آواز ہی تو ماشاء اللہ ہے" راجہ بولا۔

"جی۔" رحمان نے کافی دیر کے بعد جواب دیا۔ اس کی آواز خود اس سے بھی پہچانی نہ گئی۔

"کھا چکے کھانا؟" بیوی نے پوچھا۔

جی: رحمان کی آواز بند تھی۔

"اچھا تھا!" بیوی نے پھر پوچھا۔

"جی:" رحمان نے کہا۔ پھر ہمت کر کے چند لقمے زہر مار کئے۔ جی بیزار تھا۔

"اچھا:" بیوی بولی۔

رحمان باہر گلی میں آ گیا۔

اسے ایسا لگا جیسے ذہن کی بہت سی گرہیں کھل گئی ہیں اور وہ ان سب بے چینیوں سے آزاد ہو گیا ہے جو اس کی آنکھوں پر پٹیوں کی طرح بندھی ہوئی تھیں۔ رحمان نے نوٹ کو دوسری مٹھی میں لے لیا۔ اور پہلی مٹھی کے پسینے کو جھٹک کر پونچھ دیا۔ تربوزوں اور خربوزوں کے ڈھیر کے پاس پہنچتے ہی وہ رک گیا۔ اور اصطبل میں چلا گیا۔ ٹھیک ہے، اس نے سوچا، چوری کی جائے تو مائیں بچتی ہیں، دعائیں نہیں لگتیں۔ کیونکہ جب ماں بھوکی ہو تو ان دعاؤں کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ رہا عمر بھر شکر ہی کھانے کا سوال تو اس سے زیادہ اور کیا شکر ہی کھاؤں گا۔ اور پھر ایک روپے کی چوری کوئی چوری ہے۔ بڑے ہو کر راجہ کو پیسہ ادا کر دوں گا۔ یہ تو ادھار ہے۔ کیا کیا اتار لوں گا۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔

مطمئن ہو کر وہ باہر آیا اور فیصلہ کیا کہ تربوز اور خربوزے اس گلی سے خریدنا حماقت ہے۔ کسی دور کی گلی میں چلتے ہیں، وہیں خریدیں گے، وہیں کھائیں گے، اور پھر مسجد میں جا کر ہاتھ منہ دھو لیں گے۔ ماشاءاللہ خیر صلا!

وہ گلیاں کاٹتا ہوا تیز تیز جا رہا تھا۔ ایک گلی میں اسے گھڑونچی کے برابر تربوز پڑے نظر آئے۔ وہ ان کی طرف بڑھا مگر ایک جگہ جا کر یوں ایک دم ٹھٹھک گیا جیسے دلدل میں دھنس گیا ہے۔

اس کی نظریں اپنے گھر کے دروازے پر جم گئیں، جس کی چھت گر چکی تھی، اور جس کی ٹوٹی ہوئی دیواروں پر بلیاں رہتی تھیں۔ اسے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے کھنڈر میں سے اس کی ماں پیٹ کے درد سے کراہتی اور سسکتی ہوئی نکلی ہے۔ اور اس کے قریب آ کر اس نے رحمان کے منہ پر ایک زناٹے کا تھپڑ مار دیا ہے۔

یکایک وہ پوری شدت سے واپس بھاگا۔ اسے کچھ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی ماں ہانپتے ہانپتے ڈگ بھرتی اس کے پیچھے پیچھے آ رہی ہے۔ وہ گلیوں میں اڑا جا رہا تھا۔ وہ اصطبل کے پاس بھی نہیں رکا۔ راجہ اللہ نواز کی حویلی میں بھی وہ اسی طرح بھاگتا ہوا داخل ہوا اور کھلے ہوئے ہاتھ دھوتے ہوئے راجہ اللہ نواز کے پاس جا کر دھم سے گرا اور دو تین ہچکیاں کھا کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

"کیا ہے؟ ارے کیا ہوا؟" سارا گھرانا اس کے ارد گرد جمع ہو گیا۔

رحمان نے بھینچی ہوئی مٹھی میں سے نوٹ نکالا اور راجہ اللہ نواز کے قدموں میں رکھ کر جیسے کنویں پاتال سے بولا: "جی میں نے آپ کا یہ روپیہ چرا لیا تھا۔"

وہ ایک دم پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ تڑپ کر اٹھا۔ بھاگ کر صحن سے نکلا۔ اصطبل میں جا کر لید کی ڈھیریوں میں لوٹنے لگا اور بلبلا کر کہنے لگا۔ میں پھر چوری نہیں کروں گا۔ میں کبھی چوری نہیں کروں گا اماں!

پھر اچانک اٹھ کر اس نے غصے سے مٹھیاں بھینچ لیں اور پوری قوت سے پکارا: "اماں۔ کہاں ہو اماں!" [illegible]

اے حمید

نیل، پیارے نیل

ابھی میزوں پر موم بتیاں روشن نہیں ہوئیں۔

ابھی بال روم کے روشندانوں پر شام کی سرخی باقی ہے۔ آؤ وہاں بیٹھتے ہیں۔ اُس کونے میں ——— جہاں میز پر کانسی کا پھول دان رکھا ہے اور جس میں صرف یوکلپٹس کی ٹہنیاں ہیں ——— پتلی دبلی کمسن ٹہنیاں، کوئی پھول نہیں، کوئی موتیا اور چنبیلی نہیں۔ آج ہم کچھ جلدی آ گئے ہیں۔ بال روم میں بہت کم لوگ بیٹھے چائے وغیرہ پی رہے ہیں اور ابھی میزوں پر موم بتیاں خاموش ہیں، اور روشنی کے انتظار میں بجھی بجھی سی ہیں۔ ہمیشہ اسی وقت آتا ہوں جب میزوں پر موم بتیوں کے ننھے ننھے شعلے تھرتھرا رہے ہوتے ہیں اور بال روم کے وسط میں، ملائم اور بیضوی فرش پر اینی ونٹرز کا ہسپانوی، ہندی یا ہوائی رقص شروع ہوتا ہے۔ اس وقت لوگوں کے چہرے بے حد چمکیلے اور مدھم دکھائی دیتے ہیں، اور اینی ونٹرز کا نیم عریاں سپید جسم دھیمی دھیمی لائٹ کی سرخی میں فرش پر آتش پارے کی مانند حرکت کر رہا ہوتا ہے۔ ڈانس پر مدھم اور پرسکون اندھیرے میں موسیقی جیسے پہاڑی جھرنوں میں سے اچھل اچھل کر سنگِ مرمر پر گر رہی ہوتی ہے، اور باہر رات سرد ہوتی ہے اور اندر فضا چائے، سگریٹ، شراب اور فرنچ، انگلش، ہندی عطریات کی گرم مہک [illegible] بوجھل ہو رہی ہوتی ہے۔ اور اینی ونٹرز کا ہسپانوی رقص شروع ہوتا ہے۔ اینی انگلش عورت ہے۔ وہ بڑے بھدے انداز میں ہسپانوی رقص کی نقل اتارتی ہے۔ ہسپانوی رقص ——— چٹخارے، بجرے، لہراتے ہوئے گھنگھریالے سیاہ بال، پھولدار ساٹن اور چھڑیوں کی تال پر دھڑکتے، رکتے، گرتے اور سنبھلتے ہوئے سانولے جسم، اندلس کے پھول، سرخ گلاب کے پھول اور الحمرا کی محرابی شہ نشینوں پر جھکی ہوئی انگور کی بیلیں، اور غرناطہ کی وادیوں میں سرِ شام گونجنے والے چرواہوں کے الوداعی گیت ——— کہاں ہسپانوی رقص اور کہاں اینی ونٹرز! کہاں اندلسی سرخ گلاب اور کہاں لندن کی گوبھی! پھر بھی جب اینی ونٹرز ناچتی ہے تو اس کا ادھ کھلا سینہ، عریاں پیٹ، نیم عریاں رانیں، پنڈلیاں، بازو، گال، آنکھیں، بھنویں، تیز اور تیکھی بھنوئیں، جسم کا ایک ایک حصّہ، ایک ایک عضو ناچنے لگتا ہے۔ نظر کٹنے لگتا ہے، اور ہال میں مختلف آوازوں اور تیز سیٹیوں کا شور گونج اٹھتا ہے۔ ایک میز پر وہ تماشبین بیٹھے ہیں جو ہیرا منڈی جانے کی بجائے بال روم میں آ گئے ہیں۔ وہاں سے ایک لمبی فحش ہائے کے بعد آواز آتی ہے

"جیو مس ونٹرز جیو......."

دوسری جانب کوئی ٹیکسالی کتو جانور کی طرح چیخ اٹھتا ہے

"یا ہو......."

اور پھر ایک آواز ——— IF WINTER COMES

پھر دوسری آواز: IF ANNE WINTER COMES. CAN SPRING BE FAR BEHIND?

پھر تیسری آواز ——— NO, NO, NO .....

آؤ اسی جگہ بیٹھ جائیں۔ یہاں نسبتاً خاموشی ہے، اور گلدان میں یوکلپٹس کی نازک ٹہنیاں ہیں، اور ابھی زیادہ لوگ نہیں آئے اور درمیان میں کوئی نئے شعلے بیدار نہیں ہوئے۔ آج میں بہت اداس ہوں، اور چاہتا ہوں یہاں کوئی نہ آئے، کوئی ہسپانوی رقص نہ ہو اور کوئی موم بتی روشنی نہ ہو لیکن یہ چاہنے سے کچھ نہ ہوگا۔ ابھی لوگ آنا شروع ہو جائیں گے۔ ابھی یہاں تل دھرنے کو بھی جگہ نہ ملے گی، اور پھر فضا میں سگرٹوں کا دھواں۔ چکنے اور بدمزہ بوتلوں سے بہائی جانے والی شراب کی بو اور بے ہنگم قہقہوں، بے معنی باتوں اور میز پیٹنے کا شور ہی شور ہوگا اور کچھ نہ ہوگا۔ یہاں جب آدمی شور سے گھبرا جاتا ہے تو پہلے سے زیادہ شور مچاتا ہے۔ اور جب پہلے سے زیادہ شور ہو جائے تو ہال کی بتیاں بجھ جاتی ہیں اور میزوں پر موم بتیاں جلا دی جاتی ہیں، اور ڈانس ہو، عجیب قسم کی سرکسی موسیقی شروع ہو جاتی ہے۔ اور پھر سب اپنی دنیا میں آ جاتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی وہ سب کچھ چلا جاتا ہے جو اس سے پہلے تھا۔ لیکن یوکلپٹس کی ٹہنیاں گلدان میں، اسی طرح جھکی رہتی ہیں۔ اور پھر موم بتی کا شعلہ دھیمے دھیمے جھلملاتا رہتا ہے۔

سرد اندھیرا اور گرم روشنی ——— ملائم اور پرسکون دھیمی روشنی!

یوکلپٹس کی کمسن پتیوں کے پاس موم بتی کو روشن دیکھ کر مجھے یوں لگتا ہے جیسے لبنان کی گرتی برف میں بند کمرے میں آگ کے پاس بیٹھا کسی اداس موسیقار سے بچپن کا کوئی اداس گیت سن رہا ہوں۔ جیسے چین کی پہاڑیوں میں اگی ہوئی سبز چائے پینے کے بعد پائپ میں ایران کا خوشبودار اور تلخ تمباکو بھر رہا ہوں۔

یوکلپٹس اور موم بتی!

نینوا اور اجنتا!

سقراط کے لیکچر اور دلہن کے آنسو!

یوکلپٹس کا درخت سکندر کی فوج کے ساتھ آیا تھا۔ سکندر کے حملے کا ہندوستان کی سرزمین پر اس سے زیادہ اور کیا اثر ہو سکتا تھا۔ کہ اس کے جاتے ہی یہاں یوکلپٹس کے درخت اگنا شروع ہو گئے۔ یہ بڑا خوبصورت درخت ہے۔ اسے دیکھ کر مجھے ہمیشہ جزیرہ سلامیز کی میلے ستاروں والی نیم گرم چمکیلی راتوں میں سرو کے درختوں میں لپٹے چوڑے ملائم ایرانی قالینوں پر رقص کرنے والی یونانی رقاصاؤں کا خیال آ جاتا ہے۔ پچھواڑے کا چاند ابھی سرو کے درختوں میں طلوع نہیں ہوا۔ سمندر کی سست رفتار لہریں ساحلی پتھروں کو پیار سے تھپک کر واپس چلی جاتی ہیں۔ گہرے آسمان پر رات کے جھومر ——— نیلے جھومر خاموشی سے جھلملا رہے ہیں، اور ایک آدمی پتھر پر بیٹھا شبنائی نما لمبی بانسری پر بڑی اداس اور کومل لے الاپ رہا ہے اور نیم عریاں، حسین اور صحت مند سلامینین لڑکیاں سروں پر شاخوں کا چکر رکھے، بالوں میں پھول سجائے قالین پر رقص کر رہی ہیں۔ اور ان کے وسط میں چوڑے چوڑے پتوں پر سرخ، سبز اور نیلے انگوروں کے گچھے رکھے ہیں اور سیب، انار، انجیر اور شراب اور سرو کے درختوں میں نیم سرخ چاند کا ٹمٹماتا ہوا چہرہ نمودار ہو رہا ہے اور بانسری کی لے تیز ہو گئی ہے، اور رقص کے دائرے پھیل گئے ہیں، اور جزیرہ سلامیز کے سمندر پر لہروں کا شور بڑھنے لگا ہے، اور یونانی جنگلوں کی ڈھلوانوں پر تاریک جھنڈوں میں گلاب کے زرد پھولوں نے اپنی پلکیں بند کر لی ہیں اور اب شبنم گرنے لگی ہے۔ ایک پھول سے دوسرے پھول اور دوسرے پھول سے تیسرے پھول پر . . . .

میں سگریٹ سلگاتا ہوں۔ تم یوکلپٹس کی ٹہنیاں میرے اور قریب کر دو۔ تم نے اس درخت کو کبھی بارش کے بعد دیکھا ہے؟ جب اس کی شاخوں پر سے بارش کے رکے ہوئے قطرے ٹپک رہے ہوں اور اس کی پتیاں الائچیوں ایسی ہلکی ہلکی مہک چھوڑ رہی ہوں پھر اس کی گول گول ہموار اور ملائم ٹہنیوں کے بازوؤں کا رنگ ہلکا گندمی ہو تو کبھی گندم کا خیال نہیں آتا جو روز بروز مہنگی ہو رہی ہے۔ بلکہ ذہن میں خسروطوم کی

اور مدہوش کن خوشبوؤں کے دہکتے جسم پھرنے لگتے ہیں۔ اب جب کبھی لاہور میں بارش ہو تم اس کے بعد لارنس میں جاکر یوکلپٹس کے درخت کو غور سے دیکھنا پھر تمہیں احساس ہوگا کہ اگر کوئی یونانی دوشیزہ چلتے چلتے ایک دم ٹھٹک جائے تو وہ یوکلپٹس کا درخت بن جاتی ہے۔ اور اگر یوکلپٹس کے درخت میں جان پڑ جائے تو تم اسے جزیرہ سلامیز کی نیلی راتوں میں ایرانی قالین پر رقص کرتے دیکھو گے۔ اس کے سر پر پتے ہوں گے اور کانٹے بالوں میں پھول اور پاؤں میں مخمل اور سرخ انگور اور سیب اور اسپارٹا کے جنگجو اور ایتھنز کے فلسفی اور کریٹ کے سوداگر۔

تم کیا پیو گے؟ کریم سکواش، اورنج کرش، جنجر بیئر، چائے، گرین لیبل۔ میں تو صرف چائے پیوں گا۔ میں جب اکیلا ہوتا ہوں تو صرف چائے پیتا ہوں، اور آج میں اکیلا ہوں —— بڑا اکیلا ہوں —— تم بلیک ڈوگ —— نہیں؟ ——

اچھا پھر ریڈ لیبل —!

پھر کیا پیو گے؟

چائے؟

تم بھی چائے پیو گے؟ معلوم ہوتا ہے آج تم بھی اکیلے ہو۔

"ویٹر!"

"سر!"

"دو ہیڈ۔"

"دو ہیڈ؟"

"ہاں دو ہیڈ —— چائے، ٹی، پلین ٹی۔"

آج میری جیب میں پیسے کم ہیں۔ صبح چھوٹی بہن کو اسکول کی نئی کاپیاں خریدنے کے لئے پانچ روپے دیئے تھے اور شام کو چھین لئے ہیں۔ اس نے بڑا شور مچایا۔ پھر میں بھی شور مچانے لگا۔ اور روپے چھین کر بھاگ نکلا۔ ہم لوگ انہیں کیا دے سکتے ہیں۔ ان کے لئے کیا کر سکتے ہیں، سوائے اس کے کہ لڑتے جھگڑتے رہیں، اور جب وہ ڈولی میں سوار ہو کر گھر سے رخصت ہونے لگیں تو منہ چھپا کر دو آنسو بہا دیں ——

بیچاری بہنیں —— چھوٹی بہنیں!

کتنے پیچھے ڈالوں؟

لوگ آنا شروع ہو گئے ہیں۔ بال روم بہت جلد بھر جائے گا۔ اور آج اس کی گھٹی گھٹی فضا میں میرا دم گھٹے گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج یہاں کوئی نہ آئے۔ آج یہاں سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نہ ہو۔ آج میں بڑا اکیلا ہوں۔ آج تم بھی اکیلے ہو، اور ہم دونوں سیلون کی چائے پی رہے ہیں۔ تلخ اور کڑوی چائے —— یہ چائے تمہیں سوائے اس ہوٹل کے اور کہیں نہیں ملے گی۔ اس میں جنوبی ہند کی موسلا دھار بارشوں کی نمی اور ساحل بحر پر اُگے ہوئے ناریل کے درختوں کی مہک ہے۔ میں صرف یہ چائے پینے یہاں آتا ہوں، اور ہمیشہ اکیلا آتا ہوں، اس چائے کے ساتھ میری کچھ یادیں وابستہ ہیں۔ کچھ آنسو وابستہ ہیں۔

میں جانتا ہوں تم کچھ چپ چپ ہو۔ اداس اداس ہو۔ اسی لئے میں تمہیں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ جب آدمی چپ چپ رہتا ہے۔ سوگوار رہتا ہے تو وہ صرف اس آدمی کی سنگت میں خوشی حاصل کرتا ہے جو اس سے بھی زیادہ سوگوار ہو۔ اسے یہ جان کر تسکین ہوتی ہے کہ زندگی

صرف اسی کے لئے ایک ویران باغ نہیں بلکہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو ننگے درختوں تلے سوکھے پتوں پر بیٹھے ان رنگین پرندوں کو یاد کر رہے ہیں جو اڑ گئے ہیں۔ ان بہاروں کے انتظار میں ہیں جو منہ موڑ چکی ہیں، کہیں راستہ بھول گئی ہیں۔

تمہارا سگریٹ بجھ گیا ہے۔

اسے دوبارہ سُلگا لو اور میری باتیں اتنی توجہ سے نہ سنو۔ ان پر اتنا دھیان نہ دو کہ تمہارا سگریٹ بجھ جائے اور تمہیں پتہ نہ ہو۔ یہ بڑی معمولی باتیں ہیں۔ اس بال روم میں بیٹھ کر اپنی دنشرز کا رقص دیکھنے سے بھی زیادہ معمولی ——— !

اپنی دنشرز کی وجہ سے اس بال روم میں اب کافی لوگ آنے لگے ہیں۔ تقریباً ہر دوسرا آدمی اس سے عشق کرتا ہے، اور اس کی یاد میں آہیں بھرتا ہے۔ اپنی دنشرز بھی کسی کا دل نہیں توڑتی۔ وہ صرف کمر توڑتی ہے۔ اپنے عاشق کے ساتھ مال اور انار کلی کے دو چکر لگاتی ہے اور کمر توڑ کر واپس آجاتی ہے۔ وہ کسی کا دل توڑنا جانتی ہی نہیں۔ یہ وہ عشق ہے جو ایک کار سے شروع ہو کر دوسری کار میں پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہ کبھی فورڈ ہے، کبھی شیور لیٹ اور کبھی پونٹیاک ——— اس کا ایک ہاتھ کمر کے گرد ہوتا ہے، اور دوسرا جیب ٹٹول رہا ہوتا ہے۔ ہم لوگ اس عشق کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہمارا عشق دھندلی گلیوں کے جھکے جھکے مکانوں میں جنم لے کر کچھ دیر نیم واکھڑکی کے ساتھ لگا دل پر ہاتھ دکھے کھڑا رہتا ہے، اور پھر ڈولی میں بیٹھ کر ہولے ہولے سسکیاں بھرتا رخصت ہو جاتا ہے۔ اس نے کسی کار کا نام نہیں سنا۔ وہ کار کو آتا دیکھ کر جلدی سے فٹ پاتھ پر چڑھ جاتا ہے۔ وہ ڈوبتا سورج ہے، ٹوٹتا نغمہ ہے اور گرتا پتا ہے۔ اور گزرتا بادل ہے ——— اس کا ایک ہاتھ کمر کے گرد ہوتا ہے۔ اور وہ کبھی کمر نہیں توڑتا۔ وہ دل توڑتا ہے، ہمیشہ دل توڑتا ہے۔

ایک سگریٹ مجھے بھی دو نا!

بال روم میں ضرور کوئی ایرن مور پی رہا ہے۔ مجھے اس کی خوشبو آ رہی ہے۔ یہ تمباکو بڑا عمدہ ہے۔ موسم سرما شروع ہو گیا ہے۔ تھوڑے دنوں تک میں پائپ شروع کر دوں گا۔ اس طرح خرچ بھی کم ہوتا ہے اور تسکین بھی بہت ہو جاتی ہے۔ تم پھر کیپسٹن پینے لگے ہو۔ اچھا ہے۔ آدمی کو اپنا برانڈ بدلتے رہنا چاہئے۔ کبھی تھیٹی اور کبھی کیپسٹن ——— کبھی پیٹرو اور کبھی گوالمنڈی۔ تصویر کے دونوں رخ۔ زندگی کے دونوں موڑ!

لیکن آج ایک تیسرا موڑ پیدا ہو رہا ہے۔

یہ موڑ مجھے گوالمنڈی سے اٹھا کر یہاں لایا ہے، اور یہاں سے کھینچ کر کسی اور جگہ لے جانا چاہتا ہے۔ اس موڑ کا رنگ زرد ہے، اور آنکھیں ویران ہیں۔ تم اگر ان آنکھوں میں جھانک کر دیکھو تو تمہیں دور تک سوائے ان پتوں کے اور کچھ نظر نہ آئے گا جو درختوں پر سے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہوں گے۔ یہ پت جھڑ کا موڑ ہے، خزاں کا موڑ ہے۔ یہ مجھ سے لپٹ کر چپ چاپ رو رہا ہے۔ اور مجھے خزاں کے سارے گیت یاد آ رہے ہیں۔ پہلا گیت ناریل کا گیت ہے، ناریل کے پھولوں کا گیت ہے۔ بنگالی گیت ہے۔ اسے میں نے پہلی مرتبہ کلکتے کے ایک بازار میں سنا۔ اس گیت کا نام سدھا ہے۔ سدھا ایک بنگالی لڑکی کا نام ہے۔ یہ بنگالی لڑکی مجھے پہلے روز لیک روڈ پر نظر آئی۔ میں ایک کیبن میں چائے پی کر باہر آیا تھا اور چیت پور روڈ کو جانے والی بس کا انتظار کر رہا تھا کہ سامنے سے دبلے پتلے جسم کی ایک لڑکی سڑک عبور کر کے بس سٹینڈ تک آئی اور بینچ پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کتابیں اور ایک رجسٹر تھا۔ وہ گلابی کنارے والی عام سپید بنگالی ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ گہرے سیاہ چمکیلے بالوں کی مانگ درمیان سے نکلی تھی اور جوڑے میں ناریل کا گجرا سجا رہا تھا۔ گجرے کے پھول مرجھا کر زرد اور مٹیالے ہو رہے تھے۔ ماتھے پر چندن کا پھیکا سا ٹیکا تھا۔ اور وہ کتابیں گود میں رکھے بینچ پر جھکی جھکی، سمٹ کر بیٹھی بڑی اداس دلچسپی سے سڑک پر کاروں کو دیکھ رہی تھی۔ وہ سامنے والے گرلز پرائمری اسکول میں استانی تھی۔

اور اب گھر واپس جا رہی تھی۔ میں بنچ پر نہیں بیٹھا تھا۔ بلکہ ذرا پرے ہٹ کر باغ کے جنگلے کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ دو تین اور آدمی وہاں آکر کھڑے ہو گئے جن میں ایک سیدھی سی عورت بھی تھی جس نے ایک بڑا سا تھیلا اٹھا رکھا تھا۔ بس آگئی۔ ہم سب اس میں سوار ہو گئے۔ بس میں عرف عورتوں کی دو تین سیٹیں خالی تھیں۔ میں نے ایک روڈ سے دھرم تلہ تک کا راستہ کھڑے ہو کر طے کیا۔ وہ لڑکی میرے قریب ہی کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ کتابیں اسی طرح اس کی گود میں تھیں۔ اور وہ مخصوص افسردہ سے انداز میں سڑک پر پیچھے کی سمت بھاگتی ہوئی دکانوں، کاروں اور بجلی کے کھمبوں کو تک رہی تھی۔ اس کی گردن پر نرم نرم روئیں دار سنہری بال تھے۔ اور وہ سبز رنگین شانوں کی طرف نکل گئی تھیں۔ وہ دھرم تلہ پہنچ کر اتر گئی۔ اس دوران میں اس نے دو ایک بار ساڑھی کا پلو ٹھیک کیا اور پنسل سے اپنے بال کھجائے۔

دوسرے دن ٹھیک اسی وقت میں پھر ایک روڈ کے بس سٹینڈ پر پہنچ گیا۔ نہ جانے کیوں میں اس بنگالی لڑکی کو ایک بار پھر دیکھنا چاہتا تھا اور ایک بار اس کے ساتھ بس میں سوار ہو کر دھرم تلہ تک سفر کرنا چاہتا تھا۔ خاص وقت پر وہ کل کی طرح سڑک عبور کر کے بس سٹینڈ پر آئی اور بنچ پر بیٹھ گئی۔ میں پہلے روز کی طرح جنگلے کے ساتھ لگ گیا تھا۔ وہ کل کی طرح سپید ساڑھی اور چپل پہنے تھی۔ اور جوڑے کا گجرا کچھ اور مرجھا گیا تھا۔ اور چندن کا ٹیکا پھیکا پڑ گیا تھا۔ میں روز سہ پہر کو اس بس سٹینڈ پر جاتا اور جنگلے پر جھکا اس بنگالی لڑکی کا انتظار کرتا۔ وہ ٹھیک وقت پر سڑک عبور کرتی ہوئی بنچ پر آکر بیٹھ جاتی، اور چپ چاپ افسردہ نگاہوں سے کاروں کو گزرتے دیکھتی رہتی۔ پھر بس آجاتی، اور ہم دونوں دھرم تلے تک آتے۔ وہاں وہ ساڑھی اور کتابوں کو سنبھالتی سمٹی سمٹائی نیچے اتر جاتی اور میں پھر دوسرے دن کا انتظار کرنے لگتا۔ ایک دن بس سٹینڈ پر وہ اپنی کسی سہیلی کے ساتھ آئی جس نے اسے باتوں ہی باتوں میں مدھا کے نام سے پکارا۔ ایک ماہ گزر گیا۔ اس دوران میں نہ اس نے مجھے آنکھ بھر کے دیکھا اور نہ مجھ میں ہی اتنا حوصلہ ہوا کہ اس سے کوئی بات کروں۔ اور پھر میں اس سے کوئی بات نہ کرنا چاہتا تھا۔ دل کے غمگین پھولوں سے کوئی کیا بات کرے گا۔

کئی بار جب وہ بس سے اترنے لگی تو میں بھی اس کے ساتھ ہی اتر پڑا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ بازاروں اور گلیوں میں سے ہوتا ہوا اس کے گھر تک گیا۔ میں نے دیکھا کہ اس کے اک منزلہ کوارٹر نما مکان کے باہر کیلے اور شریفے کا درخت ہے۔ وہ دروازہ کھول کر اندر جانے لگی ہے کہ ایک گیند اس کے پاس آکر اچھل پڑی ہے۔ اس نے گیند پکڑ لی ہے۔ اور کوارٹر کے سامنے والے پارک میں اس کا چھوٹا بھائی بنیان اور نیکر پہنے کھڑا اسے پکارنے لگا ہے۔

"دیدی! دیدی! میری گیند ہے۔ پھینک دو، زور سے"۔

مدھا نے بنا وٹی غصے میں اسے ڈانٹا ہے۔

"آج کہتی ہوں ماسٹر جی سے کہ یہ سارا دن کھیلتا رہتا ہے اور ذرا کام نہیں کرتا ـــــ اسکول کا کام کیا ہے؟"

"کر لیا ہے دیدی! ـــــ اب پھینک دو نا گیند!"

اور اس نے گیند پھینک دی ہے۔ اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی ہے۔ مگر پہنچ کر اس نے ساڑھی اتار کر میلی سی دھوتی پہن لی ہے اور اپنی ماں کے ساتھ کھانے پکانے اور گھر کے دوسرے کاموں میں مصروف ہو گئی ہے۔ شام کو اس کا بھائی دفتر سے آگیا ہے۔ پھر اس کا باپ بھی آگیا ہے۔ وہ ایک کمرے میں بیٹھے ہیں۔ مدھا کا بھائی چائے بنا رہا ہے۔ اور وہ خود دوسرے روز کے لئے سٹڈی کر رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی باورچی خانے میں دبی زبان میں اپنی ماں سے لڑائی کر رہا ہے۔ اس کا ادھیڑ عمر کا باپ صوفے پر بیٹھا ہارمونیم کھولے اس کے سُر ٹھیک کر رہا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد وہ میز پر رکھی ہوئی چائے کی پیالی میں سے ایک آدھ گھونٹ پی لیتا ہے۔ راکھ دان میں اس کا

سگار سُلگ رہا ہے۔ ہارمونیم ٹھیک کر کے وہ اسے کچھ دیر بجا کر ٹسٹ کرتا ہے اور سدھا کی طرف بڑھا دیتا ہے۔

"لو بھئی اب اسے سنبھالو!"

سدھا سنڈھی کے بعد ہارمونیم کو کھڑکی کے پاس بچھے ہوئے پلنگ پر بیٹھ جاتی ہے، اور ہارمونیم کے بلیو اور دھیمے سروں پر دھیرے دھیرے ایک پرانا گیت گانے لگتی ہے ——— یہ گیت بنگال کے ایک پرانے ——— بہت پرانے عوامی شاعر کا ہے، اور اس میں سدھا کے جوڑے میں سجے ہوئے روپل کے افسردہ پھول ہیں، اور اس کی سدا خاموش رہنے والی آنکھوں کی اداسی ہے۔ کھلی کھڑکی کے باہر آسمان پر شام کا اندھیرا پھیل رہا ہے، اور کیلے کی ٹہنیاں اپنے چوڑے پتے جھکائے خاموش ہیں۔ کمرے میں کمزور بتی کی پھیکی پھیکی روشنی ہے۔ سدھا کا بھائی کتاب سامنے رکھے کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کا باپ شال کندھوں پر رکھے صوفے پر نیم دراز اخبار پڑھ رہا ہے۔ چائے کی خالی پیالی میز پر ہے۔ اس کی انگلیوں میں سگار سُلگ رہا ہے۔ باورچی خانے کی طرف سے اب کوئی آواز نہیں آرہی۔ کارنس پر پیتل کے گلدان میں جاپوتی کے پھول ہیں اور کانسی کے تھال میں بجھی ہوئی سامگری اور اگربتیاں ہیں اور مرجھائی ہوئی دو تین کلیاں، اور سدھا نرم، دھیمی اور تھکی تھکی آواز میں گا رہی ہے۔

"ابھی میرے آنگن میں چاند نہیں نکلا،
اور وہ دیوداسی جو ناریل کے درختوں میں سے گزر کر سمندر کی طرف جا رہی ہے، اسے کچھ نہ کہو۔
اسے اپنے راستے پر تنہا جانے دو،
وہ ان موتیوں کی تلاش میں ہے جو کھو گئے
وہ ان کشتیوں کی تلاش میں ہے جو ڈوب گئیں،
ابھی میرے آنگن میں چاند نہیں نکلا،
چاند نہیں نکلا ———"

پھر صبح ہو گئی ہے۔ گھر میں ہر شخص کام پر جانے کی تیاریوں میں ہے۔ سدھا غسل خانے سے باہر نکل کر آنگن میں کھڑی بال سکھا رہی ہے۔ اس کے بالوں سے ناریل کی مہک اٹھ رہی ہے، اور وہ گیلے ہیں اور ان سے پانی کے قطرے ٹپک ٹپک کر اس کے شانوں پر گر رہے ہیں۔ اس کی باریک ململ کی ساڑھی گیلے بدن سے کہیں کہیں چپک رہی ہے، اور لکڑی کے تخت پر موتیے کے پھول بکھرے پڑے ہیں۔ گیلا بدن، دھلے ہوئے بال اور بھیگی ساری اور لمبے سیاہ بالوں میں سے ٹپکتے ہوئے پانی کے قطرے اور کیلے کے پتے، ناریل کی مہک اور موتیے کے پھول اور روپل کے گجرے اور سدھا ——— اور لیک روڈ کی سنگین سڑک، پرائمری سکول اور بس سٹینڈ! زندگی کتنی آسان ہے! زندگی کتنی مشکل ہے!

ابھی میرے آنگن میں چاند نہیں نکلا۔
چاند نہیں نکلا ——— !

لیکن میں کبھی سدھا کے گھر نہ گیا تھا۔ میں کبھی دھرم تلہ بس اسٹینڈ پر نہ اُترا تھا۔ پھر بھی میں اسے جانتا تھا۔ اس کے باپ، ماں بھائی اور بہنوں کو جانتا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا۔ میں نے کبھی اس سے بات نہ کی تھی۔ اور میں اس سے کبھی کوئی بات نہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے

کبھی اس سے بات نہیں کی۔ میں انہیں صرف دیکھتا ہوں اور دیکھتا رہتا ہوں۔ میں نے پہلی مرتبہ سدھا کو بس سٹینڈ پر دیکھا تھا، اور آخری مرتبہ بھی اسی بس سٹینڈ پر دیکھا۔ ہم دونوں ایک روڈ سے سوار ہو کر دھرم تلہ سکوائر تک آتے۔ وہ حسب معمول کتابیں اٹھائے، ساڑھی سنبھالتی، مسکراتی ہوئی بس سے اترتی اور میں اسی شام فرنٹیئر میل میں سوار ہو کر لاہور آگیا اور اس بات کو سات سال بیت گئے ہیں۔ میں پھر کلکتے نہیں جا سکا۔ میں پھر دھرم تلہ نہیں جا سکا۔ میں پھر سدھا کو نہیں دیکھ سکا اور شاید اب کبھی نہ دیکھ سکوں۔ کیا خبر وہ آج بھی اسی طرح سڑک عبور کر کے بس سٹینڈ تک آتی ہو، کتابیں گود میں رکھ کر بنچ پر بیٹھ جاتی ہو، دبے دبے چپ چاپ، افسردہ انداز میں سڑک پر سے گزرنے والی کاروں کو دیکھتی رہتی ہو۔ اور کیا خبر اس کا بیاہ ہو گیا ہو اور اس کی مانگ میں سیندور دمکتا ہو اور وہ اپنے گھر میں بچوں سے کھیل رہی ہو، اور کبھی کبھی اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ ایک روز اسی بس سٹینڈ پر سے گزرتی ہو اور سوچتی ہو کبھی وہ جوڑے میں روپل کے پھول سجائے یہاں بنچ پر بیٹھی بس کا انتظار کیا کرتی تھی۔ شاید وہ اس لڑکے کو بھول گئی ہو جو بنچ کے پاس ہی جنگلے پر جھکا اس کے ساتھ بس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس کا انتظار کیا کرتا تھا۔ اور ہو سکتا ہے فسادات نے اسے قتل کیا ہو۔ وہ ایک دن بنچ پر بیٹھی گھر جانے والی بس کا انتظار کر رہی ہو اور اس کی گود میں کتابیں ہوں اور وہ افسردگی سے سڑک پر دیکھ رہی ہو کہ اچانک کسی نے اس کی پشت میں خنجر بھونک دیا ہو اور اس کے جوڑے میں لگے ہوئے روپل کے پھول زمین پر گر پڑے ہوں اور کارنس پر رکھا ہوا گلدان لاجونتی کی کلیوں سمیت فرش پر اوندھے منہ آن پڑا ہو۔ پھر سارے گیتوں نے دم توڑ دیا ہو سارے پھول مرجھا گئے ہوں، اور سارے چاند ڈوب گئے ہوں۔ بس سٹینڈ ایک دم ویران ہو گیا ہو اور بنچ پر سرخ خون بہہ نکلا ہو۔ اور سدھا کے گھر جانے والی بس اسے وہیں چھوڑ کر وہاں سے بھاگ نکلی ہو۔ اور سدھا کے گھر میں کھلی کھڑکی کے باہر شام کا اندھیرا بڑھنے لگا ہو۔ اور اس کا باپ بے چینی سے کمرے کے چکر کاٹ رہا ہو۔

"سدھا ابھی تک نہیں آئی؟"

"سدھا ابھی تک کیوں نہیں آئی؟"

سدھا کے فکر مند باپ! اب سدھا کبھی نہیں آئے گی۔ سدھا ناریل کے درختوں میں سے گزر کر تاریک سمندروں کی طرف نکل گئی ہے۔ وہ ان کشتیوں کی تلاش میں چلی گئی ہے جو ایک عرصہ ہوا ڈوب چکی ہیں۔ سدھا کی غمگین بہنو! اپنے جھکے ہوئے سر اوپر اٹھاؤ اور روتی ہوئی آنکھوں پر کیلے کے پتے اور موتیے کے زرد پھول رکھ کر سو جاؤ، اور سدھا کے ہارمونیم کو پوتر جمنا کی لہروں کے سپرد کر دو۔ اور اسے بھول جاؤ اور سدھا کے چھوٹے بھائی سے کہو وہ پارک میں گیند کھیلتے ہوئے اپنی دیدی کو یاد کر کے آنسو نہ بہائے۔ اسے کہو جب گیند اچھل کر دروازے کی طرف جائے تو وہ کسی کو آواز دے کر نہ کہے

"دیدی او دیدی! گیند میری ہے۔ پھینک دو۔ اب پھینک دو نا!"

اب کوئی جھوٹ موٹ غصے میں آ کر اسے نہیں ڈانٹے گا، اور اس کی طرف گیند نہیں پھینکے گا۔

اے ویران گھر کے سوگوار باسیو! اب کبھی تمہارے آنگن میں چاند نہیں نکلے گا۔ اب کبھی تمہارے درختوں پر کیلے کے قرمزی پھول نہیں لگیں گے۔ سدھا کے سارے گیت مجھے دے دو، سدھا کے سارے پھول میری جھولی میں ڈال دو۔ اور وہ دیوداسی جو ناریل کے درختوں میں سے گزر کر تاریک سمندر کی طرف جا رہی ہے۔ اسے کچھ نہ کہو۔ اسے اپنے راستے پر تنہا جانے دو۔ وہ ان موتیوں.......

× × × × × × × ×

ابھی میزوں پر موم بتیاں روشن نہیں ہوئیں۔

ابھی اپنی دختر بھی نہیں آئی۔ چائے اور مشروبات؟ سیلون کی چائے، کولمبو کی چائے! مگر اب چائے کا وہ لطف نہ آئے گا۔ اب بال روم کھچا کھچ بھر گیا ہے۔ اور فضا میں قہقہوں کا شور اور تمباکو اور شراب کی بو رچ گئی ہے۔ یہاں ہر قسم کے لوگ جمع ہیں۔ یہاں ہر قسم کی باتیں ہو رہی ہیں۔ ان میں اخباروں کے ایڈیٹر ہیں، اخباروں کے مالک ہیں۔ کارخانوں کے حصے دار ہیں، حصے داروں کے دوست ہیں اور دوستوں کے حصے دار ہیں۔ گزری ہوئی کل کے وزیر ہیں، اور آنے والی کل کے سیاست دان ہیں، لیڈر ہیں۔ کاغذ، سوڈا، چینی اور تمباکو کی بلیک مارکیٹ کرنے والے ہیں۔ ان فلموں کے ہیرو ہیں جو کبھی نہیں بنیں گی۔ ان ناولوں کے مصنف ہیں جو کبھی نہیں لکھے جائیں گے۔ اور ان تصویروں کے پینٹر ہیں جو انہوں نے خود نہیں بنائیں۔ یہاں وہ لوگ بھی ہیں جو اپنی کاروں کو دوسروں کی ملکیت سمجھتے ہیں، اور وہ لوگ بھی ہیں جو دوسروں کی کاروں کو اپنا سمجھتے ہیں۔ سنو اس میز پہ کیا باتیں ہو رہی ہیں ——

" ہائے قسم خدا کی ساری رات کار میں لئے گھومتے رہے۔ کیا مجال جو چٹکی نے ات بھی کی ہو۔ نہر کنارے گاڑی کھڑی کر کے پیو بیئر پینا شروع کر دی۔ بس خواجو تمہیں کیا بتاؤں۔ کیا آنکھ تھی! کیا پنڈلی تھی! کیا بات تھی! واہ واہ! —— یا ہو ——

"بیرا! بیرا! پان لانا —— سب کے لئے

"بس یار خدا سے دعا کرو کہ اب کے روئی کی فصل اچھی ہو جائے اور چار پیسے بچ جائیں۔ اب کے میں نے سوچ رکھا ہے کہ اسے پندرہ دن اپنے ہاں رکھنا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا عورت ہے ظالم،

....

" میں جمیکا چلے جانا چاہتا ہوں۔ میرا پاکستان میں کوئی کام نہیں۔ جمیکا —— جہاں سرخ کیلے اور انناس اور رم ہوتی ہے۔ پاکستان میں یہ میرا آخری سال ہے۔ اگلے سال میں یہاں سے ضرور چلا جاؤں گا،

" چلو امریکہ چلیں "

" پہلے امریکہ ہی جائیں گے "

" مگر وہاں رہیں گے کہاں؟"

" اس کا انتظام میں کر لوں گا۔ آدمی چالاک ہونا چاہئے۔ وہ ہر جگہ رہ سکتا ہے "

" اور اگر امریکہ نہ جا سکے تو؟"

" تو پھر میرے پاس ایک اور پروگرام ہے،

" وہ کیا؟"

" ذرا قریب آ جاؤ۔ سنو! میرا ایک دوست افریقہ سے آیا ہے وہ کہتا ہے وہاں پنجابی عورت کی بہت مانگ ہے۔ بس ہم افریقہ چلے جائیں گے !

" کیا مطلب؟"

" مطلب یہ کہ یہاں سے دو تین لڑکیاں لے جائیں گے "

"دو دیکھے ؟
"اس کا بندوبست میں کر لوں گا۔ ہم یہاں ان سے شادیاں کر لیں گے۔ پھر ہمیں کوئی نہ روک سکے گا۔

....

ایک لمبی ناک والی بدصورت پنجابی عورت خطرناک میک اپ کئے تیکھی نظروں سے اپنے ڈارلنگ کو دیکھ رہی ہے اور کریم چاٹ کھا رہی ہے۔

"ڈارلنگ، یہاں تو دم گھٹ رہا ہے۔ آج پورٹ وائین کا مزہ کیسا تھا ؟
"کیسا تھا ہنی ؟
"بس ایسا ہی تھا۔ جیسے ..... جیسے ..... ہائے کیا کہوں ؟
"مت کہو ہنی! میں سمجھ گیا ہوں"

....

"اس اخبار نے جو اداریہ لکھا ہے اس میں گیارہویں سطر میں وہ اپنی ایک پرانی بات کی تردید کر گیا ہے، اور پرسوں جو میں نے اداریہ لکھا تھا..... "

"وہ فراڈ تھا، سب فراڈ تھا۔ تمہاری باتوں کی طرح فراڈ تھا"
"بکو مت !"

"ضرور بکوں گا میں تمہارے سامنے کھڑا ہو کر لوگوں کو چیخ چیخ کر کہوں گا کہ تم فراڈ ہو، سر سے لے کر پاؤں تک، اور پاؤں سے لے کر پھر سر تک فراڈ ہو۔ بہت بڑے فراڈ ہو۔ بلیک میلر ہو۔ تم سہمی ہوئی خوفزدہ عزتوں کے سودے کرتے ہو تم عقاب کے پر لگا کر مردہ شکار پر جھپٹتے ہو، اور تم اپنے پنجوں پر جما ہوا خون نہ چھپا سکو گے۔ تم بے ثمر تاروں پہ کتے کی آواز میں کوئل کے گیت گا رہے ہو۔ اور تم عین محفل میں پکڑے جاؤ گے تمہاری بوڑھی رگوں میں جھاگ دار زہریلا خون گردش کر رہا ہے۔ اور تم بہت جلد اپنے خون کے زہر سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ اور جب تم مر جاؤ گے تو تمہارے کتبے پر لکھا جائے گا ——

"یہاں بنگال کا صادق، دکن کا جعفر اور میر کا چچا کیسہ دفن ہے"
اگر میں دوزخ میں گیا تو اس کے دروازے پر بیٹھ کر تمہارا ضرور انتظار کروں گا !"
"یہ جھوٹ ہے، بکواس ہے"

"دنیا میں صرف ایک بات سچی ہے۔ اور وہ یہ کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ سب بکواس ہے، سب فراڈ ہے۔ تم بھی فراڈ ہو، اور وہ بھی جو جیکا جانا چاہتا ہے، اور وہ بھی جو افریقہ جانا چاہتا ہے اور وہ بھی جو ساری رات لڑکی کو لے کر گاڑی میں گھومنا چاہتا ہے۔ تم سب فراڈ ہو، اور تم سے بڑا فراڈ یہ بال روم ہے۔ جہاں تم بیٹھتے ہو، جہاں تم پروگرام بناتے ہو۔ کبھی افریقہ جانے کے اور کبھی امریکہ جانے کے،

....

"ویٹر! ویٹر !"

"یس سر"

"تم گدھے ہو"

"یس سر"

"ہم سب گدھے ہیں"

"یس سر"

"ایک گدھا لاؤ۔ جالدی ——— ایک دم جالدی"

....

میں دوسرے تیسرے اس ہوٹل میں آتا ہوں اور بال روم میں آکر بیٹھتا ہوں۔ اور ان لوگوں کی کھوکھلی باتوں کی آوازیں اور کھوکھلے جسموں کی مصنوعی جھنکاریں سنتا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ مجھے اس ہوٹل میں سیلون کی چائے کھینچ لاتی ہے۔ پھر بھی میں نے ان لوگوں کی باتوں کا کبھی بُرا نہیں مانا۔ میں ان سے بہت کم بور ہوتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں زیادہ قصور ان لوگوں کا نہیں بلکہ اس ماحول کا ہے جہاں ان کی تربیت ہوئی ہے۔ لیکن آج میں ان کی آوازیں، ان کا شور، ان کے بے ہنگم قہقہے برداشت نہیں کر سکتا۔ آج میرا یہاں دم گھٹ رہا ہے۔ آج اس بال روم کی دیواریں، اس کی چھت، چھتوں سے لٹکے ہوئے فانوس اور میزیں، کرسیاں اور ان پر بیٹھے ہوئے بھدے، بدوضع، بے ڈھنگے لوگ مجھے بڑے اجنبی لگ رہے ہیں۔ آج میں اکیلا ہوں، میں روز اکیلا ہوتا ہوں۔ مگر آج یہ اکیلا پن مجھے محسوس ہو رہا ہے۔ میری احاسی بال روم کا شور نہیں ——— خزاں نصیب درختوں کی خاموشی چاہتی ہے۔

آؤ یہاں سے اٹھ چلیں۔

تم سگریٹ جیب میں ڈالو اور میں یوکلپٹس کی ٹہنیوں کو چوم کر ان سے رخصت طلب کرتا ہوں۔ چلو لارنس چلیں۔ لمبے لمبے سرسبز پارکوں اور گنجان درختوں کے ملک میں چلیں۔ اپنے ملک میں چلیں۔

× × × × × ×

ما ——— یہاں کتنی ٹھنڈک اور خاموشی ہے!

باغ میں اوس گرنا شروع ہوگئی ہے۔ اکتوبر کے مہینے میں لارنس کی راتیں ——— سوئٹزرلینڈ کے جنگلوں سے کم نہیں ہوتیں۔ رات کتنی شگفتہ اور چمکیلی ہے۔ نیلے آسمان پر لاکھوں چھوٹے بڑے ستارے چمک رہے ہیں، اور یہ کتنی اچھی بات ہے کہ آج اوپن ائیر ٹی ہاؤس بھی خالی ہے۔ آؤ وہاں بیٹھ کر چائے پئیں۔ وہاں ——— ایلچی کے درخت تلے۔

یہاں تمہیں چائے اچھی نہیں ملے گی لیکن چائے پینے کا صحیح ماحول ملے گا۔ بال روم میں چائے اچھی ملتی ہے۔ لیکن ماحول نہیں ملتا۔ یہاں کہیں بھی کوئی چیز اپنی صحیح جگہ پر مکمل حالت میں نہیں ہے۔ بس ٹکڑے ہی ٹکڑے ہیں جو ادھر سے ادھر چکر لگا رہے ہیں۔

دیکھو! خشک پتوں پر بڑی آہستگی سے قدم رکھو۔ ان پر بہار کے نوحے لکھے ہیں۔ یہ بڑی مقدس سرزمین ہے۔ یہ میری امیدوں کا یروشلم ہے۔ یہاں بڑی محبت سے، بڑی نرمی سے بڑے پیار سے قدم اٹھاؤ۔ یہاں ہر دوسرے قدم پر میری زندگی کے بوڑھا اور زخمی تال دفن ہیں۔ یہاں یوں چلو گویا تمہارے پاؤں ان گرے پڑے پتوں کو چوم رہے ہیں۔ ہم ان لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں، جو فائدہ اور نقصان کی

اصطلاحوں میں سوچتے ہیں۔ شاید اس دور کی سب سے بڑی ٹریجڈی یہی ہے کہ یہ فائدہ اور نقصان کا دور ہے۔ اس دور میں ہر آدمی اپنے فائدے اور دوسرے کے نقصان کی سوچتا ہے۔ لیکن ہم ان لوگوں سے بہت دور نکل آئے ہیں اور اس شہر میں آ گئے ہیں۔ جہاں نئ اپنی ونٹر کا بے حیا رقص ہے اور نیم امریکی جنیاں سے کھو کھلے قہقہے! یہاں کتنی مہربان خنکی ہے ــــــ بدن کو گرم کر دینے والی خنکی!

سامنے درختوں کے درمیان سے گزر کر جو ہوا آ رہی ہے اس میں مولسری کی مہک ہے۔

بس ہمیں یہیں بیٹھ جانا چاہئے۔ اسی جگہ ــــــ جہاں موتئے کا جھاڑ ہے۔ اندھیرے میں تمہیں موتئے کی ادھ کھلی سپید کلیاں نہیں دکھائی دیں گی۔ وہ پتوں کے آنچل میں چھپی ہوئی ہیں لیکن تم ان کی دھیمی دھیمی ٹھنڈی خوشبو ضرور محسوس کرو گے۔

موتئے کے پھول مجھے بڑے پسند ہیں۔ شاید اس لئے کہ سدھا اسے اپنے بالوں میں روپل کے گجروں کے ساتھ لگایا کرتی تھی اور اس دن جب وہ غسل خانے سے نہا کر باہر آنگن میں کھڑی بال سکھا رہی تھی۔ اور اس کی باریک ساڑھی اس کے سانولے بدن سے کہیں کہیں چپک رہی تھی تو سامنے کیاری کے تحت انہی پھولوں کی سفید کلیاں بکھری پڑی تھیں۔ ٹھہرو ــــــ بیرے کو آرڈر دے لیں۔

"چائے"

"اور کچھ"

"اور کچھ نہیں ــــــ چائے لاؤ۔ سیلون کی چائے، کولمبو کی چائے"

"جی؟"

"صرف چائے لاؤ"

"جب تک چائے نہیں آتی میں تمہیں پت جھڑ کا ایک اور گیت سناتا ہوں۔

یہ گیت دریائے نیل کے ملاحوں کا ہے:۔

"ــــــ نیل! پیارے نیل!!

تو نے قلوپطرہ کو دیکھا ہے! جس کے سر پر ہیروں کا تاج تھا۔

اور ان غلاموں کو بھی ــــــ جن کے جسموں سے پسینہ بہہ رہا تھا۔

نیل! پیارے نیل!

تیرے آسمان پر تارے سدا چمکتے رہیں،

تیرے کھجور کے درخت کبھی نہ سوکھیں،

ہماری کھیتیوں کو بھی ہرا بھرا کر دے،

نیل! پیارے نیل! ــــــ

یہ گیت مجھے اسی باغ میں اسی جگہ، اسی کے درخت تلے بیٹھے نادمی نے سنایا تھا۔ نادمی ایک لڑکی تھی بھورے بالوں اور چھوٹے قد کی مصری یہودی لڑکی۔ جس کا باپ قاہرہ کی یونیورسٹی میں پولیٹیکل سائنس کا پروفیسر تھا۔ اور جو دلی کی ایشیائی کانفرنس میں حصہ لینے کے لئے ہندوستان آیا تھا۔ اور واپس جاتے ہوئے پندرہ دنوں کے لئے لاہور ٹھہرا تھا۔ نادمی سے میری ملاقات یونیورسٹی لائبریری میں ہوئی۔ میں

کیٹالاگ ریکس کے سامنے کھڑا "S" کے خانے میں ایک آئرش مصنف کی کتاب کا نمبر ڈھونڈھ رہا تھا کہ ایک دبلی اور مختصر سی لڑکی میرے قریب آکر کھڑی ہوگئی اور "T" کا خانہ کھول کر کارڈ تلاش کرنے لگی۔ میں نے کوئی خیال نہ کیا۔ کیونکہ یونیورسٹی لائبریری میں کسی لڑکی کا کیٹالاگ ریکس کے پاس آکر کھڑا ہوجانا کوئی انوکھی بات نہیں۔ لیکن جب وہ لڑکی کافی دیر وہاں کھڑی خانے کھولتی، بند کرتی رہی، اور مجھے بھی کتاب کا نمبر نہ مل سکا۔ تو میں نے ذرا گردن گھماکر اسے دیکھا۔ اس کے بال سنہرے تھے۔ اور برش پھیر کر بنائے ہوئے تھے اور اس کے شانوں پر آبشار کی مانند گر رہے تھے۔ میں نے یونہی کہہ دیا

"کیا میں کچھ مدد کرسکتا ہوں؟"

لڑکی پہلے تو کچھ جھینپی لیکن فوراً سنبھل گئی۔ اور پھر ہم دونوں نے مل کر اس کا پسندیدہ مصنف ڈھونڈھ لیا۔ جب وہ کتاب کا نمبر نوٹ کر کے شکریہ ادا کرنے لگی تو میں نے کہا

"اب میں تمہاری مدد چاہتا ہوں"

وہ کچھ شرما سی گئی اور ذرا تعجب سے تکنے لگی

"کیسی مدد؟"

"مجھے میرا پسندیدہ مصنف نہیں مل رہا"

وہ ہنس پڑی اور میں نے دیکھا کہ اس کے دانت مونگ پھلی کے نیم سپید لمبوترے دانوں کی طرح تھے اور اس کی آنکھیں اس کے بالوں کی طرح بھوری بھوری تھیں۔ وہ میرے ساتھ مل کر کارڈ تلاش کرنے لگی۔ جب کارڈ مل گیا تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ اور ہم وہاں سے کاؤنٹر پر آکر اپنی اپنی کتابوں میں مصروف ہوگئے۔

اب ایک بڑے خوبصورت اتفاق سے جب میں لائبریری روم سے باہر نکلنے لگا تو پھر اس لڑکی سے ملاقات ہوگئی۔ عین اسی وقت وہ بھی دروازے میں سے گزر رہی تھی۔ ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے اور اکٹھے برآمدے میں سے گزر کر پلاٹ کے ساتھ ساتھ جانے والی روش پر چلنے لگے۔ گیٹ تک آتے آتے میں نے اس سے بمشکل ایک آدھ بات کی اور گیٹ سے باہر نکلتے ہوئے بغیر کچھ سوچے سمجھے چائے کی دعوت دے دی۔

"او ــــ شکریہ! میں چائے کی عادی نہیں ہوں"

"کوئی حرج نہیں۔ اس کیفے میں خالص انڈین چائے ملتی ہے"

وہ انکار نہ کرسکی، اور ہم یونیورسٹی کیفے میں آکر بیٹھ گئے۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ حیفہ میں پیدا ہوئی تھی، اور پھر اپنے باپ کے ساتھ قاہرہ آگئی تھی۔ جہاں اس کا باپ یونیورسٹی میں پروفیسر ہے اور اس کا بچپن قاہرہ میں گزرا ہے۔ اور وہ انگریزی اور فرنچ کے علاوہ عربی زبان بھی جانتی ہے اور اس کا نام ناؤمی ہے ــــ ناؤمی ــــ جو آج سے دو ہزار سال پہلے ایک فلسطینی شہزادی کا نام تھا۔

ناؤمی کا رنگ زردی مائل سپید تھا اور وہ بچوں کی طرح پیالی پکڑے مزے سے لے کر چائے پی رہی تھی۔

"یہ چائے اچھی ہے"

"یہی تو میں کہتا تھا۔ یہ چائے دارجیلنگ کی ڈھلانوں پر اگتی ہے۔"

"ناڈی! تم نے دارجلنگ دیکھا ہے؟"

"نہیں ——— میں تو پہلی بار یہاں آئی ہوں!"

"دارجلنگ بڑی خوبصورت جگہ ہے۔ وہاں کے جنگل، ان جنگلوں کی سنسان تاریکی اور بانس کے درختوں میں سے گزرنے والی پہاڑی سڑکیں، سرخ سڑکیں اور پرندوں کا شور اور......."

"تم نے دارجلنگ دیکھا ہے؟"

"نہیں!"

اور وہ بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنس پڑی، اور چائے اس کے حلق میں اٹک گئی اور اسے اچھو سا آگیا۔ میں نے جلدی سے رومال رومال دیا اور وہ اس میں منہ چھپا کر ہنستے ہنستے کھانسنے لگی۔ اور جب اس نے بالوں کو جھٹکتے ہوئے سر اوپر اٹھایا تو اس کی بھوری آنکھوں میں پانی آگیا تھا اور وہ اب بھی ہنس رہی تھی۔

"ہنسنے کی بات کیا تھی؟"

اس نے رومال سے منہ صاف کیا، اور سنبھل کر بیٹھتے ہوئے بولی ———

"میرا خیال تھا تم دارجلنگ کافی دیر رہے ہوگے!"

"اس میں کیا ہے۔ میں قاہرہ کبھی نہیں گیا، لیکن اس کے متعلق کئی مضمون لکھ سکتا ہوں۔"

وہ پھر ہنسنے لگی، اور پھر میں بھی ہنس پڑا، اور ہم کیفے سے باہر نکل آئے۔

دوسرے دن ہم پھر یونیورسٹی کیفے میں ملے، اور شام کو وہ مجھے اپنے باپ سے ملانے لے گئی۔ اس کا باپ کلب روڈ پر اپنے کسی دوست کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔ اس کا قد چھوٹا، شانے چوڑے اور بھوری آنکھیں ہر چیز کی گہرائی میں اتر جانے والی تھیں۔ گول سر درمیان سے گنجا تھا۔ اور کناروں پر کہیں کہیں سپید بال چمک رہے تھے۔ وہ کوٹھی کے باغ میں لمبے لمبے چیڑھ کے درختوں کے درمیان آرام کرسی پر بیٹھا اخبارات کا مطالعہ کر رہا تھا۔

وہ مجھ سے بڑی محبت سے ملا۔ اور جب اسے پتہ چلا کہ میں ناڈی کا دوست ہوں اور یونیورسٹی کا طالب علم ہوں تو اس نے اخبار میز پر رکھ دیا اور عینک مخملی ڈبیا میں بند کر کے مجھ سے یونیورسٹی کے طریقۂ تعلیم پر باتیں کرنے لگا۔ ناڈی بھی میرے پاس ہی کرسی پر بیٹھی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہاں قہوہ آگیا۔

"شاید تمہیں یہ قہوہ پسند نہ آئے۔ لیکن یہ خاص مصری قہوہ ہے!"

وہ خاص مصری قہوہ مجھے بالکل پسند نہ آیا۔ اس میں کچھ ایسی بو تھی جس کے متعلق مجھے یقین ہے کہ وہ لاشوں کو حنوط کرنے والے مسالے کی بو تھی۔

ناڈی اور میں دن میں دو بار ضرور ملتے۔ صبح دس بجے ہماری ملاقات لائبریری میں ہوتی، جہاں سے نکل کر ہم کیفے میں چائے پیتے اور عجائب گھر اور مال کی سیر کرتے، اور شام کو لارنس باغ میں اسی جگہ ملتے۔ جہاں اس وقت ہم دونوں بیٹھے ہیں۔

"اور بیرا ابھی تک چائے نہیں لایا؟"

[illegible] احمد

[illegible]ا ———"

[illegible] جناب!

. . . .

ا[illegible] ایک دن ——— ایک بڑے ہی پراسرار دن جبکہ رات کو بڑی سردی پڑی تھی اور صبح بازاروں میں دس بجے تک دھند پھیلی ہوئی [illegible] ہم دونوں یونیورسٹی کینٹین کے نیم گرم کیبن میں بیٹھے گرم گرم خوشبودار چائے پی رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں ناؤمی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی منگنی ہو چکی ہے اس کا نام ڈیوڈ ہے ——— یہی ڈیوڈ! وہ حیفہ میں پڑھ رہا ہے جہاں اس کا باپ چمڑے اور اون کا کاروبار کرتا ہے۔ جب وہ پڑھ لکھ لے گا، اور وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو جائے گی تو ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر وہ حیفہ چلی جائے گی اور وہیں رہے گی۔ حیفہ ——— جو اس کا اصلی وطن ہے۔ اور جس کے گلی کوچے اسے خواب کی طرح یاد ہیں۔ اپنے منگیتر کا ذکر کرتے ہوئے وہ ہندوستانی لڑکی کی طرح شرما رہی تھی، اور بات کو جلدی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا تو وہ تک اس سے حیفہ اور یروشلم کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھی حیفہ اور یروشلم کے گلی کوچوں سے پیار ہے، اور مجھے بھی وہ کبھی کبھی بہت یاد آتے ہیں۔ میں وہاں کبھی نہیں گیا لیکن یوں لگتا ہے جیسے میں وہاں سے کبھی باہر نہیں نکلا۔ میں ہمیشہ انہی اونچے نیچے پتھریلے بازاروں میں بھاگتا کھیلتا رہا ہوں۔ مجھے ان شہروں، ان بازاروں سے محبت ہے، اور ان لوگوں سے محبت ہے جو ہر راہگیر کے سر پہ شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ جو اپنی راہ میں بچھے ہوئے کانٹوں پر اس پیار سے پاؤں رکھتے تھے جیسے وہ آنے والی بہاروں کے بیج ہوں۔ جنہوں نے اس وقت پھول دیئے جب ان پر پتھر پھینکے گئے۔ جنہوں نے اس وقت محبت کی جب ان سے نفرت کی گئی ——— ناؤمی! میں بھی انہی گزرے ہوئے قافلوں کی اڑتی پھرتی، آوارہ گرد ہوں۔ اسی آفتاب کی بچھڑی ہوئی حقیر سی کرن ہوں۔ اس کرن کی روشنی کا آخری نقطہ ہوں ——— میں ان بازاروں، ان ہوٹلوں اور ان ہوٹلوں کے کیبنوں میں تنہا ہوں۔ لیکن میری تنہائیاں اکیلی نہیں ہیں۔ ان میں کہیں یروشلم کے مینار ہیں، کہیں بخارا کے کلس ہیں۔ اور کہیں قرطبہ کے گنبد، اور کہیں سسلی کی ناریلوں کے جھنڈ ہیں۔ حیفہ پہنچ کر میرا بھی انتظار کرنا۔ شاید کسی دن تم اپنے خاوند کے ساتھ کسی خوبصورت سڑک پہ چل رہی ہو تو میں بس میں سے اتر کر تمہاری طرف بڑھوں اور تمہارے قدموں پر موتیئے کے پھول رکھ کر تمہیں کہوں

"ناؤمی! میں آ گیا ہوں ——— دیکھو میں آ گیا ہوں۔"

شاید میں کبھی وہاں پہنچوں ——— شاید!

. . . .

ایک دھندلی سی شام کو ناؤمی نے اسی جگہ بیٹھ کر مجھے دریائے نیل کے ملاحوں کا وہ غمگین گیت سنایا:۔

"نیل! پیارے نیل!

تیرے آسمان پر ستارے سدا چمکتے رہیں،

تیرے کھجور کے درخت کبھی نہ سوکھیں،

ہماری کھیتیوں کو بھی ہرا بھرا کر دے،

نیل! پیارے نیل!"

اور پھر ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس قاہرہ چلی گئی۔ میں ہوائی اڈے پر اسے چھوڑنے گیا۔ اس دن صبح سویرے [illegible] چار بجے، [illegible] سڑکوں پر دھند چھائی تھی۔ ہوائی اڈے پر لوگ لمبے کوٹ اور گرم مفلر لپیٹے ادھر ادھر کھڑے ہاتھوں کو گرما رہے تھے۔ اور منہ سے [illegible] نکال رہے تھے۔ ناڈی اپنے باپ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا باپ اپنے چند ایک دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ [illegible] وہ لپک کر میرے سامنے میں آئی اور بولی

"میں نے سوچا شائد تم نہ آؤ!"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا"

میں نے دستانے میں سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے باپ نے خندہ پیشانی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اور ناڈی برآمدے میں ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے بھوسلے رنگ کی ٹویڈ کا زنانہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر گرم لیڈی فیلٹ تھی، اور صبح کے دھندلکے میں اس کی بھوری آنکھیں کبھی چمک اٹھتی تھیں کبھی بجھ جاتی تھیں۔

جہاز کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ ناڈی نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو

"دوست! ہم نے بڑے خوبصورت دن اکٹھے گزارے شہر میں، انہیں بھول نہ جانا۔

میں بھی انہیں یاد رکھوں گی ——— شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں ———"

اس کا باپ میری طرف بڑھا

"سو لانگ مائی سن!"

ناڈی نے مجھ سے ہاتھ ملایا

"خط ضرور لکھنا۔"

"تم بھی ضرور لکھنا۔"

"ہاں، میں بھی لکھوں گی ——"

وہ جہاز میں سوار ہو گئی۔ جہاز کے پروں میں طوفانی گردش پیدا ہوئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ آسمان پر اڑتے ہوئے صبح کی دھند میں غائب ہو گیا۔

× × × × × × ×

رات گہری ہونے لگی ہے۔ خنکی بڑھ گئی ہے۔ تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟

میرا مفلر لے لو۔ ہاں ——— آج چائے کا ذائقہ کس قدر پرسکون اور فکر انگیز ہے۔ تم بھی کچھ بولو میرے دوست! تم چپ کیوں ہو؟ آج ہم دونوں اکیلے ہیں، دونوں آزردہ ہیں۔ رات کے سمندروں کے دو گمنام جزیرے!

آج میں نے اپنی محبت کو لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتے دیکھا۔ اس کا رنگ فق تھا، چہرا اترا ہوا تھا۔ اور وہ نرگس کا مرجھایا ہوا چہرہ لئے خالی خالی آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہے ——— لیکن اب افسوس سے کیا ہو گا۔ جب کچھ باقی نہیں رہا تو پھر یہ افسوس بھی کیوں رہے۔ آؤ آج اس افسوس کا بھی گلا گھونٹ دیں۔ اور پھر لوگوں کو بتائیں کہ دیکھو ——— یہاں وہ دفن ہے

"بیرا ———"

"ابھی لایا جناب!"

. . . .

اور پھر ایک دن ——— ایک بڑے ہی پراسرار دن جبکہ رات کو بڑی سردی پڑی تھی، اور صبح بازاروں میں دس بجے تک دُھند پھیلی ہوئی تھی، ہم دونوں یونیورسٹی کینٹین کے نیم گرم کیبن میں بیٹھے گرم گرم خوشبودار چائے پی رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں ناؤمی نے بتایا کہ جس لڑکے سے اس کی منگنی ہو چکی ہے اس کا نام ڈیوڈ ہے ——— ریمی ڈیوڈ! وہ حیفہ میں پڑھ رہا ہے جہاں اس کا باپ چیڑے اور اون کا کاروبار کرتا ہے۔ جب وہ پڑھ لکھ لے گا، اور وہ بھی تعلیم سے فارغ ہو جائے گی تو ان دونوں کی شادی ہو جائے گی۔ پھر وہ حیفہ چلی جائے گی اور وہیں رہے گی۔ حیفہ ——— جو اس کا اصلی وطن ہے۔ اور جس کے گلی کوچے اسے خواب کی طرح یاد ہیں۔ اپنے منگیتر کا ذکر کرتے ہوئے وہ ہندوستانی لڑکی کی طرح شرما رہی تھی، اور بات کو جلدی ختم کر دینا چاہتی تھی۔ میں نے سگریٹ سلگایا تو بہت دیر تک اس سے حیفہ اور یروشلم کی باتیں کرتا رہا۔ میں نے اسے بتایا کہ مجھے بھی حیفہ اور یروشلم کے گلی کوچوں سے پیار ہے، اور مجھے بھی وہ کبھی کبھی بہت یاد آتے ہیں۔ میں وہاں کبھی نہیں گیا لیکن یوں لگتا ہے جیسے میں وہاں سے کبھی باہر نہیں نکلا۔ میں ہمیشہ انہی اونچے نیچے پتھریلے بازاروں میں بھاگتا کھیلتا رہا ہوں۔ مجھے ان شہروں، ان بازاروں سے محبت ہے، اور ان لوگوں سے محبت ہے جو ہر راہگیر کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے وہاں سے گزرا کرتے تھے۔ جو اپنی راہ میں بچھے ہوئے کانٹوں پر اس پیار سے پاؤں رکھتے تھے جیسے وہ آنے والی بہاروں کے بیج ہوں۔ جنہوں نے اس وقت پھول دیئے جب ان پر پتھر پھینکے گئے، جنہوں نے اس وقت محبت کی جب ان سے نفرت کی گئی ——— ناؤمی! میں بھی انہی گزرتے ہوئے قافلوں کی اڑتی پھرتی، آوارہ گرد ہوں۔ اسی آفتاب کی بچھڑی ہوئی حقیر سی کرن ہوں۔ اس کرن کی روشنی کا آخری نقطہ ہوں ——— میں ان بازاروں، ان ہوٹلوں اور ان ہوٹلوں کے کیبنوں میں تنہا ہوں۔ لیکن میری تنہائیاں اکیلی نہیں ہیں۔ ان میں کہیں یروشلم کے مینار ہیں، کہیں بخارا کے کلس ہیں، اور کہیں قرطبہ کے گنبد، اور کہیں سیویل کی ناریوں کے جھنڈ ہیں۔ حیفہ پہنچ کر میرا بھی انتظار کرنا۔ شاید کسی دن تم اپنے خاوند کے ساتھ کسی خوبصورت سڑک پر ٹہل رہی ہو تو میں بس میں سے اتر کر تمہاری طرف بڑھوں اور تمہارے قدموں پر موتیے کے پھول رکھ کر تمہیں کہوں

"ناؤمی! میں آ گیا ہوں ——— دیکھو میں آ گیا ہوں!"

شاید میں کبھی وہاں پہنچوں ——— شاید!

. . . .

ایک دھندلی سی شام کو ناؤمی نے اسی جگہ بیٹھ کر مجھے دریائے نیل کے ملاحوں کا وہ غمگین گیت سنایا:۔

"نیل! پیارے نیل!

تیرے آسمان پر ستارے سدا چمکتے رہیں،

تیرے کھجور کے درخت کبھی نہ سوکھیں،

ہماری کھیتیوں کو بھی ہرا بھرا کر دے،

نیل! پیارے نیل!"

اور پھر ایک دن وہ اپنے باپ کے ساتھ واپس قاہرہ چلی گئی۔ میں ہوائی اڈے پر اسے چھوڑنے گیا۔ اس دن بڑی سردی تھی۔ مجھے صبح چار بجے اٹھنا پڑا۔ سڑکوں پر دھند چھائی تھی۔ ہوائی اڈے پر لوگ لمبے کوٹ اور گرم مفلر لپیٹے ادھر ادھر کھڑے ہاتھوں کو گرما رہے تھے۔ اور تھرمس بوتلوں سے چائے نکال کر پی رہے تھے۔ ناڈی اپنے باپ کے پاس کھڑی تھی۔ اس کا باپ اپنے چند ایک دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ لپک کر سامنے آئی اور بولی

"میں نے سوچا شاید تم نہ آؤ!"

"یہ کیسے ہو سکتا تھا بھلا؟"

میں نے دستانے میں سے ہاتھ نکالتے ہوئے کہا۔ اس کے باپ نے خندہ پیشانی سے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ میں اور ناڈی برآمدے میں کھڑے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ اس نے بھوسلے رنگ کی ٹویڈ کا زنانہ سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور سر پر گرم لیڈی فیلٹ تھی، اور صبح کے دھندلکے میں اس کی بھوری آنکھیں کبھی چمک اٹھتی تھیں کبھی بجھ جاتی تھیں۔

جہاز کے چلنے میں صرف پانچ منٹ باقی تھے۔ ناڈی نے مجھے عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ رہی ہو

"دوست! ہم نے بڑے خوبصورت دن اکٹھے گزارے ہیں، انہیں بھول نہ جانا۔

میں بھی انہیں یاد رکھوں گی —— شاید ہم پھر کبھی نہ مل سکیں ——"

اس کا باپ میری طرف بڑھا

"سولانگ مائی سن!"

ناڈی نے مجھ سے ہاتھ ملایا

"خط ضرور لکھنا۔"

"تم بھی ضرور لکھنا۔"

"ہاں، میں بھی لکھوں گی ——"

وہ جہاز میں سوار ہو گئی۔ جہاز کے پروں میں طوفانی گردش پیدا ہوئی۔ اور دیکھتے دیکھتے وہ آسمان پر اڑتے ہوئے صبح کی دھند میں غائب ہو گیا۔

× × × × × × ×

رات گہری ہونے لگی ہے۔ خنکی بڑھ گئی ہے۔ تمہیں سردی تو نہیں لگ رہی؟

میرا مفلر لے لو۔ ہا —— آج چائے کا ذائقہ کس قدر پرسکون اور فکر انگیز ہے۔ تم بھی کچھ بولو میرے دوست! تم چپ کیوں ہو؟ آج ہم دونوں اکیلے ہیں۔ دونوں آزردہ ہیں۔ رات کے سمندروں کے دو گمنام جزیرے!

آج میں نے اپنی محبت کو لوگوں کے ہجوم میں سے گزرتے دیکھا، اس کا رنگ فق تھا، چہرا اترا ہوا تھا۔ اور وہ نرگس کا مرجھایا ہوا پھول لئے خالی خالی آنکھوں سے آسمان کو تک رہی تھی۔ مجھے بہت افسوس ہے —— لیکن اب افسوس سے کیا ہو گا۔ جب کچھ باقی نہیں رہا تو پھر یہ افسوس بھی کیوں رہے۔ آؤ آج اس افسوس کا بھی گلا گھونٹ دیں۔ اور پھر لوگوں کو بتائیں کہ دیکھو —— یہاں وہ دفن ہے

جس کی محبت کا ہمیں کوئی افسوس نہیں ہے۔ مجھے ان لوگوں سے جدا ہو جانا چاہئے۔ جدائی کے لمحے دل خالی ہوتے ہیں۔ اور جب دل خالی ہوں تو آنکھیں بھر آتی ہیں۔ لیکن آنسو جدائی کی اس گھڑی کو نہیں روک سکتے۔ وہ تو خود نہیں رکتے —— وہ کسی دوسرے کو کیا روکیں گے۔ میں ان لوگوں سے کبھی جدا ہونے کے لئے ملا تھا۔ اور اب کبھی نہ ملنے کے لئے جدا ہو رہا ہوں۔

دیکھو ڈھلان پہ ان درختوں کی قطار کے اوپر ستاروں کی ٹولی نمودار ہوئی ہے۔

یہ رات کے ماتھے کا جھومر ہے۔ آج رات میری محبت کے ماتھے پر بھی اسی طرح کا ایک جھومر سجایا جائے گا۔ اور پھر صبح وہ ڈولی میں بٹھلا کر رخصت کر دی جائے گی۔

ہونے والی دلہن! خدا تمہارا سہاگ سلامت رکھے!

نئی زندگی کے قالین پر قدم رکھنے سے پہلے پاؤں پر جمی ہوئی یادوں کی گرد جھاڑ دینا۔ کم خواب اور ریشم پر لیٹے لیٹے سوت اور کھدر کو یاد نہ کرنا۔ اور گھر سے رخصت ہوتے ہوئے ان پرانے دنوں، بیتے دنوں سے بھی رخصت مانگ لینا جو پلکوں پر آنسوؤں کے دیپ لئے کچھ دور تمہاری ڈولی کے ہمراہ ضرور آئیں گے —— تم میرا خیال نہ کرنا۔ میری محبت نے ہمیشہ الوداعی گیت ہی گائے ہیں۔ وہ دوست بن کر آتی ہے اور دلہن بن کر چلی گئی ہے۔ وہ ہمیشہ ڈولی کے ساتھ ساتھ روتی ہوئی گئی ہے۔ آج میں نے گم شدہ محبتوں کے درخت کو بڑے زور سے جھنجھوڑا ہے۔ اور اس کی ٹہنیوں پر سے یادوں کے ان گنت پھل ٹوٹ کر میرے قدموں میں بکھر گئے ہیں۔

آج مجھے بڑے پرانے گیت —— بڑے اداس گیت یاد آ رہے ہیں۔

آج میں اپنی ویران محبتوں کے سرہانے کھڑے ہو کر وہ تمام مرثئے پڑھنا چاہتا ہوں جنہیں بہار خزاں کے زرد پتوں پہ دم توڑتا چھوڑ گئی ہے۔ میری یادوں کے سائے چہرے کملا گئے ہیں، اور میں ان چہروں پر آنے والی بہاروں کا صندل چھڑکنا چاہتا ہوں۔ آؤ میرے دوست! ویران رات کی اس اداس گھڑی میں ان پھولوں کا ذکر چھیڑیں جو ہم سے بچھڑ کر چلے گئے ہیں۔ اور ان گیتوں کے دیپ جلائیں جن کے جہاز چھپی ہوئی چٹانوں سے ٹکرا کر ڈوب چکے ہیں۔ آؤ ناؤ می کو ڈھونڈیں، سدھا کو ڈھونڈیں۔ روپل کے پھولوں اور موتئے کی کلیوں کی تلاش میں نکلیں ——

نیل! پیارے نیل!
تیرے آسمان پر ستارے سدا چمکتے رہیں،
ہماری کھیتیاں کب ہری بھری ہوں گی؟
نیل! پیارے نیل!!

O

علی حامد عباسی

اِک نگارِ آتشیں رُخ ....

یوں تو یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی بے حد معمولی سا یعنی طور پر بیمار شاعر "عظیم" عشقیہ شاعری کرتے کرتے ان گنت محبت کی نظمیں لکھ ڈالنے کے بعد یکایک ہی اور گھٹیا قسم کی بیکار اور فضول سی نظم لکھ مارے۔ یعنی یہ زندگی ہی آئے دن کے بے شمار چھوٹے چھوٹے واقعات کی طرح ایک نہایت غیر اہم اور ناقابلِ توجہ سی بات تھی۔ یہ کوئی بڑی ہی عجیب اور غیر معمولی بات تو نہیں تھی جس پر اس قدر سنجیدگی اور تن دہی سے غور کیا جائے۔ ارے بھئی کیا ہوا آج زندگی کا ایک دن اور گزر گیا۔ یہ بھی کوئی افسوس کرنے کی بات ہے۔ یہ تو زندگی کا چکر ہے جو یوں ہی ہمیشہ چلتا رہتا ہے اور کبھی رکنے کا نام نہیں لیتا۔ اور ویسے بھی اتنی زیادہ مصروف اور بھری دنیا میں کسی کو اتنی فرصت ذرا سی بات پر سوچ بچار کرنے کا موقعہ ملتا ہے۔

لیکن وسط مارچ کی اس شام کو جب آس پاس کے سارے درختوں کے سلیٹی گھر ہو چکے تھے۔ خاموش نیلے آسمان میں شفق کی ہلکی گلابی آہستہ آہستہ گھل رہی تھی۔ آسمان کی پہنائیوں میں ہوا کا سنگیت ختم گیا تھا اور موسمِ بہار میں پہلے پہل کھلنے والے پھول کیاریوں میں اپنا سر جھکائے چپ چاپ کھڑے تھے اور رات کی بھینی بھینی سگندھ سے ساری فضا بھری ہوئی تھی۔ اس گھڑی دن بھر انگریزی ادب کی بہت ساری موٹی موٹی غیر دلچسپ کتابوں میں سر کھپانے کے بعد اعظم پر دیر نے اپنی زندگی میں شاید پہلی بار نہایت بے کیفی کے عالم میں یہ محسوس کیا کہ واقعتاً وہ بہت تھک گیا ہے۔ خیالات کی ساری گلیاں سونی ہو گئی ہیں اور زندگی کا شکست خوردہ کارواں بھٹکتے بھٹکتے اِن اجاڑ اور سنسان راستوں کی طرف نکل آیا ہے۔ جہاں ہر طرف کورس کی کتابوں کے اوراق بکھرے پڑے ہیں۔ ہر طرف اداسی [illegible] ہے۔ کوئی ہما ہمی نہیں۔ کوئی چہل پہل نہیں۔ اب کوئی فتنہ نہیں اٹھتا۔ اب کوئی ہنگامہ برپا نہیں ہوتا۔ وہی لڑکے ہیں۔ وہی ساتھی ہیں۔ وہی سب لوگ ہیں لیکن سب پر جمود طاری ہے۔ سب پر جمود طاری ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ سب باتیں پرانی ہو گئی ہیں جو زندگی کی شاخ کو مسرت اور بے فکری کے نرم جھونکوں سے ہلاتی رہتی تھیں۔ اب بھولے سے بھی کلاس چھوڑ کر بھاگنے اور دن بھر کامن روم میں پنگ پانگ کھیلنے یا ہوسٹل کے لان پر صبح سے شام تک کرکٹ کا میچ کھیلتے رہنے کو جی نہیں چاہتا۔ اور نہ اب رات کے وقت وارڈن کے کمرے سے دور جا کر اس قدر زور زور سے بے معنی اور فضول بحثوں میں گلا پھاڑ پھاڑ کر جھگڑنے اور شور مچا کر ساری دنیا کو سر پر اٹھا لینے اور لمبے لمبے گونج دار قہقہے لگانے کو طبیعت چاہتی ہے۔ اسی طرح طوفان اٹھانے کا بھی کوئی ارادہ نہیں کہ وارڈن صاحب بیچارے نیند سے اٹھ کر بگڑتے ہوئے ہمارے پاس آجائیں اور پھر ہم ان سے نہایت معصومیت کے ساتھ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا یہ کہہ دیں کہ صاحب! ہم تو کچھ ایسا زیادہ شور و غل نہیں مچا رہے تھے البتہ ان دنوں آپ کے کان ہی کچھ زیادہ حساس ہو گئے ہیں۔ اس کے علاوہ سوئی ہوئی سیاہ راتوں میں ایک نئی مسجد کی چھت پر جمع ہو کر اپنے ایسکنڈل کلب کی "انڈر گراؤنڈ" میٹنگ کرنے کا تو اب خیال ہی نہیں آتا۔ اب تو سچ مچ یہ سب باتیں آئی گئی سی لگتی ہیں۔ اب تو صرف کتابوں کو، من چاہے یا نہ چاہے، پڑھنا ہے اور انہی کے بارے میں سوچنا ہے۔ (نہ جانے کب شروع ہو کر ختم ہو گا امتحان؟ اعظم پردیز نے بڑی گھبراہٹ اور ایک عجیب سی تلخی آمیز بے چینی کے ساتھ سوچا)

پھر وہ اپنے کمرے سے باہر نکل آیا۔

شام بالکل خاموش تھی۔

اس وقت اعظم پرویز کو غیر شعوری طور پر انگریزی کی وہ نظم یاد آئی جس میں شاعر نے آسمان کی وسعتوں پر پھیلی ہوئی اداس شام کو اس قدر خاموش اور پرسکون کہا تھا جس طرح اسپتال میں کوئی مریض آپریشن ٹیبل پر بے حس و حرکت پڑا ہو۔

پھر شام کے دھندلے سائے خاموشی کے ساتھ چپکے سے لپٹ کر سو گئے۔ اور ہر طرف اندھیرا چھانے لگا۔ اور در و دیوار پر گہرا سکوت طاری ہو گیا۔ ہوسٹل کی دوسری منزل کی ساری بالکونی ویران پڑی تھی۔ لان بھی بالکل خالی پڑا تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ صرف خاموشی تھی اور تنہائی۔ گھنی بیلوں سے ڈھکے ہوئے لوہے کے فنس (FENCE) کے اس پار سے گزرتی ہوئی کولتار کی سڑک بھی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ کبھی کبھی ایشیاٹک کلب کی طرف جاتی ہوئی کسی پروفیسر کی کار یا پھر طویل وقفوں کے بعد تصویر محل کی طرف جاتے ہوئے لڑکوں کی کوئی ٹولی ادھر سے شور مچاتی ہوئی گزر جاتی تو ذرا دیر کے لئے خاموشی کا طلسم ٹوٹ جاتا اور اپنے آپ ہی ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے کسی مغنی نے بڑی دیر کی خاموشی کے بعد اپنے سامنے رکھے ہوئے طنبورے کے تاروں کو یکایک زور سے جھنجھنا دیا ہو۔ اور قریب ہی اشوک کے گھنے درختوں کی لمبی قطار کے اس جانب سرخ اینٹوں والے ہوسٹل کے کسی کمرے میں بیٹھا ہوا اسفندیار ایرانی وائلن پر مسلسل "MOVEMENT OF CAMELS IN THE DESERT" کی دھن بجا رہا تھا۔ لیکن اس کے وائلن کی مدھم آواز فضا میں کوئی حرکت پیدا کرنے کے بجائے اس کو میٹھی میٹھی لوریاں دے کر بڑے پیار سے تھپک تھپک کر سلائے دے رہی تھی۔

ہوسٹل کے سارے لڑکے ایک ایک کر کے شام کی تفریح کے لئے اپنے کمروں سے نکل گئے تھے۔ صرف جنوبی ہند کا ایک لڑکا رہ گیا تھا جو اس روز خلاف معمول باہر نہیں گیا تھا۔ شاید آج اس کے ہم وطن دوست اس کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے نہ آئے ہوں۔ وہ بڑے غمناک لہجے میں کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ اس کی عادت سی ہو گئی تھی کہ ہر وقت وہ کچھ نہ کچھ گنگناتا رہتا۔ کچھ لوگوں کا تو اس کے متعلق یہ خیال تھا کہ ٹراونکور کوچین سے سینکڑوں میل دور شمالی ہند میں آکر اگر اس کو کوئی چیز پسند آئی ہے تو وہ ہندوستانی زبان کے فلمی گانے ہیں۔ بس اور کچھ نہیں۔ اس کی آواز اس قدر تیز اور کرخت تھی کہ ہوسٹل کے اس ونگ کے سارے لڑکے جس میں وہ رہتا تھا اس سے بیزار تھے۔ یہ بھی کیا کہ ہر وقت گاتے رہو۔ نہ صبح دیکھنا، نہ شام۔ کچھ لڑکے جو قانون کے طالب علم تھے لیکن کلاس کبھی نہیں جاتے تھے اور آئندہ اگر کوئی دوسرا کام نہ مل سکا تو پھر وکیل بننے کا نہایت خطرناک ارادہ رکھتے تھے، اس سے تعزیرات ہند کی کسی دفعہ کا حوالہ دیتے ہوئے کئی مرتبہ کہہ چکے تھے کہ "اے مسٹر پلائے فرام ساؤتھ انڈیا! بند کرو اپنی یہ ہر وقت کی راگنی، نہیں تو ہم تم کو کورٹ میں نوٹس دے کر گھسیٹ لے چلیں گے۔ کچھ لڑکے جو ذرا زیادہ جمہوریت پسند واقع ہوئے تھے اس کو کئی دفعہ یہ بتا چکے تھے کہ ہم لوگ تمہارے سامنے تین ہزار دستخطیں اکٹھا کر کے پیش کرنے والے ہیں جس سے مجبور ہو کر تم اپنی نہایت سریلی تانیں ہمیشہ کے لئے بند کر دو گے۔ لیکن ہر بار وہ کچھ ڈر کر، کچھ مسکرا کر بڑی لجاجت اور شرمندگی کے ساتھ معافی مانگ لیتا۔ مگر معافی مانگنے کے کچھ ہی دیر بعد اس کو پھر معافی مانگنی پڑتی اور وہ پھر گانے لگتا ــــ اس وقت بھی وہ بالکونی کی ریلنگ پر جھکا ہوا ایک سرگوشی کے انداز میں گائے جا رہا تھا: "وہ دن کہاں گئے بتا ۔ ۔ ۔"

اعظم پرویز نے سوچا کہ آخر اتنی دیر سے وہ یہی گیت کیوں گا رہا ہے۔ دوسرے فلمی گیت بھی تو اس کو یاد ہیں جنہیں وہ وقت بے وقت گایا کرتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس گیت سے اس کی ایک ایسی ہی شام کی کوئی بھولی بسری کہانی وابستہ ہو۔ بیتے ہوئے دنوں کا کوئی رنگین خواب متعلق ہو جس کو یاد کر کے اس کے ذہن میں پرانی یادوں کے چراغ جھلملا اٹھے ہوں۔ اور پھر اس کو اپنے دور دراز وطن کے کسی ہرے بھرے گاؤں کی کوئی سانولی صورت یاد آگئی ہو جو آج بھی ناریل کے ٹھنڈے کنجوں میں یا پھر کسی خوبصورت جھیل کے ٹھہرے ہوئے پانیوں کے پاس یا کسی دھان کے لہلہاتے ہوئے کھیت کے کناروں پر اس کی یاد کا دیپ جلائے، اس کا انتظار کر رہی ہو۔ اس گانے سے اس کو ضرور کچھ نہ کچھ تسکین ملتی ہوگی۔ کچھ اطمینان اور کچھ تسلی کا احساس ہوتا ہوگا۔ وہ اس گیت کا پہلا بول پچاسویں دفعہ گنگنا رہا تھا۔

جب ہر طرف خاموشی طاری ہو اور لمحہ بلمحہ اُداسی بڑھتی جا رہی ہو اور دل درد سے بھر آیا ہو اور بے کیفی کے احساس سے نڈھال ہو کر کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کیا جائے ۔ ایسی حالت میں اگر کوئی کانوں میں بار بار یہ کہے " وہ دن کہاں گئے بتاؤ ؟ " تو کیا محسوس ہوتا ہے ۔ اچانک کوئی جھیل سکوت کے عالم میں ہو ۔ اس میں اونچی نیچی لہروں کا کہیں دور دور تک پتہ نشان نہ ہو ۔ اور ایسی حالت میں اگر کوئی اس کی سوئی ہوئی خاموش سطح پر پتھر کا ایک ٹکڑا پھینک دے تو کیا ہوتا ہے ؟ ——— پانی ہل ہل جاتا ہے نا ! ——— بالکل ایسا ہی اُس گانے کے پہلے بول نے اعظم پرویز کے ساتھ کیا ۔ وہ بالکل اداس اور انتہائی بوریت کے عالم میں بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ جیسے خوشیوں کے ارمانوں کے دن اب واقعی ختم ہو گئے ہیں ۔ اب فضا میں مسرت کے سنہری شہپر شاید ہی کبھی پھڑپھڑائیں ۔ ہر طرف اُداسی بکھر دینے اور دل کو بیٹھا دینے والی پرچھائیاں بکھر رہی ہیں ۔ لیکن وہ دن کہاں گئے بتاؤ کے مبہم اور پراسرار سوال اس کو ایک نئے احساس کی دنیا میں لے آئے ۔ بیتی ہوئی باتیں اُس کے خیالوں میں آنکھیں کھولنے لگیں ۔ اور وہ دنیا جو کب کی سوئی ہوئی تھی پھر سے انگڑائی لے کر جاگ اٹھی ۔

وہ دن کہاں گئے بتاؤ ؟ ———

• ارے بھئی ! کیا بتائیں کہ وہ دن کہاں گئے ۔ یہی تو ٹریجڈی ہے کہ ہمیں کچھ نہیں معلوم ۔ ہم کچھ نہیں جانتے ۔ بس اتنا معلوم ہے کہ وہ دن بہت اچھے تھے اور وہ دن ایک ایک کر کے بیت گئے ۔ جب ہر روز صبح ہوتی تو ہم سب اُمنگوں بھرے دل سے کتنی خوشی کے ساتھ کہتے کہ واہ بھئی ! ایک نئے دن کا آغاز ہوتا ہے ۔ اس کے بعد پھر دوسرا دن طلوع ہوتا ۔ پھر تیسرا ۔ اور اسی طرح دن پر دن حال کی سرحدوں کو چھوتے ہوئے ماضی کی انجان اور پُراسرار بستیوں کی طرف بڑی تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے چلے گئے اور کسی کو اس کا احساس تک نہ ہوا کہ دیکھتے دیکھتے اتنے سارے پیارے دن اور اتنی ساری پیاری باتیں گزر گئیں ۔ آج ان کو یاد کر کے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی کے میٹھے سپنوں کا حسین طلسم دفعتہً ٹوٹ جائے اور پھر اپنی آنکھیں مل کر اپنے چاروں طرف حیرت سے دیکھتے ہوئے کوئی کہہ اُٹھے کہ ارے یہ دنیا اتنی بدل کیسے گئی اور وہ بھی اتنی جلدی ۔

پچھلے ہفتے سر سلیمان ہال کے سالانہ الوداعی ڈنر سے واپسی کے بعد کافی رات گئے ہوسٹل کے پیچھے لگے ہوئے یوکلپٹس اور پام کے خاموش درختوں کے اوٹ سے جاڑے کے آخری ایام کا حسین ٹھنڈا اور سہانا چاند دھیرے دھیرے نکل رہا تھا اور چاندنی کی دودھیا چادریں ہر طرف پھیلتی جا رہی تھیں ۔ ساری فضا ہلکے ہلکے سروں میں کچھ گنگنا رہی تھی ۔ رات ہر لحاظ سے رومانٹک تھی ۔ ایسی ہی راتوں میں شاعروں کے خیالوں میں رنگ رنگ کے پھول کھلتے ہیں ۔ کچھ سوتی ، کچھ جاگتی آنکھوں میں ادھورے پیار کے خوابوں کی تعبیر جھلکتی ہے ۔ حسن کی پلکیں شرما کر آہستہ سے اُٹھتی ہیں اور کچھ کہہ کر پھر جھک جاتی ہیں ۔ پھر خیالات کی دھارا اور تیز ہو جاتی ہے ۔ لیکن اعظم پرویز نے اس سہانی رات کو کچھ بھی نہ سوچا ۔ البتہ نصیر زبیری نے رات کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر یہ ضرور کہا تھا کہ یہ کچھ اچھا نہیں لگتا کہ ہماری NON - SERIOUS PARTY ان دنوں اپنے راستے سے ہٹ گئی ہے اور اس قدر SERIOUS بن بیٹھی ہے کہ سوائے پڑھنے اور امتحان کے دنیا کی کسی اور چیز کے متعلق سوچتی ہی نہیں ۔ اگر یہ ابن الوقتی نہیں ہے تو پھر کیا ہے ۔ مجھے بتاؤ ۔ جیسا موقع دیکھا ویسے ہو گئے ۔ یہ کوئی مذاق نہیں بلکہ سوچنے اور رونے کی بات ہے ۔ ابھی ہم کل کیا تھے اور آج کیا ہو گئے ۔ یہ "انقلاب" ہمارے لئے سخت نازیبا ہے ۔ یہ اپنے مشن اور کاز سے غداری ہے ۔ دیکھو چاند کا خاموش چہرہ کتنا خوبصورت ہے ۔ یہ رات کتنی حسین ہے ۔ آؤ چلیں اور ان چاندنی سے دھلی ہوئی سڑکوں پر آوارہ گردی کریں جو نہ جانے کب سے ہماری راہ دیکھ رہی ہیں ۔ خوب دلچسپ اور مزیدار باتیں کریں ۔ قہقہے لگائیں ۔ شور مچائیں ۔ ودھم مچایا کریں ۔ میں کہتا ہوں بھئی آخر اتنا زیادہ پڑھ کر کیا کرو گے ۔ بہت پڑھ لیا ہے ۔ لیکن اعظم پرویز نے نصیر زبیری کی باتوں کو ان سنی کر دیا اور اپنی کتابیں بغل میں دبا کر سمنار لائبریری کی طرف چلا گیا ۔ نصیر زبیری کا دل جیسے بیٹھ گیا اور اپنے کمرے میں جا کر اس نے معاشیات کی ایک موٹی کتاب بڑی بے دلی کے ساتھ جمائیاں لے لے کر پڑھنی شروع کر دی ۔

اس رات سے کئی ہفتے قبل اعظم پرویز نے اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی چھوٹی سی دُنیا کا جائزہ لیا تو اس کو سخت اچنبھا ہُوا اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا "تعریف اس خدا کی جس نے جہاں بنایا ۔ کیسی زمیں بنائی کیا آسماں بنایا ۔ اور جس نے نصیر زبیری کی پارٹی بھی بنائی ۔ سچ مچ خدا بڑا رحیم اور کارساز ہے ۔ کچھ لوگ تو نصیر زبیری کی پارٹی کی دن دونی رات چوگونی ترقی دیکھ کر سب سے کہتے پھرتے تھے کہ یہ پارٹی وارٹی تو خیر کیا ہے اصل میں یہ ایک ایسی ٹولی ہے جس کے سارے ممبر "شیطان کے گرد" ہیں جنہیں دوسروں کی برائیاں دیکھنے، کیچڑ اچھالنے اور دوسروں کی کمزوریوں سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے علاوہ کچھ اور آتا ہی نہیں ۔ ایک صاحب نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ یہ ماہرہ کا جو نصیر زبیری ہے نا، اس کم بخت ۲۰۰۴ آدمیوں نے اپنے گرد خدا کی نہ جانے کیسی کیسی مخلوق جمع کر رکھی ہے ۔ سب کے سب نہایت غیر ذمہ دار اور غیر سنجیدہ قسم کے انسان ہیں — خیر جو کچھ بھی ہو نصیر زبیری کی پارٹی نہایت اہم تھی — یا لوگوں نے اس کو اہم بنا دیا تھا ۔ اس کے سارے ممبر بڑے پُرخلوص تھے اور کبھی ذاتی مفاد کو اپنے پاس تک پھٹکنے نہ دیتے تھے ۔ اور کبھی اس پارٹی کے اندر ملک کی سیاسی پارٹیوں کی طرح پھوٹ، گٹھ بندی اور اختلاف نہیں ہُوا تھا ۔ اس کے سارے ممبر ایک ہی رسّی کو تھامے ہوئے تھے ۔ وہ سب کے سب دُنیا کو ایک اسٹیج سمجھتے تھے جس پر ہمیشہ طربیہ ڈرامے کھیلے جاتے ہیں "جو اس دُنیا میں خوش نہیں رہ سکتا ۔ جو قہقہے نہیں لگا سکتا، جو مصیبتوں سے ٹکرا کر مسکرا نہیں سکتا ۔ وہ انسان نہیں ہے ۔ وہ ہماری پارٹی کا ممبر نہیں بن سکتا" یہ چھوٹا سا اعلان نامہ نصیر زبیری نے خود لکھا تھا اور سارے ممبروں نے اس پر روشنائی سے دستخط کئے تھے — خون سے نہیں، اس لئے کہ وہ مجنوں نہیں تھے ۔

اس پارٹی کا بانی اور لیڈر اور کرتا دھرتا نصیر زبیری ہی تھا ۔ بڑا تیز اور عجیب کینڈے کا انسان تھا ۔ اس کے اتنا ملتا پرزہ آدمی تو ڈھونڈنے سے شاید ہی کہیں مل سکے ۔ لوگ حیران تھے کہ یہ آدمی ہے یا گھن چکر ۔ یا ایک سوالیہ نشان جس کا جواب کسی کو بھی نہیں معلوم ۔ ابھی کچھ تھا، ابھی کچھ ہے، ابھی ہنس رہا تھا تو ابھی شور مچانے لگا ۔ شور مچا کر ذرا چپ ہُوا تو پھر باتیں کرنے لگا ۔ اور باتیں کرنے کے بعد چپ ہُوا تو پھر باتیں کرنے لگا ۔ اس سے اگر کہا جاتا کہ تم ذرا کم باتیں کیا کرو تو وہ بگڑ کر کہتا "کیوں ؟ — آخر کیوں — یہی تو ایک بات اچھی ہے جس کو میں نے اپنے قومی رہنماؤں سے سیکھا ہے دوسری بات جو میں ان سے سیکھنے کی ان دنوں کوشش کر رہا ہوں وہ ہے منصوبہ بندی جو ہمارے نیتا ڈرائنگ روم اور دفتروں میں بیٹھ کر آئے دن کرتے رہتے ہیں ۔ جب میں یہ کام پوری طرح سیکھ چکوں گا ۔ تو پھر خوب اسکیمیں بناؤں گا اور اس طرح اپنے آپ کو دھوکا دوں گا ۔ لیکن یہ کام ذرا مشکل ہے اس لئے کہ میرے پاس نہ تو کوئی ڈرائنگ روم ہے اور نہ دفتر ۔ تو پھر میں یہ اسکیمیں کہاں بیٹھ کر بناؤں گا ۔ غرض نصیر زبیری عجیب باغ و بہار انسان تھا ۔ نفسیاتی تجزیہ کرنے والوں کی سمجھ سے بالاتر، وہ اپنے کمرے کو بڑی شان کے ساتھ انکل ٹومز کیبن کہتا تھا ۔ وہ کچھ دنوں کے لئے گرمی کی چھٹیوں میں حیدر آباد چلا گیا تھا کہ بس آفت آگئی ۔ اس نے وہاں کے مخصوص لہجے میں "ق" کو "خ" کہنا شروع کر دیا "اجی حضت کیا بول کے بولے" کی رٹ لگا کر سب کی ناک میں دم کر دیا ۔

دوسرا سب سے اہم ممبر ایک جنوبی افریقہ کا لڑکا تھا ۔ کئی سال پہلے جب وہ افریقہ سے ہندوستان آ رہا تھا تو اس کے باپ نے اس کو تین ہدایتیں کی تھیں ۔ (۱) جوا کبھی نہ کھیلنا (۲) داڑھی والے انسانوں سے بچنا ۔ (۳) کسی ایسی لڑکی سے پیار ہرگز مت کرنا جو تم سے زیادہ ہوشیار ہو ۔ اور وہ ان پر بڑی مستعدی سے کاربند رہا ۔ وہ ہندوستانی بہت کم جانتا تھا لیکن ہمیشہ بولنے کی کوشش کرتا اور ہندوستانی لباس بھی اکثر پہنتا ۔ اس کا گھر جوہانس برگ میں تھا ۔ وہ اپنے تمام قریبی دوستوں سے اکثر کہتا کہ کبھی میرے گھر چلو ۔ میری کوٹھی "جوہانس برگ" میں ٹاؤن ہال کے پاس لوئس واک میں ہے ۔ تم کو واقعی بڑی خوشی ہوگی ۔ لیکن نہیں ۔ . . . . نہیں تم کو افسوس ہوگا کیونکہ وہاں ملاں کی حکومت ہے جو تم کو کالا آدمی کہہ کر سفید آدمیوں کے کسی بھی ہوٹل میں جانے نہیں دے گی ۔ یہ کالے گورے کی تفریق، یہ آدمی آدمی کی تفریق، یہ نسلی امتیاز اور یہ فاشزم کا بھوت — ہم سارے ساؤتھ افریقی اب جان گئے ہیں کہ اس کا علاج کیا ہے ۔ پھر وہ اپنے کمرے میں لگی ہوئی ڈاکٹر یوسف دادو اور ڈاکٹر نیکر کی تصویروں کو بڑی عقیدت کی نظروں سے دیکھنے لگتا ۔

تیسرا اعظم پرویز جو افسانہ نگار تھا۔ سارے لوگ اس سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ اپنے کسی افسانے میں ان کے چہروں سے نقاب نہ اٹھا دے۔ وہ کوئی ایسا بڑا افسانہ نگار نہ تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں اپنے آپ کو چیخوف اور موپساں سے کم نہ سمجھتا تھا۔ کہیں سے تھوڑی سی ٹوٹی پھوٹی بنگلہ سیکھ لی تھی اور ہر دم ٹیگور اور نذرل کی باتیں کیا کرتا۔ کچھ بڑے مصنفین کے اقتباسات یاد کر لئے تھے جس سے ہر نئے ملنے والے پر رعب جمایا کرتا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت لگاتا تھا۔ لیکن پارٹی کا بہت پرخلوص ممبر تھا۔ غرض کہ ۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

اعظم پرویز کے علاوہ اور بہت سے ممبر تھے۔ ایک غازی پور کا لڑکا تھا جس کا نام سارے ممبروں نے مل کر جان گلپن رکھ چھوڑا تھا۔ وہ ایک ہی شاطر تھا۔ کبھی اپنے راز کو کھلنے نہ دیتا۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو ہمیشہ گول کر جاتا۔ اس کو دنیا میں صرف دو ہی کام آتے تھے۔ ایک تو طوائفوں سے فلرٹ کرنا اور دوسرے سیٹی بجانا۔ اس کے علاوہ ایک آسامی لڑکا تھا جو سب کو اپنی زبان کی گالیاں سکھاتا تھا اور فارسی میں ایم اے کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک اور لڑکا تھا تنویر جو ہمیشہ اپنی محبوبہ کی باتیں کرتا تھا جو بمبئی میں کئی آدمیوں سے بیک وقت عشق لڑا رہی تھی۔

ہاں! یاد آیا۔ ایک سردار بھی تھا۔ وہ سندھی ریفیوجی تھا اور جالندھر سے ایم، اے اور ایل ایل۔ بی کرنے وہاں چلا آیا تھا۔ پہلے اس سے تمام لوگ بہت بھڑکتے تھے اور کٹے کٹے رہتے تھے اور وہ حیران کہ آخر یہ لوگ مجھ سے اس قدر دور دور کیوں رہتے ہیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ تو بہت ہی سویٹ ہے، ان ہی کی برادری کا آدمی ہے اور پارٹی کا بہت اچھا ممبر ثابت ہو سکتا ہے۔ وہ ہر پندرھویں دن پابندی کے ساتھ بک اسٹال سے سویٹ لینڈ" خریدتا اور ہوسٹل کے سارے لڑکوں میں اس کو پھراتا۔ وہ "امن کا سپاہی" بھی تھا۔ اس کو سب "پنجاب کا البیلا" کہتے تھے۔

پھر تھے نصیر زبیری اور راس کی "نان سیریس پارٹی" کے اراکین۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ اپنے اپنے فن میں طاق۔ زندگی کو کھیل سمجھنے کے آرٹ کے ماہر۔ کتنی ہی بڑی مصیبت آئے، کتنی ہی گمبھیر صورت حال پیدا ہو جائے کیا مجال جو کسی کے ماتھے پر ذرا بھی شکن آ جائے۔ اپنے اوپر "غیر سنجیدگی" کا لیبل تو ان سب نے یوں ہی لگا رکھا تھا کیونکہ وہ کونسا ایسا کام نہیں کرتے تھے جو صرف بڑے ہی "بقراط" قسم کے لوگ کرتے ہیں۔ سیاست میں ان کو دخل۔ مذہب میں ان کو دسترس۔ جنوبی ہند میں کمیونزم کے بڑھاؤ سے لے کر ہندوستان کے غذائی بحران، روس، نئے چین، برما، فرانس، مارشل ایڈ، کوریا۔ جنوبی افریقہ میں نسلی امتیاز، احمد عباس اور کرشن چندر پر وہ بڑی عالمانہ گفتگو کر سکتے تھے۔ نصیر زبیری اور جان گلپن لکھنؤ تقریری مقابلے میں گئے تو وہاں سے خوب بڑی سی چاندی کی ٹرافی جیت لائے اور پہلا انعام بھی جنوبی افریقہ والے لڑکے اور اعظم پرویز نے جو انگریزی میں مضامین لکھنے شروع کئے تو ان کے سارے قلم گھس گئے۔ سردار جو اپنی صافی اور داڑھی کو سنوارنے میں زیادہ لگا رہتا تھا اس نے اگر کچھ نہیں کیا تو کیا کم کیا کہ پنجابی کے بہت سارے گیت لکھ مارے اور روس اور نئے چین پر پچیسوں[25] کتابیں پڑھ ڈالیں۔ اور اعظم پرویز نے افسانے لکھ لکھ کر لوگوں کا جوب منہ چڑایا۔

اصل میں ان سبھوں نے اپنے اوپر "غیر سنجیدگی" کا لیبل ایک خاص وجہ سے لگایا تھا۔ وہ اپنے ماحول سے سخت ناآسودہ تھے۔ وہ اپنے سماج کی غلط تقسیم اور فرسودہ بنیادوں سے بیزار تھے۔ وہ یونیورسٹی کے پرانے تعلیمی نظام سے بھی خوش نہیں تھے، وہاں جتنے لوگ تھے وہ سب اپنے چہروں پر نقاب ڈالے ہوئے تھے۔ اندر کچھ، باہر کچھ اور۔ جو لوگ اشتراکی تھے وہ لیڈر زیادہ تھے اور اشتراکی کم اور دنیا کو صرف کتابوں اور اخباروں کے ساحل پر کھڑے ہو کر دیکھنے کے عادی تھے۔ سب تھیوری۔ عمل کچھ بھی نہیں۔ لڑکیاں تھیں، لڑکے تھے۔ لیکن سب اپنے ماحول سے اکتائے ہوئے۔ کسی سے پوچھو کہ آئندہ کیا کرو گے تو جواب ملتا دیکھئے کچھ نہیں معلوم کہ ہماری قسمت میں کیا ہے۔ ان کی کوئی زندگی نہیں تھی۔ صرف دکھاوا تھا۔

قدم قدم پر زندگی کی غلط اقدار کا پاس - اصل میں سب شو ہے - ملمع ہے - حقیقت کچھ نہیں - وہ سب ان باتوں سے نفرت کرتے تھے - چنانچہ ان کی "غیر سنجیدگی" ان کے ماحول پر ایک گہری طنز اور ایک کڑی تنقید تھی - ان کی "غیر سنجیدگی" میں زندگی کے لئے ایک نئے راستے کی تلاش تھی - اس دنیا سے ایک بہتر دنیا بنانے کے خوابوں کی کسک تھی، ایسی دنیا جو بناوٹ اور دکھاوے کی دنیا نہ ہو جس میں کوئی نسلی امتیاز، اونچ نیچ کا فرق، لوٹ کھسوٹ اور روپے سے پیدا ہونے والی برائیاں نہ ہوں - اور ساری دنیا ایک گھرانہ ایک خاندان ہو -

ان کا ایک مشترکہ کلب بھی تھا جس کو وہ بڑی شان سے "ہمارا اسکینڈل کلب" کہتے تھے - اس کا کام تھا ہر طرح کے اچھے برے معاملات پر بے لاگ تبصرہ کرنا - اس دنیا میں بہت سے واقعات ایسے بھی ہوتے ہیں جو بہت غور طلب ہوتے ہیں لیکن جن کی حقیقت نظروں سے اوجھل رہتی ہے - ایسے واقعات کی جانچ پڑتال کے لئے وہ باقاعدہ اپنے کلب کی طرف سے کمیشن مقرر کرتے اور جب صحیح واقعات کا پتہ چل جاتا تو وہ اس کو TOP SECRET کہتے - انہوں نے اپنے کلب کی شاخیں بمبئی اور دہلی میں بھی قائم کر رکھی تھیں - اس کا ایک ڈائرکٹر بھی ہوتا تھا - وہ بڑی پُراسرار شخصیت کا انسان تھا - کسی کو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں معلوم تھا - لیکن وہ تمام باتوں سے باخبر رہتا - اس کو تو یہاں تک معلوم رہتا تھا کہ کون سی لڑکی کس لڑکے سے آئندہ فلرٹ کرنے کا ارادہ رکھتی ہے -

یہ سب کے سب اکثر و بیشتر ہوسٹل کے ٹیرس پر اکٹھا ہوتے اور بڑی عجیب اور بے ہنگم بحثیں کرتے - اور جب کبھی ان کی بحث جھگڑے کا رخ اختیار کر لیتی تو نصیر زبیری چلا کر کہتا، - زندگی جھگڑوں کے لئے نہیں ہے! اور اس پر سب خاموش ہو جاتے - کبھی کبھی وہ خدا کے وجود سے لے کر عورت کے وجود تک پر بڑی گرماگرم بحث کرتے تو پاس ہی رہنے والا مولوی صورت لڑکا سوچنے لگتا کہ اے خدا یہ سب کم بخت کہاں بخشے جائیں گے - ایک دن جب وہ یونیورسٹی کی تمام لڑکیوں پر بے لاگ تبصرہ کر رہے تھے وہی مولوی صورت لڑکا جس کا نام شکیل اختر تھا مدینہ اخبار کی پرانی فائل پڑھتے پڑھتے ان کے پاس آیا اور بڑی بیزاری کے ساتھ ان سے کہنے لگا - کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو لڑکیوں کی باتیں نہ کرتا ہو، کیا یہاں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو ان خرافات کو چھوڑ کر سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کر سکتا ہو، نہ جانے کیا ہو گیا ہے ان سادے لوگوں کو - تو اس پر نصیر زبیری نے ذرا بناوٹی سنجیدگی سے کہا، مولانا شکیل! یہاں تو آپ کو شاید ہی کوئی ایسا آدمی مل سکے، آپ کیوں نہ ایک ترکیب کریں - اور وہ یہ کہ اپنے سامنے آئینہ رکھ کر باتیں کیا کریں - ہم تو لڑکیوں سے محبت کرتے ہیں - آپ چمکتے ہوئے ہلیٹوں اور پرانی کتابوں سے محبت کیجئے جیسا کہ رپرٹ بروک کیا کرتا تھا - اگر وہ شاعر آج زندہ ہوتا تو آپ کا بہترین دوست ثابت ہوتا لیکن افسوس کہ اس کو مرے ہوئے ایک زمانہ بیت چکا ہے - اس پر مولانا شکیل اختر پیر پٹک کر خفگی کے عالم میں وہاں سے چلے جاتے - اور وہ سب چلا اٹھتے کہ جلدی اب کوئی دوسری بات کرو، مولانا نے یہاں آ کر ساری فضا کو تقدس سے بھر دیا ہے - پھر ان میں سے کوئی کہتا:

"آج کے اسکینڈلز کیا ہیں"

پھر وہ خیال آرائیاں ہوتیں کہ بس مزہ ہی آ جاتا -

ان میں سے کوئی کہتا یہ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس ہفتے سلیم قدانی کی مشغولیت بہت بڑھ گئی ہے -

"وہ کیسے، بتاؤ؟" کوئی سوال کرتا - اور جواب ملتا ارے اس نے مونچھیں جو رکھ لی ہیں اور ہر دم دونوں ہاتھوں سے ان پر وہ تاؤ دیا کرتا ہے - اس کے متعلق دوسری اہم خبر یہ ہے کہ کل ۶ بجے شام سے اس پر عشق کے سخت دورے پڑ رہے ہیں - اس کے پاس لاہور کی ایک سنہری بالوں والی لڑکی نے اپنی تصویر بھیجی ہے -

اور تیسری گرم خبر یہ ہے کہ کامریڈ پھر خفا ہو گیا ہے - ابھی میرس روڈ سے دونوں گانا گاتے مسعود آتے ہیں تو ان سے پوچھا جائے گا - وہ سب

نیچے سائیکل سٹینڈ کے پاس کھڑے ہیں۔

"آصف! اے آصف! بولتے کیوں نہیں؟"

"کیا بولیں بھئی! کچھ سوچ رہا تھا" اس نے اپنا ہیٹ سر سے اتارتے ہوئے کہا۔

"تم جانتے ہو ہمارے ساتھی، کل رات سے کامریڈ پھر خفا ہو گیا ہے۔ ہم تو اس کے روز روز کے خفا ہو جانے کے عادی ہو چکے ہیں، لیکن وہ ہے کہ ہمارے ذہن کا کوئی ساتھی ہی نہیں ہوتا۔ تم اب کی بار مصالحت کرا دو۔ اگر ہم پھر لڑیں تو تم کبھی بیچ بچاؤ نہ کرنا۔"

"اچھا تو تم لوگ پھر لڑ پڑے!" آصف نے تعجب سے کہا۔

"لڑے کہاں تھے ہم بھئی! کچھ ذرا اس کی پارٹی کی پرانی پالیسی پر گفتگو ہو گئی تھی۔"

"میں نے کئی مرتبہ کہہ دیا کہ تم لوگ اس بیچارے سے اس موضوع پر بات ہی نہ کیا کرو۔ اس لئے کہ وہ اپنی پارٹی کی سابقہ حماقتوں پر سخت نادم ہے۔ اور ویسے بھی وہ اب تم لوگوں کو رجعت پسند نہیں کہتا۔ اب تو وہ جمہوری محاذ اور مشترکہ پلیٹ فارم کی باتیں کرتا ہے۔ اگر تم آج ہی امن کی اپیل پر دستخط کر دو تو وہ تم سے پھر خوش ہو جائے گا۔"

ایک دن کیا ہوا کہ یونیورسٹی کے کچھ مغرب پرست لوگوں نے مغربی موسیقی کا پروگرام کیا۔ اعظم پرویز اور مسعود انور بھی وہاں مدعو تھے۔ وہ وہاں گئے تو پروگرام شروع ہو چکا تھا۔ اور ریڈیو گرام پر کوئی ریکارڈ بج رہا تھا۔ کسی نے ان کو آکر بتایا کہ یہ آرنلڈ بیکس کا بنایا ہوا ایک راگ ہے۔ پھر اس کے قریب آکر کسی امریکی کانونٹ میں پڑھی ہوئی لڑکی نے خاص امریکی لہجے میں اس سے پوچھا۔

"آپ کو بیتھوون کی کون سی کمپوزیشن پسند ہے؟"

"کون سی؟ — جی مجھے تو سبھی پسند ہیں۔"

"اور موزارٹ اور آرنلڈ بیکس بھی پسند ہیں؟"

"جی ہاں۔ کیوں نہیں۔"

یہ سب جھوٹ تھا۔ اعظم پرویز کے باپ کو بھی مغربی موسیقی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس نے بیتھوون اور موزارٹ کے صرف نام ہی سُنے تھے۔ اور جتنے لوگ اس شام کے وقت وہاں موجود تھے ان میں سے کوئی بھی مغربی موسیقی سے واقف نہیں تھا۔ لیکن نہیں صاحب ہم ضرور یہ یقین دلائیں گے کہ ہم ویسٹرن میوزک کے تمام راگوں سے واقف ہیں اس لئے کہ جب سوسائٹی میں موزارٹ وغیرہ کا نام لیا جاتا ہے تو خواہ مخواہ بہت رعب پڑتا ہے)

اتنے میں ایک ٹھگنے قد کی خوبصورت بالوں والی لڑکی جو کشمیر سے آئی تھی اعظم پرویز کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اعظم پرویز سے آنکھیں جھپکا کر کچھ پوچھا۔ لیکن اعظم پرویز نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اور مسعود انور کے کان میں یہ کہا: "کیا اس کشمیری لڑکی کی جھپکتی ہوئی آنکھیں یہ کہتی ہیں کہ یہ دُنیا ایک واہمہ ہے۔ خواب و خیال ہے۔"

پھر وہ دونوں وہاں سے اُٹھ کر چلے آئے۔ شام ڈھل چکی تھی۔ اور اندھیرا چھا رہا تھا۔ وہ سردیوں کا زمانہ تھا۔ سڑک پر دونوں طرف لگے ہوئے درختوں کی پتیاں اوس کے غبار میں لپٹی ہوئی سو رہی تھیں۔ وہ دونوں سڑک پر ہوسٹل کی طرف چلے جا رہے تھے۔ مسعود انور نے یکایک سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "خندہ خاتون!" اعظم پرویز نے اس سے کہا۔ "آپ تو نہ جانے کہاں رہتی ہیں۔ آپ کے تو درشن ہی نہیں ہوتے۔" یہ سنتے ہی خندہ خاتون نے اپنا منہ بگاڑ لیا جیسے کوئی کڑوی چیز اس کی حلق میں اٹک گئی ہو۔ اس نے اپنی چمکیلی آنکھوں سے اس کی طرف گھور کر دیکھا گویا کہہ رہی ہو۔ یہ بھی

عجیب بات ہی بات ہے "تم سخت بدتمیز معلوم ہوتے ہو۔ راستے میں کسی لڑکی سے ایسی باتیں نہیں کرتے ہو۔
کہاں صاحب! ادرشن نہیں ہوتے۔ کوئی ہم بھی دیوی دیوتا ہیں کہ درشن دیتے پھریں۔ اس پر وہ ناراض ہو کر چلی گئی۔ وہ دونوں چلتے رہے۔ راستے بھر مسعود انور فرخندہ خاتون کی برائیاں کرتا رہا۔ پھر وہ دونوں ہوسٹل پہنچ گئے۔ مسعود انور اسی طرح بکتا رہا۔ آخرکار اعظم پرویز سے رہا نہ گیا۔ اس نے کہا: بھئی اس کے متعلق اس قسم باتیں نہ کیا کرو۔ تم جانتے ہو ایک زمانے میں اس کا گرفتار رہ چکا ہوں۔ وہ لڑکی ہے اصل میں بہت اچھی۔ تم سے گھنٹوں باتیں کرے گی۔ تم ذرا بھی بور نہیں محسوس کرو گے۔ بہترین مقرر ہے۔ اور کبھی میک اپ نہیں کرتی۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ذرا خوبصورت نہیں ہے تو کیا ہوا اس کا دماغ تو خوبصورت ہے۔

ارے یہ کیا بکواس مچا رکھی ہے اتنی دیر سے۔ کوئی اور بات کرو۔ یہ فرخندہ خاتون ہی کے پیچھے ہاتھ دھو کر تم دونوں کیوں پڑ گئے ہو جہاں گیر نے بجلی کے چولہے پر چائے کا پانی رکھتے ہوئے کہا۔ اچھا بتاؤ تمہارے اس نئے "ورک" کا کیا حال ہے۔ کچھ بات بنتی ہوئی نظر آتی ہے کہ نہیں۔ میں نے تو تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تم لاکھ کوشش کرو لیکن تم اس کے لکڑی کے جسم میں کوئی حرکت نہیں پیدا کر سکو گے۔ وہ یوں ہی بے حس و حرکت رہے گی اور تم اس کو اس طویل خواب سے جگانے کی کوشش کرتے رہو گے اور تمہارا وقت ضائع ہوتا رہے گا۔ ذرا سوچو تو کہ اس کو تم کتنے ناموں سے پکارتے ہو، مریم، انجیلا، مونالزا۔ اور میں کہتا ہوں کہ وہ اس دنیا کی لڑکی ہی نہیں۔ اور تم مانتے ہی نہیں اور اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہو۔

تم یہ سب باتیں اس لئے کہتے ہو کہ تم اس کو جانتے ہی نہیں۔ اعظم پرویز نے کہا۔ جانا تو کیا تم نے تو اس کو کبھی قریب سے بھی نہیں دیکھا ہے۔ اس کا معصوم چہرہ، اس کی معصوم آنکھیں، اس کے نازک ہونٹوں پر بہت کم آنے والی ہنسی تم نے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ کبھی تم اس کی شرمیلی آنکھوں سے کچھ کہتے اور وہ تمہارے سامنے خاموش بت بن کر بیٹھ جاتی اور اس کا چہرہ حیا کی آگ سے دہک اٹھتا تو تم ضرور یکایک اپنے آپ ہی کہہ اٹھتے "اک نگارِ آتشیں رخ . . . . ."

پھر تنویر جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا بولا: "دیکھو تم نے پھر وہی شاعری کی باتیں شروع کر دیں اور ہوا میں اڑنے لگے۔ اس دنیا میں رہ کر اس دنیا ہی کی باتیں کیا کرو۔ لیکن کرو گے بھی کیا؟ —— تمہارا دماغ ہی ایسا ہے جو ہمیشہ آسمان پر ہی رہتا ہے۔ ابھی کچھ دن ہوئے انجم بھی یہی کہہ رہا تھا کہ تم اس سوتی ہوئی لڑکی سے ایک طرح کی روحانی محبت کیا کرنے لگے ہو کہ کسی کو نگاہ ہی میں نہیں لاتے۔

اور نصیر زبیری چائے کی پیالیوں کو صاف کر کے میز پر رکھتے ہوئے چیخ کر بولا "جھوٹ۔ یہ سب جھوٹ ہے، فریب۔ یہ اعظم پرویز کسی سے محبت نہیں کرتا۔" "اک نگارِ آتشیں رخ" بالکل ہی ایک فرضی چیز ہے۔ یہ تو افسانہ نگار ہے۔ ایسی ہی کہانیاں گھڑتا رہتا ہے اور لوگوں کو مرعوب کرتا رہتا ہے۔ اس کے متعلق تو یہاں کے دو چرخ جیسے شاعروں نے ایک ہی بات کہی ہے کہ یہ کسی سے عشق کر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم اس سے ذرا سی بحث کرو تو صاف کہہ دے گا۔ کہ اک نگارِ آتشیں رخ تو میں نے زندگی کا سمبل بنا رکھا ہے۔

"تم چپ رہو۔ یہ باتیں تم کیا سمجھو؟" اعظم پرویز نے زبیری کو چڑاتے ہوئے کہا۔

"واہ! کیوں نہیں سمجھتا۔ دشت گزری ہے اسی عمر کی سیاحی میں۔"

"خوب وحشت گزری ہے۔" ذرا اس مصرع پر غور تو کرو۔

"ہاں تو کیا میں جھوٹ کہتا ہوں۔ بالکل میری وحشت گزری ہے۔ ارے معاف کرنا، عمر گزری ہے اسی دشت کی سیاحی میں۔ جلدی میں الٹے کہہ گیا تھا۔ ہاں تو جب میں حیدرآباد میں تھا تو ایک لڑکی مجھ سے پیار کرتی تھی۔ وہ مجھے اب بھی دل و جان سے چاہتی ہے اور برابر محبت

بہت خوبصورت ہے۔ وہ ڈاکٹری پڑھ رہی ہے۔ جب وہ لیڈی ڈاکٹر بن جائے گی تو میری اس کی شادی ہو جائے گی جو پہلے ہی سے طے ہے۔"

"ایک دن تمہاری آنکھیں کھل جائیں گی اور خواب ختم ہو جائے گا۔" اعظم پرویز نے مسکرا کر نصیر زبیری کو چھیڑتے ہوئے کہا۔ "اور دیکھو مجھ سے تم یہ سب یا اس قسم کی کوئی بات نہ کیا کرو۔ ورنہ کبھی کو اگر میں نے ان باتوں کو ملا کر کوئی افسانہ لکھ دیا تو تم بلا وجہ بدنام ہو جاؤ گے اور پھر تمہارا سارا عشق ہوا ہو جائے گا۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ لوگ مجھ سے کس قدر چڑتے رہتے ہیں۔ ابھی کل کی بات سنو۔ میں جن لکھنوی خاتون کو انگریزی پڑھانے وہ تین دن سے جاتا ہوں ان ہی سے متعلق یہ بات ہے۔ کل شام کو وہ بازار جانے کے لئے اپنے گھر سے نکل کر باہر آئیں اور اپنے ریشمی غرارے کے دونوں پائنچوں کو شستہ انداز سے چلتے اٹھا کر نہایت تکلف سے کہا "اللہ! علی گڑھ میں کتنی دھول اور گرد ہے۔ ہمارا لکھنؤ کتنا صاف ہے۔" میں بھی وہیں کھڑا تھا۔ اور جب میں نے ان کے غرارے کو غور سے دیکھا تو ان کے جائی جان کا رنگ گھبرا سے گئے۔"

"تمہیں کچھ خبر بھی ہے۔" ان ہی دنوں میں سے ایک دن نصیر زبیری نے نمائش سے لوٹنے کے بعد کہا۔ "آج میں نے اپنی کپتان کو نمائش میں دیکھا۔ کچھ خاص بات نہیں۔ اس میں ہم کیا کریں اب تو اس سے پیار ہو ہی گیا۔"

اس پر سب نے ایک آواز ہو کر خطرے کی گھنٹی بجا دی۔ "خبردار!!۔ اوج انقلابی "لڑکیوں سے کبھی پیار نہ کرنا ورنہ جہاں خفا ہوئیں تمہارا گھر ہم سے اڑا دیں گی۔ ہم بات یہاں اپنے محبوب سے خفا ہو کر اس کو گھوڑے سمیت پتھر کا بنا دیتی ہیں۔"

وسط مارچ کی اس شام کو اعظم پرویز نے سوچا کہ یہ سب کچھ کتنا اچھا تھا۔ یہ سب کچھ ختم ہو گیا لیکن ایک دن میں نہیں۔ ایک عرصہ لگا ہے اس میں۔ بہت سی راتیں گزری ہیں۔ پھر دن نکلا ہے۔ اس طرح ہنستے کھیلتے چاندنی صورت جیسے دن بیت گئے۔ اس کے ساتھ جان گلین کی سیٹیاں بھی بند ہو گئیں۔ اب اس کی گونج ہوسٹل اور یونیورسٹی کے برآمدوں میں نہیں سنی جاتی۔ کچھ ہی دن ہوئے اس کو یکایک یہ خیال آیا کہ امتحان میں اب کتنے دن اور رہ گئے ہیں۔ وہ بالکل گھبرا گیا جس طرح پلیٹ فارم پر کھڑے ہوئے مسافر آتے ہوئے انجن کی دھمک سن کر پریشان ہو جاتے ہیں پھر اس کی سیٹیاں خلا میں گم ہو گئیں۔ اس نے کسی بھی لڑکی سے فلرٹ کرنے کی قسم کھالی یہ سوچ کر کہ پہلے امتحان پاس کریں پھر زندگی میں یہ کام کرتے رہیں گے۔ پھر وہ اپنی پڑھائی میں مصروف ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی اعظم پرویز، نصیر زبیری، سردار اور سارے لوگ اپنے اپنے کام میں لگ گئے۔

لیکن وسط مارچ کی وہ شام گزر چکی تھی۔ اور رات ہو چکی تھی۔ لڑکے گھوم گھام کر واپس آ چکے تھے۔ باہر اندھیرا تھا۔ ہوسٹل کے عقب میں اشوک کے درختوں کی اوٹ سے چاند اپنا خاموش چہرہ اوپر اٹھا رہا تھا۔

اب یہ سب ختم ہو گیا۔ تاہم یہ زندگی کا دور بہت یادگار رہے گا۔ اگرچہ یہ بیتے ہوئے دن رات اب لوٹ کر نہیں آئیں گے پھر بھی ان کی یاد ہمیشہ تڑپاتی رہے گی۔ لوگ لاکھ ہم کو کمینہ کہیں۔ برا کہیں اس لئے کہ اب ہم یہاں سے چلے جائیں گے۔ لیکن چاہے ہم یہاں ہوں یا نہ ہوں۔ لیکن زندگی تو اسی طرح رہے گی۔ کچھ دوسرے نصیر زبیری، اعظم پرویز اور جان گلین اور سردار یہاں آئیں گے اور اسی ٹیرس پر بیٹھ کر قہقہے لگائیں اور زندگی کا یہ عظیم تسلسل اسی طرح قائم رہے گا۔ اور یہ زندگی ہم جس کی پوجا کرتے ہیں یوں ہی ہنستی رہے گی۔ البتہ ہم یہاں نہ ہوں گے اس لئے کہ زندگی کے "نئے جنگلات اور نئے سرسبز چراگاہ ہمارے منتظر ہیں ۔۔۔"



میرزا ادیب

لہو اور قالین

افراد

(جس ترتیب سے اسٹیج پر آتے ہیں)

بابا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نوکر

تجمل ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک سرمایہ دار

اختر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مصور

رؤف ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تجمل کا پرائیویٹ سیکرٹری

منظر :۔ سردار تجمل حسین کی کوٹھی "انشاط" کا ایک وسیع کمرہ۔ یہ کمرہ اختر سٹوڈیو کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ نہایت اعلیٰ فرنیچر سے آراستہ، فرش پر قالین، دیواروں پر مشہور مصوروں کے شاہکار، ایک طرف ریڈیو سیٹ۔ کچھ فاصلے پر صوفہ سیٹ اور کرسیاں۔ شمالی دیوار کے ساتھ لگی ہوئی دونوں الماریوں میں مجلد کتابیں۔ کارنس اور تپائیوں کے اوپر تر و تازہ پھولوں میں مزین گلدان۔ دروازے اور کھڑکیوں پر ریشمی پردے۔ وسط میں ایزل۔ ایزل پر کینوس جو ابھی تک سادہ اور صاف ہے۔ قریب ایک تپائی پر رنگوں کے ڈبے، چینی کی چھوٹی چھوٹی پیالیاں، طرح طرح کے قلم اور مصوری کا دوسرا سامان۔

گرمیوں کے ابتدائی زمانے کی ایک صبح روشندانوں میں سے دھوپ اندر آ رہی ہے۔

جب پردہ اٹھتا ہے تو بابا جھاڑن سے کمرے کی چیزیں صاف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ دو چار لمحوں کے بعد تجمل آتا ہے۔ تجمل کی عمر ۴۰ اور ۴۵ کے درمیان ہوگی۔ صحت نہایت اچھی۔ جسم پر قیمتی سوٹ۔

تجمل :۔ یہ اختر کہاں ہے بابا؟

بابا :۔ اُدھر باغ میں ہیں سرکار!

تجمل :۔ ابھی تک باغ میں۔ وہاں کیا کر رہے ہیں؟

بابا :۔ ٹہل رہے ہیں۔ میں نے کہا ابھی سرکار ناشتہ تیار ہے اندر آ جائیں۔ مگر انہوں نے تو مجھے جھڑک دیا۔ ابھی تک مصروف ہیں (لیکن اسی پر ہیں۔ رات سرکار ۔۔۔ خاموش ہو جاتا ہے)

تجمل :۔ بات کیا؟

بابا :۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔ ہوا یہ سرکار کہ میری اچانک آنکھ کھل گئی۔ دیکھتا کیا ہوں کہ باغ میں کوئی شخص گھوم رہا ہے۔ سمجھا چور ہے۔ شور

جیسے بھولا ہوا تھا کہ اختر میاں کے ہاتھ میں ان کی چھڑی نظر آگئی ۔
تجمل :۔ اس قسم کے لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے۔ ہر وقت کسی نہ کسی سوچ میں ڈوبے رہتے ہیں۔ الگ تھلگ رہنا چاہتے ہیں۔
بابا :۔ سرکار میں تو نہ خود یہاں آتا ہوں اور نہ کسی کو یہاں آنے دیتا ہوں۔ ذرا صفائی کے لئے پانچ دس منٹ کے لئے آجاتا ہوں یہیں کہا سرکار نے
تجمل :۔ کیا ہے؟
بابا :۔ شاید کچھ پریشان ہیں چند روز سے۔
تجمل :۔ پھر وہی بات۔ ایک بار کہہ جو دیا تم فنکاروں کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ ہر وقت یونہی پریشان رہتے ہیں۔
بابا :۔ (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) اچھا سرکار!
تجمل :۔ بلاؤ انہیں۔ جلدی کرو۔
بابا :۔ بہتر!

(بابا کمرے سے نکل جاتا ہے۔ تجمل آگے بڑھ کر کینوس کو دیکھنے لگتا ہے۔ اختر آتا ہے
ادھیڑ عمر کا شخص۔ سر کے بال بکھرے ہوئے۔ آنکھیں شب بیداری کی وجہ سے سرخ
لباس پاجامہ اور قمیص۔ آستینیں چڑھی ہوئیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے زیادہ نمایاں)

اختر :۔ (تجمل کی طرف دیکھے بغیر) کہیئے!
تجمل :۔ بڑی دیر تک ٹہلتے رہے ہو آج۔
اختر :۔ جی ہاں۔
تجمل :۔ ایک بہت بڑی خوشخبری سنانے آیا ہوں تمہیں۔ ابھی ابھی میرے ایک دوست نے فون کیا ہے۔ ججوں نے تمہاری تصویر کو اول انعام کا
مستحق قرار دیا ہے۔ میں نے تفصیل معلوم کرنے کے لئے رؤف کو بھیج دیا ہے۔ ابھی آجائے گا۔
اختر :۔ مجھے اخبار سے معلوم ہو چکا ہے۔
تجمل :۔ (اختر کی بے نیازی پر متعجب) تمہیں اس کا علم تھا اور ———
اختر :۔ اخبار صبح سویرے مل جاتا ہے۔
تجمل :۔ تمہیں یہ خبر سن کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیئے تھی۔ میرا خیال ہے یہ تمہارا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

(اختر خاموش ہے)

تم نے ملک کے تمام مصوروں کے مقابلے میں یہ انعام جیتا ہے۔ یہ کوئی معمولی اعزاز نہیں ہے۔ میں نے اس خوشی پر آج شام چائے کا اہتمام
کیا ہے۔ تمہیں مبارک باد دینے شہر کے معززین آرہے ہیں۔ سنا تم نے۔

(اختر خاموش ہے)

کیا کہا؟
اختر :۔ کچھ نہیں۔

تجمل ۔ کچھ نہیں (اختر کے چہرے کو غور سے دیکھ کر) شاید بابا نے غلط نہیں کہا تھا۔ معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

اختر۔ جی نہیں۔

تجمل:۔ اس نے کہا تھا (مسکرا کر) ہمارے مصور کے ساتھ کچھ گڑبڑ ہے ان دنوں۔ تمہارا کیا خیال ہے اپنا؟

اختر: صحیح کہا تھا اس نے!

تجمل:۔ یعنی کہ

اختر:۔ یہی کہ یہاں سے رخصت ہونا چاہتا ہوں۔

تجمل:۔ کیا کہا؟ (لہجے میں حیرت) رخصت ہونے کی ضرورت؟

اختر:۔ میرا دل چاہتا ہے۔

تجمل:۔ کوئی شکایت؟ کوئی تکلیف!!

اختر:۔ کوئی شکایت نہیں۔

تجمل:۔ پھر بات کیا ہے؟ اگر کوئی تکلیف ہے تو صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیتے۔ تمہارے لئے کیا کچھ نہیں کیا گیا۔ اور کیا کچھ نہیں کیا جائے گا۔

اختر:۔ میں اس کے لئے آپ کا شکر گزار ہوں، پھر بھی

تجمل:۔ پھر بھی کا کیا مطلب؟

اختر:۔ مجھے جانا ہی چاہئے۔

تجمل:۔ بے وقوف نہ بنو اختر۔ یہ بیٹھے بیٹھے آج تمہیں کیا ہو گیا ہے؟

اختر:۔ اس کا جواب دے چکا ہوں۔

تجمل:۔ اگر تمہیں کچھ نہیں ہوا تو اس بے وقوفی کی وجہ؟ ذرا سوچو تو۔ یہاں آکر تم نے کتنے بڑے کارنامے انجام دیئے ہیں۔ کتنی زبردست قدر و منزلت حاصل کی ہے۔ اس سے بڑی عزت کیا ہوگی کہ آج تم ملک کے بہترین مصور سمجھے جاتے ہو۔ اور کیا چاہئے تمہیں۔

اختر:۔ اس کے لئے میں آپ کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تجمل:۔ مجھے شکریے کی ضرورت نہیں۔ صاف صاف بتاؤ تمہیں تکلیف کیا ہے۔ کس چیز کی کمی محسوس ہوتی ہے۔ اور کیا چاہئے تمہیں؟

اختر:۔ مجھے کچھ نہیں چاہئے۔ رخصت ہونے کی اجازت دیجئے۔

تجمل:۔ میں اس پاگل پن کی اجازت کبھی نہیں دے سکتا۔

اختر:۔ آخر کیوں؟

تجمل:۔ اس پاگل پن کی اجازت کیونکر دے سکتا ہوں؟

(اختر خاموش رہتا ہے)

سنا ہے آرٹسٹوں پر کبھی کبھی دورے پڑتے ہیں۔ شاید (اختر کی [illegible]۔ اختر کا چہرہ بدستور سنجیدہ ہے) کچھ اس قسم کی بات معلوم ہوتی ہے۔

اختر:- [illegible] دیجیے۔

تجمل:- کیا تماشہ ہے ایک شخص کو دلدل سے نکالا جاتا ہے۔ اور جب وہ کامیاب ہو جاتا ہے تو پھر اسی دلدل میں جا گرنے کا نے پکارا ہو جاتا ہے۔

اختر:- میرے [illegible] بس میں ہے کہ یہاں سے چلا جاؤں۔

تجمل:- تم کیا بات کرتے ہو۔ یہاں آنے سے پہلے بھی تمہارے پاس فن تھا۔ اور آج بھی ہے۔ مگر دونوں میں کتنا فرق ہے، تم خود نہیں جانتے یا فرق۔

اختر:- کیا آپ سمجھتے ہیں میں آپ کا شکر گزار نہیں ہوں!

تجمل:- اختر!

اختر:- فرمایئے۔

تجمل:- اگر تم سنجیدگی سے یہ بات کر رہے ہو تو سن لو۔ میں تمہیں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ یہ میری توہین ہے۔ لوگ کیا کہیں گے؟

اختر:- لوگوں کو میرے اور آپ کے ذاتی معاملے سے کیا واسطہ۔

تجمل:- تم دنیا سے الگ تھلگ رہ کر مصوری کرتے رہتے ہو، تمہیں معلوم نہیں لوگ اس قسم کے واقعے پر کیا کہا کرتے ہیں۔ سب کہیں گے ایک غریب اور قلاش مصور کو جھونپڑی میں سے نکال کر لایا دکھانے کے لئے اور پھر اسے واپس بھیج دیا گیا یہ میری توہین نہیں ہے۔

اختر:- (چونک کر) توہین۔ توہین کیسی!

تجمل:- اتنی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتے۔

اختر:- صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔ اور اب میں آپ کے رحم و کرم پر ہوں۔

تجمل:- یہ بات نہیں ہے اختر (ملامت سے) غور تو کرو۔ کتنی عجیب حالت ہو گی میری۔ میں نے فرداً فرداً کئی دوستوں کو چائے کی دعوت دی ہے۔ وہ ضرور شام کو آئیں گے۔

اختر:- میرے جانے یا نہ جانے سے اس دعوت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟

تجمل:- میں سمجھتا ہوں نا فرق پڑتا ہے۔ اب اس پاگل پن کو چھوڑو اور اطمینان کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔

اختر:- آپ مجھے اس طرح روک نہیں سکتے۔

تجمل:- روک نہیں سکتے۔ خوب۔ جس شخص کو میں اپنا سمجھ رہا ہوں اس پر مجھے اتنا حق بھی نہیں ہے کہ اسے کسی پاگل پن سے روک سکوں۔ آج تم اتنی بلندیوں پر پہنچ گئے ہو اس لئے جانا چاہتے ہو۔ تمہیں اس بات کا احساس نہیں کہ تمہیں ان بلندیوں تک پہنچانے میں میں نے بھی کچھ حصہ لیا ہے۔

اختر:- آپ اصرار کرتے ہیں تو سنئے جس اختر کو آپ ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی سے نکال کر اپنے محل میں لائے تھے وہ مصور اختر مر چکا ہے۔ اور جو شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے اور جس کے لئے یہ شاندار سٹوڈیو بنایا گیا ہے وہ اس کی چلتی پھرتی لاش ہے۔

تجمل:- معلوم ہوتا ہے دورہ بہت شدید ہے۔ مجھے ڈاکٹر کو فون کرنا چاہیئے۔

(تجمل جانے لگتا ہے۔ اختر اس کے سامنے کھڑا ہو جاتا ہے)

اختر:- (بھیجے میں کسی قدر تحکم) ٹھہریئے اور سب کچھ سن کر جایئے۔ میں نے اپنی زندگی کی سب سے بڑی حقیقت بیان کر دی ہے۔

تجمل:۔ یہ سب سے بڑی حقیقت ہے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ ڈاکٹر کو کرنا چاہئے۔

اختر:۔ آپ ابھی تک اسے ایک مذاق سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ میں بالکل سنجیدہ ہوں۔ ابھی تک آپ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھ رہے ہیں اور اب اس کا دوسرا رخ دیکھئے جو اتنا بھیانک اور اتنا خوفناک ہے کہ آپ کے تصورات کا شیش محل ابھی زمین بوس ہو جائے گا۔ گزشتہ دو برس میں جتنی تصویریں میرے نام کے ساتھ اس شاندار محل سے باہر گئی ہیں ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔

تجمل:۔ (اختر کو گھورتے ہوئے) معاملہ اتنی دور تک جا پہنچے گا مجھے اس کا وہم و گمان بھی نہیں تھا۔ اختر میرا مشورہ یہ ہے کہ اس وقت آرام کرو۔ تمہیں مکمل آرام کی سخت ضرورت ہے۔

اختر:۔ ذرا تحمل سے کام لیجئے۔ مجھے جو کچھ کہنا ہے کہنے دیجئے۔

تجمل:۔ تم پاگلوں کی سی باتیں کر رہے ہو۔ تحمل سے کام خاک لوں!

اختر:۔ جب آپ کو پوری حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ اس وقت فیصلہ کیجئے کہ یہ پاگل پن ہے یا کچھ اور۔

تجمل:۔ یہ پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ آخر گزشتہ دو سال سے تم میرے مہمان ہو۔ اس دوران میں تم نے کئی تصویریں بنائی ہیں جو شہر کے معزز لوگوں کی کوٹھیوں میں آویزاں ہیں۔ ان میں سے اکثر میں نے تحفتاً اپنے دوستوں کو دی ہیں۔ یہ سب کی سب تمہاری ہیں تمہاری اپنی تخلیق ہیں۔ لیکن آج تم کہہ رہے ہو ان میں سے ایک بھی میری نہیں ہے۔ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا۔

اختر:۔ مجھے اس کی پروا نہیں کہ کوئی اور سنے گا تو کیا کہے گا۔ میرے لئے یہ کشمکش ناقابلِ برداشت ہو چکی ہے۔ اس خلش نے مجھے بے قرار کر دیا ہے۔ یہ فریب اب زندہ نہیں رہ سکتا۔

تجمل:۔ فریب؟ آج تمہیں کیا ہو گیا ہے اختر۔ کاش میں کچھ سمجھ سکتا کہ تمہاری اس پریشانی کی وجہ کیا ہے۔ ڈاکٹر کو تم بلانے نہیں دیتے۔ میں کیا مجبور ہوں آخر!

اختر:۔ آپ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ یہ کوئی معمہ نہیں ہے۔ سنئے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں آج سے دو سال پہلے میں ایک تنگ و تاریک گلی کے ایک خستہ اور بدنما مکان میں رہتا تھا۔ بہت کم لوگ مجھے جانتے تھے۔ اور جو جانتے تھے انہیں میرے متعلق صرف یہی معلوم تھا کہ میں ایک مفلس و قلاش اور گمنام مصور ہوں۔ میں نے بے شمار تصویریں بنائی تھیں مگر وہ تمام کی تمام کباڑیوں یا نیلام گھروں میں پہنچ کر کوڑیوں کے بھاؤ بک چکی تھیں۔ زندگی اسی حالت میں گزر رہی تھی کہ اتفاقاً تصویروں کی ایک نمائش گاہ میں میری آپ سے ملاقات ہو گئی۔ آپ نے میری تصویروں میں دلچسپی لی اور مجھے اسی شام کو اپنے ہاں چائے پر بلا لیا۔ میں اپنے ہزاروں ہم پیشہ بھائیوں کی طرح غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو چھپی رہ سکتی۔ آپ نے میری حالت کا اندازہ لگا لیا۔ اور اس بات پر اصرار کیا کہ میں اپنے غربت کدے سے نکل کر آپ کے ہاں آ جاؤں۔ تاکہ اطمینان کے ساتھ فن کی خدمت کر سکوں۔ آپ نے میرے لئے یہ کمرہ وقف کر دیا اور مجھے زندگی کی ضروریات سے بے نیاز کر دیا۔

تجمل:۔ ان باتوں کے ذکر کی کیا ضرورت ہے۔

اختر:۔ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے سلوک نے مجھ پر کتنا اثر ڈالا۔ میں سمجھنے لگا آپ نہایت اونچے درجے کے انسان ہیں۔ دولت مند ہونے کے باوجود آپ کے پہلو میں ایک ایسا دل دھڑک رہا ہے جو انسانیت نواز ہے جس میں ساری دنیا کا درد سمایا ہوا ہے۔ آپ نے اپنے دوستوں کو بلا کر انہیں میری تصویریں دکھائیں۔ آپ نے بڑے بڑے اداروں کے دفتروں میں میری تصویریں آویزاں کرائیں۔ آپ نے میری شہرت کے لئے میری تخلیقات رسائل و جرائد میں چھپوائیں۔ سچ مچ اس وقت آپ میری نظروں میں ایک دیوتا تھے۔ ایک فرشتہ تھے، ایک ایسی ہستی تھے جس کی تعریف ہمارے

تصویروں اور کہانیوں میں کی گئی ہے۔

تجمل:۔ میں نہیں سمجھ سکتا اس ذکر سے تمہارا مقصد کیا ہے؟

اختر: مگر تھوڑے عرصے بعد ہی ایک بھیانک خیال اپنا منحوس سایہ میرے ذہن میں ڈالنے لگا۔ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں نے آپ کی ذات کے بارے میں جو کچھ سوچا ہے وہ محض میری اپنی خوش فہمی ہے حقیقت کچھ اور ہے۔

تجمل:۔ کیا مطلب؟

اختر: مجھ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ آپ کی سرپرستی تو محض ایک التباس ہے آپ کی مصور نواز شخصیت کا۔ اس سرپرستی میں آپ کا ایک خاص مقصد چھپا ہوا ہے۔

تجمل:۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟

اختر: آپ مجھے نواز رہے تھے مگر ایک خاص مقصد کی خاطر، اور وہ مقصد یہ تھا کہ آپ سوسائٹی کو بتانا چاہتے تھے: دیکھو میں کتنا اچھا ہوں میں نے ایک غریب اور مفلس مصور کو اپنے ہاں پناہ دی ہے، اب یہ جو کچھ بنا رہا ہے وہ محض میری سرپرستی کا نتیجہ ہے۔ میں نے اس کی صلاحیتوں کو زندہ رکھا ہے ورنہ یہ کب کی ختم ہو چکی ہوتیں ——— جس طرح بڑی بڑی دکانوں کے دروازوں پر انسانی پیکروں کو نہایت خوبصورت اور شفاف لباس پہنا کر انہیں الماریوں کے اندر سجا دیا جاتا ہے تاکہ لوگ ان حسین و جمیل مجسموں کو دیکھ کر دکانداروں کے اعلیٰ ذوق اور ان کی شان و شوکت سے مرعوب ہو جائیں۔ اسی طرح آپ بھی اپنی امارت اور اپنی شخصیت کی نمائش کے لئے میری ذات کو میرے فن کو استعمال کر رہے تھے۔

تجمل:۔ (غصے سے) یہ جھوٹ ہے ——— سراسر جھوٹ ہے۔

اختر: اور آپ کہہ بھی کیا سکتے ہیں۔ مگر بلند آواز سے حقیقت نہیں بدل سکتی۔ آپ کے یہاں میری یہی حیثیت تھی۔ اور جس وقت مجھے اس کا احساس ہوا مجھے محسوس ہوا جیسے میری انگلیوں پر برف کی تہہ جم گئی ہے۔ میرے سینے میں ایک بھی شرارہ باقی نہیں رہا۔ یہ احساس میرے لئے سوہانِ روح ثابت ہو رہا تھا کہ اپنے جگر کا خون دے دے کر میں نے فن کی جس شمع کو اب تک روشن رکھا ہے اس کا مقصد آپ کی شاندار کوٹھی اور آپ کی شخصیت کو سجانے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ ایک فنکار یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا فن اپنا اصلی جوہر کھو کر کسی کے لئے محض ایک ذریعہ شہرت بن کر رہ جائے ——— انہی دنوں مجھے ایک ہم پیشہ دوست مل گیا جو بدستور غربت کی چکی میں پس رہا تھا۔ میں نے اسے اپنی ذہنی کیفیت بتائی۔ اور التجا کی کہ وہ مجھے اپنے ہاں رہنے کی جگہ دے دے۔ یہ سن کر اس نے کہا۔ دیکھو اگر تم آجکل تصویریں نہیں بنا سکتے تو کوئی حرج کی بات نہیں تمہارے لئے میں تصویریں بناتا رہوں گا۔ تم مجھے اتنے پیسے دے دیا کرو کہ میں اور میرا خاندان عزت و آبرو میں زندہ رہ سکیں۔ یہ تجویز میرے لئے ناقابل برداشت تھی۔ مگر اس کا اصرار کم نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح وہ کھیل شروع ہو گیا جو دنیا کا سب سے گندہ اور ذلیل کھیل ہے۔ مجھے یہاں پیسے حاصل کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ یہ روپے میں اسے دے دیتا تھا اور وہ مجھے اپنی تصویریں ——— ان تصویروں کو میں ———

تجمل:۔ ان تصویروں کو تم

اختر: اپنی تخلیق بنا کر پیش کر دیتا تھا

(تجمل اس انداز سے اختر کو دیکھتا ہے جیسے ان الفاظ سے اسے دھچکا سا لگا ہو)

تجمل:۔ تم مجھے دھوکہ دیتے رہے اب تک۔

اختر:۔ دھوکا کیا اور بہرحال واقعہ یہ ہے کہ نیازی کو دھوکا دیتا رہا اور یہ سب ہے۔ مجھے بنی بنائی تصویریں اور آپ کو فن کی قدر افزائی اور مصورفازی کے لئے سوسائٹی میں عزت و احترام۔

تجمل:۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ تم اتنی پست سطح پر اُتر چکے ہو۔

اختر:۔ میں نے خود کبھی نہیں سوچا تھا۔ لیکن اس پست سطح پر اترنے کے لئے مجبور تھا۔ نیازی نے مجھے کئی تصویریں دی ہیں۔ یہ تصویریں آج آپ جیسے معزز لوگوں کے ڈرائنگ روموں کی زینت ہیں۔ وہ پہلے کی طرح مفلس نہیں ہے۔ وہ اپنی بہن کی شادی کر چکا ہے۔ اسے روٹی اور کپڑے کی بھی تکلیف نہیں۔ اب مالک مکان بھی اسے پریشان نہیں کرتا لیکن جانتا ہوں اس کے دل کی کیا کیفیت ہے۔ اپنی اولاد کو چند سکوں کے عوض دوسروں کو سونپ دینا ایک ایسا تکلیف دہ واقعہ ہے جس کا اندازہ آپ نہیں لگا سکتے۔ آج جب اس نے سنا ہوگا کہ اس کی بنائی ہوئی تصویر اول انعام کی مستحق قرار پائی ہے تو اس کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ وہ کیا سوچے گا۔ اسے کتنا دکھ ہوگا۔ میں اس تصور ہی سے کانپ جاتا ہوں۔

تجمل:۔ تو اب تک تم نے ہمیں دھوکے میں رکھا۔ اپنی نالائقی چھپانے کے لئے مجھے اتنی آسائشیں بےکار مہیا کی تھیں۔

اختر:۔ آپ ان کی قیمت وصول کر چکے ہیں۔ ہمیشہ کی طرح اس سودے میں آپ ہی کو فائدہ ہوا ہے۔

تجمل:۔ اس قدر فریب دینے کے بعد اپنے محسن کو جلی کٹی سناتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔

اختر:۔ مجھے شرم کیوں آئے گی۔ شرم تو آپ لوگوں کو آنی چاہئے جو بلندیوں پر پہنچنے کے لئے ہزاروں انسانوں کو اپنی سیڑھی بنا لیتے ہیں۔ جو ایک فن کار کی سرپرستی بھی کرتے ہیں تو اپنے مطلب کے لئے۔

تجمل:۔ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو کہ تم کیا ہو۔ احسان فراموش، چور، مجرم۔

اختر:۔ میں سب کچھ ہوں مگر تم۔ تم کیا ہو؟ یہ بھی تو کہو!

تجمل:۔ میں؟

اختر:۔ ہاں تم —— بتاؤ خاموش کیوں ہو۔ بتلاتے کیوں نہیں۔ دوسروں کے جرم دیکھ لیتے ہو۔ دوسروں کو مجرم کہتے ہو۔ مگر اپنے متعلق کچھ نہیں کہتے۔ بتاؤ کون ہو تم؟

(رؤف آتا ہے۔ دونوں خاموش ہو جاتے ہیں)

رؤف:۔ وہ خبر بالکل درست ہے جناب۔ پہلا انعام اختر صاحب ہی کو ملا ہے۔ یہ رہا چیک (جیب سے چیک نکالتا ہے) آپ ....

(دونوں کو اس حالت میں دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے)

تجمل:۔ تم جاؤ اس وقت۔

رؤف:۔ بہتر جناب! (رؤف دروازے کی طرف جانے لگتا ہے پھر ٹھہر جاتا ہے)

اوہ یاد آ گیا۔ مسٹر اختر آپ کا کوئی واقف کار راستے میں ملا تھا۔ اس نے ایک پیغام دیا ہے آپ کے نام۔ آپ کا کوئی مصور دوست تھا نا نیازی۔

اختر:۔ ہاں! کیا ہوا اسے۔ جلدی بتاؤ؟

رؤف:۔ افسوس آج صبح اس نے خودکشی کر لی۔

اختر:۔ خودکشی!

رؤف:۔ بچیاں ہسپتال میں جانے سے پہلے ہی مر چکا تھا۔

اختر:۔ (تجمل سے) سنا تم نے۔ ابھی پوچھ رہے تھے۔ میں کیا ہوں، اب تو تمہیں معلوم ہو گیا ہو گا کہ تم کیا ہو۔ تم قاتل ہو۔ تم نے قتل کیا ہے۔

تجمل:۔ (غصے سے گرج کر) بکواس بند کرو۔

اختر:۔ قانون تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔ مگر انسانیت کی نظروں میں تم قاتل ہو۔ تم نے دو قتل کئے ہیں۔ ایک مصور کے فن کو موت کے گھاٹ اتارا ہے، اور دوسرے مصور کی جان لے لی ہے۔ یہ قتل نہیں تو اور کیا ہے۔ اور قتل کیا ہوتا ہے!

تجمل:۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ کمینے۔ پاجی۔ احسان فراموش!

اختر:۔ میری زبان رک نہیں سکتی۔ میں چیخ چیخ کر کہوں گا۔ دیکھو لوگو! یہ قاتل ہے۔ اس کے ہاتھ خون میں رنگے ہوئے ہیں۔ یہ سوسائٹی کا خوفناک مجرم ہے۔ یہ ——

تجمل:۔ رؤف کھڑے کیوں ہو۔ اس پاجی کو دھکے دے دے کر نکال دو۔ لے جاؤ اسے پاگل خانے میں۔ پولیس کو ٹیلیفون کرو۔ یہ پاگل ہو گیا ہے۔ خطرناک پاگل ہے۔

(رؤف اختر کو دھکے دے کر باہر نکالنے لگتا ہے۔ اختر چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ تم قاتل ہو —— تم نے قتل کیا ہے —— میں خاموش نہیں رہوں گا —— یہ آواز آہستہ آہستہ ڈوبنے لگتی ہے تجمل دائیں ہاتھ کی انگلیوں سے پیشانی کا پسینہ پونچھتا ہے)

(پردہ گرتا ہے)

حفیظ ہوشیارپوری

نہ فریبِ دانہ و دام ہے نہ وہ شرطِ قیدِ مقام ہے
سرِ شاخسار ہیں آشیاں سرِ شاخسار قفس بھی ہیں

کہیں لگ نہ جائے چمن میں آگ ترے فسونِ بہار سے
وہی آتشِ گل و لالہ ہے وہی خار بھی وہی خس بھی ہیں

جنہیں دے گئی ہے پیامِ خواب صدائے کوچ کی دلکشی
پسِ کاروانِ بلاکشاں وہ ہلاکِ صوتِ جرس بھی ہیں

غمِ روزگار کی تلخیاں بھی نہ جن کو دل سے بھلا سکیں
مرے دردِ عشق کی یادگار حسیں وہ یک دو نفس بھی ہیں

جو ترے تبسمِ یک نفس کی تجلیوں کو ترس گئے
مری زندگی کے شمار میں وہ طویل و تیرہ برس بھی ہیں

یہ تمیزِ عشق و ہوس نہیں یہ حقیقتوں سے گریز ہے
جنہیں عشق سے سروکار ہے وہ ضرور اہلِ ہوس بھی ہیں



آج ہم رو سکے نہ جی بھر کر
رہ گئے کتنے راز سینے میں

اب کسی کا یہاں نہیں کوئی
موت کا سا ہے لطف جینے میں

دل ہے ویراں کہ اب نہیں باقی
دردِ غم تک اس آبگینے میں

سب کو دعوےٰ تھا ناخدائی کا
کتنے طوفاں اٹھے سفینے میں

کچھ غمِ عشق کے سوا بھی ہے
غمِ ہستی ترے خزینے میں



آغا صادق



صبحِ چمن یا شامِ قفس! کس پہ چلا ہے اپنا بس
دکھ کا زمانہ لمبے سال سکھ کی گھڑی دو چار نفس
ہائے وہ اُن کا وقتِ سفر بوجھل ہے اب تک نس نس
نازک ہونٹوں پر مسکان یا کچی کلیوں کا رس!
قافلے کتنی دُور گئے! گونج رہی ہے بانگِ جرس
شام و سحر کے وعدوں میں بیت گئے کتنے ہی برس
بَیر کی ناگن لہرا کر کتنے ہردوں کو گئی ڈس
تال تو سب سیراب ہوئے سوکھی کھیتی پر بھی برس

بھول ہی جاتے صادق کو
لیکن اُس کی بات کا رس!

عارف عبدالمتین

میں اضطرابِ امید اور سکونِ یاس بھی ہوں
میں جس سے دور ہوں عارفؔ اُسی کے پاس بھی ہوں

بجا کہ میرا شبستاں دھواں دھواں ہے مگر
میں تیرے حسنِ فروزاں کا ضو شناس بھی ہوں

غمِ حبیب لٹا کر غمِ جہاں پایا
میں آج خوش ہی نہیں ہوں بہت اُداس بھی ہوں

مری نگاہ میں شادابیٔ چمن ہی نہیں،
میں ریگزاروں کے تشنہ لبوں کی پیاس بھی ہوں

ترے شعور پہ ہے فیصلے کا دار و مدار
میں ورنہ ایک حقیقت بھی ہوں، قیاس بھی ہوں

مجھی سے جلوتِ ہستی، مجھی سے خلوتِ زیست
کہ میں حیات کا پیکر بھی ہوں، لباس بھی ہوں

میں اپنے عہد کا ماتم سہی مگر عارفؔ
میں آنے والے زمانے کے دل کی آس بھی ہوں

تمہاری دُھن میں جو دامن فگار گذرے ہیں
وہ اپنے حُسنِ نظر کا شکار گذرے ہیں

O

رہینِ رسمِ وفا ہیں وہی زمانے میں
جو بن کے دار و رسن کی بہار گذرے ہیں

O

بہائے شوق رہی ہے وہ رہگذر جس پر
گذر کے بھولے سے ہم بار بار گذرے ہیں

O

مقامِ ہوش میں دشوار تر تھے جو لمحے
رہِ جنوں میں وہی سازگار گذرے ہیں

O

خزاں بھی موت کو ڈھونڈے گی جن کی حسرت میں
چمن سے ایسے بھی کچھ گل عذار گذرے ہیں

O

دلیلِ صبحِ منوّر بجھے بجھے تارے
نصیبِ شب کے لئے سوگوار گذرے ہیں

O

سید فیضی

باغوں میں بہار آ چکی ہے خوں بن کے شفق نہا چکی ہے

پھولوں کی فسردگی نہ دیکھو، یہ آگ دیئے جلا چکی ہے

مشتاقِ نظر ہے خوں گرفتہ جیسے کہیں چوٹ کھا چکی ہے

ہر شاخِ چمن بہار ساماں دنیا یوں بھی جگمگا چکی ہے

لیکن یہ جنوں کی سادہ لوحی کتنے ہی فریب کھا چکی ہے

گل کر دو نظر فروز شمعیں رات اپنی کتھا سنا چکی ہے

یہ موجِ سبک خرامِ ساحل طوفان میں سر اٹھا چکی ہے

دیوار نہ سن سکے تو کہہ دوں اک بات لبوں تک آ چکی ہے

اے ساتھیو! قدم بڑھاؤ

منزل تو قریب آ [illegible]

لطف کیا ملے گا اب حالِ دل سنانے سے
جو گزر گئی دل پر تیرے مسکرانے سے

اس نے آزما کر بھی ہم کو باوفا پایا
جس کو بے وفا پایا ہم نے آزمانے سے

نیند اگر نہ آجاتی موت اگر نہ پا جاتی
حشر تک نہ اُٹھتے ہم تیرے آستانے سے

تھرتھری سی لہجے میں کپکپی سی ہونٹوں پر
اور بھی نمایاں ہے دردِ دل چھپانے سے

ہر کلی ہے پژمردہ گلستاں ہے افسردہ
اک ہمیں نہیں غمگیں آپ کے نہ آنے سے

اک نشہ سا طاری ہے روح کی فضاؤں پر
کتنی مستیاں بکھریں عشق کے فسانے سے

دل کی بے قراری کا اب سلیم کیا کیجے
جس نے ہم کو لوٹا ہے نت نئے بہانے سے

جمیل ملک

پلکوں پر کچھ دیپ سے جلے
آج وہ ہم سے روٹھ چلے

پہلے جب دل توڑ دیا۔
پھر کوئی کیوں ہاتھ ملے!

سب کا غم اپنا غم ہے
آپ کے غم میں کون جلے

ذوقِ سفر ہی کام آیا۔
ہم گِر گِر کر بھی سنبھلے

کندن بن کر چمکے گا،
دل سے کہہ دو خوب جلے

طوفاں سے الجھیں گے جمیل
ساحل کون چلے!

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود
ز حافظ

حفیظ ہوشیارپوری

تاریخِ وفات

چودھری برکت علی مرحوم

زدُنیا چودھری برکت علی رفت
شُد اُورا جنّت الفردوس ماوا
پئے تاریخِ اُو رضواں زِ جنّت
"بجنّت برکتِ مرحوم" گُفتنا
۱۳ ھ ۷۱

احمد ندیم قاسمی

ایک ادب دوست ناشر

اردو کے کلاسیکی ادب کو ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لینے کے سلسلے میں تاریخ ادب اُردو میں جو مقام منشی نول کشور آنجہانی اور ان کے مطبع کو حاصل ہے، تقریباً وہی مقام جدید ادب کی نشر و اشاعت کے ضمن میں چودھری برکت علی مرحوم کا ہے۔ "ادبِ لطیف" کی ادارت سنبھالنے سے پہلے مکتبہ اردو سے میرے افسانوں کے مجموعے "بگولے" اور "طلوع و غروب" شائع ہو چکے تھے، لیکن ان کتابوں کے معاملات کو میری طرف سے کرشن چندر نے طے کیا تھا اس لئے مکتبہ اردو کے مالکوں سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا موقع بہت کم ملا۔ ۱۹۴۲ء میں، جب میں "پھول" اور "تہذیبِ نسواں" کا ایڈیٹر تھا تو رسالہ "ادبِ لطیف" کی ترتیب بھی میرے سپرد کی گئی اور یوں مجھے چودھری برکت علی مرحوم کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ان دنوں "نیا ادارہ" اور "سویرا" کے مالک چودھری نذیر احمد (جو چودھری صاحب مرحوم کے بھتیجے ہیں) مکتبہ اردو کی ملکیت میں مرحوم چودھری صاحب کے ساتھ برابر کے حصہ دار تھے۔ میں نے دیکھا کہ ان دونوں ناشرین نے اپنے مکتبہ کے مختلف شعبوں کو اپنے درمیان کچھ یوں تقسیم کر رکھا تھا کہ چودھری نذیر احمد صاحب یا تو دفتر میں بیٹھے رہتے یا آس پاس کے مطابع یا خوش نویسوں کی بیٹھکوں کا چکر لگا آتے۔ لیکن چودھری برکت علی عموماً دن بھر غائب رہتے جب کبھی دوپہر کے بعد دفتر میں آتے تو ان کا چہرہ گرد سے اٹا ہوتا، سائیکل پر بھی دھول جمی ہوتی اور ہونٹ خشک ہوتے لیکن ان کے فلک شگاف قہقہوں اور گونجیلی آواز میں تھکن کے کوئی آثار نہ ہوتے۔ مجھے لوگوں کے نجی معاملات کو کھوجنے کی عادت نہیں، اس لئے مجھے چودھری صاحب کی ان مصروفیتوں کی نوعیت کا علم نہ ہو سکا۔ لیکن یہ بات تو واضح تھی کہ وہ مکتبہ کے لئے کاغذ یا مسودات کی فراہمی کے سلسلے میں دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہوں گے، پھر ان دنوں پنجاب بک ڈپو بھی محض انہی کی نگرانی میں چل رہا تھا۔ میں نے اس تمام دوران میں محسوس کیا کہ چودھری صاحب انتہا درجہ کے ان تھک کارکن ہیں، اور ان میں اتنی قوت اور توانائی ہے کہ وہ کسی بھی رکاوٹ سے ٹکر لینے کے فیصلے کو ملتوی نہیں کر سکتے۔ میں یہاں یہ ذکر نہیں کروں گا کہ مجھے ادبِ لطیف کی ادارت کا کیا معاوضہ ملتا تھا، یا یہ معاوضہ حاصل کرنے میں مجھے کتنے پاپڑ بیلنا پڑتے تھے، مکتبہ اردو کے اس رُخ کی تفصیل کسی اور وقت پر اٹھا رکھتا ہوں۔ یہاں مجھے چودھری صاحب کی شخصیت کے بارے میں اپنے تاثرات کو قلم بند کرنا ہے، اور اس سلسلے میں ان کی اشاعتی سرگرمیوں کو بطورِ خاص مدِ نظر رکھنا ہے۔

ادبِ لطیف کی ترتیب کے سلسلے میں انہوں نے مجھ سے کبھی کوئی بات نہ کی۔ ڈھائی برس کی اس مدت میں انہوں نے مجھے کسی ایک غزل، نظم یا افسانہ کی اشاعت پر ناراضگی اور کسی کی سفارش کی؛ البتہ ایک بار انہوں نے پریس میں میرا اداریہ دیکھ لیا اور نہایت دوستانہ طور پر صرف اتنا کہا کہ "آپ نے اس ایک صفحے میں "علامتِ لزوم" "ابہام" "تفہیم" اور "تشکیک" کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اور ایک ایسا ادبی رسالہ جسے دانشوروں کے علاوہ عوام بھی پڑھتے ہیں، اس بوجھ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔" بات معقول تھی۔ میں مان گیا اور جب میں نے ہنس کر اپنی غلطی تسلیم کی تو چودھری صاحب یکدم سنجیدہ ہو گئے اور بولے "قاسمی صاحب! آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ آپ کو یہ ذرا سا مشورہ دینے کے لئے میں نے کتنی بار کمر ہمت باندھی ہے مگر ہر بار اس خیال سے اس عزم کو ترک کر دیا کہ ادیب بے حد انفرادیت پسند ہوتا ہے، آپ برا مان جائیں گے۔" اور پھر قہقہہ لگا کر بولے "مجھے تو آپ کے ادیب ہونے کے بارے میں شبہ ہونے لگا ہے، ورنہ میں نے سنا تھا کہ تو ایسی ادیب کی ضد ہی رہتی ہے جو صنوبر کو ریگستانوں اور کیکر کو پہاڑوں کی چوٹیوں پر دکھاتا ہے اور اس پر اس کی خامی واضح کی جائے تو اسے تسلیم نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ میں نے تو ایسا ہی محسوس کیا تھا!"۔

اسی دوران میں ایک اور بڑا واقعہ سعادت حسن منٹو صاحب کے مشہور افسانے "بُو" کے خلاف فحاشی کا مقدمہ تھا۔ "بُو" کے شائع ہوتے ہی ادبِ لطیف کے

خلاف ایک وقت دو لہریں اٹھیں، "المائدہ" کے ایڈیٹر موسلے خاں کا عیسائیوں کی طرف سے ہندوستان گیر احتجاج اور اخباروں کی طرف سے اس رسالے پر فحاشی اور عریانی کی نشر و اشاعت کا الزام، سالنامہ ادبِ لطیف جس میں منٹو صاحب کا یہ افسانہ شائع ہوا آج تک رسالوں کی دنیا میں ایک حسین یادگار مانا جاتا ہے، سوچیے چودھری صاحب مرحوم، چودھری نذیر احمد اور میں "بُو" کی اشاعت کے الزام میں ضلع کچہری کے صحن میں گرفتار کر لئے گئے اور منٹو صاحب کو بمبئی سے پولیس کے ذریعے بلایا گیا تو چودھری صاحب مرحوم نے ایک بار بھی تو مجھ سے یہ نہ کہا کہ یہ افسانہ کیوں چھاپا گیا۔ انہوں نے نہایت خندہ پیشانی سے ان مصائب کا مقابلہ کیا اور سالنامے کی خوب صورت ترتیب کے صلے میں میرے حق الخدمت میں اضافہ کر دیا۔ مقدمے کے تمام اخراجات انہی نے برداشت کئے اور عدالت میں حاضری کے علاوہ میرا اور کسی پریشانی سے سابقہ نہ پڑا۔

ڈھائی برس کے اس عرصے میں میں نے دیکھا کہ چودھری صاحب نہایت زندہ دل انسان ہیں، وہ ایسا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے جب وہ کھل کر قہقہہ لگا سکیں، اور اس قہقہے میں سب کو شامل کر سکیں، انہیں علامہ اقبال اور مرزا غالب کے بے شمار اشعار یاد تھے اور گفتگو کے دوران میں ان اشعار کو موقع بموقع چسپاں کرتے تھے کہ سننے والا پھڑک اٹھتا تھا، ایک بار سی آئی ڈی کا ایک آدمی مکتبۂ اردو میں آیا اور بولا "قاسمی صاحب کہاں مل سکتے ہیں؟" میں نے اپنا تعارف کرایا تو اس نے میرے شعر و افسانہ کی قصیدہ خوانی شروع کر دی اور عقیدت کا ایسا زبردست مظاہرہ کیا کہ مجھے سخت کوفت ہونے لگی، اوپر سے چودھری صاحب آ گئے، وہ اُسے پہچانتے تھے یا پہچان گئے۔ بہرکیف انہوں نے اس سے "تشریف آوری" کا مقصد پوچھا، اور جب انہیں معلوم ہوا کہ وہ محض مجھے خراجِ عقیدت ادا کرنے آیا ہے تو مرحوم نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، کان پر ہاتھ رکھا اور پھیپھڑوں کی پوری قوت سے غالب کا یہ شعر پڑھا نہیں بلکہ گایا ؎

انہیں منظور اپنے زخمیوں کا دیکھ آنا تھا
اُٹھے تھے سیرِ گل کو، دیکھنا شوخی بہانے کی

اس کے بعد سی آئی ڈی کے ان صاحب نے صرف جلدی سے کہے ہوئے سلام علیکم پر اکتفا کی اور آئندہ کبھی ملنے کا وعدہ کر کے یوں گئے کہ پھر کبھی نہ ملے۔

نظریے کے لحاظ سے وہ شدید قسم کے سامراج دشمن تھے، اور اس معاملے میں اتنے نڈر اور بے باک کہ بعض اوقات ان کا سارا ادارہ ایک کچے دھاگے سے لٹکنے لگتا تھا مگر وہ پیچھے نہ ہٹتے تھے، چودھری محمد حسین مرحوم ان دنوں حکومت کی پریس برانچ کے انچارج تھے، چودھری برکت علی مرحوم نے ان سے جو ٹکریں لی ہیں، اور جس انداز سے ان کی زیادتیوں کا مقابلہ کیا ہے اسے جاننے والے بہت اچھی طرح جانتے ہیں، ہماری پریس برانچ عموماً ایک طرفہ تعاون کا مطالبہ کرتی ہے حالانکہ اگر حکومت عوام کا تعاون چاہتی ہے تو عوام کو حکومت کا تعاون بھی تو چاہیئے۔ اسی بنا پر ان دونوں چودھریوں میں وہ وہ جھڑپیں ہوئی ہیں کہ میزوں پر مکے پڑ رہے ہیں، آنکھوں میں خون اتر آیا ہے۔ جسم پر لرزہ طاری ہے۔ مگر ہار دونوں نہیں مانتے، اس لئے کہ دونوں جری تھے چودھری محمد حسین مرحوم کی جرأت کے پیچھے حکومت کی ساری مشینری تھی اور چودھری برکت علی مرحوم کے پاس ان کا یقینِ محکم تھا جو ایمان کا درجہ حاصل کر چکا تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مکتبۂ اردو کی بیشتر مطبوعات ترقی پسند ادب، اور ترقی پسند سیاست کی نمائندہ ہیں، مکتبۂ اردو نے جب اپنا اشاعتی پروگرام شروع کیا ہے تو کتابوں کی دنیا پر صرف ان ادیبوں کا قبضہ تھا جو یا تو اپنی متاع صرف کر چکے تھے، یا پرانی باتوں کو دہراتے چلے جا رہے تھے، اس وقت نئے ادیبوں کی تصانیف چھاپنا بڑے دل گردے کا کام تھا خصوصاً جب یہ ادیب "کمپنی کی حکومت" جیسی کتابیں لکھتے تھے اور ملک پر کمپنی ہی کے پوتے پڑپوتے حکمران تھے، یہ چودھری برکت علی مرحوم اور ان کے ساتھیوں ہی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ترقی پسند ادب کی تحریک کا بھرپور ساتھ دیا اور اردو ادب کو نئے، جاندار، توانا اور صحت مند ادب کے شہ پاروں سے مالا مال کر دیا۔ ورنہ کسی بھی ادیب میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ اپنی کتاب آپ ہی چھاپ کر آپ ہی بیچے، ساتھ ہی مکتبۂ اردو کتابوں کی گٹ اپ کے سلسلے میں بھی ایک انقلاب لے آیا، آج اگر اردو مطبوعات کا حسن بیرونی ملکوں سے بھی خراجِ تحسین وصول کر رہا ہے تو یہ وہ روایت ہے جسے چودھری برکت علی مرحوم نے شروع کیا

اور پھر سے مرتے دم تک جاری رکھا۔

گزشتہ رمضان المبارک کو یکم کو چودھری صاحب مرحوم نے مجھے پیغام بھیجا کہ آج شام کو انہیں مجھ سے چند اہم امور پر گفتگو کرنا ہے۔ اردو کے مشہور نقاد ممتاز حسین صاحب بھی اس روز میرے ہاں مقیم تھے، چودھری صاحب چار بجے کے قریب اپنی کار پر میرے ہاں تشریف لائے، ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے گرتی ہوئی صحت اور سفید ہوتے ہوئے بالوں کے بارے میں انہوں نے تشویش کا اظہار کیا اور پانچ بجے کے قریب وہ ممتاز صاحب کو اور مجھے اپنی کار میں بٹھا کر مسلم ٹاؤن کے قریب نہر کے کنارے لے گئے، راستے میں انہوں نے ہمیں اپنی کار میں لگے ہوئے ریڈیو سیٹ سے گیت سنائے۔ نہر کے کنارے دیر سے اتر کر چودھری صاحب نے چند امور پر گفتگو شروع کی۔ یہ امور واقعی بے حد اہم تھے۔ روزے کی وجہ سے ان کے ہونٹ تشویش ناک حد تک خشک ہو گئے تھے۔ اس لئے وہ بار بار اپنے ہونٹوں کو تر کرتے رہے اور بولتے رہے، ان کے سامنے ایک پروگرام تھا جس کی تین شقیں تھیں، ا۔ "نئے زاویئے" کی تیسری جلد کی ترتیب، اشاعت اور سلسلہ جاری رکھنے کا فیصلہ ۲۔ رسالہ ادب لطیف کے معیار میں مزید بلندی اور نکھار۔ ۳۔ کلاسیکل ادب اور جدید ترقی پسندانہ تصانیف کی باقاعدہ اشاعت۔

"نئے زاویے" کی مستقل ترتیب کا کام انہوں نے ممتاز صاحب کے اور میرے سپرد کیا، اور کہا کہ دو چار ابتدائی روزے گزر جائیں تو (ممتاز صاحب اسی شام کو کراچی واپس جا رہے تھے) وہ مجھ سے جملہ امور طے کر لیں گے اور اس کے بعد ترتیب کا کام شروع ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں انہوں نے پاکستان و ہند کے تمام اردو ادیبوں کا تعاون حاصل کرنے پر زور دیا، کرشن چندر کی تعریف میں وہ رطب اللسان تھے، انہوں نے اس روز یہاں تک کہہ دیا کہ مکتبۂ اردو ایسے عظیم ادارے کی تعمیر میں کرشن سے زیادہ شاید ہی کسی ادیب نے ان کا ساتھ دیا ہو۔ وہ کرشن چندر کے خلوص، ہمدردی اور انسان دوستی کی باتیں کر رہے تھے تو ان کی آنکھیں، جو اس روز زرد ہو رہی تھیں، چمک اٹھی تھیں۔

"ادب لطیف" کا ذکر چلا تو انہوں نے سب سے پہلے انجمن ترقی پسند مصنفین کے رویے کی شکایت کی اور کہا کہ دیکھ لیجئے، انجمن نے ہمارا بائیکاٹ کر دیا مگر زندگی اور ادب کی ترقی پسند قدروں پر میرا عقیدہ اتنا پختہ ہے کہ میں آپ لوگوں کے عتاب سے بوکھلایا نہیں بلکہ میرزا ادیب صاحب کی مدد سے ترقی پسند ادب ہی پیش کرتا رہا ہوں، اور واقعی ہمیں عقیدے کی پختگی کی ایسی مثالیں کم ہی ملیں گی۔ نومبر ۱۹۴۹ء کی پہلی کل پاکستان ترقی پسند مصنفین کانفرنس کے بعد چودھری صاحب مرحوم سے میرے بڑے بڑے معرکے رہے، یہ معرکے سب کے سب بالمشافہ ہوتے۔ چودھری صاحب کہتے تھے کہ آپ لوگ مکتبۂ اردو کی اور خود اپنی انجمن کی گذشتہ تیس سال کی روایات پر پانی پھیرنے لگے ہیں، اور میں کہتا تھا کہ ہمارا نظریہ ہو یا شخصیت یا ادارہ کسی کو جامد نہیں رہنا چاہیئے۔ اور آخر ان تمام گرجتے گرجتے مباحثوں کا انجام نہایت پُر تکلف چائے ہوتا تھا اور چودھری صاحب یہ کہہ کر بڑی خندہ پیشانی سے مجھے رخصت کرتے تھے کہ آپ جو بھی کہیں مجھے ضد ہے کہ میرا ادارہ اور میرا رسالہ ترقی پسند ہیں۔ اور ضد اگر صداقت پر مبنی ہو تو بڑی قوت ہے، یہ حضرت موسیٰ کی ضد ہی تو تھی کہ خدا انہیں اپنا جلوہ دکھانے پر مجبور ہو گیا! - بہرکیف اس روز اپنے گزشتہ جھگڑوں کو بھول کر ہم نے "ادب لطیف" کے بارے میں سوچا اس کی ادارت نہایت قابل ہاتھوں میں ہے صرف ہم سب کو مستقل اور مسلسل تعاون درکار تھا سو اس کا ہم نے وعدہ کیا اور یہ وعدہ آج چودھری صاحب کے انتقال کے بعد بھی قائم ہے، اس رسالے سے ہماری تحریک کا پورا ماضی وابستہ ہے، اور جب تک اس کی موجودہ ترقی پسندانہ، جمہوری اور آزاد خیالی کی پالیسی قائم رہتی ہے یہ وعدہ بھی قائم رہے گا۔

مطبوعات کے جدید پروگرام کے سلسلے میں ہم تفصیل سے باتیں نہ کر سکے کیونکہ افطار کا وقت قریب آ رہا تھا۔ ان باتوں کو دو چار روز بعد پر ملتوی کر کے ہم چودھری صاحب کے دیا شنکی مکان واقع ٹمپل روڈ پر آ گئے، وہاں سے ان کا ڈرائیور ہمیں نسبت روڈ پہنچا آیا، بعد میں معلوم ہوا کہ ہم سے جدا ہونے کے کوئی پندرہ منٹ بعد انہوں نے روزہ کھولا۔ بے ہوش ہو کر گر گئے، اور ایسے گرے کہ پھر نہ اٹھے۔ ایک نہایت مفید اور مصروف زندگی کا یہ قبل از وقت انجام کس ادب دوست

فکر تونسوی

چودھری صاحب سے آخری ملاقات

پیارے میرزا ادیب

بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں، جن پر اگر یقین کر لیا جائے - تو سارے وجود کی ہڈیاں چٹخنے لگتی ہیں - چودھری برکت علی کے انتقال کی خبر نے مجھ پر بھی ایسا ہی عمل کیا، بالکل اسی طرح کا ردِ عمل تقریباً دو سال پیشتر باری علیگ کے انتقال کی خبر نے پیدا کیا تھا۔ ایسی باتوں کا تسلیم کرنا کتنا مشکل ہوتا ہے - کتنی اذیت اور کرب کے ساتھ یہ زہر کا گھونٹ اندر اتارنا پڑتا ہے - اس کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کی ذہنی وابستگی کی جڑیں کافی گہری چلی گئی ہوں -

چودھری صاحب کے ساتھ میری ذہنی وابستگی کچھ اس قسم کی تھی - کاش! یہ شخص اس ذہنی وابستگی کو ابتدا ہی میں کاٹ دیتا - تو آج اذیت کی یہ شکل اتنی ناقابلِ برداشت نہ ہوتی -

میری اور چودھری صاحب کی آخری ملاقات کا منظر ایک بار پھر میرے ذہن میں جاگ اُٹھا ہے - اور میں شدت سے یہ چاہ رہا ہوں، کہ یا تو اس منظر کو جھٹلا دوں اور آنکھیں بند کر کے یوں فرض کر لوں کہ یہ واقعہ کبھی وجود ہی میں نہیں آیا تھا - اور یا پھر چودھری برکت علی کے انتقال کی خبر سے منکر ہو جاؤں۔ آخری ملاقات کا زندہ اور شگفتہ منظر اور موت کی یہ افسردہ اور اداس خبر ——— میرا ذہن ان دونوں متضاد حقیقتوں کو ایک ساتھ برداشت نہیں کر سکتا - موت یقیناً اتنی نااہل نہیں ہو سکتی۔ کہ ایسے جیتے جاگتے شخص پر ہاتھ اُٹھا سکے -

یہ اُن دنوں کی بات ہے - جب لاہور انگریزی سامراج کے خنجر تلے تڑپ رہا تھا - وحشت اور بربریت فرقہ وارانہ فسادات کا گھناؤنا روپ دھار کر لاہور کے گلی کوچوں میں [illegible] اور انگارے بکھیرتی ہوئی گھوم رہی تھی، ہندو سکھوں کا ایک کیمپ ڈی، اے، وی کالج میں بن چکا تھا - اور میں ۱۵ر اگست کے بعد مسلسل تین ماہ تک کی کڑی جدوجہد اور ذہنی و جسمانی کشمکش کے بعد اپنی شکست کا اعتراف کر کے لاہور چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا تھا - اور دو گھنٹے پہلے لاہور کے آزاد بازاروں، سڑکوں اور گلی کوچوں سے الگ ہو کر ڈی، اے، وی کالج کے رفیوجی کیمپ میں پہنچ چکا تھا -

صبح مجھے اپنے "آزاد ہندوستان" کی طرف روانہ ہونا تھا۔ کتنی مسرت کا مقام تھا! کتنی تاریخی مسرت نے میرے اوپر پنکھ پھیلا رکھے تھے -

لیکن میں خاموش تھا - اتنی بے رونق اور پھیکی خاموشی میں نے زندگی بھر محسوس نہیں کی تھی - احساسِ مسرت کے ہجوم سے کھوئی ہوئی خاموشی، اداس، ناکام اور زندگی [illegible] "عجیب جبر ہے یہ بھی" - میں سوچ رہا تھا، تو گویا اب سنگینوں سے مجھے یہ منوایا جا رہا ہے - کہ میں اپنے مسلمان احباب میں نہیں رہ سکتا - میں ان کی شکلیں تک نہیں دیکھ سکتا، ان سے بول بھی نہیں سکتا - وقت اور تاریخ کی ظالم سنگینیں میری پشت پر کچوکے دے رہی ہیں کہ مجھے ان سے منہ موڑنے جا رہا ہوں" بے بسی کی اس کیفیت پر غصہ تو بیکار تھا ہی، آنسو تک بہانا شجرِ ممنوعہ بنا دیا گیا تھا - یقین مانو میرزا! میں نے بے تحاشا آنکھیں بند کر لیں - یہ احساس کہ میں ابھی لاہور ہی میں ہوں، آنکھیں بند کرتے ہی بہت زیادہ تیز ہو گیا - تصور ہی میں میں تیزی سے اپنی جانی پہچانی سڑکوں اور بازاروں میں جا پہنچا - میرے تصور پر کوئی سنگین نہ اٹھ سکی ———

میں اپنے بندھے ہوئے بستر کو زمین پر رکھے، اسی پر آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا - میرے دونوں پہلوؤں میں ڈی، اے، وی کالج کی اونچی دیواریں تھیں، اور جہاں دیواریں ختم ہوتی تھیں - وہاں دروازے پر چار فوجی سنتری پہرہ دے رہے تھے - اندر، دائیں بائیں، چاروں طرف ایک ناقابلِ فہم شور و غل تھا، سکھوں کی آوازیں، [illegible] کی چیخ پکار، آپا دھاپی جاری ہے اور میں لاہور کی مال روڈ کی طرف منہ کئے، آنکھیں بند کئے، تصور ہی تصور میں اپنے مسلمان احباب کے ساتھ محوِ گفتگو تھا - [illegible]

…جتیں، گویا اس سب سانجھی دو بہشتی کی، ان کے سنترے، ان کے پھل، ان کے آب، اُن کے چہرے، ہاتھ، پاؤں، آنکھیں، ہونٹ ——— پھولوں سے …تعمیل ——

اُدا سی میں ہمیں نے اپنے بچے ایک جنت آباد کر لی تھی۔ دروازے پر فوجی سنتریوں کی سنگینیں پہرہ دینے کے باوجود بے خبر تھیں۔

…ایک سپاہی نے بندوق کے کندے سے میرے شانوں پر ہلکا سا ٹھوکا دیا۔ میں نے جھنجھلا کر آنکھیں کھول دیں۔ ایک سکھ سنتری مجھ کو کہہ رہا تھا۔

"اسے اسے دیکھو، وہ لوگ تمہیں بلاتا۔ یہ کون ہوتا ہے تمہارا؟"

…سے چودھری برکت علی اور استاد …کھڑے ہنس ہنس کر مجھے اشارہ سے بلا رہے تھے۔

میں بے ساختہ اُن کی طرف بھاگا۔ فوجی سنتری مجھے روکتا رہا، لیکن میں نے تو جیسے تخیل کی جنت کو مجسم شکل میں اپنے پاس بلا لیا تھا۔ یہ میرے تخیل کی تاریخی فتح تھی۔ فوجی سنتری کو کیا علم تھا کہ اس فتح کا کتنا وسیع پس منظر تھا۔ کتنی لمبی روایات تھیں۔

چودھری لپک کر مجھ سے بغل گیر ہو گیا۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہنس رہا تھا۔ وہی کھلی ہوئی بے باک ہنسی جو دیکھتے ہی دیکھتے قہقہہ بن جاتی تھی۔ وہی اداس مسکراتی آنکھوں میں شگفتگی کی متحرک لہر دوڑ رہی، باتوں میں زندگی بخش گرمی، مونچھوں میں حرارت سے دل دھڑکتا ہوا۔ خالص پنجابی شلوار قمیص میں ملبوس، سفید اور سیاہ بالوں کا سنجیدہ اور البیلا امتزاج۔ کا کا تم تو میرا پیارا! ——— خدا کی قسم! کیا زندگی اور طاقت اور رعنائی کی اتنی متحرک تصویر کے بارے میں تم لوگ کہہ رہے ہو کہ اُسے موت جیسی رذیل اور مردہ چیز بھی چھو سکے گی؟

چودھری کے ہاتھوں میں پھلوں کی ایک ٹوکری تھی۔ سنترے، انگور، کیلے، سیب اور امرود ———

"یہ تمہارے لئے ہیں" چودھری نے ہنسی کا فوارہ چھوڑتے ہوئے کہا ——— "یہ میں اس لئے لایا ہوں۔ تاکہ لاہور کو تم بھول نہ جاؤ، یہ پھل تمہیں ہمیشہ یاد دلائیں گے۔ کہ لاہور نے تمہیں کبھی اپنے آپ سے جُدا کرنا نہیں چاہا۔"

میں جانتا تھا۔ کہ ان الفاظ کی روح میں کتنے گھاؤ ہیں۔ مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ چودھری برکت علی ہمیشہ چوٹ کو بھی سہلاتا تھا۔ تو اپنے مخصوص قہقہے اور شگفتہ مسکراہٹ سے ٹال دیتا تھا۔ اور یہی چیز اسے ہمیشہ دکھ اور غم پر فتح پانے میں کامیاب کر لیتی تھی۔ شگفتگی اس کے مذہب میں فرض تھی۔

میں نے اداس ہو کر کہا "چودھری صاحب! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کیسے ہوگا؟ کیا بنے گا؟" اُس نے بے ساختہ میرے کندھے پر زور سے ہاتھ ملا۔ اور پھر قہقہہ لگا کر کہا ——— "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ ہمارا کام جاری رہے گا۔ ہم آگے بڑھنے والی طاقت ہیں، ہم ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتے۔ یہ پاگل پن کے اس دور کو ہم سچائی اور انسانیت کے سانچے میں دوبارہ ڈھالیں گے۔ ہمارا کام اب زیادہ سخت ہو گیا ہے ——— اور تمہیں اس کام میں بہت بڑا حصہ لینا ہے۔"

میرے پیارے! یہ آواز صداقت اور خلوص کی گہری آواز تھی۔ اس کی معنی خیزی یادگار حیثیت رکھتی تھی۔ اُس زمانے میں جبکہ شک و شبہ کے سایے ذہنوں پر مسلط تھے۔ فرقہ پرستی نے دماغ و دل زہریلے کر رکھے تھے۔ اعتماد اور خلوص کی دولت لُٹ چکی تھی۔ سچ اور دیانت کی کھیتی ویران ہو رہی تھی۔ ایسے عالم میں یہ آواز کتنی زندگی بخش تھی۔ کتنی توانا، کتنی بھرپور اور کتنی باعزم تھی ———

مجھے اس کی اس بات پر حیرت نہیں ہوئی، کیونکہ میں چودھری کو کئی سال سے پہچان چکا تھا۔ ترقی اور خوبصورتی اور تعمیر کی طرف بڑھتی ہوئی زندگی کا اُس نے ہمیشہ مردانہ وار ساتھ دیا تھا۔ رجعت پرستی کے خلاف وہ ڈٹ کر اپنے محاذ پر لڑا تھا۔ آج بھی لاہور کے سوشل اور سیاسی حلقے اس بات کا اعتراف کریں گے۔ کہ چودھری برکت علی کی شروع ہمیشہ صالح اقدامات کا ساتھ دیتی رہی اور بڑی پامردی کے ساتھ قبیح اور مکروہ رجعتی تصورات اور عوامل کو ٹھکراتی رہی۔

میں نے کہا "چودھری صاحب! ادبِ لطیف اب آپ کے ہاتھوں میں ترقی پسند تحریک کی امانت ہے۔"

"ہاں! یہ آپ لوگوں کی امانت ہے" چودھری صاحب نے بچوں کی ٹوکری میں سے سنترے چھیل چھیل کر ہم دونوں کو دینے شروع کئے۔ "اور مجھتا ہوں اس امانت کی حفاظت کرنا میرا کام ہے۔ اگر آپ لوگ میرا ساتھ دیتے رہیں۔ تو میں اسے اس اندھیرے میں بھی ایک روشن مشعل کی طرح جگمگاتے دیکھوں گا۔"

اس کے بعد ہم آدھ پون گھنٹہ تک بات چیت کرتے رہے۔ وہ ادبِ لطیف اور مکتبۂ اردو کے آئندہ پروگرام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے۔ بلند اور عظیم ارادے رکھنے والا یہ شخص قہقہے لگا لگا کر میری گواہی منظور کرتا رہا۔ مجھے تسلی دیتا رہا۔ مجھ سے وعدے لیتا رہا۔ اپنے رسالہ اور مکتبہ کے کئی کام میرے ذمے لگائے۔ ادبِ لطیف کے بارہ سالہ ادبی انتخاب کے بارے میں مجھے بالخصوص تاکید کرتا رہا۔ "اگر میں اس دوران کام کر کے چھوڑے جا رہا ہوں۔ مکمل کرنا تمہارا فرض ہے۔ ابھی دو تین سال بھر کے ادبی انتخاب کا جو سلسلہ ہم نے شروع کر رکھا تھا۔ اس کا مسودہ مجھے سونپ کر کہنے لگا جاتے ہی مکمل کر کے بھیج دینا۔ اور ادبِ لطیف کے لئے مسلسل لکھتے رہنا۔ ہندوستان کے ادیب دوستوں سے تعاون دلاتے رہنا۔"

ملاقات اگرچہ آدھ پون گھنٹے کی تھی۔ اس سے زیادہ لمبی نہ ہو سکی۔ کیونکہ اس ملاقات کو شکوک نگاہوں سے دیکھنے والے فوجی سنتری اور کیمپ کے عہدیدار مداخلت کے لئے آ پہنچے تھے۔ اور ہمیں آواز دینے لگے کہ اس ملاقات کو فوراً ختم کر دو۔

یقیناً ہم تینوں کے ذہن سازشی نہیں تھے۔ ہم ادب اور ترقی اور تعمیر کو سازش کا مکروہ نام کبھی نہیں دے سکتے تھے، مگر وہ زمانہ اتنی تاریک فضاؤں میں گھِر گیا تھا۔ کہ ہمیں جبراً جدا کر دیا گیا۔

جاتے جاتے چودھری صاحب نے اپنی ٹوپی سر سے اتار کر ہلائی، قہقہہ لگایا اور لوٹ گیا۔ جیسے وہ مجھ سے ملنے کے لئے جس انتہا خلوص اور محبت کے جذبات لے کر گیا تھا۔ میری طرف سے ان جذبات کا اسی سرگرمی اور خلوص سے استقبال کیا گیا تھا۔ اور یہ ترقی پسندانہ احساسات کی فتح کا لمحہ تھا۔

اور آج —— میرزا ادیب! تم لکھ رہے ہو کہ میں اتنی بڑی ناقابلِ یقین خبر کو تسلیم کر لوں۔ کہ چودھری برکت کا قہقہہ بند ہو گیا، اس کی شگفتہ آنکھوں کا بے پایاں خمار ٹوٹ گیا، اور آج وہ قبر کی آغوش میں چلا گیا ہے۔

چودھری صاحب نے کیمپ کی اس شام کو مجھ سے ترقی پسند تحریک سے، زندگی کی آگے بڑھتی ہوئی طاقتوں سے جو وعدہ کیا تھا، کہ وہ ہم سب کی امانت ہے۔ اُسے انہوں نے آج تک بڑی خوبصورتی اور بہادری سے محفوظ رکھا ہے۔ آج یہ امانت ہم سب ترقی پسندوں سے سوال کر رہی ہے کہ کیا ہم اس قابل ہیں؟ کہ چودھری صاحب کی اس یادگار کو اسی بہادری اور خوبصورتی سے محفوظ رکھ سکیں۔ جس طرح چودھری صاحب نے رکھی تھی۔

مجھے یقین ہے۔ کہ ترقی پسند تحریک اس سوال کا عملی اور پائیدار جواب دے سکتی ہے۔ اور چودھری صاحب کی زندگی بھر کی جدوجہد کے اس مشعل کو بدستور زندہ رکھ سکتی ہے۔ کیونکہ چودھری صاحب کی جدوجہد کا اعتراف اُن کی موت کا سوگ منانے میں نہیں، بلکہ اُن کے آدرش کو آگے بڑھانے ہی سے کیا جا سکتا ہے۔

(ادب دوست ناشر کا بقیہ صفحہ ۹۳)

کے لئے دردناک نہ ہوگا؛

چودھری برکت علی مرحوم دوستوں کے جان نثار دوست اور دشمنوں کے بڑے خوفناک دشمن تھے، وہ زندہ دل شگفتہ مزاج، جری اور باہمت تھے، صحت مند ادب کی اشاعت کے سلسلے میں ان کی خدمات کبھی فراموش نہیں ہو سکیں گی اور اگر ان کے جانشین نے ہمت اور جرأت سے کام لیا تو وہ مکتبۂ اردو اور ادبِ لطیف کو جاری رکھ کر اور ان دونوں کے جمہوری رول کو واضح تر کر کے چودھری صاحب مرحوم کی ایک ایسی یادگار قائم کر لیں گے جس کا ذکر شاید وہ اُتنی مدح خوانی کی تحریروں میں نہ آسکے، لیکن ادب، تہذیب اور تمدن کی تاریخ اس کے تذکرے کے بغیر نامکمل رہے گی۔

[illegible]

میرا دوست میرا رفیق!

آج جب کہ ادب اور کلچر کا چلن شدت اختیار کر چکا ہے ایسے وقت میں چودھری برکت علی کی مفارقت ایک روح فرسا سانحہ ہی نہیں بلکہ نئے ادب کے لئے نقصان عظیم بھی ہے۔ آج وہ پبلشر ہیں ہی کتنے جو اس دور کے نمائندہ اور حقیقت بردار ادب کی اشاعت کو اپنا ایمان سمجھتے ہیں۔ ترقی پسند اور صحت مند ادب کی اشاعت کے لئے ہاتھ بھر کا کلیجہ چاہیئے۔ اور ہاتھ بھر کا کلیجہ چودھری برکت علی کا تھا۔ جنہوں نے سب سے پہلے وقت کی آواز کو پہچانا اور ایسے ادب کی اشاعت کی جو ہماری زندگی سے بہت قریب تھا۔ اشاعت کے سلسلے میں نئی نئی راہیں پیدا کیں۔ کتابوں کی گٹ اپ کے سلسلے میں ان کی کوشش اجتہاد کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ چودھری صاحب کے سلیقہ اور نفاست پسندی کا ثبوت ہے۔ وہ بنی ہوئی لکیروں پر کبھی چلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ اُن دنوں جہاں ترقی پسند ادیبوں پر رجعت پسندوں کی طرف سے عتاب نازل ہو رہا تھا وہاں اس ادب کے ناشر چودھری صاحب پر بھی کٹڑ روایت پسند حلقے اپنی جھلاہٹ کے تیر چھوڑ رہے تھے۔ مگر چودھری برکت علی ایک حوصلہ مند انسان تھے۔ اپنی دھن کے پکے تھے۔ عصمت چغتائی اور سعادت حسن منٹو پر فحاشی کے سلسلے میں مقدمے چلائے گئے تو چودھری صاحب سرکاری مشینری سے ٹکرا گئے مگر پیچھے نہ ہٹے۔ مقدموں کے دوران میں ان کا رویہ ایک جنگجو سپاہی کا سا تھا۔ انہوں نے ہمت اور دریا دلی کا کئی مرتبہ مظاہرہ کیا۔ بعض اوقات تو وہ اپنی بساط سے زیادہ چھلانگ لگا دیتے۔ ان دنوں نئی پود کے امام جوش ملیح آبادی سمجھے جاتے تھے۔ چودھری صاحب نے جوش کے تمام مجموعوں کے سلسلے میں پانچ سالہ معاہدہ کیا یعنی پانچ سال تک وہ کلام جوش چھاپتے رہیں گے اور اس کے عوض میں چودہ ہزار روپے دیں گے۔ چودہ ہزار روپے شاید چودھری صاحب کے لئے بھاری رقم نہیں تھے لیکن دوسرے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کے ساتھ ساتھ ایک ہی مصنف کو اتنی رقم کی پیشکش بہت بڑی بات تھی۔ جبکہ دوسرے ناشروں کے ہاں کسی تصنیف کے دائمی حق اشاعت لینے کے بدلے پچاس روپے سے زیادہ ادا کرنے کی روایت ہی نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ مکتبہ اردو کی بنیاد کے وقت اُسے مضبوط بنانے کے لئے چودھری صاحب نے بھی کچھ مسودے سستے داموں لئے لیکن بعد میں انہوں نے ادیبوں اور فنکاروں کو معقول رائلٹی دینے کی رسم چلائی۔ اس رواج کی پہل چودھری صاحب ہی نے کی۔ اس پر اُن کے ہمعصر ناشروں نے ناک بھوں چڑھائی۔ وہ بِلبلائے اور چِلّائے مگر بعد میں انہیں بھی ہوش آگیا کہ کاروبار کا صحیح طریقہ وہی تھا جس پر چودھری صاحب چل رہے تھے۔ اُدھر ہندوستان کے ادیبوں کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ان کی ادبی ریاضت "نیکی کر اور دریا میں ڈال" کے مترادف نہیں۔

چودھری صاحب کی ناشرانہ سرگرمیاں اپنے ہی ادارے تک محدود نہیں تھیں۔ وہ اردو کی ترویج و ترقی کے لئے بھی دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ کتابت طباعت اور گٹ اپ کے اعتبار سے اچھی کتابیں چھاپ کر نئے لکھنے والوں کو ادب کے میدان میں اُتار کر اور اُن کی حوصلہ افزائی کر کے انہوں نے اردو میں نہایت اچھی چیزیں لکھوائیں۔ ایک دفعہ تو انہوں نے عجیب و غریب پروگرام بنایا۔ ادیبوں سے زبردستی کچھ نہ کچھ لکھوانے کے لئے انہوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔ ہندوستان کے جس کونے میں بھی کوئی ادیب چھپا ہوا تھا چودھری صاحب چیک بک لے کر اس کے پاس پہنچے۔ کسی کو افسانوں کے لئے، کسی کو ڈراموں کے لئے، کسی کو تنقید و تحقیق کے لئے اور کسی کو ناول لکھنے کے لئے اُکسایا۔ اور رائلٹی پیشگی دے دی۔ یہ اس طوفانی دورے کا نتیجہ تھا کہ عصمت چغتائی نے ناول "ٹیڑھی لکیر" لکھا۔ باری نے "کمپنی کی حکومت" کو ادبی جامہ پہنایا۔ اختر حسین رائے پوری نے "جنگ اور ادب" کے نام سے تنقیدی مضامین لکھے۔ کرشن چندر نے

"نئے زاویے" کی جلد دوم مرتب کی۔

پٹھان ہیں، کرید اور تجسّس کو چودھری صاحب نے اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔ جس کسی سے ملتے مشورہ کرتے۔ جن لوگوں کا مطالعہ وسیع ہوتا ان سے موضوع پر شہرۂ آفاق کتابوں کی فہرس بنواتے۔ ہر نئے لکھنے والے کے بارے میں دوسروں کی رائے معلوم کرتے۔ اگر کسی کے ہاں کسی نئے ڈھنگ کا گرد پوش دیکھا تو اُس گرد پوش والی کتاب کو فوراً منگوا لیتے حتیٰ کہ کتابت کو بہتر بنانے کے لیئے طویل بحث کرتے۔ شریف عباسی، اقبال عباسی اور محمد حسین شاہ ذہین جواں کاتبوں کی صلاحیتوں کو منظرِ عام پر لانے والے بھی چودھری صاحب ہی تھے۔ اور آج جو ہمیں کتابت ایسے فن میں ارتقا کی جھلک نظر آتی ہے وہ چودھری برکت علی کی مرہونِ منت ہے جنہوں نے کاتبوں کو یقین دلایا کہ اس فن میں ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ مشوروں کی افادیت تو چودھری صاحب خوب پہچانتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شام کو وہ ادیبوں اور فنکاروں کا ایک جلوس لے کر چائے پینے نکلتے تھے۔ انار کلی کا نظام ہوٹل ادبی مباحثوں کا شام کو اکثر اکھاڑہ بنتا۔ اور اسی نظام ہوٹل کی قدیم مغل شاہی چھتوں کے نیچے اہم فیصلے ہوتے۔ پھر یہی فیصلے چودھری برکت علی کے ہاتھوں عمل میں آکر اُردو ادب کو خوب صورت پیرہن دیتے۔ چودھری صاحب کو ادیبوں اور فنکاروں کی صحبت بہت پسند آتی تھی۔ رات کو کھانے پر اکثر اُن کے ہاں ادیبوں کا جمگھٹا ہُوا کرتا۔ ادیبوں کی چھوٹی چھوٹی اور ہنگامی ضرورتیں شاید سب سے زیادہ ہوتی ہیں۔ وہ فقیر قسم کے اور ہر وقت کے ننھے ننھے مطالبات سے ہرگز تنگ نہ آتے — اُن کی پیشانی پر کبھی بل نہ پڑتا۔ ایک دلفریب سی مسکراہٹ اُن کے لبوں پر نمودار ہوتی اور ساتھ ہی چودھری صاحب جیب میں ہاتھ ڈال کر رومال نکالتے۔ (کیونکہ اکثر وہ نوٹ رومال میں باندھ کر رکھا کرتے تھے) اور رومال جب کھلتا تو وہ کسی ادیب کے گلے میں گرم کوٹ بن جاتا — کسی کے پاؤں میں جوتی اور کسی کے لیئے شام کی بوتل۔

اور اس طرح چودھری صاحب نے اُردو ادب کی عظیم خدمت کی۔ چودھری صاحب کی موت جس کا یقین نہیں آتا جس پر یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا اُردو کے صحت مند اور حقیقت پسند ادب کی موت معلوم ہوتی ہے۔ سامراجی دیسوں میں سچ کے نمائندہ ادب کو سربازار جلایا جا رہا ہے — اور ایسے ادب کے ناشروں کے کان پکڑوائے جا رہے ہیں۔ وہ تائب ہو کر اپنی زندگی برقرار رکھنے اور حکومت کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیئے فحش تخیلی اور زہر بھرا لٹریچر لوگوں کے دل و دماغ میں ٹھونس رہے ہیں۔ آج ننگی کہانیاں اور ننگی تصویریں چھاپنا زیادہ آسان ہے — جھوٹ کو بے نقاب کرنے والے ادب کی اشاعت جان جوکھوں کا کام ہے — ایسے وقت میں چودھری صاحب کی جدائی فاشی قوتوں اور اُن کے پٹھوؤں کی جیت معلوم ہوتی ہے۔ لیکن صحت مند روایت ہمیشہ آگے بڑھتی ہے۔ مجھے چودھری صاحب کے وارثوں سے پوری توقع ہے کہ وہ اُسی دل گردے سے کام لے کر حقیقت پسند ادب کی اشاعت کا بیڑا اٹھائیں گے اور راستے میں ثابت قدم رہیں گے جتنے کہ چودھری صاحب تھے کیونکہ انہیں زندہ رکھنے کا یہی ایک طریقہ ہے۔



مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں

(اقبال)

سلام مچھلی شہری

ایک باخلوص انسان

۔۔۔۔ "کاروان"، "مخزن"، "ادبی دُنیا"، "نیرنگِ خیال" اور "عالمگیر" کا جب واقعی "عروج" کا زمانہ تھا تو میں ادبی میدان میں پاؤں پاؤں چل رہا تھا۔ جب ہوشیار ہُوا تو "ہمایوں"، "ساقی" اور "ادبِ لطیف" کا چرچہ سُننے لگا۔ پہلے کے جرائد اب بس تبرک کے طور ہی نکلتے تھے۔ بعض نے تو اپنے انداز بھی بدل لیے تھے۔ بے شک میری ادبی زندگی کا آغاز "نیرنگِ خیال" کے ہاتھوں ہُوا لیکن مجھے پروان چڑھانے میں میراجی کے دَور کے "ادبی دُنیا" اور میرزا ادیب کے پہلے دور کے "ادبِ لطیف"، حامد علی خاں کے دور کے "ہمایوں" اور شاہد احمد کے دہلی کے دور کے "ساقی" کا بڑا ہاتھ ہے (میں صرف ماہناموں کا ذکر کر رہا ہوں۔ حیات اللہ انصاری کے شروع کے دَور کے ہفتہ وار "ہندوستان" نے مجھے کچھ کم تربیت نہیں دی تھی) بلکہ "ساقی" نے "ادبِ لطیف" کے بعد مجھے اپنایا تھا۔

اپنی ادبی زندگی کے آغاز کی یاد ذریعہ ہے چند ادیبوں، شاعروں، مفکروں اور خاص طور پر ایڈیٹروں اور پبلشروں کے بارے میں بڑی سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کے اظہار کرنے کا۔ اس لئے کہ میرا یہ دَور بڑا پاکیزہ دَور تھا، نازک دَور تھا، میری ادبی بقا اور موت کا دَور تھا۔ اس دَور میں کبھی پہلی نیکی، پہلی حلمت، پہلی ہمدردی اور پہلی محبت کا فطری طور پر ضرورت مند ہو سکتا تھا۔ اور آج بھی اسی دَور کے نقوش ہی پاکیزگی کے ساتھ میرے ذہن میں محفوظ رہ سکتے ہیں۔ میں ان نقوش کو جان بوجھ کر بھلا دینا، انسانی کردار سے گری ہوئی بات سمجھتا ہوں۔

اسی رشتے کو دیکھتے ہوئے۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں "مکتبۂ اردو" اور "ادبِ لطیف" اور ان کے مالکوں اور منتظمین کو اچھی طرح جانتا ہوں اور ان کا احترام کرتا ہوں اس لئے کہ میری فنی زندگی کے ابتدائی دَور کو تربیت دینے میں، آگے لے جانے میں یہ لوگ ہمیشہ میرے مددگار رہے ہیں۔ یہ سچ ہے میری بیشتر ابتدائی نظمیں "ادبِ لطیف" ہی میں شائع ہوئی ہیں، یہ بالکل ٹھیک ہے کہ میرا دوسرا مجموعۂ کلام "دستکیں" "مکتبۂ اردو"۔ لاہور ہی نے شائع کیا اور میری ادبی زندگی کے لئے یہ بھی ایک ناقابلِ فراموش حقیقت ہے کہ سب سے پہلے معلوم رسالوں میں اگر کسی نے مجھے معاوضہ دیا ہے تو وہ "ادبِ لطیف" کے مدیر کی حیثیت سے میرزا ادیب کے شروع کے دَور کا ذکر ہے۔

۔۔۔۔ میں بھی عجیب ہوں، بھائی میرزا ادیب نے کانپتے ہوئے قلم سے اپنے ۱۲ اگست ۵۲ء کے خط میں محترمی (چودھری) برکت علی کے انتقالِ پُرملال کی خبر دی ہے اور میں ہوں کہ دفورِ غم سے دھڑکتے ہوئے دل اور اشکبار آنکھوں پر فوراً قابو پانا چاہتا ہوں اور اپنی شاعری کے بچپن کی پاکیزہ وادی کی طرف امنگ، یاد اور امید کے نرم پروں کے سہارے اڑنے لگا ہوں۔ بات یہ ہے کہ اس المیہ نے اس دم میری فنی زندگی کے وہ خاص منظر میرے خیالوں میں زندہ کر دیئے ہیں۔

میں یونیورسٹی لائبریری، الٰہ آباد کے شعبۂ مشرق (اردو، فارسی اور عربی) کا انچارج ہوں۔ وکٹوریہ ہوٹل۔ کٹرہ (الٰہ آباد) میں محمد نذر التّوریں کی گرم چائے ان کی ہوشیار نظروں کی چھاؤں میں چپکے سے پی کر، اور مجتبیٰ حسین (جو اب کراچی میں ہیں) کے غضب ناک لیکن محبت بھرے اشاروں سے گھبرا کر، دس بجنے سے پہلے ہی دفتر آگیا ہوں۔ صاحبِ حاکم اعلیٰ شری ترپاٹھی جی (لائبریرین اور یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ کے پُرعظمت پروفیسر جو ان دنوں ساگر یونیورسٹی کے وائس چانسلر ہیں)، کے بڑے کمرے کی طرف ان کا حکم پانے کے بعد جانے ہی والا ہوں کہ شلوار، کوٹ اور کشمیری ٹوپی میں دو وجیہہ آدمی آگئے ہیں۔ ایک جوان ہے اور ایک ادھیڑ

لیکن ادھیڑ، ہوتے ہوئے بھی کافی تندرست ——

"—— آپ مجھے پہچان کیسے گئے ؟"

"آپ کی تصویر جو "ادبِ لطیف" میں شائع کر چکا ہوں"۔

"آپ کے لئے چائے منگاؤں ؟"

"نہیں حضرت ! آج آپ کی تفریح کی ساری ذمے داری ہمارے اوپر ہے" مہمان خود میزبان بن رہا تھا لیکن یہ ہنس مکھ، پرخلوص اور بے تکلف نذیر احمد کی آواز تھی۔ اور اب زیادہ باتیں نذیر احمد ہی کر رہے تھے۔ برکت علی صاحب کے چہرے سے خاموشی اور متانت برس رہی تھی۔ البتہ ان کے چوڑے ماتھے کے شکن اور دُنیا کے دکھ درد اور نچائی سچائی سمجھی ہوئی آنکھوں سے اُن کی شفقت اور محبت کا ضرور پتہ چلتا تھا۔

"آپ نے اپنے مجموعۂ کلام کے لئے ہمیں لکھا تھا، اب ہم خود آپ کے پاس آگئے ہیں" بہت دیر کے بعد برکت علی صاحب بولے اور فوراً ڈیڑھ سو کے نوٹ میری میز پر رکھ دئے۔ "بقیہ مسودہ پانے کے بعد" انہوں نے ایک سچے پبلشر کی حیثیت سے کہا اور پھر ان کے بجائے نذیر احمد میرا ہاتھ پکڑ کر کہنے لگے۔ "تھوڑی دیر کے لئے چُھٹی لے لو۔ ذرا شہر میں تفریح کر آئیں"۔

—— شاید دو دن تک یہ دونوں حضرات الٰہ آباد میں رہے اور ہر جگہ، ہر محفل میں مجھے اپنے ساتھ گھسیٹتے رہے۔ فراق گورکھپوری اور ڈاکٹر اعجاز کے یہاں بعض صحبتیں بڑی دلچسپ رہیں۔

—— دوسرا اور آخری منظر جو اس وقت میرے تصورات میں ہے، اس کے نقوش یہ ہیں۔

والدین نے مزید تعلیم دلوانے سے انکار کر دیا ہے، میں کچھ سیاسی لیڈر، کچھ انقلابی شاعر اور کچھ "ڈان جون" بنتا جا رہا ہوں اور کبھی الٰہ آباد، کبھی فیض آباد، کبھی لکھنو اور کبھی دھلی کے ادبی حلقوں کا چکر لگایا کرتا ہوں۔ ایک صاحب (شاید انجم نام تھا) کا حوصلہ افزا خط پانے کے بعد میں نے لاہور جانے کا قطعی ارادہ کر لیا ہے (یہ میرا لاہور کا دوسرا دورہ تھا، پہلی بار میں میراجی کے یہاں ٹھہرا تھا)۔

میں لاہور پہنچ گیا ہوں اور "مکتبۂ اردو" کے سرکلر روڈ والے دفتر کی بالائی منزل میں مقیم ہوں۔

مجھے نہیں معلوم ہے کہ واقعی ایک شاعر اور ادیب کو اپنے ملنے والوں اور قدر دانوں سے کس طرح سلوک کرنا چاہیئے۔ شہرت کے باوجود مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ میں POSE نہیں کر پا رہا ہوں —— ذرا ذرا سی بات پر چڑ جانا، اپنے بارے میں ضرورت سے زیادہ باتیں کرنا۔ ہر علمی اور ادبی مسئلے پر بغیر کچھ سمجھے بُوجھے بول دینا ——!!! میرے قدر دانوں کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہے اور میں اپنے اَن پڑھ اور دہقان ہونے پر پیچ و تاب کھا رہا ہوں۔

ایک شام اُداس بیٹھا ہوں کہ چودھری برکت علی صاحب اُوپر آگئے ہیں —— "وہ جوش، وہ بھروسہ اور وہ تازگی جو آپ کی نظموں میں ہے، اس کا شائبہ بھی آپ کی روزانہ کی زندگی میں نہیں ملتا ——"

"میں اپنی کمزوریوں اور محرومیوں کو کیسے جھٹلاؤں ؟"

کمزوریوں اور محرومیوں کا شکار کون نہیں ہے۔ آپ یہ احساسِ کمتری دور کر دیں تو اچھا ہے۔ یہ آپ کے فن اور آپ کی زندگی کے لئے بہت مضر ہے اور ایک بات اور —— آپ ہر شخص پر اتنی جلدی بھروسہ کرنے کی عادت چھوڑ دیں" ! آج پہلی بار یہ خاموش دیوتا مجھ سے کھل کر باتیں کر رہا تھا۔

پھر نذیر احمد، فکر تونسوی اور بشیر احمد وغیرہ آگئے اور مجھے قریب کے ایک ہوٹل میں پکڑ لے گئے (شاید "نظام" ہوٹل نام تھا) نذیر یا کی طرح ہنس مکھ اور باتونی تھے۔ فکر شاید میرے المیہ کو اپنے المیہ سے ہم آہنگ کر رہا تھا اور بشیر احمد معصوم معصوم اور اچھے اچھے سے لگ رہے تھے۔

دن بیتے، مہینے گزرے۔ سال رخصت ہوتے رہے اور ایک طویل مدت گزر گئی۔

اردو کی ادبی دنیا میں "ترقی پسندی" اور "رجعت پسندی" کی جنگ چھڑ گئی اور میں نہ جانے کیوں رجعت پسند سمجھا جانے لگا۔ میری اپنی کچھ مجبوریاں تھیں اور سب سے زیادہ یہ کہ مجھے اس کا یقین تھا کہ فن کی منزل کے لیئے میرا ہی راستہ ٹھیک ہے۔ علاوہ اس کے یہ کہ میں اب بھی بڑا ضدی تھا ــــ میں اپنے راستے پر چلتا رہا۔ چلتا رہا اور ابھی تک چل رہا ہوں۔ "ادب لطیف" اسی آب و تاب سے نکلتا رہا۔

اچانک "ادبِ لطیف" کے کچھ "ایڈیٹوریل" نظر سے گزرے اور میں چونک سا گیا ــــ یہ تو ادب و حیات کے متعلق میرے ہی خیالات کی ترجمانی کر رہا ہے۔ یعنی کہ "ترقی پسند ادب" کے معانی صرف کسی سیاسی جماعت کے مینی فیسٹو کا پرچار ہی کرنا نہیں ہے۔ ادب زندگی کا صرف ایک ہی پہلو پیش نہیں کرتا۔ اگر یہ صحیح ہے کہ ادب زندگی کا ترجمان ہے تو مجموعی طور پر اسے زندگی کے تمام پہلوؤں کو چھونا چاہیئے!!

میں نے اس طوفانی دور میں بھی چودھری برکت علی صاحب کی اس ہمت اور اس عزم کے لیئے، انہیں خطوط لکھے اور انہوں نے میرے ہر خط کا تسلی بخش جواب دیا۔ مگر میں پھر بھی "ادبِ لطیف" میں نہیں لکھ رہا تھا ــــ اس کی وجہ وہی میری ضد تھی۔ اپنی ایک نظم پر اختلافِ رائے کے باعث میں میرزا ادیب سے ناراض بھی ہو گیا تھا۔ میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا بلکہ اب بھی میں اس کا خیال بھی نہیں کر سکتا کہ میرا بچپن کا دوست میرزا ادیب کسی بھی معنی میں میرا برا چاہے گا مگر ایسے ہیں کہ میں اپنی نظموں کو اپنی اولاد نہیں سمجھتا بلکہ خود ان کے پیچھے اڑتا رہتا ہوں، میں یہ بھی نہیں برداشت کر سکتا کہ میں جس بات کو اچھا کہوں، میرے قریبی دوست اسے برا سمجھیں۔

●

ــــ بہر حال اردو کے نئے اور ترقی پسند ادب کی جب بھی تاریخ لکھی جائے گی، میرا دعویٰ ہے کہ کوئی بھی سمجھدار اور باخلوص مصنف مکتبۂ اردو اور ادبِ لطیف کو نظر انداز نہ کر سکے گا ــ ہم اہلِ قلم جو کچھ سوچتے ہیں، جو کچھ لکھتے ہیں اسے جنتا کے سامنے یہی ایڈیٹر اور پبلشر ہی پیش کرتے ہیں۔ ہم اگر گیت ہیں تو یہ اس کے ساز۔ ہم اگر نعرہ ہیں تو یہ ہمارے پرچم۔ مغربی ممالک میں جب کسی مصنّف کو طوفانی شہرت حاصل ہوتی ہے تو ناقدین سب سے پہلے اس آدمی اور اس ادارے کی جستجو کرتے ہیں جو ان کی شہرت کی وجہ بنا ہے۔ اچھے اور باخلوص پبلشرز کا مقصد صرف پیسہ کمانا ہی نہیں ہوتا۔ ان کے دل میں زبان و ادب کی ترقی کی لگن رہتی ہے اور وہی مصنّفین کی مدد سے قصرِ ادب کی تعمیر کرتے ہیں۔ اچھے پبلشر راکھ سے دبی ہوئی چنگاریاں اور کھنڈروں سے جواہر نکال لیتے ہیں اور پھر ان کے شعلوں اور ان کے جلوؤں سے تمام ادبی دنیا کو جگمگ کر دیتے ہیں۔ یہ بدقسمتی کی بات ہے کہ اردو میں ایسے پبلشرز کم ہی ہیں جو کے دل میں یہ لگن ہو مگر اس کے معنی یہ بھی نہیں ہیں کہ ایسے پبلشرز سرے سے مفقود ہی ہیں۔ میں نے پبلشرز کو سمجھنے کے لیئے کچھ ذاتی تجربات کیئے ہیں اور مجھے زیادہ مایوسی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ "صدیق بک ڈپو" لکھنؤ۔ "ساقی بک ڈپو" دہلی (اور اب کراچی) اور "مکتبۂ اردو" لاہور نے میری چھوٹی سی ادبی زندگی میں میری کب کب اور کس کس طرح مدد کی ہے۔

میرزا ادیب نے مجھے لکھا ہے کہ "آپ چودھری صاحب کے قریبی دوست تھے اس لیئے آپ ان کی یاد میں کچھ لکھ دیجیے!" جہاں تک عمر کا سوال ہے، میں ان کا دوست نہیں تھا لیکن یہ حقیقت ہے کہ میں اُن سے بہت مانوس تھا۔ وہ میرے بزرگ اور مددگار تھے۔ کسی المیہ کی خبر پانے کے بعد میری عادت رونے کی نہیں ہے اور نہ مجھے اپنے اوپر سوگ طاری کرنا اچھا لگتا ہے۔ میں ایسے موقعوں پر بہت جلد اپنے دل کی دھڑکنوں اور اپنی آنکھوں کے آنسوؤں پر قابو پا لیتا ہوں اور پھر اس آدمی کی اچھائیوں کے بارے میں سوچنے لگتا ہوں اور میرے دل میں یہ تمنا مچلنے لگتی ہے کہ اس آدمی کے جتنے اچھے کام ادھورے رہ گئے ہیں۔ انہیں کوئی دوسرا آدمی پورا کرے۔ میں موت سے بھی ایک پیغام لینے کا

جاری رہا۔

سوال یہ ہے کہ چودھری صاحب کی موت ہم اردو والوں اور خاص طور پر اُردو کے پبلشروں کو کون سا پیغام دیتی ہے اور پھر اس سوال کا جواب پانے کے بعد مجموعی طور پر جو پیغام ہمیں ملے ——— ہمیں اس کی روشنی میں اپنے عمل ہائے عقیدت اس باخلوص انسان اور ترقی پسند پبلشر کی یاد میں سجانے چاہئیں :

آج اور آج سے پہلے اردو کی کیا حالت تھی۔ آج بھی خود پاکستان میں اردو کی کیا حالت ہے، میں اس کا اندازہ کر سکتا ہوں۔ اگر مصنفین کا یہ شکوہ ٹھیک ہے کہ "ایڈیٹر اور پبلشر ہمیں لُوٹتے ہیں" تو پبلشرز کا یہ شکوہ بھی بے جا نہیں کہ "ہمارے پاس سرمایہ نہیں ہے عوام میں ابھی زبان کے لئے تڑپ اور لگن نہیں پیدا ہوئی۔" لوگ "مکتبۂ اُردو" لاہور کو ایک سرمایہ دار ادارہ سمجھتے تھے اور کہتے ہیں مگر مجھے معلوم ہے کہ یہ غلط ہے۔ میں اس ادارے کی فضاؤں میں رہ چکا ہوں اور یہ جانتا ہوں کہ چودھری برکت علی اور ان کے اعزا کس کس مشکل سے اردو کی گاڑی چلا رہے تھے اور چلا رہے ہیں۔

میں جذباتی اور ذاتی تعلقات کا بہت قائل ہوں (اور اسی لئے ابھی تک زندگی میں کامیاب نہیں ہو سکا ہوں) اور اس وقت جبکہ چودھری مرحوم کی یاد میں لکھتے لکھتے میرا قلم اچانک رُک گیا ہے: میں ان کے خطوط، ان کی ملاقاتیں اور ان کی نصیحتیں یاد کر رہا ہوں، میرے کانوں میں ان کی یہ آواز گونج رہی ہے ———

"——— کمزوریاں اور مجبوریاں کا شکار کون نہیں۔ آپ یہ احساسِ کمتری دُور کر دیں تو اچھا ہے۔ یہ آپ کے فن اور آپ کی زندگی کے لئے بہت مُضر ہے ———!"



قراردادِ تعزیت

حلقۂ اربابِ ذوق چودھری برکت علی مدیر ماہنامہ "ادبِ لطیف" و مالک "مکتبۂ اُردو" پر دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور اسے اردو کے لئے نقصانِ عظیم خیال کرتا ہے۔

چودھری برکت علی کی ذات اپنی شرافت۔ خلوص اور قابلیت کے علاوہ بے لوث ادب نوازی، علم پروری اور اردو زبان کی ترویج و اشاعت کی بے پناہ لگن کی وجہ سے ان چند نادر شخصیتوں میں شمار ہوتی تھی جن کی مثال کم ملتی ہے۔ ان کی اس دائمی مفارقت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے اس کا پُر ہونا اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔

شہرت بخاری

سیکرٹری حلقۂ اربابِ ذوق

ہنس راج رہبر

چودھری برکت علی

چودھری مرحوم مہربان طبیعت آدمی تھے ان کا میرے ساتھ گہرا تعلق رہا ہے۔ یکایک ان کی موت کی خبر سُن کر مجھے دلی رنج ہوا اور میں دیر تک سوچتا رہا کہ جو شخص اس قدر تندرست اور ہٹا کٹا تھا یک دم وہ [illegible] ہو گیا، وہ کبھی مر سکتا ہے۔ سوچتے سوچتے ایک ذہنی تصویر آنکھوں کے سامنے اُبھر آئی اور میں محسوس کرنے لگا جیسے وہ فر دار ٹوپی اور شلوار پہنے سامنے کھڑے مسکرا رہے ہوں۔ جب وہ مسکراتے تھے تو آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہو جاتی تھی جو ان کی مسکراہٹ کو اور بھی دلنواز بنا دیتی تھی۔

اب ان کا کتابی چہرہ اور کشادہ پیشانی میری نظروں کے سامنے ہے۔ میں کس طرح یقین کروں کہ وہ مر گئے۔ نہیں چودھری برکت علی مر نہیں سکتے!

یوں تو میں انہیں ۱۹۴۲ء سے جانتا تھا مگر صرف اتنا کہ وہ ایک نیشنلسٹ ہیں۔ بحیثیت انسان وہ کیا ہیں اتنا جاننے کا موقع مجھے نہیں ملا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ بلا مطلب کسی بات میں دخل دینا چودھری صاحب کی عادت نہ تھی۔

جب ۱۹۴۶ء میں مکتبۂ اُردو اور ادبِ لطیف کا انتظام چودھری صاحب نے سنبھالا تو میرا ان سے براہِ راست واسطہ پڑا۔ اس وقت مجھے ان کی روح میں جھانکنے اور انہیں بحیثیت ایک انسان کے سمجھنے کا موقع ملا۔ انہی دنوں میں نے "ادبِ لطیف" میں پھر سے لکھنا شروع کیا۔ چودھری صاحب ایک دو ملاقاتوں میں ہی بے تکلف ہو گئے۔ ان کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوسرے آدمی کے جذبات کا احترام کرتے تھے اور بڑی مروت سے پیش آتے تھے اور احباب کی محفل میں اس قدر معصوم بچوں کی طرح باتیں کرتے تھے اور یہی ان کی زندگی کا خوبصورت پہلو تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوتا تھا کہ دو آدمی باتیں کر رہے ہیں اور چودھری صاحب قریب بیٹھے ہیں ان کے بے حس اور ٹھوس چہرے سے گمان ہوتا تھا کہ وہ ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے۔ لیکن بات چیت جب کسی نازک مرحلہ پہ پہنچتی تو وہ جھٹ بول اُٹھتے اور ایسی چٹکی لیتے کہ ساری محفل قہقہہ زار بن جاتی۔ خود بھی ہنستے اور دوسروں کو بھی ہنساتے۔

مثال کے طور پر ادبِ لطیف کا ۱۹۴۷ء کا سالنامہ مرتب ہو رہا تھا۔ فکر ایڈیٹر تھے اور ممتاز مفتی کہانیوں کا حصہ دیکھتے تھے۔ چودھری صاحب نے مجھے بلوایا تھا کیونکہ ممتاز مفتی کو میری کہانی "گڈولنا" پر (جو میں نے سالنامے کے لئے دی تھی) اعتراض تھا اور وہ اس پر تبادلہ خیال کرنا چاہتے تھے۔ فکر اور مفتی اور میں آپس میں اس کے متعلق باتیں کر رہے تھے چودھری صاحب پاس بیٹھے تھے جیسے ہماری بات چیت سے انہیں کوئی سروکار نہ ہو۔ سن ہی نہ رہے ہوں۔ ممتاز مفتی چاہتے تھے کہ اس کہانی میں کچھ واقعاتی تغیر ہو جائے۔ اس لئے میں اسے ذرا آگے بڑھاؤں اور یہ دکھاؤں کہ بچہ بیمار ہو گیا یا اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے اور وہ چلنا بھول گیا ہے۔ لیکن میں بضد تھا کہ افسانہ مکمل ہے۔ میں نے اس میں زندگی کے ارتقاء کو اس کی عملی صورت میں پیش کیا ہے۔ واقعاتی تغیر کہانی کی تہ میں چھپے ہوئے اس سائنٹیفک مرکزی خیال کو تباہ کر دے گا۔ ممتاز مفتی مجھ سے متفق نہیں تھے۔ افسانہ اپنی موجودہ صورت میں انہیں محض ایک واقعہ نظر آتا تھا اس میں TURNING POINT ہونا چاہئے تھا اور وہی پیدا کرنے کے لئے وہ مجھے کہہ رہے تھے۔ بحث جب ایسے مرحلے پر پہنچ کر رُک گئی کہ اس کے آگے بڑھنے کی گنجائش نہیں تھی تو چودھری صاحب جھٹ بول اُٹھے "اچھا بھئی، افسانہ جیسے ہے ویسے ہی رہنے دو" اور وہی جانی پہچانی مسکراہٹ اور دلکش چمک آنکھوں میں لا کر کہا "آپ بھی ادیب، وہ بھی ادیب، ہر ایک ادیب

اپنے مقام کی حفاظت کرنا ہے۔" یہ طنز سن کر ہم لوگ بھی ہنس پڑے۔ ان کے فیصلے کے مطابق افسانہ جوں کا توں چھپا صرف اس تنازع کی حفاظت کے مقصد سے اس کا عنوان "ارتقاء" کر دیا گیا۔

دو تین ماہ بعد لاہور میں فرقہ وارانہ فساد شروع ہو گیا۔ چودھری صاحب کے رویئے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف وہ انسانوں کی اس وحشت سے نالاں تھے اور فرقہ پرست جنونیوں کی بوالہوسیوں اور آنکھوں دیکھی حرکتوں کے لطیفے سنایا کرتے تھے۔ آج ہم ان سب باتوں کو یاد کرتے ہیں تو بار بار یہ کہنا پڑتا ہے کہ چودھری صاحب ایک نیک طینت انسان تھے وہ ہر تعصب سے بلند ہو کر عمر بھر ادب کی خدمت کرتے رہے۔

آدمی اپنے صالح عمل اور کردار سے ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور وہی آنے والی نسلوں کے لئے وراثت میں چھوڑ جاتا ہے۔



پیغام

وہ پیغام جو چودھری صاحب نے اپنی موت سے چند روز پیشتر انجمن ترقی پسند مصنفین کی دوسری سالانہ کانفرنس کے موقع پر بھیجا

میں انتہائی مسرت کے ساتھ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ اس یقین کے ساتھ کہ کانفرنس اپنے جملہ مقاصد میں کامیاب ہوگی اور ملک کے سربرآوردہ باشعور دماغ متفقہ رائے سے جو منشور منظور کریں گے وہ وقت کے عین تقاضوں کے مطابق ہوگا اور اس کی وجہ سے اہلِ قلم کی اکثریت انجمن . , سے ہم آہنگ ہوگی۔

یہ منشور ان احساسات اور عزائم کا پرتو ہونا چاہیے جو پاکستانی عوام کی مادی بہتری و خوشحالی اور روحانی ترقی کے لئے ملک کے مخلص خدمت گزاروں کے سینوں میں موجزن ہیں۔

اس کے ساتھ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ ترقی پسند اپنی ذہنی جدوجہد میں اردو کو بھی اس مقام پر پہنچا دیں گے جس کی یہ مستحق ہے۔

مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مکتبۂ اردو ادبِ لطیف نے ہمیشہ ادب کی ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیا ہے اور اکثر اس سلسلے میں گوناگوں رکاوٹوں اور مصیبتوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا ہے یہ ضرور ہے کہ پچھلے منشور سے مجھے کچھ اختلاف تھا اور اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ میں ادب کو سب سے پہلے ادب سمجھتا ہوں اور اُسے کسی سیاست کا آلۂ کار بنا کر صحافت کی سطح پر لانے کے خلاف ہوں، مجوزہ منشور میں نے دیکھا ہے اور میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ بڑے غور و فکر کا نتیجہ ہے اور اس میں کوئی ایسی بات نہیں جو میرے نقطہ نظر سے قابلِ اعتراض ہو۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں ادبِ لطیف اور مکتبۂ اردو نے اب تک جس سرگرمی سے اس تحریک کا ساتھ دیا ہے اسی سرگرمی کا مظاہرہ آئندہ تعاون میں بھی ہوتا رہے گا۔

میرا پرچہ میرا ادارہ ترقی پسند تحریک کے ساتھ رہے ہیں ساتھ ہیں اور ہمیشہ ساتھ رہیں گے۔

میں گزشتہ ڈیڑھ دو ماہ سے صاحبِ فراش ہوں چلنا پھرنا تو رہا ایک طرف اس وقت اٹھنے بیٹھنے سے بھی محروم ہوں۔ اگر سفر کرنے کے ذرا بھی قابل ہوتا تو انجمن ترقی پسند مصنفین کی اس کانفرنس میں ضرور شریک ہوتا اور اس کی تمام کارروائیوں میں حصہ لیتا۔

لاہور ۔ ۹ جولائی ۵۲ء

(برکت علی چودھری)

ابن انشا

ترقی پسند پبلشر

چودھری برکت علی چند ماہ اُدھر علیل ہوئے تو اس کی اطلاع کسی نے مجھے بھی دی لیکن ہمارے ملک میں کون علیل نہیں ہوتا ـــ اس کے بعد میرے بھائی نے لکھا ان کی حالت زیادہ ہی خراب ہو گئی ہے ـــ یہ بات البتہ تشویشناک تھی ـــ میں نے انہیں خط لکھا ـــ اسی اثنا میں نذیر صاحب نے اطلاع دی کہ دوا کا مرحلہ قریب قریب ختم ہے دعا سے کچھ ہو تو ہو ـــ لیکن میں بدستور امید پسند ہوں۔ اور جب کراچی آنے والے کچھ ترقی پسند مصنفین نے بتایا کہ وہ ہسپتال میں ان سے ملے تھے۔ بیماری واقعی شدید ہے لیکن انہیں رخصت کرتے وقت بھی ان کی زندہ دلی قائم تھی اور ان کی مخصوص چہلیں بھی۔ انہوں نے افسوس ظاہر کیا کہ میں ترقی پسند مصنفین کی کانفرس میں شریک ہونے کے قابل نہیں لیکن ہمیشہ کی طرح اب کے بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوں ـــ (اور وہیں پانچ سو روپیہ بھی دیا) ـ تو میں نے سوچا اندیشے فضول ہیں۔ چودھری برکت علی جیسا زندگی سے بھرپور آدمی یوں نہیں مر سکتا۔ اس میں موت سے لڑنے کی ہمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے انتقال کی خبر مجھے اچانک غیر متوقع اور ناقابل یقین معلوم ہوئی ـــ اور کافی دیر میرے حواس اس کا یقین کرنے سے انکار کرتے رہے۔

چودھری صاحب کی زندگی کیسی تھی سب کو معلوم ہے۔ انہوں نے لاکھوں کمائے اور لاکھوں ہی خرچ کئے۔ کتنے ہی اسکول اور خیراتی ادارے ان کے دم قدم سے چل رہے تھے۔ نوجوان مصنفوں سے ان کا سلوک پدرانہ اور مشفقانہ تھا۔ لیکن بات چیت اور برتاؤ میں وہ اسی بے تکلفی سے کام لیتے تھے جو برابر کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ ان کا قہقہہ بے پناہ ہوتا تھا اور وہ ایک جگہ جم کر بیٹھ نہیں سکتے تھے۔ ان کی طبیعت سیمابی تھی۔ میں نے انہیں بیٹھے بہت کم دیکھا ہے وہ ہمیشہ بھاگتے نظر آتے تھے جیسے انہیں زندگی میں کام بہت کرنے ہوں اور وقت تھوڑا ہو ـــ یہ بات سچ تھی ہماری نئے ادب کی تحریک جس کا ترقی پسند تحریک محض ایک حصہ ہے ۱۹۳۵ء یا ۱۹۳۶ء کے قریب شروع ہوئی اور قریب قریب اسی زمانے میں "مکتبۂ اردو" اور "ادب لطیف" کی داغ بیل ڈالی گئی۔ اس کے بعد سے اب تک اس تحریک کا ان اداروں سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے اور انہیں ہم ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ ہمارے اکثر بڑے مصنفین ادب لطیف کی وساطت سے ابھرے اور مکتبۂ اردو کی وساطت سے ان کی کتابیں ہمارے سامنے آئیں۔ قدامت پرست حلقوں نے نئے ادب پر ہر پہلو سے ناک ناک کر حملے کئے کبھی اس پر فحاشی کا الزام لگایا کبھی اشتراکیت کا لیبل چسپاں کیا لیکن چودھری صاحب اس ہونہار پودے کو مقدس امانت سمجھتے تھے اور ان مخالفتوں سے بے نیاز اپنی انفرادی اور ناشرانہ حیثیت میں اس کی حفاظت کے لئے سینہ سپر رہے۔

میں ان ہزاروں لوگوں میں سے ہوں جنہوں نے انہیں کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے دیکھا ہے اور ہر بار ان کے خلوص، ایثار اور زندہ دلی سے متاثر ہوئے ہیں۔ ان کے انتقال کی خبر کے ساتھ کتنی ہی صحبتوں کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ کتنی ہی محفلیں ـــ ذہن کے پردۂ سیمیں پر فلم کے مناظر کی طرح آتی ہیں اور سٹ جاتی ہیں۔ چودھری برکت علی صاحب ایک انسٹی ٹیوشن تھے اور ادب کے سلسلے میں ان کی خدمات انہیں ہمیشہ زندہ رکھیں گی۔ ان کی بہترین یادگار مکتبۂ اردو اور ادب لطیف ہیں اور یہ قائم رہنے چاہئیں۔ زندہ دلوں کے مزار ان کے دوستوں کے سینوں میں رہ جاتے ہیں۔ اس لئے ہم لوگوں کے لئے وہ اپنے کارنامے ہی نہیں بلکہ خوشگوار یادوں کا سرمایہ بھی چھوڑ کر رخصت ہوتے ہیں۔

o

چودھری مرحوم

بھائی میرزا ادیب!

اس میں کوئی شک نہیں کہ موت پر کسی کو قابو نہیں۔ لیکن میں اس منحوس خبر کو پڑھنے کے لئے بالکل تیار نہ تھا۔ میں دوپہر کا کھانا کھا رہا تھا جب آپ کا خط ملا۔ میں نے سوچا۔ آپ نے افسانہ مانگا ہوگا۔ بڑے اشتیاق سے خط کو کھولا۔ لیکن افسانے کی مانگ کی بجائے چودھری برکت علی کی اچانک موت کی خبر کو پڑھنا پڑا۔ ایک منٹ کے لئے مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا۔ اور پھر لاہور کی پرانی ملاقاتیں ذہن میں ابھر کر رہ گئیں۔ آج سے چار دہ برس پہلے کی بات ہے۔ جب پہلی بار چودھری برکت علی سے ملاقات ہوئی۔ اُس وقت اُن کی دکان موری دروازے کے باہر تھی۔ چودھری برکت علی اور چودھری نذیر احمد دونوں اکٹھا کام کرتے تھے۔ چودھری صاحب کا خلوص تمام ادیبوں کو اس ادارے کی طرف کھینچ لایا تھا۔ کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، اوپندر ناتھ اشک، منٹو، ان سب ادیبوں سے یہیں ملاقات ہوئی۔ اسی دفتر میں گنڈیریاں چوسی جاتی تھیں۔ چائے پی جاتی تھی۔ مونگ پھلی کھائی جاتی تھی۔ گپیں ہانکی جاتی تھیں۔ اور ادبِ لطیف کی نئی پالیسی کا رُخ طے کیا جاتا تھا۔ چودھری برکت علی میں ایک سنجیدگی تھی، اُن کی باتوں میں ایک وقار تھا جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ انہیں ادیبوں سے محبت تھی۔ ان کی کتابوں سے والہانہ عشق تھا۔ وہ ہر نئے ادیب کو منظرِ عام پر لانا چاہتے تھے، اور ترقی پسند ادب کی ترقی کے لئے ہمیشہ کوشش کرتے رہتے تھے۔ انہی کی کوشش سے مکتبہ اُردو نے ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے افسانہ نگاروں اور شاعروں کی کتابیں چھاپیں۔ اور اُردو پبلشنگ کا ایک اعلیٰ معیار قائم کیا۔ آج تک کوئی اور ادارہ اس انداز کی کتابیں چھاپ کر آگے نہیں بڑھ سکا۔ ان میں اچھے ادب کو پرکھنے کا ذوق تھا۔ کتابیں چھاپنے کا سلیقہ تھا۔ وہ چھوٹے اور بڑے ادیب دونوں کی عزت کرتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے۔ کہ ہر چھوٹا ادیب کچھ عرصے کے بعد بڑا ادیب بن جاتا ہے۔ اور اس طرح انہوں نے ہندوستان کے بہترین ادیبوں کی کتابیں چھاپیں۔ اور اُردو ادب کو ایک نئی سطح پر پہنچایا۔ یہ واقعی ایک معرکے کی بات تھی —— چودھری برکت علی سے آخری ملاقات پونا میں ہوئی۔ یہ تقسیم سے پہلے کی بات ہے۔ جب یہ چودھری صاحب اور چودھری نذیر احمد ہندوستان کا دورہ کرتے ہوئے پونا پہنچے۔ اور کرشن چندر کے پاس ٹھہرے۔ ان دنوں جوش اور ساغر نظامی پونا میں تھے۔ اچھی خاصی محفلیں رہیں۔ چودھری برکت علی پر خلوص قہقہے لگاتے رہے۔ لیکن آئندہ کا اشاعتی پروگرام بھی بنایا۔ مجھے یاد ہے، کہ برکت علی کہا کرتے تھے "کرشن صاحب، اب کے کتاب ایسی چھاپوں گا کہ وہ ہندوستان میں ایک یادگار ہو کر رہ جائے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ ہر بڑے اور چھوٹے ادیب کی کتاب میرے ادارہ سے چھپے۔ میں چاہتا ہوں۔ کہ کوئی ادیب بھوکا نہ مرے۔ روپیہ میں بناؤں، کوٹھی دوں۔ اور آپ لوگ صرف ادب کی خدمت کریں۔ اور کچھ نہیں۔" اُس وقت وہ جوش، کرشن چندر، ساغر نظامی، اور میری کتابیں لے گئے۔ اور اسی طرح باقی ہندوستان کا دورہ کر کے مواد مسودے لے گئے۔ اور سب کو رائلٹی دی —— اور اس میں کوئی شک نہیں۔ کہ مکتبہ اُردو نے چودھری برکت علی کی قیادت میں اردو ادب کو ایک نئی سطح پر پہنچایا۔ ترقی پسند ادیبوں کی کتابیں چھاپ کر اس تحریک کی خدمت کی۔ چودھری صاحب کی یہ خدمت ناقابلِ فراموش خدمت ہے۔ ان کی اچانک موت کا مجھے بہت رنج ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ ہمارے ساتھی ادبِ لطیف کو یادگارِ برکت علی سمجھ کر اس میں لکھتے رہیں گے۔ اور مکتبہ اُردو اسی طرح ترقی پسند تحریک کا ساتھ دیتا رہے گا —— میں اپنی طرف سے ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں سے اپنے دلی غم کا اظہار کرتا ہوں —— کاش میں وہاں پہنچ سکتا ——

تعزیتی پیغامات

جو بر عظیم کے مختلف گوشوں سے ادیبوں اور دانشوروں نے بھیجے

چودھری برکت علی صاحب مرحوم و مغفور کی ذاتِ گرامی دنیائے اشاعتِ ادب میں ایک نہایت ہی ممتاز درجہ رکھتی تھی۔ افسوس کہ دستِ بیدادِ اجل نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ اس غم میں مجھے اپنا شریک سمجھئے۔ چودھری صاحب مرحوم میرے حال پر جو شفقت فرمایا کرتے تھے، اس کا بدلہ اتارنا میرے لئے ناممکن ہے۔ صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ اپنی بضاعت کے مطابق آپ کے ارشاداتِ گرامی کی تعمیل کو اپنی سعادت سمجھوں۔

(سید ذوالفقار علی بخاری)

آپ کے والد ماجد کی وفات کا حال سن کر بہت افسوس ہوا۔ میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے۔ اور میری تمنا ہے کہ جس کاروبار کو انہوں نے قائم کیا تھا وہ آپ کی نگرانی میں سرسبز رہے۔ اس کا تو مجھے یقین ہے کہ آپ کے ادارے نے مرحوم و مغفور کی رہنمائی میں اردو ادب کی جو خدمت کی ہے اس میں یقیناً اضافہ ہوتا رہے گا۔ آپ اردو کے ان مخلص حامیوں میں ہیں جن کے اخلاص پر ہمیشہ بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

(قاضی، محمد عبدالغفار)

چودھری برکت علی صاحب کی وفات کی خبر ایسی غیر متوقع تھی کہ یقین نہیں آ رہا۔ اب بھی جیسے ان کا ہنستا ہوا چہرہ دیکھ رہا ہوں۔ جب وہ آخری بار بمبئی میں ہمارے ہاں آئے تھے ان دنوں کی خوشگوار یادیں میرے خانۂ دل میں چمک اٹھتی ہیں۔ موت بھی کیسے کیسے چراغ بجھا دیتی ہے۔ چودھری صاحب کو جہاں اچھی کتابیں شائع کرنے کا جنون تھا وہاں وہ ان اچھی کتابیں لکھنے والے مصنفوں کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی کما حقہ آشنا ہوتے تھے۔ اور اکثر محفل میں ان کا ذکر بڑے دلچسپ پیرائے میں کیا کرتے تھے۔ افسوس کہ یاروں کی محفل سے ایک اچھا دوست اٹھ گیا۔ اس کی یادگار ادب لطیف باقی ہے۔ اسے باقی اور زندہ رہنا چاہئے۔

(کرشن چندر)

چودھری برکت علی مرحوم میرے پرانے دوست اور ہم مکتب تھے۔ ان کے انتقال سے مجھے ایسا ہی صدمہ پہنچا جیسا کہ تاثیر، اختر شیرانی یا میرا جی کی وفات سے پہنچا تھا۔ خدا ان سب کی روحوں کو جنت میں جگہ دے۔
آج کل کچھ ایسی "مری" پڑی ہے کہ اپنی اور دوسروں کی زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں رہا۔

(غلام عباس)

چودھری برکت علی مرحوم کی وفات کی خبر اخبار میں دیکھی۔ جو دلی صدمہ پہنچا اس کا اظہار ناقابلِ بیان ہے۔ یہ کب اور کسے معلوم تھا کہ ہماری ان کی پہلی ملاقات آخری ملاقات بن جائے گی جس دن میں لاہور سے کراچی آنے والا تھا اس دن وہ مجھے اور قاسمی کو نہر کے کنارے لے گئے، اور وہاں بڑی دیر تک ٹہل ٹہل کر علمی و ادبی موضوعات اور اشاعتی پروگرام پر باتیں کرتے رہے۔ چونکہ انتظار کا

وقت قریب تھا اور مجھے اسٹیشن بھی پہنچنا تھا۔ اس لئے ہم لوگ افطار سے قبل ہی لوٹ آئے۔ معلوم ہوا کہ اسی دن افطار کرنے کے دوران ہی ان کو دردِ گردہ کی شکایت ہو گئی۔ یہ خبر قاسمی صاحب کراچی لائے۔ خیال یہ تھا کہ کچھ دنوں کے بعد سنبھل جائیں گے۔ لیکن زمانہ کب کسی کی توقعات کو پورا کرتا ہے جو اسے پورا کرتا۔ چودھری برکت علی بذاتِ خود ایک ادارہ تھے، انہوں نے ترقی پسند ادب اور نئے رجحانات کا اس وقت ساتھ دیا جبکہ دوسرے ناشرین اس نام سے بدکتے تھے۔ ادبِ لطیف کی کامیابی اور شہرت میں ان کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہوں نے کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، فیض احمد فیض، ساحر، ندیم اور بہت سے دوسرے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی۔ ان کا اس سے بھی بڑا کارنامہ باری مرحوم کے بنانے اور ان کی تحریروں کے ذریعے ترقی پسند خیالات کی تبلیغ و اشاعت کا تھا۔ جہاں تک ادیبوں کے ساتھ لین دین کا تعلق ہے ان سے ہر شخص مطمئن اور آسودہ تھا۔ ایک وہ شخص جس کی ملاقات اتنے تھوڑے عرصے کی رہی ہو اور جس کا سابقہ اس قدر کم رہا ہو وہ اس بات کا مستحق نہیں کہ ان کی تمام خوبیوں کا اعادہ کر سکے تاہم اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں نے اس قلیل ملاقات ہی میں یہ چیز محسوس کر لی کہ چودھری برکت علی کو مکتبے سے دلچسپی صرف روپے کی خاطر نہیں ہے بلکہ وہ اس ادارے کے ذریعے ملک و قوم اور ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کرنا چاہتے ہیں۔

ادارے کو ان کا کام آگے بڑھانا چاہئے۔ کیونکہ زندگی لافانی ہے۔ اگر چودھری صاحب کا مکتبہ اور ان کی خدمات کا تسلسل زندہ رہے گا تو چودھری برکت علی بھی زندہ رہیں گے۔

(ممتاز حسین)

چودھری برکت علی صاحب کی وفات پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ وہ ہمارے لئے قابلِ صد احترام تھے۔ اور ان کی یاد ہمارے دل و دماغ سے کبھی محو نہ ہو گی۔

اس صدمۂ جانکاہ میں میں آپ سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں۔ آپ مکتبۂ اردو، ادبِ لطیف اور پنجاب بک ڈپو کے کاروبار کو بڑھا کر ان کی یاد کو زندۂ جاوید کر سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ چودھری صاحب نے جو شمع روشن کی تھی آپ اسے روشن رکھیں گے۔ یہی ان کی بہترین یادگار ہے۔

(عبدالسلام خورشید)

چودھری برکت علی کی وفات کی خبر سن کر بے حد صدمہ ہوا۔ مجھے افسوس ہے کہ ان کی بیماری کی خبر کا مجھے علم نہ ہوا۔ اور میں ملاقات سے محروم رہ گیا۔ چودھری صاحب کی شخصیت سے ہم سب کو محبت تھی۔ اللہ تعالےٰ آپ کو توفیق عطا فرمائے کہ آپ ان کے نقشِ قدم پر چل سکیں۔ اور اس جانکاہ صدمے کو برداشت کر سکیں۔

(ممتاز مفتی)

اللہ تعالےٰ جناب چودھری صاحب مرحوم پر رحمت کے دروازے وا کرے! آمین۔ یہ رنج دہ خبر مجھے آپ کے خط سے ملی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مکتبۂ اردو سے میرے دیرینہ تعلقات ہیں۔ اللہ تعالےٰ آپ کو توفیق دے کہ آپ اپنے والد صاحب کی روایاتِ صالحہ کو جاری قائم اور مستحکم رکھ سکیں۔ انشاءاللہ حسبِ توفیق میں آپ سے تعاون کرتا رہوں گا۔

(سید اختر اللہ ہاشمی)

چودھری صاحب کے انتقال کی خبر سن کر مجھے بے حد رنج ہوا۔ مجھے اس سے پہلے ان کی بیماری کی کوئی [illegible] اور نہ ان کے انتقال کی۔ اللہ تعالےٰ انہیں جنت نصیب کرے۔ اور آپ حضرات کو صبر کی توفیق دے۔

آپ بڑی خدمت کریں گے اگر ان کے قیمتی ورثہ کو قائم رکھیں گے۔

(رشا احمد دہلوی)

حقیقت یہ ہے کہ چودھری صاحب کی موت ان کے اعزہ اور اولاد کے علاوہ ان کے وسیع حلقۂ احباب کیلئے بھی بہت رنجدہ ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی اشاعت اور توسیع کا کام اس وقت شروع کیا جب ملک میں عموماً اور پنجاب میں خصوصاً کوئی قابلِ ذکر اشاعتی ادارہ موجود نہ تھا۔ اور بظاہر اشاعت کی زمین اتنی بنجر معلوم ہوتی تھی کہ کسی بہادر اور حوصلہ مند شخص کے بغیر اس زمین میں قدم رکھنا کسی دوسرے آدمی کا کام نہ تھا۔ چودھری صاحب نے نقصان اور خسارے کے خوف کے باوجود قدم اٹھایا۔ اور اپنی ہمت اور زیرکی کی بدولت بہت جلد اس بنجر زمین کو ادب کا گل وگلزار بنا دیا ——— میں چودھری صاحب کو ایک سیاسی کارکن کی حیثیت سے بھی جانتا ہوں۔ اور اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ مجلسِ احرار کے پرجوش رکن اور خادم کی حیثیت سے عملی خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس حیثیت سے بھی ان کی زندگی اور ان کا عمل نہایت قابلِ قدر اور قابلِ ستائش تھا۔ میری ناچیز رائے میں چودھری صاحب کے انتقال سے خادمانِ ادب کے حلقے میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کو آسانی سے پُر نہیں کیا جا سکتا۔ خدا تعالیٰ آپ کو اپنے والد مرحوم جیسا حوصلہ وہمت اور ان جیسی زیرکی اور فراست عطا فرمائے۔ مجھے آپ سے دلی ہمدردی ہے۔ اور میں آپ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

(سید عبداللہ)

چودھری صاحب مرحوم کے انتقالِ پرملال کی خبر سن کر تمام ساتھیوں کو صدمہ ہوا۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ہم سب کو اس قابل بنائے کہ اس ادبی تحریک کی خدمت کر سکیں جس کے ساتھ مرحوم تا عمر وابستہ رہے۔

(ڈاکٹر) سلامت اللہ

چودھری برکت علی مرحوم کی بے وقت وفات حد درجہ افسوسناک ہے۔ اشاعتِ ادب کے سلسلہ میں بھی یہ نقصانِ عظیم ہے۔ اور حلقۂ احباب کے لئے شدید صدمہ کا موجب۔

خداوند کریم مرحوم کو اعلیٰ علیین میں جگہ عطا کرے اور پس ماندگان کو توفیقِ صبر بخشے۔

(عشرت رحمانی)

چودھری صاحب کے انتقالِ پرملال کی خبر اس سے کچھ عرصے قبل سنی تھی۔ انہوں نے اردو ادب اور زبان کی جو خدمات کی ہیں وہ ناقابلِ فراموش ہیں۔ ادب کی دیوی کے پاس جمال اور حسن تھا۔ مگر اسے دیدہ زیبی اور خوش پوشاکی عطا کرنے میں چودھری صاحب کا بڑا اہم حصہ رہا ہے۔ میری طرف سے تعزیت قبول فرمائیے۔

مجھے مسرت ہے کہ آپ نے چودھری صاحب کے عظیم ورثے کو پوری ذمہ داری سے جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں اپنی طرف سے آپ کو پوری اعانت اور امداد کا یقین دلاتا ہوں۔ میں آپ کی ہر طرح معاونت کرنے میں مسرت محسوس کروں گا۔

(ڈاکٹر) محمد حسن

چودھری صاحب کو مرحوم لکھتے ہوئے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مرحوم کی اشاعتی خدمات کو اردو ادب، اگر وہ اپنے محسنوں کو فراموش کرنے کا خوگر نہیں ہے تو کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ خدا مرحوم کو فردوسِ بریں میں جگہ دے اور آپ کو اور دیگر پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

ادبِ لطیف مرحوم کا روحانی ورثہ ہے۔ آپ نوجوان ہیں۔ نیا نیا خون ہے۔ کام کرنے کی خواہش بھی ہے۔ کوشش کیجئے

کہ ادبِ لطیف کا معیار اور بلند ہو۔ اور وہ ایسا بن جائے کہ لوگ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو اپنی ڈاک میں سب سے پہلے اسے ہی تلاش کریں۔ اور یہ کام آپ کے لئے کچھ ایسا مشکل بھی نہیں ہے۔ آپ کا کاروبار وسیع ہے۔ والد صاحب کے نام کو آپ اسی طرح زندہ رکھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح ان کی روح کو سکون کا سامان بھی مہیا کر سکتے ہیں۔

آپ کا یہ جملہ آپ کے عزم کو ظاہر کرتا ہے "مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کو نہ صرف زندہ رکھوں گا بلکہ دونوں پہلے سے بھی بڑھ کر ترقی کریں گے۔" میری طرف سے ہر قسم کا تعاون انشاء اللہ ہمیشہ آپ کو حاصل رہے گا۔

(جمیل جالبی)

چوہدری صاحب کی وفات کی خبر سن کر مجھے یقین نہ آیا کہ میں چوہدری صاحب کی وفات کی خبر سن رہا ہوں۔ دراصل مجھے آج بھی یقین نہیں آ رہا کہ وہ وفات پا گئے ہیں۔ میں جب کبھی ادبِ لطیف کے دفتر میں بیٹھا ہوتا ہوں تو نہ جانے کیوں مجھے ہر گھڑی یہ محسوس ہوتا ہے جیسے ابھی دروازہ کھلے گا اور ایک مضبوط چوڑے جسم والا انسان مسکراتا ہوا اندر داخل ہوگا اور ٹوپی اتار کر کہے گا۔
"بھئی واہ یہاں تو میلہ لگا ہے۔"

(اے حمید)

چودھری برکت علی صاحب کے نا وقت انتقال کا انتہائی افسوس ہے۔ انہوں نے اردو کی جتنی خدمت کی ہے اس کی مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔ ادبِ لطیف کو جس طرح سے انہوں نے اتنے روز چلایا ہے وہ تو آپ اپنی مثال ہے۔ چودھری صاحب کی اس یادگار کو زندہ رکھنا ہم سب کا فرض ہے۔ اپنی حد تک میں کمل اشتراک کا یقین دلاتا ہوں

(غلام ربانی تاباں)

چودھری صاحب مرحوم نے علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے ذریعے ہند و پاکستان کی جو خدمت انجام دی ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اس وقت ان کی یادگار کو بہترین طور پر قائم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کے کام کو پوری ہمت سے جاری رکھیں اور انہوں نے جو پودے لگائے ہیں جان و دل سے ان کی آبیاری کریں۔ مجھے یقین ہے اس نیک کام میں آپ کو چودھری صاحب مرحوم کے تمام دوستوں اور رفیقوں کا تعاون حاصل ہوگا۔

(جگن ناتھ آزاد)

آپ کا خط ملا۔ جونہی اس کی پہلی سطر پر نگاہ پڑی۔ دل کو ایک دھچکا سا لگا اور مجھے ایسے معلوم ہوا جیسے میں کوئی بہت قیمتی شے کھو بیٹھا ہوں۔ چودھری برکت علی کی موت کا یہ صدمہ بہت بڑا صدمہ ہے۔ ابھی ہمیں ان کی راہنمائی کی بڑی ضرورت تھی۔ افسوس کہ حیات نے وفا نہ کی۔

لیکن اس سب کے باوجود دل نہیں مانتا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔ اچھا ہے اگر دل نہ مانے۔ ورنہ اگر دل کہیں یہ مان گیا تو پھر اور کچھ نہ مانے گا۔

(مارگن فیلیو ڈر)

چودھری برکت علی صاحب کی قبل از وقت موت کی خبر کو ہر اس شخص نے جس کا اردو ادب و زبان سے تھوڑا سا تعلق بھی ہے دلی صدمہ کے ساتھ سنا ہوگا مرحوم پہلے لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے خالص و معیاری ادبی تصنیفات کو گٹ اپ کی جدید ترین خوبصورتیوں کے ساتھ چھاپنا شروع کیا۔ اور یوں اردو ادب کے فروغ و قبول میں یادگار حصہ لیا۔ (سید ضمیر جعفری)

چودھری صاحب مرحوم کے انتقال کی خبر اخبارات میں پڑھ چکا تھا۔ کیا کہوں دل پر کیا گزری۔ زبان و ادب کا ایک ایسا مربی ہم سے چھن گیا جس نے گیسوئے اردو کو صحیح معنوں میں سنوارا۔ میں "ادبِ لطیف" کا مطالعہ کم و بیش بارہ سال سے کر رہا ہوں۔ اور مجھے یہ اعتراف کرنے میں مسرت ہوتی ہے کہ میں نے اپنے ادبی ذوق کی تربیت اور اپنے شعور کو جلا دینے میں "ادبِ لطیف" سے بڑا فائدہ اٹھایا ہے۔ ادبِ لطیف ترقی پسند ادیبوں کا ایسا رسالہ ہے جو باقاعدہ نکلتا رہا ہے۔ اور جس اہتمام و آرائش کے ساتھ اس نے ہمیشہ پہلے پرچوں سے ترقی پسند ادیبوں کی تخلیقات پیش کی ہیں۔ شاید ہی اس کی مثال اردو صحافت میں مل سکے۔ اگر اردو کے بہترین افسانوں، نظموں، ڈراموں اور تنقیدی مضامین کا جائزہ لیا جائے تو مجھے پوری توقع ہے کہ اس میں سے بیشتر ایسے نکلیں گے جو پہلی بار ادبِ لطیف کے ذریعہ منظرِ عام پر آئے۔

مکتبہ اردو نے نوجوان ادیبوں کی تخلیقات کو شائع کر کے اشاعت کا جو معیار پیش کیا ہے وہ غالباً ہمارے یہاں پہلی مثال ہے آج تو خیر بہت سے مکتبے قائم ہو گئے ہیں جو اپنی مطبوعات کو زیادہ سے زیادہ حسین و دیدہ زیب بنانے کی کوشش کر رہے ہیں لیکن اس راہ میں پہلا چراغ مکتبہ اردو ہی نے جلایا ہے جسے اردو ادب و زبان کا کوئی مورخ نظر انداز نہیں کر سکتا۔

ابھی کل ہی کراچی کے رسالہ "افکار" کا تازہ ترین پرچہ ملا جس میں چودھری صاحب مرحوم کا وہ پیغام شائع ہوا ہے جو انہوں نے بسترِ علالت سے ترقی پسند مصنفین پاکستان کی کانفرنس کو بھیجا ہے۔ پڑھ کر دل بھر آیا۔ ان کا خلوص، ان کا اپنے ادب سے لگاؤ، نوجوان ادیبوں سے ان کی محبت کے انمٹ نقوش ہمارے دلوں کو ہمیشہ گرم رکھیں گے۔ ع

اب کہاں لوگ اس طبیعت کے

امید ہے آپ چودھری صاحب کی اعلیٰ روایات کے بہترین وارث ثابت ہوں گے۔ میں آپ کو اپنے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

چودھری صاحب کی موت آپ کے لئے جتنی جانکاہ ثابت ہوئی ہوگی اس کا اندازہ تو ہم لگا نہیں سکتے۔ لیکن ہمارے لئے بھی کچھ کم اندوہناک نہیں ہے۔ لیکن جس نے ادب کی خدمت میں اپنی جان دی اسے ہم مرحوم کہنے کی جرأت کیونکر کر سکتے ہیں۔ اس کی روح ہماری تہذیب و ثقافت کی روح ہے۔ اور اس کا ہر نقشِ قدم ہمارے لئے مشعلِ راہ بن سکتا ہے۔

آپ نے چودھری صاحب کے قدموں کو پہچان لیا ہے۔ آپ جو کچھ کریں گے انشاء اللہ اس میں کامیاب ہوں گے۔ میں اردو کا ایک ادنیٰ خادم ہوں۔ اگر اس سلسلے میں آپ کی کسی خدمت کے لائق ہوا تو اس سے ہرگز گریز نہیں کرونگا

(انجم اعظمی)

چودھری برکت علی مرحوم کی وفات سے دلی صدمہ ہوا۔ مرحوم کی ادب دوستی میں کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کی تمام عمر خدمتِ ادب میں گزری۔ مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کے ذریعے سب سے پہلے انہوں نے ہی پنجاب میں ترقی پسند ادب کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا۔ باری مرحوم کی کتاب "کمپنی کی حکومت" انہوں نے اس وقت چھاپی جب کہ اس قسم کی جرأت بہت مہنگی پڑتی تھی۔ مرحوم سے ہمارے ذاتی مراسم بھی تھے۔ اس لئے ہمیں انہیں قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ حقیقتاً شعوری طور پر ترقی پسند واقع ہوئے تھے۔ ایک تاجر ہوتے ہوئے بھی ہمیشہ جلبِ زر سے زیادہ مقصدیت کا انہیں خیال رہا۔ وہ چاہتے تو گھٹیا لٹریچر چھاپ کر ہزاروں لاکھوں روپے کما سکتے تھے لیکن اپنے نام اور معیار کو بٹہ لگانا انہیں کبھی گوارا نہ ہوا۔

ہمیں امید ہے جو مشعل مکتبہ اردو اور ادبِ لطیف کی صورت میں چودھری صاحب مرحوم روشن کر گئے ہیں وہ کبھی گل نہ ہوگی۔

ہماری ہمدردیاں اور مخلصانہ تعاون ہمیشہ آپ کے ساتھ رہے گا۔

(فارغ بخاری ۔ رضا ہمدانی)

چودھری صاحب کے انتقال کی خبر سے مجھے دلی رنج اور قلق ہوا۔ مرحوم سے ذاتی طور پر میرے مراسم اگرچہ بہت گہرے نہیں تھے۔ تاہم چند مختصر سی ملاقاتوں ہی نے مجھے ان کی شریف النفسی اور خلوص نے بے حد متاثر کیا تھا۔ ان کی موت بلاشبہ اردو کلچر کے ایک عظیم اور ناقابلِ فراموش محسن کی موت ہے۔

میں یہ چند سطور انتہائی دکھ سے لکھ رہا ہوں ۔

(نریش کمار شاد)

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بہت افسوس ہوا کہ ادبِ لطیف کے مالک جناب چودھری برکت علی صاحب کا انتقال ہو گیا خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے متعلقین کو نیز آپ سب لوگوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔

(ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی) ۔

اخبارات کے ذریعے آپ کے والدِ گرامی کی وفات کا پڑھ کر بہت صدمہ ہوا ادب اردو کی اشاعت میں چودھری صاحب نے ایک طرح نو استوار کی تھی جو ان کے زندۂ جاوید رہنے کی ضمانت ہے ۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ ان کے قابلِ قدر ترکے کو نہ صرف قائم رکھیں گے بلکہ اس کی ترقی کا باعث بھی ہوں گے آپ کے عزائم قابلِ تعریف ہیں۔ خدا آپ کو چودھری صاحب مرحوم کی روایات برقرار رکھنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔

میری معاونت آپ کے شاملِ حال ہے ۔

(سید فیضی)

کل ہی چودھری صاحب کے انتقال کی خبر "امروز" میں پڑھی ——— کیا بتاؤں ؟

کتنے عالم گزر گئے دل پہ

چودھری صاحب کو ہمارے ادب اور زندگی کے ارتقاء پسند نظریات سے جس قدر خلوص تھا ——— وہ ایک حقیقت ہے ۔ آئینے کی طرح صاف اور روشن حقیقت ۔

چودھری صاحب اٹھ گئے، ہمارے مخلص ساتھیوں میں سے ایک ساتھی کم ہو گیا۔ ہماری دنیا ایک انسان سے محروم ہو گئی۔ ان تمام عزائم سے محروم ہو گئی جو عمل میں ڈھل آنے کے خواب دیکھ رہے تھے۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے۔ کتنا عظیم نقصان ہے ۔ کرشن چندر نے سچ کہا ہے ——— "جب ایک انسان مرتا ہے تو .... ایک دنیا مر جاتی ہے"

میں کیا ہندو پاک کے سارے ادیب، شاعر اور فنکار اس غم میں برابر کے شریک ہیں ۔ ادیب بھی ان آنسوؤں کو پونچھنے کی کوشش کریں گے ۔ جو چودھری صاحب کی موت سینچتی ہوئی آنکھوں کو دے گئی ہے ۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ

موت جب آ کے کوئی شمع بجھا دیتی ہے ۔۔۔ زندگی ایک کنول اور جلا دیتی ہے

لیکن ——— اس وسیع و عریض دنیا میں چودھری برکت علی کہاں ملیں گے ؟

اک یہی غم ہے، نہیں جس کا مداوا کوئی

چودھری صاحب کی وفات سے ادبی اور ثقافتی دنیا کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ مدتوں تک فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔
[illegible] کو صبر اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین!
میں پورے خلوص سے آپ کے غم میں شرکت کا اور آپ کے بلند عزائم سے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

محمد بجنوری

"پاکستان ٹائمز" میں چودھری برکت علی صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر دل کو انتہائی قلق ہوا۔ افسوس کہ اردو ادب ایک بہت بڑے محسن سے محروم ہو گیا ہے۔ مرحوم چودھری صاحب کو ترقی پسند ادب کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ وہ نہ صرف ابتدا سے اس کے مربی اور معاون رہے ہیں بلکہ انہوں نے ترقی پسند ادب کے ہر موڑ پر اس کا مخلصانہ اور والہانہ طور پر ساتھ دیا ہے۔ چودھری صاحب کا نام، ادبِ لطیف اور مکتبہ اردو کا مقام ادب کی تاریخ میں ہمیشہ سربلند، واضح، روشن اور زندہ رہے گا۔ چودھری صاحب مرحوم نے زندگی کی شریانوں میں چمکتا ہوا گرم خون دوڑانے والے ادب اور تحریک کا چونکہ ہمیشہ سے ساتھ دیا ہے لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ چودھری صاحب اپنی موت کے باوجود زندہ رہیں گے۔ موت اور وقت کا ہولناک جھکڑ ان کے کارناموں، ان کے نام اور نمایاں مقام کو کبھی دھندلا نہ سکے گا۔

(عزیز اثری)

چودھری برکت علی صاحب کی وفات کی خبر پڑھ کر افسوس ہوا۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ اردو ادب کو ایسا معاملہ فہم، ادب شناس اور اچھا پبلشر مشکل سے ملے گا۔

(ڈاکٹر) وحید قریشی

آفاق اور امروز میں یہ خبر پڑھ کر افسوس ہوا کہ چودھری برکت علی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ مرحوم نے اردو ادب کی نشر و اشاعت میں جو خدمات انجام دی ہیں وہ سب پر عیاں ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ خود مصنف نہ تھے، لیکن جس طرح ایک لائبریرین خود مصنف نہیں ہوتا لیکن مصنفوں کو نئے نئے مشورے دے کر نئی نئی کتابیں لکھوانے میں مدد کرتا ہے، اسی طرح ایک ناشر بھی یہی کام دوسرے طریقے پر انجام دیتا ہے۔ چودھری صاحب نے اپنی ہمت سے اپنے لئے ایک نئی راہ پیدا کی۔ اور بہت سے نئے لکھنے والوں کو پہلی مرتبہ اردو داں طبقہ سے روشناس کرایا۔ بہرحال مرنے والے میں ہزاروں خوبیاں تھیں۔ اور ان کی دائمی جدائی پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے۔ آپ کو اس موقعہ پر جو رنج ہوا ہوگا وہ ظاہر ہے۔ مجھ کو بھی اپنے غم میں برابر کا شریک سمجھئے۔ خدا آپ کو اس رنج کے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(نبی احمد جامعہ ملیہ)

کل ہماری انجمن کا ایک جلسہ ہوا تھا، اس میں معلوم ہوا کہ آپ کے قابلِ قدر والد صاحب چودھری برکت علی کا اچانک انتقال ہو گیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالےٰ ان کی بخشش فرمائے۔ اور آپ لوگوں کو صبر کرنے کی، اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ آمین!

انہوں نے اردو ادب کی جتنی اچھی خدمت کی ہے لاہور کے کسی ادارہ نے بھی نہیں کی۔ میرے ان سے ۱۹۳۷ء سے مراسم [illegible] کی بنا پر آپ سے عرض کروں گا کہ ان کے کاروبار کو ان سے بھی زیادہ آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ [illegible] اللہ تعالےٰ آپ کی مدد کرے گا۔

وصی اشرف (کتب خانہ علم و ادب)

آپ کا خط ملا۔ آپ کے والد مرحوم کی وفات کی خبر سے صدمہ ہوا۔ ادارہ دارالمصنفین اس صدمہ میں آپ کا شریکِ غم ہے۔ مرحوم نے اردو زبان کی بڑی گراں قدر خدمت انجام دی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اپنی رحمت و مغفرت سے سرفراز فرمائے۔ دارالمصنفین آپ کے علمی و ادبی خدمات میں ہر طرح تعاون کے لئے ہمیشہ تیار رہے گا

معین الدین احمد ندوی دارالمصنفین اعظم گڑھ

تعزیت کی قراردادیں

انجمن ناشران و تاجرانِ کتب کراچی کا یہ غیر معمولی جلسہ چودھری برکت علی صاحب مالک "مکتبہ اردو" و "پنجاب بک ڈپو" کی اچانک وفات پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔ اور ان کے انتقال کو ایک ایسا سانحہ تصور کرتا ہے جسے علم دوست حضرات کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ انہوں نے اردو علم و ادب کی نشر و اشاعت میں سالہا سال تک بہت نمایاں حصہ لیا اور اردو کتابوں کو معیاری انداز پر پیش کرنے میں جو انفرادیت انہوں نے پیدا کی وہ مدت دراز تک مرحوم کی یاد کو تازہ رکھے گی۔ یہ جلسہ چودھری صاحب کی وفات کو اردو علم و ادب کے لئے ایک زبردست نقصان تصور کرتا ہے۔ اور خدا سے دست بدعا ہے کہ وہ مرحوم کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے متعلقین کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

شریکِ غم: ضیاء الدین
سیکرٹری انجمن ناشران و تاجرانِ کتب (کراچی)

انجمنِ ترقی پسند مصنفین شاخ دہلی اس رنجیدہ خبر پر اظہارِ افسوس کرتی ہے کہ "ادبِ لطیف" کے مالک اور مدیر جناب چودھری برکت علی ۹ راگست کو رحلت فرما گئے ہیں۔ مرحوم کی ادبی خدمات کے سلسلہ میں کوئی ادب دوست ناواقف نہیں۔ مرحوم کو شروع ہی سے ترقی پسند تحریک سے دلی لگاؤ تھا۔ اور انہوں نے دوسرے ناشرین کے مقابلہ میں ہمیشہ ترقی پسند ادیبوں کی تصانیف شائع کیں۔ "ادبِ لطیف" جس ہمت اور استقلال سے آج تک ترقی پسند ادیبوں کی نمائندگی کر رہا ہے یہ مرحوم ہی کا کام تھا۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اردو ادب کی اشاعتی تاریخ میں چودھری صاحب کی بے وقت موت سے جو خلا پیدا ہو گیا ہے وہ بہت دنوں تک پُر نہیں ہو سکے گا۔

پرکاش پنڈت سیکرٹری
انجمن ترقی پسند مصنفین دہلی

آرٹ اینڈ لٹریچر سوسائٹی ایبٹ آباد کے تمام ممبران اور اس اجلاس کے تمام حاضرین لاہور کے مشہور پبلشر چودھری برکت علی مالک مکتبہ اردو و ایڈیٹر ادبِ لطیف کی وفات حسرت آیات پر اظہارِ رنج و غم کرتے ہیں۔ مرحوم نے اردو ادب کی خدمت اور ملک کے نوجوان ادیبوں کی ہمت افزائی کا بوجھ اس وقت سنبھالا جبکہ یہ برِ عظیم ایک مسلسل پریشانی کے دور سے گزر رہا تھا۔ یہ خلا آسانی سے پُر نہ ہو سکے گا۔ دعا ہے کہ خداوند کریم مرحوم کو جنتِ فردوس میں جگہ دے اور مرحوم کے لواحقین کو اس عظیم کام کو

...کی تعزیتی قرارداد۔ آمین!

پیش کردہ:- اللہ بخش ... آنریری سیکرٹری آرٹ اینڈ کلچر سوسائٹی ایبٹ آباد
تائید:- نسیم حجازی۔ نگران "تعمیر" روزنامہ راولپنڈی
مورخہ:- ۲۹/ اگست ۱۹۵۹ء۔
زیرِ صدارت:- ایس فیاض علی صاحب۔ ایڈووکیٹ جنرل پاکستان



۱۸ اگست کی شام کو ادبی و درسی کتابوں کے مشہور ناشر اور مشہور ترقی پسند ماہنامہ "ادبِ لطیف" کے مالک و مدیر چودھری برکت علی دو مہینے کی علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون!

چودھری صاحب کی عمر ۵۰ سال کے لگ بھگ تھی۔ آپ لاہور کے اراعی برادری کے اہم رکن تھے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم ... سکول میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔

بی اے کرنے کے بعد آپ نے درسی کتابوں کا کام شروع کیا اور پنجاب بک ڈپو کی بنیاد رکھی۔ اس کے بعد ۴۳-۱۹۴۲ء میں مکتبہ اردو کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا۔ اور اسی زمانے میں مرزا ادیب کی ادارت میں ماہنامہ "ادبِ لطیف" جاری کیا۔ مکتبہ اردو نے پچھلے سولہ سترہ برس میں اردو ادب کی اشاعت میں اس برِاعظم میں سب سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔
اور اس سلسلے میں کوئی اور
ادارہ مکتبہ اردو سے ٹکّا نہیں کھا سکتا۔ دراصل اس تمام علمی و ادبی کام میں چودھری برکت علی مرحوم کی شخصیت کارفرما تھی۔

ترقی پسند ادب کی نشر و اشاعت میں اس قدر گہری دلچسپی کی وجہ بھی یہ تھی کہ مرحوم شروع ہی سے سامراج دشمن تحریکوں سے بہت ہی گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ گو چودھری صاحب نے عملی سیاست میں کبھی حصہ نہیں لیا۔ لیکن وہ ہمیشہ سامراج دشمن جماعتوں سے بہت گہری ہمدردی رکھتے تھے۔ چنانچہ مجلسِ احرار سے ان کو اس زمانے میں اس لئے گہری عقیدت رہی کہ اس دور میں مجلسِ احرار ایک سامراج دشمن تحریک تھی۔ غالباً یہی سامراج دشمنی کا جذبہ تھا۔ جس نے چودھری صاحب کو مکتبہ اردو کی بنیاد رکھنے کی طرف مائل کیا۔ چنانچہ مکتبہ اردو نے ابتدائی برسوں میں جو کتابیں شائع کیں وہ سامراج دشمن ادب میں بہت ہی بلند درجہ رکھتی ہیں۔ اسی زمانے میں باری مرحوم کی معرکتہ آلارا تصنیف "کمپنی کی حکومت" مکتبہ اردو کی طرف سے شائع کی گئی۔ اس وقت اس نوعیت کی کتاب شائع کرنا فیصل گردے کا کام تھا۔ اس کے بعد کمیونسٹ مینی فسٹو، سٹالین، عصمت انونو، مصطفےٰ کمال اور ... سامراج دشمن شخصیتوں کی زندگیاں شائع کیں۔ ان سیاسی موضوعات کے علاوہ جب ہندوستان کے برِاعظم میں ترقی پسند مصنفین کی تحریک ابھری تو مکتبہ اردو نے ہندوستان بھر کے ترقی پسند مصنفین کی نگارشات کو شائع کرنا شروع

گیا۔ چنانچہ ترقی پسند افسانہ نگاروں کی سب سے زیادہ تخلیقات مکتبہ اردو نے شائع کیں۔ کرشن چندر، منٹو، راجندر سنگھ بیدی، احمد عباس، دیوندر ستیارتھی، حیات اللہ انصاری کے افسانوں کے مجموعے سب سے پہلے اسی مکتبہ سے شائع ہوئے۔

نظم میں بھی فیض اور راشد کے مجموعے مکتبہ اردو نے شائع کئے۔ فیض اور راشد کے علاوہ مجاز، فراق، جذبی، اختر انصاری کے مجموعے بھی سب سے پہلے مکتبہ اردو سے ہی شائع ہوئے ہیں۔

مرحوم درسی کتابوں کے کاروبار کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ چنانچہ پچھلے چند برس سے ان کا یہ کاروبار بہت پھیل گیا تھا۔ اور وہ اب اپنی پوری توجہ اردو کے کلاسیکی ادب کی جدید ترتیب و تدوین کی طرف مبذول کرنا چاہ رہے تھے کہ ایک حیلہ گر نے ان پر حملہ کیا اور آخر اس پیہم سرگرم عمل شخصیت کا سلسلۂ حیات ختم ہو گیا۔ ہمیں امید ہے کہ مرحوم کے لواحقین ان صحت مند اور توانا روایات کو بدستور جاری رکھیں گے، جن سے مرحوم کو عقیدت کی حد تک محبت تھی۔

(بہ شکریہ "امروز" لاہور)

لاہور کے علمی و ادبی حلقوں میں یہ خبر رنج و افسوس کے ساتھ سنی گئی ہو گی کہ چودھری برکت علی مرحوم طویل علالت کے بعد انتقال فرما گئے۔ چودھری صاحب نے اپنی زندگی ذاتی محنت اور جد و جہد سے خود بنائی تھی اور صحیح معنوں میں وہ —— PIONEER تھے۔ آپ زندگی بھر ادبی و اشاعتی سرگرمیوں میں مصروف رہے۔ مکتبہ اردو اور پنجاب بک ڈپو کے پروپرائٹر اور رسالہ ادب لطیف کے مالک و مدیر تھے۔ پنجاب بک ڈپو نے خاصی تعداد میں درسی اور ادبی کتابیں شائع کی ہیں۔ اور مکتبہ اردو مشہور مصنفین کی الگ بھگ پانصد کتابیں شائع کر چکا ہے۔ آپ محض ایک ناشر اور کامیاب کاروباری ہی نہ تھے بلکہ ایک سرگرم قومی کارکن اور ایک درد مند دل کے مالک بھی تھے۔ آپ نے کئی قومی تحریکوں میں مالی مدد دی ہے۔ آج مسلم تعلیمی مجلس کے زیر اہتمام لاہور میں جو تین ہائی سکول کام کر رہے ہیں آپ ان کے مینجر بھی تھے۔

مرحوم خوش اخلاق اور شریف النفس انسان تھے۔ آپ کی وفات سے لاہور ایک محسن علم و ادب سے محروم ہو گیا۔ ہم مرحوم کے پسماندگان کے رنج و غم میں برابر کے شریک ہیں، اور ان کے ساتھ دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ مرحوم اپنی زندگی میں جس طرح نشر و اشاعت کے ذریعہ علم و ادب کی خدمت کرتے رہے۔ ہمیں یقین ہے کہ آپ کے صاحبزادے اپنے والد کے نقشِ قدم پر چل کر اس مفید کام اور ان کے اداروں کو جاری رکھیں گے۔ ہمیں مصنفین سے بھی توقع ہے کہ وہ ان اداروں کی حسبِ معمول سرپرستی فرماتے رہیں گے۔

ہماری دعا ہے کہ خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔ اور لواحقین کو صبرِ ایوبی عطا کرے۔

"مکتبہ اردو" لاہور کے مالک و مدیر چودھری برکت علی مرحوم کے سانحۂ ارتحال پر

[illegible] چودھری صاحب مرحوم نے ادبی اور اشاعتی حلقوں میں اردو ادب کی گرانقدر خدمات انجام دی ہیں۔ آپ نہ صرف پاکستان کے مشہور آدمی تھے۔ بلکہ برصغیر کے ادبی حلقوں میں آپ کا بڑا احترام تھا۔

آج ادبی اور اشاعتی حلقے بڑی شدت سے محسوس کر رہے ہیں کہ پاکستان ایک مخلص ادب دوست اور ایک مستعد ادیب نواز شخصیت سے محروم ہو گیا۔ آپ نے ماہنامہ "ادب لطیف" کے ذریعہ ادب اور زندگی کو ہمیشہ چولی دامن کی طرح ساتھ رکھا اور ہمیشہ ان کتابوں کو ملک کے سامنے پیش کیا جو واقعی ملک اور قوم کے لئے ضروری تھیں۔

ہم "مکتبہ اردو" ادارہ "ادب لطیف" اور چودھری صاحب مرحوم کے پسماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتے ہیں۔ اور دعا کرتے ہیں کہ خدائے بزرگ و برتر چودھری صاحب کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین ثم آمین!

"لالہ فراز" لائل پور

چودھری برکت علی مرحوم جو پچھلے دنوں ڈھائی ماہ کی مختصر علالت کے بعد انتقال کر گئے۔ اردو زبان کے ان سچے ہمدرد اور قدردان لوگوں میں سے تھے جن کی ٹھوس خدمات اور خاموش جدوجہد کو قوم ہمیشہ یاد رکھے گی۔ چودھری صاحب ادیب نہ تھے۔ ادیب گر تھے۔ فنکار نہ تھے فن پرور تھے۔ انہوں نے مکتبہ اردو اور ادب لطیف کے ذریعے ۱۵ سال تک اردو زبان اور اردو کے ادیبوں اور فن کاروں کو بے انتہا فائدہ پہنچایا۔ ایک پبلشر اور کاروباری انسان ہونے کے باوجود انہوں نے کبھی خود غرضی سے کام لے کر محض ذاتی منفعت کو مدنظر نہیں رکھا۔ بلکہ بے سہارا ادیبوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ ادیبوں کے حقوق غصب کرنا عام پبلشروں کی خصوصیت ہے۔ مگر چودھری صاحب کے ہاتھوں ادیبوں کے حقوق ہمیشہ محفوظ رہے۔ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ بعض ادیبوں کی وفات کے بعد تک ان کے اہل و عیال کو چودھری صاحب سے فائدہ پہنچتا رہا ہے!

اردو کے مصنفین کی حالتِ زار کو دیکھتے ہوئے یہ ایک بہت ہی مناسب قسم کا اقدام تھا۔ گو ممالک غیر میں ادارہ ہائے اشاعت کا مصنفین سے حسنِ سلوک کوئی نئی بات نہیں۔ لیکن ہمارے ملک میں جہاں حق تلفی ایک عام عادت ہے۔ چودھری صاحب کی حق شناس طبیعت بہت بڑا سہارا تھی

ان کی وفات پر ہمیں بیگم چودھری برکت علی اور ان کے بچوں سے پوری پوری ہمدردی ہے۔

قضا و قدر کو یہی منظور تھا کہ ان کی عمر کا رشتہ اتنی جلد منقطع ہو جائے۔ مگر نیک نیتی کا جو بیج ان کے ہاتھوں آج سے ۱۵ سال پہلے بویا گیا تھا۔ اور جن روایات کے لئے مکتبہ اردو ہمیشہ مشہور رہا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ادارے کے منتظمین اب بھی ان ہی روایات کو قائم رکھنے کی کوشش کریں گے۔

"بنتِ داؤدی" لاہور

چودھری برکت علی اردو کے اُن پبلشروں میں سے تھے جن کا مصنفوں کے دلوں میں بدرجہ اتم احترام موجود ہے۔ آپ [illegible] تھے اور تمام عمر خاموشی سے اردو کی خدمت انجام دیتے رہے۔ چودھری برکت علی اور

مکتبہ اردو درحقیقت ایک ہی ادارہ ہے ... اور آج کا یا آنے والے ... اردو [illegible]
کی خلوص اور جانفشانی سے ... انکار نہیں کر سکتا۔

ادب لطیف ہمارے ... ادب کا ایک ایسا پودا ہے جس کی رستے وہ تک چودھری برکت علی نے آبیاری
کی۔ ہمیں یقین ہے کہ یہ رسالہ چودھری صاحب کی یادگار کے طور پر اردو ادب کی بدستور خدمت کرتا رہے گا!

ادارہ "آجکل" ادب لطیف کے اس غم میں برابر کا شریک ہے، اور دست بدعا ہے کہ چودھری صاحب مرحوم
کی جلائی ہوئی مشعلیں مکتبہ اردو اور ادب لطیف ——— دنیائے ادب میں ہمیشہ روشنی پھیلاتی رہیں۔

ماہنامہ "آجکل"

O

اخبارات سے چودھری برکت علی صاحب کی وفات پر ملال کے متعلق معلوم ہو چکا تھا۔ علالت کی خبر تو پہلے ہی
معلوم تھی۔ لیکن یہ خیال بھی نہ آتا تھا کہ اچانک یہ سانحہ رونما ہو جائے گا۔ سال گزشتہ جب چودھری صاحب کوئٹہ
تشریف لائے تھے، تو ملاقات ہوئی تھی۔ یہ خیال بھی نہ آ سکتا تھا کہ یہ پہلی اور آخری ملاقات ہوگی۔
ان کی یاد قائم رکھنے کا بہترین طریقہ ان کے کام کو جاری رکھنا ہے۔ یقین واثق ہے کہ آپ کے ہاتھوں یہ کام
بخیر و خوبی جاری رہے گا۔ اور راہ ترقی پر گامزن رہے گا۔ میں کیا اور میرا تعاون کیا۔ بہر حال ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔
یقین ہے کہ آپ کی سرکردگی میں مکتبہ اردو اور ادب لطیف برابر ترقی کرتے رہیں گے۔

(سعید احمد رفیق)

آپ کے والد بزرگوار کی بے وقت موت نے اردو ادب کے چند بھاری ناشروں کی نہایت ہی مختصر فہرست میں
سے ایک نہایت ہی پیاری شخصیت کو ہم سے چھین لیا ہے۔ خدا آپ کو ان کے ترکے کو سنبھالنے کے سلسلے میں عزم
و ہمت سے سرفراز فرمائے جو مرحوم کا گراں مایہ اثاثہ تھا۔
آپ نے ترکہ میں ایک عظیم الشان ادارے کے علاوہ چند ایسی روایات بھی پائی ہیں جن کے زندہ رکھنے کی ذمہ داری
دوسری تمام ذمہ داریوں سے کہیں کٹھن ہے۔ خدا آپ کا حامی و ناصر ہو۔
آپ ہم دونوں بھائیوں اور الائیڈ پریس کو ہمیشہ کی طرح اپنا مخلص اور حامی پائیں گے۔

مجید ملک

چودھری صاحب کی وفات جہاں آپ کے لئے صدمۂ جانکاہ ہے وہاں یہ دنیائے ادب کے لئے ایک ایسا نقصان
ہے جس کی کبھی تلافی نہ ہو سکے گی۔ میری دلی دعا ہے کہ خداوند آپ کو اور دیگر پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔
مرحوم کے ادبی و علمی کارنامے عالم ادب میں مشعل راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ادب لطیف مرحوم کے ان کارناموں

[illegible] کی حیثیت رکھتا ہے۔ ادبِ لطیف کا اپنی تمام اعلیٰ روایات کے ساتھ زندہ رہنا ان کی بہترین یادگار رہے گا۔
خدا کا شکر ہے کہ آپ نے ادبِ لطیف کو زندہ رکھنے کا عزم کیا ہے۔ میں اس سلسلے میں ہر خدمت کے لئے حاضر ہوں۔

احمد ظفر

میں چودھری صاحب مرحوم سے صرف ایک بار ملا تھا۔ جس کی یاد آج پھر تازہ ہو گئی ہے۔ میری تمام تر ہمدردیاں آپ سب کے ساتھ ہیں۔ خدا آپ کو صبر عطا کرے اور مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ آمین!
چودھری صاحب کے اردو ادب پر بہت سے احسانات ہیں۔ مجھے یقین ہے "ادبِ لطیف" کو آپ اسی شان سے جاری رکھیں گے۔ جس شان سے یہ چودھری صاحب کے ہاتھوں پروان چڑھا تھا۔

انور عنایت اللہ

مرحوم و مغفور چودھری صاحب کی وفاتِ حسرت آیات کی خبر سن کر جو صدمہ آپ کو، ہمیں، ان کے دوستوں اور ملنے والوں کو ہوا ہے اسے بیان کرنا عبث ہے۔ کون ہوگا جو مرحوم سے ایک دفعہ مل کر ان کا گرویدہ نہ ہوا ہوگا۔
ان کا اس عمر میں ہم لوگوں کو داغِ مفارقت دینا ایک ایسا صدمہ ہے جو کبھی کسی کو نہ بھولے گا۔ یہ یقین کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ موت کے منحوس ہاتھ نے ایک ایسے دوست کو چھین لیا ہے جو محبت اور زندگی کا مظہر تھا اور جس کی نظر میں دوستوں کے لئے بھی اتنی ہی ہمدردی تھیں جتنی کہ عزیزوں کے لئے۔
چودھری صاحب مرحوم نے اپنی زندگی میں جو محبت اور عنایت ہم پر کی اس کی مثال میں نے کوئی نہیں دیکھی اور اس لئے میں ہمیشہ ان کے حق میں دعاگو رہوں گا کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ دے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل عطا کرے۔

انور

چودھری صاحب محترم کی رحلت کا حال اخبارات میں پڑھا۔ بہت صدمہ ہوا۔ مجھے تو ان کی علالت تک کی خبر بھی نہ تھی۔ اس اچانک خبر نے بہت پریشان کیا۔ اقبال صاحب اور دیگر اساتذہ جو چودھری صاحب سے آشنا تھے بہت افسوس کرتے ہیں۔ چودھری صاحب یقیناً ایک بہترین انسان اور ہمدرد دوست تھے۔ ان کی موت ادبی دنیا میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو غریقِ رحمت کرے۔ اور آپ لوگوں کو توفیق دے کہ چودھری صاحب مرحوم کے نقشِ قدم پر چل کر ویسا ہی نام پیدا کریں جیسا انہوں نے پیدا کیا تھا۔

محمد سلطان

چوہدری برکت علی مرحوم ان لوگوں میں سے تھے جن کی جدائی یا موت کا تصور کبھی ذہن میں نہیں آتا اور آج بھی [illegible] ہوتا ہے کہ موت اٹل نہیں ہے۔ ان کی آواز، ان کی گفتگو اور ان کے جملہ افعال و اطوار میں زندگی اس مبالغے سے نمایاں تھی کہ ان کے دیکھنے سے بیمار کا اچھا ہو جانا قرین قیاس معلوم ہوتا تھا۔ آزادی کی لگن زندگی کی محبت ہی کا ایک پہلو ہے اور اس میں کلام نہیں کہ حریت فکر و تحریر کی جدوجہد میں چوہدری برکت علی مرحوم ایک یادگار مقام رکھتے ہیں۔

فیض احمد فیض

آپ سے تعزیت کرنا چاہتا ہوں، پھر سوچتا ہوں کہ آپ کو جتنا بڑا زخم پہنچا ہے، وہ الفاظ کے مرہم سے ٹھیک نہیں ہوگا۔ لیکن دنیا کی رسم یہی ہے۔ آپ کو یہ غم مردانہ وار جھیلنا چاہیئے اور اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہیئے جو مرحوم چھوڑ گئے ہیں۔

میری دلی ہمدردیاں آپ کے ساتھ ہیں۔

رئیس احمد جعفری

میں جب چوہدری صاحب کی وفات اور پسماندگان کے حالات کا تصور کرتا ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں اور سمجھ میں نہیں آتا کہ ایسے عالم میں صبر کی تلقین کروں تو کیسے اور اگر نہ کروں تو کیا کروں۔ آپ ہی اگر ممکن ہو تو میرے جذبات کا ان کے تمام صاحب زادگان کے آگے اظہار کر دیں۔

شریف کنجاہی

چوہدری صاحب کی وفات حسرت آیات کا بے حد افسوس ہے۔ انشاء اللہ العزیز فرم کے اراکین چوہدری صاحب کو حیات و سلامت جانتے ہوئے آپ کی ہر خدمت اور معاونت کے لئے بدستور حاضر رہیں گے۔

ملک محمد عارف

(ملک دین محمد اینڈ سنز)

ینگ مین اُردو لٹریری سوسائٹی، راولپنڈی کا تعزیتی اجلاس زیرِ صدارت جناب سید ضامن علی شاہ ضامن بخاری منعقد ہوا جس میں چوہدری برکت علی مرحوم، مدیر "ادبِ لطیف" کی وفاتِ حسرت آیات پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔ اور مرحوم کی ادبی خدمات کو سراہا گیا۔ مرحوم کا ہم سے جدا ہو جانا واقعی ایک ناقابلِ فراموش صدمہ ہے۔ سوسائٹی آپ کے ساتھ شریکِ غم ہے۔

پراپیگنڈہ سیکرٹری

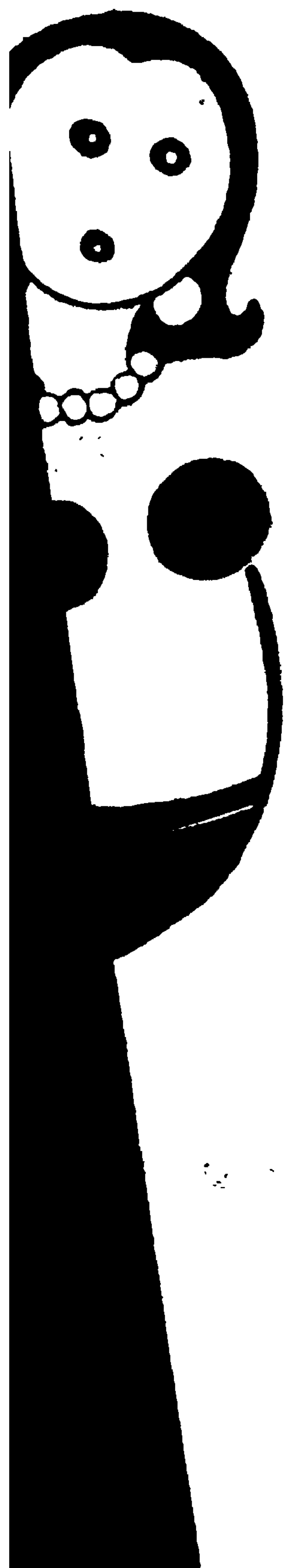
ینگ مین اُردو لٹریری سوسائٹی، راولپنڈی

(چوہدری افتخار علی پرنٹر و پبلشر نے ویسٹ پنجاب پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر مکتبہ اردو لاہور سے شائع کیا)

REGD, L, No, 3521



ادبِ لطیف



اکتوبر
۱۹۵۳

نیا ادب

تنقید

بحث و نظر	ڈاکٹر سید عبداللہ	پانچ روپے
تنقیدی زاویے	ڈاکٹر عبادت بریلوی	چار روپے

ناول

جھیل اور کنول	اے حمید	چار روپے
ڈربے	اے۔ حمید	چار روپے
نئی پود	مترجمہ: انتظار حسین	تین روپے آٹھ آنے
ہامبی	مترجمہ: ظہورالحسن ڈار	دو روپے
ڈرپوک	ابو سعید قریشی	دو روپے آٹھ آنے
تہمت	ابو سعید قریشی	تین روپے

اے - حمید
کا نیا ناول
جنگل روتے ہ
(زیر طبع)

اے - حمید کی تازہ ترین تصنیف
جہاں برف گرتی ہے
(ناولٹ) دو روپے چار آنے

طنز و مزاح

داستان غریب حمزہ
اے - حمید کے فکاہی مضامین
قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ اردو، لاہور

بانی چودھری برکت علی مرحوم

ادبِ لطیف

جلد ۳۶ شمارہ ۶

مینجنگ ایڈیٹر ——— افتخار علی چودھری

ایڈیٹر ——— میرزا ادیب

پاکستان میں

زرِ سالانہ ، آٹھ روپے

غیر ممالک

زرِ سالانہ ، بارہ روپے

فی پرچہ ۱۲ ر آنے

مکتبہ اردو - لاہور

ترتیب

پیرایۂ آغاز

گنج ہائے گرانمایہ

اُردو کے پُرانے رسائل و جرائد کا مطالعہ کرتے وقت بعض اوقات ایسی چیزیں بھی نگاہوں سے گزر جاتی ہیں جو ادبی لحاظ سے بڑی وقیع ہوتی ہیں۔ مگر یہ سوچ کر بہت افسوس ہوتا ہے کہ گمنام اہلِ قلم کی یہ ذہنی تخلیقات پُرانے رسالوں کے انہی بوسیدہ اوراق میں دفن ہو کر رہ جائیں گی۔ اور اُردو پڑھنے والوں کی اکثریت ان کے مطالعے سے بدستور محروم رہے گی! ہماری طرح دوسروں کو بھی کبھی کبھی یہ خیال ضرور آیا ہوگا۔ اور انہیں بھی گنج ہائے گرانمایہ کے اس اتلاف کا مزید افسوس ہوا ہوگا۔ پُرانے رسالوں کو کون پڑھتا ہے۔ اول تو ان کے فائل ہی موجود نہیں ہوتے اور جن کے پاس ہوتے ہیں وہ بھی ان کی ورق گردانی صرف اس وقت کرتے ہیں جب کوئی خاص ضرورت پیش آئے ورنہ انہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا جاتا۔ اس صورت میں وہ وقیع مضامین کس طرح محفوظ رہ سکتے ہیں اور کس طرح ان سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے؟

ہم زیادہ دور تک نہیں جاتے صرف انہی ادبی رسائل کا ذکر کرتے جو پہلی جنگ عظیم کے بعد شائع ہوئے ان میں سے نیرنگ خیال، عالمگیر، ہمایوں اور ساقی ابھی تک زندہ ہیں۔ ان چاروں پرچوں کی ادبی خدمات ہمارے ادب کا نہایت اہم اور تابناک باب ہیں۔ ان میں ساقی ایک ایسا پرچہ ہے جس کے شائع شدہ افسانوں کا انتخاب 'ریزہ مینا' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ باقی پرچے اس قسم کی کوشش نہیں کر سکے۔ ان میں سے کوئی پرچہ بھی پچیس سال سے کم عمر کا نہیں۔ غور کیجیے اس ربع صدی میں کتنی اعلیٰ درجے کی چیزیں ان میں چھپی ہوں گی — اور اب کتنے لوگ آسانی سے ان کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ یہ صورتحال تو ان پرچوں کی ہے جن کی زندگی کا تسلسل ابھی قائم ہے۔ ہو سکتا ہے ان کے پڑھنے والوں کے پاس ان کے فائل محفوظ ہوں اور وہ فرصت کے اوقات میں پچھلے پرچوں کا مطالعہ بھی کر لیتے ہوں۔ لیکن المناک کیفیت تو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب ہم ان پرچوں کے بعض شماروں کو دیکھتے ہیں، جنہیں بند ہوئے وقت گزر چکا ہے اور جن کا نام بھی ہماری موجودہ نسل کے بعض افراد نے نہیں سنا ہوگا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان پرچوں میں ایسے لوگ بھی لکھتے رہے ہیں جن کا شمار آج مشاہیرِ ادب میں ہوتا ہے اور ان کی بیشتر تخلیقات کتابوں میں محفوظ ہو چکی ہیں مگر یہاں سوال صرف ان گمنام اور غیر معروف ادیبوں کا ہے جو تھوڑے سے عرصے کے لئے ایوانِ ادب میں آئے اور اپنے تخلیقی ذہن کے شعلۂ مستعجل سے فضاؤں کو منور کر کے ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئے۔ مسئلہ صرف ان لوگوں کے افکار محفوظ کرنے کا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں ادب کے دوسرے اہم مسائل کے ساتھ ساتھ آج اس مسئلے پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے اور اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل ہمیں نکالنا چاہیئے۔

اس وقت کہ ہم یہ سطریں سپردِ قلم کر رہے ہیں ہماری آنکھوں کے سامنے کئی نام ابھر آئے ہیں۔ مثلاً ایک نام حنیف ہاشمی ہے۔ کچھ زیادہ مدت نہیں گزری یہ نوجوان افسانہ نگاری کا ایک خاص اسلوب اور بڑا شاعرانہ اندازِ بیان لے کر محفلِ ادب میں آیا تھا۔ اس نے گنتی کے چند افسانے لکھے مگر یہ افسانے آج بھی پڑھنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ افسانوں کی بات چل نکلی ہے تو ایک اور نام بھی ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ شیخ ضیاالدین شمسی۔ شمسی صاحب نے تمام کے تمام طویل افسانے لکھے — اور حقیقت یہ ہے کہ ان کا ہر افسانہ معرکے کا ہے۔

اصغر گونڈوی بڑے معروف غزل گو تھے مگر انہوں نے چند تنقیدی مضامین بھی لکھے تھے اور یہ کافی اونچے درجے کے تھے۔

چند سال ہوئے ہمایوں کے صفحات پر محمد حسین ادیب کے تحقیقی اور تنقیدی مقالات شائع ہوتے رہے ہیں یہ مضامین بھی ادبی اعتبار سے قدر و قیمت کے مستحق ہیں۔

یہ نام تو وہ ہیں جو یونہی یاد آ گئے ــــ ذہن پہ زور دیا جائے تو اور نام بھی یاد آ سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی اہلِ قلم ہوں گے جنہوں نے ادب میں قابلِ قدر اضافہ کیا اور پھر یا تو دُنیا سے رخصت ہو گئے اور یا پھر زندگی کے معاشی تقاضوں نے انہیں اس طرح مجبور کر دیا کہ وہ ادب کی طرف توجہ ہی نہ کر سکے! اب یہ کام ہمارا ہے کہ ان کی چیزیں پرکھیں اور انہیں محفوظ کرنے کی تجویزیں سوچیں!

اس راہ میں کتنی دقتیں ہیں ــــ یہ بات ہم سے پوشیدہ نہیں۔ مگر ہم کہتے ہیں کہ اگر اس سلسلے میں ایک باقاعدہ ضابطۂ عمل بنا کر ریسرچ کی جائے تو نا خوشگوار نتائج مرتب ہو سکتے ہیں ــــ ضرورت ضابطۂ عمل کے تعین اور مادی وسایل کی فراہمی کی ہے ــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ کوئی معمولی ادارہ اس کام کو اپنے ہاتھ میں لے بھی نہیں سکتا اس کے لئے اوّلیں ضرورت ایک ایسے بورڈ کی ہے جو پچھلے رسالوں کا تنقیدی نظر سے مطالعہ کرے اور پھر چیزیں چھانٹے۔

یہ مسئلہ غالباً پہلی مرتبہ چھیڑا گیا ہے اور اس پر بحث و تمحیص کی بڑی گنجائش ہے۔ مسئلے کے کئی ایسے پہلو ہیں جو صاف نہیں ہیں!

انجمن ترقی اُردو کی گولڈن جوبلی

اکتوبر کے وسط میں انجمن ترقی اُردو کی گولڈن جوبلی (پنجاہ سالہ جشن) منائی جا رہی ہے۔ یہ واقعہ ایک تاریخی حیثیت کے حامل ہے اور اہلِ وطن کا فرض ہے کہ وہ اس تقریب کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کی کوشش کریں۔ انجمن صرف ایک اشاعتی ادارہ ہی نہیں بلکہ ایک نہایت قیمتی ثقافتی سرمایہ بھی ہے اور اس ادارے نے اپنی پچاس سال کی مدت میں ہماری زبان کی جو خدمات انجام دی ہیں۔ انہیں کسی طرح بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا!

انجمن کو پے در پے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ دہلی میں اس کے وسیع کتب خانے کا بیشتر حصّہ ضائع ہو گیا۔ کراچی میں عرصہ تک کوئی ڈھنگ کی جگہ نہ مل سکی اور ٹھیک طور پر کام نہ ہو سکا۔ یہ مشکلات ایسی نہیں جن پر قابو نہ پایا جا سکے مگر بنیادی دقت سرمائے کی کمی ہے۔ ہمیں توقع رکھنی چاہئیے، اُردو کے ہمدرد انجمن کی طرف دستِ تعاون بڑھائیں گے اور ان کوششوں میں ضرور حصّہ لیں گے جو گولڈن جوبلی کی کامیابی پر منتج ہو سکتی ہیں۔

تشکّر

والدِ محترم کے انتقال پر ادبِ لطیف کے جن قلمی معاونین اور قارئین نے تعزیتی خطوط لکھے ان کا فرداً فرداً شکریہ ادا کرنا مشکل ہے اس لئے میں ادبِ لطیف کے ذریعے ان تمام محبانِ گرامی قدر کی بے پایاں ہمدردیوں کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں!

میرزا ادیب

افکار و مسائل

"ترقی پسند ادب"

●

ترقی پسند تحریک اردو ادب کی سب سے بڑی تحریک نہ سہی بڑی اہم تحریک ضرور ہے۔ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد جب پرانی سماجی اقدار کی شکست ریخت ہوئی اور نئی اقدار سنے پاؤں جمانے کی کوشش کی تو ادب میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح کافی دیر تک ایک تذبذب اور جھجک کی کیفیت رہی۔ سیاسی سمجھوتہ بازی کے ساتھ ساتھ ادب میں اصلاح پسندی کے رجحانات پلتے رہے۔ سرسید، حالی اور آزاد مصلح تھے۔ ان کا سیاسی شعور ابھی اس سطح پر نہیں پہنچا تھا (اور نہ پہنچ سکتا تھا) جہاں سمجھوتے کی گنجائش نہیں رہتی اور کشمکش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ جہاں ادیب غیر جانبداری کا مقدس لبادہ اوڑھ کے خلوت نشین نہیں رہ سکتا۔ جہاں فراق کو یہ کہنا پڑتا ہے۔

تھوڑی بہت محبت سے کام نہیں چلتا اے دوست
یہ وہ معاملہ ہے جس میں یا سب کچھ یا کچھ بھی نہیں

اشتراکی منشور کے یہ الفاظ "دنیا کے محنت کشو! متحد ہو جاؤ" ادب عالم میں نئی انقلابی تحریکوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ روس میں عوامی انقلاب کے بعد اس نعرے کو ایک واضح سیاسی شکل اور ادب کی انقلابی تحریکوں کو ایک نیا آدرش ملا۔ ان ادبی تحریکوں کی نوعیت بین الاقوامی تھی۔ اگرچہ وہ اپنے اپنے ملک کے مزاج کے مطابق پروان چڑھ رہی تھیں۔ انہی بین الاقوامی تحریکوں سے متاثر ہو کر ہندوستان کے چند ذہین افراد نے انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد رکھی اور ادب کا یہ مطمح نظر قرار دیا۔ کہ وہ "ہندوستانی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا بھرپور اظہار کرے اور ادب میں سائنسی عقلیت پسندی کو فروغ دے"۔ ابتداء میں اس انجمن کو جہاں ٹیگور، پریم چند، جوش اور ذاکر حسین کی سرپرستی نصیب ہوئی وہاں اس کے پہلے منشور پر مولوی عبدالحق، ڈاکٹر عابد حسین اور مولانا نیاز فتحپوری کے بھی دستخط تھے۔ اور اس کے نوجوان قافلے میں نوشق ادیبوں کی ہمت افزائی کے لئے مجنوں گورکھپوری اور قاضی عبدالغفار جیسے پختہ کار ادیب بھی شامل تھے ۱۹۳۵ء سے لے کر اب تک ترقی پسند تحریک کا کارواں کئی منزلوں سے گزرا ہے۔ اگرچہ اب اس تحریک میں وہ وسعت نہیں رہی۔ اور اس قافلے سے بہت سے ایسے فنکار الگ ہو گئے۔ جن کی حیثیت انجمن کے لئے سرمایہ افتخار سے کم نہیں تھی۔ پھر بھی اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس مرحلے پر یہ ضروری تھا۔ کہ کوئی ایسا ادیب جو شروع ہی سے اس تحریک سے وابستہ رہا ہو۔ اس کا منزل بہ منزل جائزہ لے۔ کھوٹے کھرے میں تمیز کرنی سکھائے۔ اور اس تحریک کو پہلی سی کشادگی اور وسعت نظر عطا کرے۔ علی سردار جعفری نے یہی کام "ترقی پسند ادب" میں اپنے ذمے لیا ہے۔ اس کام میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے۔ یہ مختصر تبصرہ اس کا جواب ہے۔

کئی لحاظ سے سردار جعفری اس کام کے لئے بڑے موزوں آدمی ہیں۔ وہ نہ صرف ترقی پسند برادری کے بڑے ذہین اور پڑھے لکھے فرد ہیں۔ بلکہ انہیں اس عہد وجہد میں عملی شرکت کے مواقع بھی ملے ہیں۔ جو آج ایک تاریخی حقیقت ہے۔ بیشتر ترقی پسند ادیبوں اور نقادوں کو طبقاتی

کشمکش میں حصہ لینے اور کوئی خدمت سرانجام دینے کا موقع نہیں ملا بلکہ موقع ملا ہے۔ تو انہوں نے ذاتی مصلحتوں کی وجہ سے اس معاملہ میں اظہارِ لب کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کھل کر بات کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔ طبقاتی جدوجہد اور فن پر اس کے اطلاق کا واضح تجزیہ نہ کر سکے۔ اور ایک ایسے جذباتی تضاد کا شکار ہو گئے جس سے نجات ان کے بس کی بات نہ رہی۔ وہ ایک طبقہ گری کے ساتھ سرمایہ و محنت کے نزاع کو گوشۂ خلوت سے دیکھتے رہے اور انسانیت پرستی کے زیرِ اثر ان عقائد کو قبول تو کر لیا۔ اور اپنے فن پاروں میں اس کا ذکر کرنے لگے مگر وہ اس کشمکش کی صحیح نوعیت سے آگاہ نہ ہو سکے اور نہ انہوں نے اس کا سائنٹیفک طریقے سے مطالعہ کیا۔ ترقی پسند ادب میں محنت کش طبقہ بھی ویسا ہی رومانی کردار بن گیا۔ جیسا الف لیلیٰ کا کوئی خیالی ہیرو۔ اور سب میں اس مظلوم طبقے کا ذکر اسی انداز میں ہونے لگا جس میں ہمارے کلاسیکی شاعر محبوب کے زلف و رخسار کا ذکر کرتے ہیں۔ سردار جعفری ادیبوں کے اس گروہ میں شامل نہیں جنہیں آمادہ بندہ کے نزاع کی آگ میں تپنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ مگر اسی شدتِ احساس نے انہیں تنقید میں سائنٹیفک نقطۂ نظر سے محروم کر دیا۔ کتاب کے بعض حصے تو کارپوریشن کی ممبری کے کسی ایسے امیدوار کی الیکشن تقریر معلوم ہوتے ہیں جو دلائل کی کمی مدِ مخالف کو ملعون کر کے پورا کرتا ہے۔ عسکری کا ذکر کرتے ہوئے ان کی زبان تنقید کی زبان نہیں رہتی۔ انہوں نے یہ وجہ معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی کہ ترقی پسند تحریک جو آغاز میں مختلف خیال کے لکھنے والوں کی تحریک تھی، اب ایک محدود طبقے کی میراث ہو کر کیوں رہ گئی ہے۔ حالانکہ پہلے بھی خیالات کے اس تنوع میں مرکزی نقطہ ایک ہی تھا۔ وہ ایک سانس میں کرشن چندر اور فیض کے ساتھ ساتھ نیاز، سعید، مہدی، عبداللہ ملک، کیفی اور مجروح کے نام لے کر اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ انہوں نے اس تحریک سے کٹ جانے والے ادیبوں کا بدل ڈھونڈ لیا۔ اور تحریک پھل پھول رہی ہے۔ یہی غلط فہمی ان کی تنقید کا المیہ ہے۔ وہ ایک غلط نقطے سے چلتے ہیں۔ اور اسی لئے بار بار اپنے دلائل میں الجھ جاتے ہیں۔ انہیں جگہ جگہ اپنی تردید خود آپ کرنی پڑتی ہے۔ اور جب وہ اس چکر سے گھبرا جاتے ہیں۔ تو دلائل کی کمی کو زورِ خطابت سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا یہ کہنا ٹھیک ہے۔ کہ جب حق و باطل کی جنگ ہو رہی ہو تو ادیب کے لئے اس معرکے کا خاموش تماشائی بننا اور غیر جانبداری کا دعویٰ کرنا مجرمانہ فعل ہے۔ مگر جب ہم ایسے ادیبوں کے کام پر تنقید کیلئے قلم اٹھاتے ہیں تو غیر جانبداری جرم نہیں بلکہ ایک احسن چیز بن جاتی ہے۔ اس وقت ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس ادیب نے جو کچھ کہا ہے۔ وہ کیسے کہا ہے۔ "کیا کہا ہے" بڑا اہم مرحلہ ہے، مگر "کیسے کہا ہے" بھی کم اہم نہیں اور ہم ایک ادیب کو محض اس وجہ سے ترقی پسند ادیب نہیں مان لیتے۔ کہ اس نے چند پٹے پٹائے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے۔

اس کے علاوہ یہ چیز بھی نظر انداز نہیں کرنی چاہیئے۔ کہ طبقاتی جدوجہد کے علاوہ اور بہت سے حقیقتیں بھی بڑی اہم ہیں۔ ان سب سے ہٹ کر دائرہ کو صرف ایک موضوع کو اپنا لینا زندگی کی کشادگی کو محبوس کر دینا ہے۔ اگر ہم ذہن میں کچھ مخصوص معیار بنا کر تنقید کرنے چلیں تو عملی تنقید میں بڑی الجھن پیدا ہو جاتی ہے۔ شعر و ادب کے نمونوں کو جانچنے کے لئے نظریۂ شعر و ادب کے جانچنے اور پرکھنے کے دوران ہی یہ پیدا ہو سکتے ہیں کہیں سے ڈھل کر نہیں آتے۔ ترقی پسند تحریک کے "سرکاری" نقادوں کی تحریروں میں اسی باعث بڑی پیچیدگی اور ابہام ہوتا ہے۔ اور عملی تنقید ان کی نظریاتی تنقید کے قابو میں نہیں آتی۔ ترقی پسند ادب میں بھی عملی تنقید اور نظریاتی تنقید کے دھارے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو چلتے ہیں۔ اور قاری ان کے سنگم کی تلاش ہی کرتا رہتا ہے۔ دو اور چیزیں جنہیں جعفری صاحب نے تنقید کرتے وقت نظر انداز کر دیا ہے۔ یہ ہیں (۱) اس ثقافتی گروپ کا مزاج جس کے ادب پر وہ تنقید کرتے ہیں (۲) ادب اور ادیب کا عمل ہر ثقافتی گروپ کے سیاسی مزاج کی طرح اس کا ایک ادبی مزاج بھی ہوتا ہے۔ اردو ادب کا بھی ایک مخصوص مزاج ہے۔ موضوعات اور اصناف کے انتخاب میں اس کا بڑا اہم حصہ ہوتا ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔ کہ ادب کی تخلیق میں سب سے ضروری حصہ ادیب کا عمل ہے۔ اس عمل کی بنیاد مادی، تاریخی اور عمرانی حقائق پر ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں۔ مگر ان حقائق کا ردِ عمل مختلف انسانوں میں مختلف ہوتا ہے۔ ادیب بھی انسانی برادری کے افراد ہونے کی حیثیت سے لازم نہیں کہ یکساں حالات سے ایک سا اثر قبول کریں۔ اور پھر اس اثر کو قبول کرنے کا عمل ایسے اپنی شخصیت کا جزو

بانے کا عمل اور اپنے اظہار کا اپنے پیمانے کا عمل۔ ان میں فرق کی بڑی گنجائش ہے۔ تنوع کے بڑے امکانات ہیں۔ اسی سے ادب میں وسعت اور کشادگی پیدا ہوتی ہے۔ ادیب مشین نہیں اور نہ ادب مشین کی پیداوار۔ ادب کے تخلیقی عمل کی نوعیت جداگانہ اور بڑی پیچیدہ ہے۔ اس سلسلے میں سہل نگاری سے کام لینا اور چند فارمولوں کو ادب کی بنیاد بنا لینا بڑی مہلک غلطی ہے۔ ادیب کے لئے آزادیٔ اظہار اتنی ہی ضروری ہے جتنی زندگی کے لئے حرارت۔ ترقی پسند ادب وہی ہے جس میں صالح روایتوں کی پاسداری کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کے قدم بقدم چلنے کا ولولہ ہو۔ اور نئے حالات کے پیدا کردہ مسائل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنے کا حوصلہ۔ فن کار کو فن کے نئے تقاضوں کے پیش نظر نئے سانچے ڈھالنے اور پرانے سانچوں کو اپنی ضروریات کے مطابق بدلنے کی صلاحیت بھی ہونا چاہئے۔ مواد، اسلوب اور ہیئت کی بھی نئی ترکیب ترقی پسند ادب کی بنیاد ہے۔ ادب میں نقاد کے لئے یہی حد ہے۔ ورنہ کسی فیکٹری کے منیجر اور نقاد میں کیا فرق باقی رہ جاتا ہے؟

جعفری صاحب کی کتاب کا موضوع نظریاتی مباحث اور ترقی پسند تحریک کے محرکات اور رجحانات ہیں۔ اس میں اس تحریک کا تاریخی اور نظریاتی جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کتاب کے سلسلے کی تین اور کتابیں بھی چھپ رہی ہیں۔ جن میں مشہور ترقی پسند ادیبوں اور ان کی تخلیقات کا جائزہ لیا جائے گا اور ساتھ ہی ان کے ادب کا انتخاب بھی ہوگا۔ جعفری صاحب نے خود اس کتاب کے متعلق لکھا ہے۔

"..... میں اپنے تجزیئے کو حتی الامکان سائنٹیفک اور علمی رکھنا چاہتا ہوں۔۔ حقیقتاً میں نے نقاد کے فرائض انجام نہیں دیئے۔ کیونکہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں۔ میں نے خود ایک ادیب اور شاعر کی حیثیت سے اس تحریک کے بارے میں جو کچھ محسوس کیا ہے، جو مجھے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ اور جس سے میرا شروع سے بہت قریبی تعلق رہا ہے اسے کاغذ پر منتقل کر دیا ہے"

ایک ہی صفحے پر وہ اپنے تجزیئے کو حتی الامکان سائنٹیفک اور علمی رکھنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں۔ اور پھر یہ کہہ کر کہ مجھے نقاد ہونے کا دعویٰ نہیں اسے تاثراتی سطح پر لے آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک باب "نقطۂ نگاہ" کے سوا کتاب کا بیشتر حصہ تاثراتی تنقید کے سوا کچھ نہیں۔ اور سائنٹیفک تنقید اور تاثراتی تنقید میں جو فرق ہوتا ہے اس کا جعفری صاحب کو اچھی طرح علم ہوگا۔

حرفِ اول میں جعفری صاحب نے ترقی پسند ادب کے بنیادی مقاصد انسانیت اور آزادی کی جدوجہد قرار دیئے ہیں۔ ادب کی اس تعریف کے ساتھ اس تحریک میں الگ الگ نقطۂ نگاہ رکھنے والے ادیبوں کا انضمام مشکل نہیں تھا جعفری صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ مختلف نقطہ ہائے نگاہ اور نظریات کا تنوع ترقی پسند انجمن اور تحریک کی جان ہے۔ انجمن کے متعلق یہ بات آغاز میں تو صحیح تھی مگر اب جو تنگ نظری تحریک میں پیدا ہو گئی ہے اس کے پیش نظر مختلف خیال کے لوگوں کا ترقی پسند تحریک کے پرچم تلے انسانیت اور آزادی کی جدوجہد کے نقطے پر جمع ہونا مشکل ہو گیا ہے۔ انجمن اب زیادہ سے زیادہ ایک مخصوص سیاسی نظام کے نشر و اشاعت کا آلۂ کار بن کر رہ گئی ہے۔ اس نظام کے حسن و قبح سے قطع نظر ادب کو چند متعین سیاسی، سماجی یا ادبی اصولوں کا پابند کر دینا کسی طرح بھی مستحسن نہیں۔ اگر ہم سائنٹیفک نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ حقیقت کھلتی ہے کہ سوشلزم اور اس کے زیر اثر اصلاحی قوانین نے محنت کش طبقے کی حالت کو اس حد تک نہیں گرنے دیا۔ جس کا تصور مارکس نے سرمایہ دارانہ صنعتی نظام کے آغاز میں کیا تھا۔ اس طبقے کی نفسیات میں ابھی وہ تضاد نہیں پیدا ہوا جس کا اشتراکی تحریروں میں ذکر ہے۔ تاریخی ارتقاء میں فاشزم کو سر حد مارکس کی توقعات سے مطابق نہیں کیا جا سکتا۔ حالانکہ جنگ سے عین پہلے فاشزم بیشتر صنعتی ممالک پر چھا چکی تھی۔ اس کے باوجود اس بنیادی حقیقت سے اختلاف ممکن نہیں کہ مختلف جماعتوں کا طرزِ عمل ان کے معاشی حالات کا ساختہ ہیں۔ وہ جماعت جو ذرائع پیداوار پر قابض ہوتی ہے۔ ان سے کسی صورت دست بردار ہونے پر تیار نہ ہوگی۔ اس کے برعکس جس جماعت کے قبضۂ اختیار میں کچھ نہیں وہ ان ذرائع پر قابض ہونے کی سعی کرے گی۔ اس کشمکش میں نادار جماعت زیادہ سے زیادہ مفلس ہوتی جائے گی اور ذرائع پیداوار پر قابض جماعت

اپنے تصرف کو زیادہ سے زیادہ بڑھاتی جائے گی۔ اس کشمکش میں ادیب کا فرض کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ باتیں نہیں کہی جا سکتیں۔ مگر شعر و ادب کو سماجی بہتری کا وسیلہ سمجھا جانے کی بجائے طبقاتی حربہ سمجھ لینا ادب کی خدمت نہیں ہے۔ ترقی پسند ادیبوں نے اجتماعی زندگی سے قطع تعلق کر کے اپنے آپ کو طبقاتی زندگی تک محدود کر لیا ہے۔ انہوں نے یہ امر فراموش کر دیا ہے۔ کہ ادب کے ذریعے تبدیلی کا عمل غیر شعوری اور بالواسطہ ہوتا ہے ادب انسانی ذہن کو جمالیات کے ذریعے متاثر کرتا ہے۔ سیاست کی طرح یہ عمل خارجی اور شعوری نہیں ہوتا۔ جعفری صاحب کو بھی ادب کی ان خوبیات کا احساس ہے: "نقد و نظر" میں وہ لکھتے ہیں۔ کہ مجھے ایسے ادب سے بحث نہیں جو جمالیاتی تجربے سماجی ذمے داری اور احساسِ فرض سے بے نیاز ہو۔ ادب اور فن کی تخلیق کے لئے اپنی آزادی کے داخلی احساس اور جمالیاتی ذوق کی پاکیزگی کو برقرار رکھنا ضروری ہے۔ وہ اس چیز سے بھی انکار نہیں کرتے کہ ہر شخص کے احساس اور ذوق کی انفرادی خصوصیات الگ الگ ہوتی ہیں۔ سماجی مخلوق کی حیثیت سے ہر فرد ماحول کے مختلف عناصر کا ڈھالا ہوا ہے جو بدلا ایک دوسرے کو کاٹتے رہتے ہیں۔ اور آپس میں خلط ملط ہوتے رہتے ہیں۔ اور اس طرح وہ ہر انسان کے احساس کو مختلف شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ ہر شخص کا اپنا انفرادی ذوق ہوتا ہے۔ مگر کتاب کے بعد کے ابواب میں جب وہ مثالیں دیتے رہیں [illegible]) ادب کی جیسے سجاد حیدر کی یہ نظم جس کا ایک شعر ہے۔ ؎

چھین لو ادب کو سرمائے کے دلالوں سے!
آج سے اپنا یہی ایک سبق ہے ساتھی

یا کیفی اعظمی کی "فتح برلن" "امن چین" ایک جگہ اعلیٰ درجے کے ادب کی مثال وہ مجروح کی اس غزل سے دیتے ہیں جس کا مطلع ہے ؎

دشمن کی دوستی ہے اب اہلِ وطن کے ساتھ
ہے اب خزاں چمن میں نئے پیرہن کے ساتھ

جو کسی طرح بھی اعلیٰ ادب نہیں جعفری صاحب نے جمالیات کے سرچشموں کا جس طرح تجزیہ کیا ہے۔ وہ بڑا مشینی ہے۔ ذوقِ جمال کی بنیادی ضرور ہیں لیکن یہ عمل اتنا سیدھا نہیں اس میں معاشی اور سماجی حالات کا بھی اتنا ہی حصہ ہے۔ جتنا ان حالات کے متعلق افراد کے ردِعمل کا اور فرد کے اس عمل اور ردِعمل کو جعفری صاحب نے اپنی کتاب میں معقول جگہ نہیں دی۔ انہیں اس چیز کا احساس نہیں کہ جن ادیبوں کی تصانیف کو وہ مثالی ادب کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ بدلے ہوئے حالات میں جب محنت کش طبقے کے اوقات اتنے سخت نہیں رہیں گے۔ اور ان فن پاروں سے ان کا جذباتی پس منظر چھن جائے گا۔ یہ تحریریں بے جان ہو کر رہ جائیں گی اس وقت ان کی تاریخی اہمیت تو شاید باقی رہے ادبی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ فیض کی تحریروں میں بھی جو ترقی پسند تحریک کا سب سے اچھا نمائندہ ہے۔ تشدد کا جو نیا انداز پیدا ہوا ہے۔ اس کی شاعری کے لئے اچھے امکانات کا حامل نہیں "نقشِ فریادی" "دستِ صبا" سے ہر طرح اچھا مجموعہ ہے اور اگر "دستِ صبا" سے اس کی دو تین اچھی نظمیں اور وہ جذباتی پس منظر علیحدہ کر لیں۔ جو فیض کی اسیری کی وجہ سے ہے تو اس کی بہت سی کشش جاتی رہے گی۔

"ترقی پسند ادب" ان تمام باتوں کے باوجود بڑی اہم کتاب ہے۔ اور اس میں بعض باتیں ایسی ہیں جو خود ترقی پسند ادیبوں کو بار بار پڑھنی چاہئیں۔ اور ان پر عمل کرنا چاہیئے۔ مثال کے طور پر جعفری صاحب کی سستی جذباتیت کے متعلق ادیبوں کو تنبیہہ۔ جیسے کیفی اعظمی اور ساحر کی تاج محل کے متعلق نظموں کے بارے میں ان کا یہ کہنا کہ ان میں تاریخی ارتقار سے ناواقفیت کا ثبوت اور جھوٹی جذباتیت ہے۔

سید احمد رفیق

ادب — کس کیلئے اور کیوں

ہم کس کے لئے لکھتے ہیں۔ اور کیوں لکھتے ہیں؟ فن تنقید میں یہ وہ بنیادی سوالات ہیں۔ جن کا جواب شعوری یا غیر شعوری طور پر ہر زمانے میں کچھ نہ کچھ ضرور دیا جاتا رہا ہے۔ موجودہ زمانے میں زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں اور زندگی کے بعض شعبوں کی بڑھتی ہوئی اہمیت کے پیش نظر یہ سوالات اور بھی زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ جن کا مفصل اور واضح جواب دیئے بغیر تنقید میں ایک قدم بھی آگے بڑھنا تقریباً ناممکن ہے۔ غلامانہ اور جاگیردارانہ دور میں اگرچہ یہ سوالات کافی اہم تھے لیکن اُس زمانے کی زندگی کچھ ایسی سپاٹ تھی۔ کہ ان کے جوابات دینا کچھ مشکل نہ تھا۔ موجودہ زمانے میں جب ایک پیچیدہ دور دوسرے پیچیدہ تر دور کے لئے آہستہ آہستہ جگہ خالی کر رہا ہے۔ اس قسم کے سوالات کا ایسا جواب دینا جو عام طور پر قابلِ قبول ہو۔ اگر ناممکن نہیں تو کافی مشکل ضرور ہے۔ اور پھر ایک ایسی سرزمین میں جہاں صرف دو دور ہی آپس میں برسرِ پیکار نہ ہوں۔ بلکہ ایک تیسرے دور کے دل میں بھی زندگی کی رمق موجود ہو۔ اور وہ زندہ رہنے۔ بلکہ بہتر الفاظ میں دوبارہ زندگی حاصل کرنے کا متمنی ہو۔ زندگی کے ایک ایسے شعبے پر نظر ڈالنا جس میں تمام زندگی کا نہ صرف عکس نظر آئے۔ بلکہ جو اسے پوری طرح پکڑ کر اسے آگے بڑھانے میں بھی کوشاں ہو۔ اور بھی زیادہ مشکل کام ہے۔ بہرحال ان سوالات کی اہمیت کے پیش نظر یہ سوالات بار بار اٹھائے گئے ہیں۔ متعدد بار ان کا جواب دیا گیا ہے۔ اور ابھی ان کے متعلق بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔

ہم کس کے لئے لکھتے ہیں؟ اپنے لئے۔ کس قدر سیدھا سادھا اور آسان جواب ہے۔ لیکن حقیقت سے کس قدر دور اور واقعات کے کس قدر خلاف۔ اگر آپ اپنے لئے لکھتے ہیں۔ تو پھر یہ دوسروں کو سنانے۔ شائع کرانے۔ نشر کرنے۔ زیرِ بحث لانے کا کیا مطلب؟ آپ اپنے متعلق تو لکھ سکتے ہیں۔ لیکن اپنے لئے نہیں۔ یا کم از کم صرف اپنے لئے نہیں۔ دوسرے ہمیشہ ہمارے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ ڈائری اور اعترافات تک۔ لکھتے وقت غیر شعوری طور پر دوسرے ہمارے سامنے موجود رہتے ہیں۔ اور اس طرح ہم اپنے متعلق لکھتے ہوئے بھی دوسروں کے لئے ہی لکھتے ہیں۔ لیکن یہ وہ دوسرے کون ہیں۔ جن کے لئے ہم لکھتے ہیں کبھی ہم نے شہنشاہوں، بادشاہوں۔ ان کے حواریوں۔ سپہ سالاروں، آقاؤں، سرداروں۔ پادریوں کے لئے قصیدے لکھے اور کبھی کہانیاں۔ کبھی ان کی فتوحات کے لئے دعائیں مانگیں۔ اور کبھی ان کی صحت اور زندگی کے لئے ان کے مظالم کو برحق ثابت کرنے کے لئے نئے نئے نظریات تراشے عوام کو سلانے کے لئے نت نئی قسم کی مختلف افیون کی گولیاں تیار کیں۔ مذہب کے نام پر انہیں کٹوایا، تہذیب و تمدن کے جھوٹے دیوتاؤں پر ان کی بھینٹ چڑھائی، قومیت اور وطنیت پر انہیں قربان کرایا۔ جاگیرداری کو فروغ دیا۔ سرمایہ داری کو پروان چڑھایا۔ بغرض بعض اوقات ہمارے قلم نے وہ سب کچھ کیا۔ جو زمانے نے اس سے کرایا۔ قلم ہمارے ہاتھ میں تھا۔ اور ہم کافی حد تک زمانے کے قبضے میں لیکن اس کے برخلاف اکثر ایسا بھی ہوا کہ زمانے کو اپنے قبضے میں لاتے۔ عمل تضاد کو بڑھانے۔ زمانے کے صالح اجزاء کو آگے بڑھانے اور نئے دور کو آگے لانے کے لئے ہمارے قلم نے زمانے کے جمود کے خلاف آواز اٹھائی۔ جب کبھی یہ آواز اٹھی تو اُسے دبانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن یہ کوشش ہمیشہ رائیگاں ثابت ہوئی۔ زمانہ اپنے جدلیاتی اصول کے ماتحت ہمارے قلم کی مدد کرتا رہا۔ اور ہمارا قلم شعوری طور پر زمانے کو جدلیاتی عمل کی راہ پر آگے بڑھاتا رہا۔ شعوری طور پر اس وجہ سے کہ قلم کا یہ عمل غیر شعوری ہو ہی نہیں سکتا۔ موجودہ زمانے میں جدلیاتی اصول کے تحت

ماحول اور شعور دونوں کافی تیز رفتار سے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں جس کے وجوہ ماحول اور شعور دونوں میں پوشیدہ ہیں۔ لیکن ان کی اصل وجہ جدلیاتی شعور میں عمل اور رد عمل کا اصول ہے۔ ایک دوسرے کو مدد دیتے ہوئے وہ آگے بڑھ رہے ہیں۔ اور ان کے اس آگے بڑھنے کا نام ترقی ہے۔ اگر شعور زمانے کے اس جدلیاتی عمل میں اپنا فرض ادا نہ کرے۔ تو یہ جدلیاتی عمل بالکل بے وقعت ہو کر رہ جائے۔ اور دنیا کی ترقی کی رفتار اس قدر سست ہو جائے کہ اسے ترقی کہنا بھی صحیح نہ ہو۔ شعور کو جانچنے اور اس کی ترقی کا اندازہ لگانے کے اگرچہ اور بھی پیمانے ہیں۔ لیکن ایک عام اور غالباً سب سے زیادہ صحیح پیمانہ قلم ہے۔ یہ پیمانہ صرف پیمائش و عکاسی ہی کے فرائض انجام نہیں دیتا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ شعور میں پختگی پیدا کرتا۔ اسے آگے بڑھاتا اور اسے صحیح راستے پر لگاتا بھی ہے۔ اور غالباً یہی وجہ ہے کہ رو بہ انحطاط طبقے نے قلم پر ہمیشہ ظلم و ستم توڑے۔ تاکہ وہ بڑھتے ہوئے شعور کو کسی نہ کسی طرح آگے بڑھنے سے روک سکے اس کے برخلاف قلم اکثر اوقات جدلیاتی عمل کو آگے بڑھانے کی جدوجہد میں کوشاں رہا۔ تاکہ اس طرح عالم رو بہ انحطاط طبقے کا خاتمہ کر کے نئے طبقے کو ابھرنے کا موقع دے۔

اس پس منظر کے پیش نظر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ قلم کو کس کی خدمت کے لئے وقف ہونا چاہئے۔ دوسرے الفاظ میں ہمیں کس کے لئے لکھنا چاہئے۔ یہ سوال جیسا کہ شروع میں عرض کر دیا گیا ہے۔ ہمیشہ سے قابل توجہ رہا ہے لیکن سرمایہ داری کے اس آخری دور میں جب کہ بعض ممالک میں وہ ختم ہو چکی ہے۔ بعض میں آخری سانس لے رہی ہے۔ اور بعض میں اپنی غیر طبعی عمر کو بڑھانے کی ناکام کوشش کر رہی ہے۔ یہ سوال اور زیادہ اہم ہو گیا ہے۔ سرمایہ داری کے اس دور میں دونوں طبقوں یعنی محنت کش طبقے اور محنت سے فائدہ اٹھانے والے طبقے کا تضاد اس حد تک بڑھ گیا ہے کہ نہ دونوں کا ایک کشتی میں سوار ہونا ممکن ہے۔ اور نہ ہی غیر جانبداری کا ڈھنڈورہ پیٹا جا سکتا ہے۔ متوسط طبقہ اب بھی موجود ہے۔ لیکن آہستہ آہستہ ختم ہوتا جا رہا ہے۔ متوسط طبقے کا وجود اصل میں ناسازگار حالات کا ایک مجموعہ ہے۔ حالات کے متوازن ہونے پر یہ طبقہ قدرتی طور پر ختم ہو جائے گا۔ سرمایہ داری جیسے جیسے اپنی منطقی تکمیل کی طرف بڑھتی رہے گی۔ یہ طبقہ ختم ہوتا جائے گا۔ اور جب یہ دور سرمایہ داری اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گا۔ تو نہ صرف متوسط طبقہ فنا ہو جائے گا۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اعلیٰ طبقہ بھی ختم ہو جائے گا۔ جو اس دور سرمایہ داری کا مکمل طور محافظ ہے۔ ان حالات میں ظاہر ہے۔ کہ ہمارا قلم یا تو اعلیٰ طبقے کے مفاد کو آگے بڑھانے کے لئے اپنے آپ کو وقف کرے گا۔ یا اس کے برخلاف غریب اور محنت کش طبقے کو جگانے۔ احساس دلانے۔ نئے دور کے خیر مقدم کے لئے تیار کرنے کے لئے اپنی خدمات پیش کرے گا۔ ان دو راستوں کے درمیان کوئی اور راستہ تلاش کرنا۔ یا ان دو راستوں کے علاوہ کوئی اور تیسرا راستہ بنانا سعیٔ لاحاصل ہے۔ اگر ہم ایک راہ پر گامزن نہ ہوں گے۔ تو یقیناً دوسری پر ہوں گے۔ ادب کی ازلی ابدی دائمی قائمی اقدار کے حامی۔ ادب برائے ادب کے پرستار حسن و عشق کے متوالے۔ زندگی کی ناپائیداری کا راگ الاپنے والے۔ بن میں ڈوب کر سراغ زندگی پانے کی کوشش کرنے والے۔ لاشعور کی گتھیوں کو سلجھانے والے۔ حیات مابعد الممات کے سنہری خواب دکھانے والے نسل و خون۔ رنگ کی بنا پر عالم انسانیت کو تقسیم کرنے والے۔ کشمکش حیات سے دور رہنے کی تلقین کرنے والے انفرادیت کے گیت گانے والے اپنی غیر جانبداری کا کس قدر بھی ڈھنڈورہ پیٹیں۔ بہر حال ان کی جانبداری میں کوئی شک و شبہ نہیں۔ وہ ہر حال میں مورد الزام ہیں۔ اس لئے کہ محنت کش طبقے کی صفوں میں نئے نئے بھیس بدل کر انتشار پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس قسم کے فنکاروں کی نہ پہلے کمی تھی۔ نہ اب ہے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے فنکاروں کی اکثریت عموماً متوسط طبقہ ہی سے متعلق ہوتی ہے۔ اعلیٰ طبقے کے افراد کو اپنی مصروفیتوں سے اتنی فرصت کہاں۔ کہ ادب کی طرف متوجہ ہو سکیں۔ ادنیٰ طبقے کے پاس وہ ذرائع محدود کہ میدان ادب میں شہسواری کر سکیں۔ متوسط طبقے کے وہ فنکار جن کا شعور پوری طرح بیدار نہیں ہوا ہے۔ اور جو جدلیاتی عمل کے اصول کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے ہیں۔ اپنے آپ کو اعلیٰ طبقے تک لے جانے کی خواہش میں یا اس طبقے کے افراد سے

[illegible] کے عالم میں خود کو اعلیٰ طبقے کے مفاد سے وابستہ کر دیتے ہیں۔ اور شعوری یا غیر شعوری طور پر وہی چیز پیش کرتے ہیں جو ان کی اس [illegible] کو پورا کر سکے۔ یہاں ان فنکاروں کی مجبوری بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ جو سیاسی، معاشی، نفسیاتی اور عام تمدنی حالات کی بنا پر [illegible] ہیں۔ جو یا تو حقیقت تک ان کی نظر پہنچتی ہی نہیں۔ یا اگر پہنچتی بھی ہے۔ تو وہ اس میں وہ کشش محسوس نہیں کر سکتے۔ جو ان تمام نہ شعوری [illegible] میں جذبات، مفاد اور بہت حد تک بیدا کر سکے۔ اب آئیے ان فنکاروں کی طرف جن کی عقل پختہ، شعور بیدار، مطالعہ وسیع اور قوت مشاہدہ [illegible] ہے۔ تاریخی قوتوں کا انہیں پورا اندازہ ہے۔ جدلیاتی عمل اور اصولِ ترقی کو وہ پوری طرح سمجھتے ہیں۔ ذاتی، طبقاتی یا اور کسی مفاد سے بلند ہو کر سوچ سکتے ہیں۔ ان فنکاروں کا نظریہ صاف ہے۔ اور اس لئے جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں۔ اس سے ان ترقی پذیر قوتوں کو آگے بڑھنے میں مدد ملتی ہے۔ جن پر دنیا کی فلاح و بہبود، راحت و مسرت، امن و اطمینان کا انحصار ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسا طبقہ ہے جو ان ترقی پذیر قوتوں کا حامل ہے۔ یا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ ہمارے لکھنے کا اصل مقصد ان قوتوں کو آگے بڑھانا ہونا چاہیئے۔ اور جو طبقہ ان قوتوں کو آگے بڑھانے کا متمنی ہو ہمارا فرض ہے کہ ہم اسی کے لئے لکھیں۔ اور وہ چیز تخلیق کریں۔ جو ان قوتوں کو آگے بڑھانے میں معاون و مددگار ثابت ہو۔

اعلیٰ، متوسط یا ادنیٰ ان تینوں طبقوں میں سے ہم کون سے طبقے کو ترقی پذیر قوتوں کا حامل قرار دے سکتے ہیں؟ جہاں تک اعلیٰ طبقے کا تعلق ہے۔ اسے ان قوتوں کا حامل قرار دیا ہی نہیں جا سکتا۔ وہ اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کے پیشِ نظر اس بات میں کوشاں رہتا ہے کہ ان آگے بڑھتی ہوئی قوتوں کو روکے ختم ہوتے ہوئے نظام کو زندہ رکھنے کی کوشش کرے۔ کیونکہ اس کی اپنی زندگی اور اس کے عیش و آرام کا انحصار اس نظام پر [illegible] ہے۔ قدامت پسندی کو تقویت دے۔ دوسرے طبقات کے افراد کو اندھیرے میں رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے تمام دنیا [illegible] آرام کو اپنے قبضہ میں رکھے۔ ترقی پسندی کو برا بھلا کہتے ہوئے قدامت پسندی کی تعریف میں گیت گائے۔ اور دنیا کو آگے بڑھانے کی بجائے پیچھے ہٹانے یا کسی جگہ جامد رکھنے کی کوشش کرے۔ یہ طبقہ ترقی پذیر قوتوں کا ساتھ دینے کی بجائے ان کی راہ میں رکاوٹ بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ترقی سے گھبرا کر اعتدال پسندی کا نام لیتا ہے۔ لیکن حقیقتاً قدامت پسندی کی طرف دنیا کو لیجانا چاہتا ہے۔ کیونکہ صرف اس طرح وہ اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کی نگہداشت کر سکتا ہے۔ متوسط طبقہ جیسا کہ کہا جا چکا ہے۔ ذہنی طور پر دو حصوں میں منقسم ہے۔ ایک تو وہ جس نے تاریخی قوتوں کا صحیح اندازہ نہ کر کے اپنے آپ کو اعلیٰ طبقے کے مفاد سے وابستہ کر لیا ہے۔ اور دوسرا وہ جو سماجی شعور کا حامل ہے۔ اور آگے بڑھتی ہوئی قوتوں کا ساتھ دیتا ہے۔ اب رہا ادنیٰ طبقہ۔ حقیقتاً یہی وہ طبقہ ہے۔ جو ترقی پذیر قوتوں کا حامل ہے یہی وہ طبقہ ہے جس پر عالم انسانیت کی ترقی فلاح و بہبود اور مسرت کا دار و مدار ہے۔ لیکن معاشی مشکلات اور تعلیم کی کمی کی بنا پر ابھی اس طبقے کا سماجی شعور پوری طرح بیدار نہیں ہو سکا۔ بہرحال بالقوۃ اس میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں۔ جن کا اظہار بعض ممالک میں کر دیا گیا ہے۔ ہر فنکار کا فرض ہے۔ کہ وہ ان صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لئے اپنے قلم کو وقف کر دے۔ ظلم و ستم کے خلاف جہاد کرے۔ عوام کو ان کے صحیح مسائل سے روشناس کرائے۔ ان مسائل کے حل کرنے کے صحیح طریقے [illegible]۔ ان کے دل میں زندگی کی امنگ پیدا کرے۔ انہیں روشن مستقبل کا یقین دلائے۔ عمل پر اکسائے۔ ترقی کی راہ دکھائے۔ انفرادیت کے اندھے کنوئیں سے نکال کر انہیں اجتماعیت کے روشن میدان میں لائے۔ غرض ان میں سماجی شعور کو اور زیادہ نکھارنے کی کوشش کرے تاکہ یہ سماجی شعور سماج کو بہتر بنا سکے۔ اور یہ بہتر ماحول عمل اور ردِ عمل کے اصول کے ماتحت سماجی شعور کو اور زیادہ نکھارے۔ فنکار کے یہ تمام فرائض ہیں۔ جن سے [illegible] ہوتا ہے۔ اگر وہ یہ سب کچھ نہیں کرتا۔ تو یقیناً اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی برتتا ہے۔

یہاں ایک سوال اٹھتا ہے۔ کہ کیا فنکار اپنا یہ فرض ساحلِ دریا پر کھڑے ہو کر اور دریا کی صرف سیر کر کے ادا کر سکتا ہے۔ یا اسے اس عملی جدوجہد

میں خود بھی حصہ لینا چاہیئے۔ موجوں کے تھپیڑے خود کھانے چاہئیں۔ گرداب میں غوطے لگانے چاہئیں۔ نظری طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب تک فنکار عملی طور پر جد و جہد زندگی میں حصہ نہ لے۔ اس کے مد و جزر سے اسے واسطہ نہ پڑا ہو۔ جب تک زمانے کے گرم و سرد تھپیڑے اس نے نہ کھائے ہوں۔ وہ عوام کے خیالات اور جذبات صحیح طور پر سمجھ ہی نہیں سکتا۔ ان کی صحیح راہنمائی نہیں کر سکتا۔ جب تک وہ ان مشکلات اور مصائب کو خود برداشت نہیں کرتا۔ جن میں عوام گرفتار ہیں۔ اور جن سے نکلنے کے لئے وہ جد و جہد کر رہے ہیں۔ اس وقت تک وہ ان کا صحیح حل پیش کر ہی نہیں سکتا یہ دلائل کافی صحیح اور پر وزن ہیں۔ اس قدر پر وزن کہ انہیں اگر کلی طور پر نہیں تو جزوی طور پر ماننا پڑتا ہی ہے۔ لیکن اگر ایک فنکار قلم توڑ کر یا پھینک کر تلوار اٹھا لے شعر کہنے کے بجائے نعرے لگانا شروع کر دے۔ افسانے اور مضامین پیش کرنے کے بجائے پروپیگنڈے کے اشتہارات لکھنا شروع کر دے تو وہ فن کار نہیں رہ جاتا۔ تقسیم عمل کے اصول پر کام کرنا پڑتا ہے۔ اور کرنا چاہئے بھی۔ عملی جد و جہد میں حصہ لینے کی اہمیت سے انکار نہیں۔ لیکن فن اور قلم کی اہمیت بھی تو مسلّم ہے۔ یہ دونوں کام بیک وقت نہیں کئے جا سکتے۔ اور نہ ہی ایک شخص ان دونوں کاموں کو پوری طرح انجام دے سکتا ہے۔

مستثنیات کو چھوڑیئے۔ عام فنکاروں پر نظر رکھئے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ اس کے علاوہ ہر فنکار صرف اپنے فن ہی سے تو پیٹ نہیں پال سکتا۔ فنکاروں کی زبردست اکثریت کو اپنی معاشی ذمہ داریاں دوسرے ذرائع سے پوری کرنی پڑتی ہیں۔ ان کی ان تمام ذمہ داریوں کو دیکھئے۔ کیا یہ ممکن ہے۔ کہ ان پر ایک اور زبردست ذمہ داری ڈال دی جائے۔ ایک ایسی ذمہ داری۔ جسے پورا کرنے کے لئے انہیں اپنا تمام وقت صرف کرنا پڑے۔ اس ضمن میں ایک اور بات بھی یاد رکھنی چاہئے۔ زندگی کے موجودہ دورِ کشاکش میں کیا فنکاروں کو اس طرح دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ کہ اول وہ جو ساحلِ دریا پر کھڑے محوِ تماشہ ہوں۔ اور دوسرے وہ جو خود موجوں کے تھپیڑے کھا رہے ہوں۔ اس قسم کی تقسیم نہ صرف منطقی طور پر غلط بلکہ واقعات کے بھی بالکل خلاف ہے۔ ہر شخص کو چاہے وہ فنکار ہو یا نہ ہو عملی طور پر گرداب میں پھنسنا اور نکلنا پڑتا ہی ہے۔ درجے کا فرق ہو سکتا ہے۔ اور ہوتا ہے لیکن یہ نہیں ہو سکتا۔ کہ کوئی شخص محوِ تماشہ ہو۔ اور کبھی کوئی موج اسے نہ چھوئے۔ اس پر پانی کا کوئی چھینٹا نہ پڑے۔ اس کے کپڑے بالکل خشک رہیں۔ کیا وہ ہوا جس میں وہ سانس لے رہا ہے۔ بخارات سے خالی رہ سکتی ہے۔ وہ جگہ جہاں وہ کھڑا ہے۔ کیا نم نہ ہو گی؟ کیا وہ موجوں سے اس قدر دور رہ سکتا ہے۔ کہ کوئی موج اس کے پاس تک نہ آ سکے۔ کشاکشِ زندگی میں صرف محوِ تماشہ رہنا مشکل ہی نہیں۔ ناممکن بھی ہے۔ عملی حصہ اس میں لینا ہی پڑتا ہے۔ کم یا زیادہ یہ اور بات ہے۔

یہ دیکھنے کے بعد کہ ہم کس کے لئے لکھتے ہیں۔ یا صحیح الفاظ میں ہمیں کس کے لئے لکھنا چاہیئے۔ لازمی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کس طرح لکھنا چاہیئے ہمیں اپنے خیالات کا اظہار کس طریقے سے کرنا چاہیئے۔ یقیناً اس طریقے سے کہ مخاطب اسے سمجھ سکے۔ اور اسی طرح سمجھ سکے۔ جس طرح کہ مخاطب کہنا چاہتا ہے۔ صاف ظاہر ہے۔ کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے فن کار کو اپنا مطلب نہ صرف صاف اور آسان الفاظ میں ادا کرنا چاہیئے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ واضح طور پر بھی ادب میں اندازِ بیان کی کافی اہمیت ہے۔ کہ اس کے بغیر ادب اعلیٰ ادب بن ہی نہیں سکتا۔ لیکن یہ اہمیت بالذات نہیں۔ بلکہ بالواسطہ ہے۔ اور اس کی حیثیت ثانوی ہے۔ اسلوب کا اصل مقصد صرف وضاحت ہے۔ اگر یہ مقصد پورا ہوتا ہے تو اسلوب کامیاب ہے۔ ورنہ ادب میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہو سکتی۔ اسلوب کی اہمیت سے انکار مقصود نہیں۔ لیکن اسلوب پر ضرورت سے زیادہ توجہ دینے کا مطلب ادب کی اعلیٰ قدروں کو قربان کر دینا ہے۔ اصل اہمیت جس چیز کو حاصل ہے۔ وہ مواد ہے۔ ہر مواد اپنے اسلوب کو آپ ہی متعین کر لیتا ہے "کیا" آپ ہی "کس طرح" کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ توجہ کا اصل مستحق "کیا" ہے۔ نہ کہ "کس طرح"۔ "کس طرح" پر صرف اس وقت زور دیا جا سکتا ہے جب کہنے کو کچھ نہ ہو۔ اگر فنکار کے پاس پیش کرنے کے لئے کوئی اعلیٰ مقصد موجود ہے۔ تو یہ مقصد الفاظ کا جامہ پہن کر ہی رہے گا۔ اور یہی لباس

اس کے سامنے بیچ رہی ہو گا۔ اگر آپ اسے کسی دوسرے لباس سے مزین کرنا چاہیں گے۔ تو الفاظ کا یہ جامہ اس مقصد کو ختم کر دے گا۔ اگر میں کہوں کہ آپ اپنی تحریر میں جو چیز پیش نظر رکھئے۔ جو آپ کو کہنی ہے۔ اور وہ کس طرح کہی جائے۔ اسے خود متعین ہونے دیجئے۔ تو غالباً زیادہ غلط نہ ہوگا قدرتی انداز بیان بھی ہوگا۔ اور اسی بنا پر کامیاب بھی، ہیزلٹ کے خیال میں تو اعلیٰ عمدہ اور صحیح طرز بیان کا مطلب اس طرح لکھنا ہے جس طرح کوئی بیا شخص عام طور پر گفتگو کرتا ہو۔ جسے الفاظ کے استعمال اور انتخاب پر پورا عبور حاصل ہو۔ بآسانی۔ پرزور اور واضح انداز سے گفتگو کر سکتا ہو۔ اور اپنی گفتگو میں غلط قسم کا عامیانہ اور خاصلانہ انداز نہ آنے دیتا ہو۔ سومرسٹ موگھم کہتا ہے " میں کسی ایسے قابل مطالعہ فنکار کو نہیں جانتا جس نے اپنے اسلوب کو بنانے میں ذرا سی بھی تکلیف اٹھائی ہو۔ . . . میں صاف طور پر یہ کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ میں نے اپنے اسلوب کو بنانے پر نہ کبھی کوئی توجہ دی۔ نہ اس کے متعلق کبھی سوچا۔ نہ میں یہ جانتا اور نہ جاننا چاہتا۔ کہ کیا یہ کوئی اسلوب ہے بھی یا نہیں . . . . میری سمجھ میں یہ نہیں آسکتا کہ کوئی شخص بھلا کس طرح بغیر اپنے آپ کو اور اپنے قاریوں کو زبردست نقصان پہنچائے۔ اپنے اسلوب کے متعلق سوچ سکتا ہے " موجودہ صدی کے خدائے علم و ادب کے الفاظ بھی سن لیجئے۔ " ایک صحیح نیا اسلوب بیان کبھی بھی مقصد بالذات کی حیثیت سے حاصل نہیں کیا جاتا . . . . . . مواد کو پیش کرنا اسلوب کا اصل مقصد ہے۔ جس کے پاس کچھ مواد ہی نہیں۔ نہ اس کا کوئی اسلوب ہے۔ اور نہ ہی اس کا کوئی اسلوب ہو سکتا ہے۔ جس شخص کو کچھ کہنا ہے۔ وہ اپنا اسلوب قدرتی طور پر بنا ہی لے گا۔ اور اس کے خیالات اسے اس کا اسلوب بخش دیں گے۔ جو کچھ اس نے کہا ہے۔ اسے غلط ثابت بھی کر دیجئے۔ لیکن اس کا اسلوب پھر بھی باقی رہے گا۔" (برنارڈ شا) کسی چیز کو پیش کرتے ہوئے آپ دیکھیں گے کہ آپ کو بار بار الفاظ میں رد و بدل کرنا پڑے گا۔ تشبیہات اور استعارے بدلنے پڑیں گے۔ جملوں میں تراش خراش کرنی ہوگی۔ انہیں نئی ترتیب دینی ہوگی۔ لیکن ان تمام باتوں کا اصل مقصد صرف اور صرف یہ ہوتا ہے۔ کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے۔ اسے واضح سے واضح تر طور پر بیان کر سکیں۔ اگر آپ نے صرف الفاظ کی خوبصورتی۔ جملوں کی نادر ترکیب۔ نئی تشبیہات، دور کی استعاروں کی طرف توجہ دی تو آپ دیکھیں گے۔ کہ آپ کی تخلیق ایک فن پارہ نہیں بلکہ ایک پہیلی بن کر رہ گئی ہے۔ فن پارہ کے بجائے اس قسم کی پہیلی کی تخلیق کے دو وجوہ ہیں۔ اولاً فن کار کے دماغ میں کوئی خاص مقصد ہی نہ ہو جسے وہ پیش کرنا چاہے۔ یا کم از کم وہ مقصد واضح طور پر اس کے دماغ میں موجود نہ ہو۔ اور دوم فن کار کسی احتساب کے ڈر سے اپنے مقصد کو واضح اور غیر مبہم طریقے سے پیش نہ کر سکے۔ غالب کے یہ اشعار نہ پڑھنے شروع کر دیجئے :-

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام — چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر
ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو — بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

ذرا اس کے عملی پہلو کی طرف غور کیجئے۔ موجودہ ادب کا کتنا حصہ ابہام میں گرفتار ہو کر رہ گیا ہے۔ بہر حال اس معاملے میں فن کار سے کچھ زیادہ کہا بھی نہیں جا سکتا۔ کیونکہ احتساب کا ڈر کوئی ایسا ڈر تو نہیں۔ جس کی طرف توجہ دینے کی مطلق ضرورت ہی نہ ہو۔ رمزیت اور اشاریت بھی تو احتساب کا یہ علاج جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر کہیں ابہام کی حدود چھو لی گئیں۔ تو اس قسم کی پہیلی کی ادبی حیثیت معلوم!

اب دوسرے سوال کی طرف آئیے۔ ہم کیوں " لکھتے ہیں " کس کے لئے " میں " کیوں " کا جواب کچھ حد تک موجود ہے۔ بہر حال یہ سوال خود اس قدر اہم ہے۔ کہ اس کے متعلق کچھ نہ کچھ کہنا ناگزیر ہے۔ " کیوں " کے صرف دو جواب ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہمیں کچھ کہنا ہے۔ ہمارا کوئی مقصد ہے جسے ہم واضح اور حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اور دوسرا یہ کہ ہم دوسروں پر یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں۔ کہ ہم کہنا جانتے ہیں ہمارے خوبصورت الفاظ اور جملے۔ عجیب غریب تشبیہات، دور رس استعارے۔ ان چیزوں کو پیش کرنے کا ایک عجیب انداز موجود ہے۔ اس لئے

ہمارا طریق غلط ہے۔ کہ ہم کہیں اور دوسروں کا یہ فرض ہے کہ وہ سنیں اور پڑھیں۔ ادب برائے ادب اصطلاح پر استدلال سکتا ہے جیسا کہ ہم تذکرہ کر رہے ہیں تو کہہ سکتا ہوں۔ کہ یہ جواب ادب برائے زندگی کے حامیوں کا ہے۔ اور اگر چہ ادب برائے ادب والے اگر اب بھی ان کا یہ کہنا ہے کہ ادب یہ جواب دینا پسند نہ کریں گے۔ بلکہ تخلیق حسن۔ احساس مسرت وغیرہ الفاظ استعمال کریں گے۔ لیکن اگر ان کی باتوں کا کچھ مطلب ہو سکتا ہے تو صرف یہ کہ ہم کہنا جانتے ہیں اور کہہ رہے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مقصد کہنے کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اگر چہ ادب برائے ادب کے حامی کچھ بھی کہیں لیکن ادکم ان کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم ان کی تخلیقات پر نظر ڈالیں۔ تو صاف معلوم ہو جاتا ہے۔ کہ ان کا بھی کوئی مقصد ہے۔ جس کے ماتحت وہ اپنی تخلیقات پیش کرتے ہیں۔ یہ مقصد ان کے ذہن میں شعوری طور پر موجود ہو۔ یا غیر شعوری طور پر۔ بہر حال اس کی موجودگی سے انکار ممکن نہیں۔ ادب برائے ادب کے کسی بھی مبلغ کو دیکھئے اور اس کی تخلیقات پر نظر ڈالئے کیا آپ کو وہاں کوئی مقصد نظر نہیں آتا۔ مقصد ہے۔ اور یقیناً ہے۔ لیکن چونکہ اس مدرسہ فکر کے حامیوں کو اس بات کا کم از کم ہلکا سا احساس ضرور ہے۔ کہ ان کا یہ مقصد دوسروں کی نگاہ میں پسندیدہ نہیں ہے۔ اس لئے وہ اس مقصد کی موجودگی سے منکر ہیں۔ ان کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ شاہراہِ ترقی میں سے چھوٹی چھوٹی پگڈنڈیاں نکالنا۔ کبھی وہ آپ کو منہ کے سائے تلے لا بٹھاتے ہیں۔ اور کبھی چاندنی راتوں میں لطف اٹھانے کے لئے چھوڑ دیتے ہیں۔ کبھی وہ گزشتہ زمانے کے سنہری دور کی تعریف میں گیت الاپتے ہیں۔ اور کبھی مستقبل کی تاریکیوں کا ذکر کرتے ہیں۔ کبھی عملی زندگی اور جد وجہد کو بیکار ثابت کرتے ہیں۔ اور کبھی صبر و شکر اور فقر و قناعت کی تلقین کرتے ہیں۔ لیکن اس بات کا غالباً خاص خیال رکھتے ہیں۔ کہ آپ کو ان کے اس مقصد کا علم نہ ہو۔ وہ ہمیں زہر کی گولیاں دیتے ہیں۔ لیکن شکر میں لپیٹ کر۔ یہ نہیں کہ شاہراہِ ترقی میں صنوبر کے سائے۔ چاندنی راتیں۔ قوس قزح۔ نیلوفر کے پھول۔ حسن و جمال، عشق و شباب، زلفِ پیچاں، عارضِ گلگوں، چمپئی رنگ۔ جام و مینا، بربط و نے یا صبر و قناعت، ناامیدیاں، تاریکیاں، مایوسیاں نہیں آتیں یہ سب چیزیں آتی ہیں اور ضرور آتی ہیں۔ لیکن مقصد بالذات کی حیثیت سے نہیں بلکہ زندگی کو آگے بڑھانے کے لئے۔ ان میں کھو جانے کے لئے نہیں۔ بلکہ ان سے کچھ حاصل کرنے کے لئے لیکن ادب برائے ادب کے حامی ہمیں ان میں مدغم کر دینا چاہتے ہیں۔ تاکہ ہم شاہراہِ ترقی پر گامزن نہ رہ سکیں۔ اور ان پگڈنڈیوں میں اپنی راہ گم کر دیں۔ ان کا یہ مقصد ان پر واضح ہو یا نہ ہو۔ لیکن ہم پر ضرور واضح ہو چکا ہے۔ ذاتی اور قومی مفاد کے یہ وفادار خادم اب ہمیں زیادہ عرصہ تک سنہری الفاظ کے جال میں پھنسا کر نہیں رکھ سکتے۔

اب آئیے دوسرے مدرسہ فکر کی طرف جو ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔ جو ادب کو کسی مقصد کے تحت لانا چاہتے ہیں۔ جن کی تخلیقات کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے جسے وہ شعوری طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اس مدرسۂ فکر پر نت نئے اعتراضات کئے جاتے رہے ہیں۔ جن میں غالباً سب سے زیادہ وزنی یہ اعتراض سمجھا جاتا ہے۔ کہ اس مدرسۂ فکر کے حامی فن اور ادب کی قدر جانتے ہی نہیں۔ انہیں یہ معلوم ہی نہیں کہ ادب اور فن کس قدر اعلیٰ قدر ہے۔ اسے کسی بھی اور مقصد کے ماتحت کر دینا اسے ختم کر دینا ہے۔ اسے پروپیگنڈا بنا دینا ہے۔ اس اعتراض کا جواب یوں تو جب سے یہ بحث چھڑی ہے۔ ہمیشہ ہمیشہ دیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اعتراض کرنے والے یہ نہیں جانتے کہ جس مقصد کے ماتحت ادب اور فن کو پیدا کیا جاتا ہے۔ وہ مقصد کیا ہے۔ کاش وہ زندگی کو اس کے پورے طول، عرض اور عمق کے ساتھ جان سکتے۔ وہ اسے انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں سے دیکھ سکتے۔ وہ اسے ساکت و جامد شے کی بجائے جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں سمجھ سکتے۔ اس قسم کا اعتراض کرنے والے زندگی کو صرف انفرادی زندگی سمجھتے ہیں۔ انہیں کیا معلوم کہ یہ ایک جوئے کم آب نہیں۔ بلکہ ایک بحرِ بیکراں ہے۔ اور اگر ہم فن اور ادب کو اس کے تحت لانا چاہتے ہیں تو ادب کی حدود اس سے محدود نہیں ہو جاتیں، بلکہ ادب زندگی کی طرح خود بحرِ بیکراں بن جاتا ہے۔ ادب کی قدر اس سے

نہیں۔ لیکن [illegible] نہیں بلکہ اس کا اصلی مقصد وسیلہ ہے۔ جسے زندگی کہتے ہیں۔ وہ ادب کو پراپیگنڈا بنانا۔ تو اس بات کو تو یہاں زیرِ بحث ہی نہ لایئے۔ کیونکہ ادب اور پراپیگنڈے میں کوئی حدِ فاصل قائم کرنا ممکن بھی ہے؟ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ادب کے اپنے کچھ مطالبات ہیں۔ جب تک یہ مطالبات پورے نہ ہوں ہم اسے ادب کہہ ہی نہیں سکتے۔ اگر یہ مطالبات پورے ہو جائیں۔ تو وہ پروپیگنڈا جن معنوں میں عام طور پر ہم [illegible] استعمال کرتے ہیں۔ نہیں رہتا۔

عرض تو میں یہ کر رہا تھا کہ جو کچھ ہم لکھتے ہیں۔ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہوتا ہے۔ لیکن مقصد ہونا کیا چاہئے؟ زندگی اور صرف زندگی۔ یہاں میں مقصدِ زندگی کی تفصیلی بحث میں نہیں جاؤں گا۔ صرف اس قدر عرض کروں گا۔ کہ زندگی جدلیاتی عمل سے مرکب ہے۔ یہ جدلیاتی عمل تصور یا خیال کا محض ذہن میں ہونا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ ہیگل کا خیال ہے۔ بلکہ اس مادی دنیا میں یہ جدلیاتی عمل ہو رہا بلکہ جاری و ساری ہے۔ جس کے ہم بھی ایک جزو ہیں۔ اور تمام تصورات، خیالات، تخیلات بھی مادی کے لفظ سے گھبرایا جاتا ہے۔ الفاظ سے نفرت کب تک روا رکھے گا؟ حقیقت کا مقابلہ تو کرنا پڑے ہی گا۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ہم حقیقت کو جلد از جلد اپنانے کی کوشش کریں۔ حقیقت کو اپنانے سے یہ نقصان تو ضرور ہوگا۔ کہ آپ کو اپنے بہت سے سنہری خوابوں کو خود اپنے ہاتھوں دفن کرنا پڑے گا۔ جنت الحمقا سے نکل کر حقیقی دنیا میں آنا پڑے گا۔ افلاطون کی خیالی ریاست کو چھوڑنا پڑے گا۔ لیکن اگر ہم اسی موجودہ دنیا ہی کو جنت میں تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو یہ سودا کچھ ایسا مہنگا بھی نہیں۔ یہ مقصد آپ کس طرح پیدا کر سکتے ہیں اس کا صرف ایک طریقہ ہے۔ جدلیاتی عمل کے اصول کو پوری طرح سمجھ کر شعوری طور پر اسے آگے بڑھانے ہی سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ہر صاحبِ قلم اپنی نظموں، غزلوں، افسانوں، ڈراموں میں جدلیاتی عمل کی تشریح شروع کر دے۔ اور اس کے مطالبات ہمارے سامنے پیش کرنے لگے۔ کہنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہر اہلِ قلم کا یہ فرض ہے۔ کہ وہ اپنے فن پارے میں وہ چیز پیش کرے جو جدلیاتی عمل کے اصول کے موافق ہو۔ عوام کے دل میں ترقی کا ذوق و شوق پیدا کرے۔ انہیں سلانے کی بجائے جگانے کی کوشش کرے۔ قنوطیت کی بجائے رجائیت کی تعلیم دے۔ انفرادیت کی بجائے اجتماعیت سکھلائے۔ غمِ جاناں کی بجائے غمِ دوراں کو پیش کرے۔ اور اگر غمِ جاناں کو بھی پیش کیا جائے۔ تو اس عمومیت کے ساتھ کہ وہ غمِ دوراں بن جائے۔ صرف اسے پیش کرنے ہی پر اکتفا نہ کی جائے۔ بلکہ اس کا علاج اور یہ علاج بھی تجویز کیا جانا چاہئے۔ مرض کی تشخیص علاج کے لئے ضروری ہے۔ لیکن صرف اتنا ہی تو کافی نہیں۔ اسے دور کرنے کی کوشش بھی تو کرنی چاہئے۔ زندگی کے کسی پہلو کو صرف پیش کر دینا ہی اہلِ قلم کا کام نہیں۔ اس پر تنقیدی نظر ڈالنا بھی ضروری ہے۔ تاکہ زندگی کے اس پہلو کو سنوارا جا سکے اس طرح میں شعور کی اہمیت اور جدوجہد کی وقعت کو واضح کرنا بھی ادیب کا فرض ہے۔ فن پارے میں وعظ شامل کر کے نہیں بلا واسطہ اس کی تلقین کر کے نہیں بلکہ اس طرح کہ جدوجہد و شعور کی اہمیت ہمارے ذہن میں جاگزیں ہو جائے۔ اور اس طرح آگے بڑھنے میں ہماری مدد کرے۔ سلانے کی بجائے اور [illegible] جوانوں کو آمادۂ جدوجہد کرے۔ آگے بڑھائے۔ کرخت آواز سے نہیں۔ بلکہ شیریں اور مترنم آواز سے۔ ہاں آواز میں اگر کبھی کبھی کرختگی آ جائے۔ تو کچھ زیادہ برا بھی نہیں۔

ہنس راج رہبر

پریم چند کا آخری ناول

"منگل سوتر" پریم چند کا آخری ناول ہے۔ انہوں نے یہ ناول بیماری کی حالت میں لکھنا شروع کیا تھا۔ اور ابھی چار باب ہی لکھنے پائے تھے کہ ان کی اپنی جیون کہانی کا انت ہو گیا۔

کچھ دن پہلے تک "گئودان" ہی پریم چند کا آخری اور بہترین ناول تصور کیا جاتا تھا۔ اور اس میں مصنف کو اس قدر کامیابی حاصل ہوئی ہے کہ ہندی کے بعض نقاد اس ناول کو نثر میں لکھا ہوا "مہا کاویہ" کہتے ہیں۔ اس ناول کا ہیرو ہوری اور ہیروئن دھنیا ہمارے ادب کے لافانی کردار بن چکے ہیں۔ اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے۔ کہ طبقاتی جدوجہد اور لوٹ کھسوٹ کو اس شدت اور صداقت کے ساتھ پیش کرنے والا اردو ہندی میں تو کیا بنگالی میں بھی کوئی ناول موجود نہیں۔

پریم چند کی موت کے دس بارہ سال بعد یہ ادھورا ناول "منگل سوتر" ہمارے سامنے آیا ہے۔ (اور وہ بھی صرف ہندی میں) اسے پڑھنے کے بعد ذہن میں خود بخود یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر "منگل سوتر" مکمل ہو جاتا تو کیا وہ "گئودان" سے بہتر ہوتا؟ اگر پریم چند اب واقعی حقیقت پسند بن چکے تھے تو ان کی حقیقت پسندی کی آئندہ سمت کیا ہوتی؟

"گئودان" میں پریم چند آدرش واد (عینیت پسندی) چھوڑ کر حقیقت پرست بن گئے ہیں اس ناول میں انہوں نے سماجی اور سیاسی مسائل کا کوئی غیر قدرتی حل پیش نہیں کیا۔ ناول کا ہیرو ہوری سماج، دھرم، برادری اور قانون سب کو مان کر چلتا ہے۔ زندگی بھر سخت محنت کرتا ہے۔ لیکن اس کا حشر یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنا سب کچھ (موروثی زمین) لٹا کر کسان سے مزدور بنتا ہے۔ اور کام کے بھیانک بوجھ تلے دب کر مر جاتا ہے۔ مرنے کے بعد بھی قدامت پسند رسوم — براہمن دیوی دین کے روپ میں — جو براہمن ہی نہیں سود خور مہاجن بھی ہے سر پہ آکھڑی ہوتی ہیں۔ اور خراج طلب کرتی ہیں۔ خراج اس انسان سے جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔

ہوری کی کہانی میں پریم چند نے اس خون چوسنے والے طبقہ داری اور بوسیدہ سماج کو ٹوٹتے دکھایا ہے۔

لیکن بات یہیں پر تو ختم نہیں ہو جاتی۔ اگر یہ سماج واقعی ٹوٹ رہا ہے۔ اور اس کا ٹوٹنا ناگزیر ہے۔ تو کیا اس کے ساتھ ہی انسانی زندگی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا؟ یا کوئی نیا سماج وجود میں آئے گا اور اس نئے سماج کی تعمیر کے عناصر کیا ہیں؟

"منگل سوتر" میں ہم پریم چند سے ان سوالوں کے جواب کی توقع رکھ سکتے تھے اور وہ جو جواب دیتے وہی ان کی آئندہ حقیقت پرستی کا معیار ہوتا۔ لیکن اس شک کی بھی گنجائش ہے۔ کہ وہ شائد پھر آدرش وادی بن جاتے کیونکہ "نرملا" میں بھی وہ حقیقت پرست ہیں۔ لیکن اس کے بعد کے ناولوں "پردۂ مجاز" "چوگانِ ہستی" اور "میدانِ عمل" میں وہ پھر آدرش وادی بن گئے ہیں۔

اس شبے کو بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا "گئودان" میں بھی آدرش واد کے کچھ عناصر موجود ہیں۔ گو وہ بہت کمزور ہیں۔ اور ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر مزدور ہڑتال کی ناکامی کے بعد جب چندر پرکاش کھنہ کی مل کو آگ لگتی ہے تو پریم چند اسے مزدوروں پر کئے ہوئے ظلم

کا نئیں انتقام لیکھتے ہیں تو یہ ایسی ہی بات ہے جیسی گاندھی جی بہار کے زلزلہ کو انسان کے پاپ کرموں کا پھل بتاتے تھے) اس آگ میں کھنہ کا سب کچھ جل جاتا ہے جس سے اس کا ہردیہ پریورتن (تالیفِ قلب) ہوتا ہے۔ دوسرے ہی دن ہم اسے پھر اپنے پرانے روپ میں دیکھتے ہیں۔ کارخانہ پھر چل رہا ہے اور پھر اپنی طبقاتی بے رحمی کے ساتھ مزدوروں کا خون چوس رہا ہے۔ (یہاں ناول میں واقعاتی تسلسل بھی قائم نہیں رہتا۔)

گیان شنکر کا کردار بھی عجیب معجون مرکب ہے۔ ان سے جب ہمارا پہلی بار تعارف ہوتا ہے۔ تو وہ ایک خود پسند دانشور سے زیادہ کچھ نہیں۔ انہیں اس بات کا افسوس ہے۔ کہ فلسفہ پر ان کی نئی تصنیف کی کافی پوچھ نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ یکایک بڑے ہی آدرش وادی اور ایثار پسند اور مستحکم کردار کے انسان بن کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ اس کے لئے انہیں کسی قسم کی ریاضت نہیں کرنی پڑتی۔ پھر یہی جاتے اس وقت کامل قناعت پسند بن گئے ہیں۔ جب وہ اپنی بیوی گوبندی کو ماں کی عظمت کا اپدیش دے کر گھر لوٹ جانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ اور انہیں اس میں کامیابی بھی ہوتی ہے۔

دراصل اس جگہ پریم چند نے بہتر سے بہتر وقت خود وہ سماج اور اس کے بوسیدہ رسم و رواج سے سمجھوتہ کر لیا ہے۔

پریم چند نے جب منگل سوتر لکھنا شروع کیا تھا۔ اس وقت زمانے کا تقاضا کیا تھا۔ اور ہماری تحریکِ آزادی کن منزلوں سے گذر رہی تھی؟ اس بات کا اندازہ لگا کر ہی ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ "منگل سوتر" اپنی مکمل صورت میں کیا ہوتا؟ کیا وہ واقعی "گؤدان" سے بہتر ناول ثابت ہوتا؟

اس وقت کے سیاسی اور سماجی حالات سے پریم چند مطمئن نہیں تھے۔ کوئی بھی سمجھدار اور ایماندار شخص مطمئن نہیں تھا۔ اس لئے پریم چند کی سبھی تصنیفات میں بےچینی اور جد و جہد کا احساس جاری و ساری ہے۔ "منگل سوتر" میں یہ احساس اور زیادہ شدت سے ابھر کر سامنے آتا ہے۔ ناول کا ہیرو کہتا ہے۔ "میں ہی ہوتا تو دنیا کا یہ نظام سرے سے بدل ڈالتا" اس ناول میں بھی پریم چند نے انہی چار ابواب میں وہ تمام مسائل پیش کر دیئے ہیں۔ جو وہ اس سے پہلے بھی اپنے ناولوں میں پیش کرتے آئے ہیں۔ اس ناول کے چیدہ چیدہ کردار یہ ہیں۔

۱۔ دیو کمار۔ شہرت یافتہ اور کہنہ مشق ادیب۔ موجودہ سیاسی اور اقتصادی نظام سے بیزار ہے۔ جو عمر بھر خلوص اور ایمانداری سے ادبی خدمت کرتا رہا ہے۔ متعدد مقبولِ عام کتابوں کا مصنف ہے لیکن ان سے کوئی معقول آمدنی ہونے کے بجائے وہ بزرگوں کی چھوڑی ہوئی موروثی جائداد بیچ کر کھا جاتا ہے۔

۲۔ سنت کمار۔ ادیب کا بڑا لڑکا۔ انگریزی تعلیم یافتہ اور وکیل ہے۔ جو انتہا درجے کا خود غرض اور خود پسند واقع ہوا ہے۔

۳۔ سادھو کمار۔ ادیب کا چھوٹا لڑکا۔ ایثار پسند اور با اصول نوجوان ہے۔ سیاسی تحریک میں دو مرتبہ قید کاٹ چکا ہے۔

۴۔ مسٹر سنہا۔ سنت کمار کا لنگوٹیا یار۔ وہ بھی وکیل، خود غرض اور چلتا پرزہ۔

۵۔ گرد ھرداس۔ سنئے نگلنے کا سیٹھ ہے۔ انگریزی تعلیم حاصل کی ہے۔ قانون کو خوب سمجھتا ہے کمپنیوں کے حصے خریدتا ہے اور بازار اچھا دیکھ کر بیچ دیتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانڈ کے ایک کارخانے کا بھی مالک ہے۔

۶۔ شیبیا۔ ادیب کی بیوی، خاوند کے آدرش واد کی قائل ہے۔ سنت کمار کی خود غرضی اور کج روی کو پسند نہیں کرتی۔ بیٹے کے خلاف ہمیشہ خاوند کی طرفداری کرتی ہے۔

۷۔ پنکجا۔ ادیب کی بیٹی۔ بڑی سیدھی اور خدمت گذار ہے۔

۸۔ پشپا۔ سنت کمار کی بیوی، فراخدل واقع ہوئی ہے۔ عورت کی آزادی اور حقوق کی علمبردار ہے۔

۹۔ ٹبی۔ سادھو کی بیٹی کالج میں پڑھتی ہے۔ انتہائی فیشن پسند ہے۔ چلتے پھرتے کتابی فقرے بول کر قابلیت کا اظہار کرنا خوب جانتی ہے۔ نئی تہذیب کے مطابق زندگی بسر کرنا پسند کرتی ہے۔ اس کی حرکات و سکنات میں اپنی اس نمائشی زندگی اور پرانے ماحول کے خلاف نفرت کا جذبہ کارفرما ہے۔

۱۰۔ گرد سے۔ ٹبی کا بوائے فرینڈ۔ ٹبی کی خود سری اور بد مزاجی سے تنگ آکر سوچتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ پڑھنے سے عقل آتی ہے یہی ہے وہ عقل!"

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین کرنی ضروری ہے کہ ان کرداروں کے ارتقا اور مسائل کے حل کا ایک واضح خاکہ پریم چند نے اپنے ذہن میں یا کاغذ پر ضرور بنا لیا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے "ناول کا موضوع" کے نام سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے "کوئی ناول شروع کرنے سے پہلے اگر ہم اس کے کرداروں کی ایک ذہنی تصویر بنا لیا کریں تو پھر ہمیں ان کا ارتقا دکھانے میں سہولت ہوگی۔"

ظاہر ہے پریم چند نے اپنے ذہن میں "منگل سوتر" کے کرداروں کی ایک واضح تصویر بنائی ہوگی۔ اگر ہم "منگل سوتر" کے کرداروں کا پریم چند کے پچھلے کرداروں سے مقابلہ کریں تو بظاہر ان میں کوئی فرق نظر نہیں آتا یہ دوسری بات ہے کہ آگے چل کر ان کا کوئی روپ نکھر آتا۔ مثال کے طور پر سنت کمار کو لیجئے وہ "گوشۂ عافیت" کے گیان شنکر سے مختلف نہیں ہے۔ اس نے بھی انگریزی تعلیم حاصل کی ہے۔ گریجوایٹ ہے وکالت پاس نہیں کی۔ لیکن کرنا چاہتا ہے۔ اسے بھی اپنے چچا سے ہوا سے اپنی اولاد ہی کی طرح محبت کرتا ہے۔ یہ شکایت ہے کہ وقار پرستی کے نام پر وہ بزرگوں کی وراثت میں ملی ہوئی جائداد لٹاتے جا رہا ہے۔ اس کی بیوی وِدیا بھی پشپا کی طرح خوددار اور نیک دل عورت ہے۔ وہ بھی اپنے خاوند کی خود غرضی کو پسند نہیں کرتی۔ گیان شنکر بھی ودیا سے اس لئے لڑ پڑتا ہے کہ وہ اپنے والد باپ سے روپیہ کیوں نہیں لاتی۔ ادھر صرف اسی نیت سے سنت کمار روٹھی ہوئی پشپا کو منانے جاتا ہے۔ وہ اس کی دلیل کو درست نہ سمجھتے ہوئے بھی اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن جب وہ اپنے پتا کو روپے بھیجنے کے لئے خط لکھنے سے انکار کر دیتی ہے تو سنت کمار کی ساری ملائمت اور شرافت کافور ہو جاتی ہے۔ اور وہ پھر اس سے لڑ پڑتا ہے۔ گیان شنکر مطلب برآری کے لئے گائتری سے محبت کا سوانگ بھرتا ہے۔ اور سنت کمار اس مطلب برآری کے لئے ٹبی سے محبت جتاتا ہے۔

لیکن گیان شنکر اور ودیا کی پرورش جس ماحول میں ہوئی ہے "منگل سوتر" کا ماحول اس سے مختلف ہے۔ اس لئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ سنت کمار اور پشپا کی کہانی کا انت وہ نہیں ہوگا جو گیان شنکر اور ودیا کی ازدواجی زندگی کا ہوا ہے۔ "چوگانِ ہستی" کے راجا مہندر اور مانوں کی ازدواجی زندگی کی کہانی بھی اس سے ملتی جلتی ہے۔ مسئلہ جہیز کی رسم کا ہو یہ اور نقصان وہ ہوتا۔ لڑکی کو بیاہ سنگ کی گائے سمجھ کر جس کے ہاتھ چاہے پکڑا دیا۔ لیکن ماحول اور حالات مختلف ہونے کے باعث ان دونوں کہانیوں کا انجام بھی مختلف ہوتا ہے "گوشۂ عافیت" کی ودیا خاوند کی خود غرضی اور نفس پروری سے تنگ آکر خودکشی کر لیتی ہے۔ اور گیان شنکر اپنا سب کچھ لٹتے دیکھنے کے لئے زندہ رہتا ہے۔ "چوگانِ ہستی" کی اندو اپنے ریاکار خاوند کو چھوڑ کر اپنی آدرش وادی ماں کے پاس آکر رہنے لگتی ہے۔ اور اس کے ساتھ خدمتِ خلق میں لگ جاتی ہے۔ جب مہندر کمار اپنے حسد اور بغض کے باعث سورداس کا بت گراتا ہے۔ اور خود اس کے نیچے دب کر مر جاتا ہے۔ تو اندو کو خاوند کی موت کا ذرا بھی افسوس نہیں ہوتا۔

اس ناول میں بھی اگرچہ مسئلہ یہی ہے۔ کہ خود دار فراخ دل پشپا کو ایک ایسے مرد کے پلے باندھ دیا گیا ہے۔ جو اپنی کمینہ فطرت کے باعث اس [illegible] نہیں ہے۔ لیکن ضروری نہیں کہ پریم چند اس ناول میں بھی "گوشۂ عافیت" اور "چوگانِ ہستی" کی طرح اس مسئلے کا حل پیش ہی نہ کرتے۔ اگر [illegible] پشپا کو بھی کوئی مہتہ اس کی عظمت سمجھا کر خاوند کے ساتھ بنائے رکھنے کی تلقین کرتا۔ اس قدامت پسند سماج کے خلاف پریم چند کے دل میں [illegible] سے کہیں زیادہ شدید ہو گیا تھا۔ اس لئے ممکن ہے کہ جس طرح "کفن" میں انہوں نے سماج کے رسم و رواج، اخلاق اور اس کی تمام پابندیوں کو پاؤں سے روندا ہے۔ یہاں بھی روندتے۔

پشپا ڈاکٹر کی بیٹی ہے۔ اس کی پرورش نئی تہذیب کے مطابق ہوئی ہے۔ وہ ودیا اور اندو کی طرح جاگیردارانہ سماج سے وابستہ نہیں ہے۔ بلکہ وہ "میدانِ عمل" کی سکینہ کی طرح بیدار احساس کی مالک ہے۔ عورت کے حقوق اور ذمے داریوں کو سمجھتی ہے۔ اور ان حقوق کے لئے جدوجہد کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔ وہ اپنے خاوند سنت کمار سے صاف صاف کہتی ہے "اگر میں تمہاری محتاج ہوں تو تم بھی میرے محتاج ہو۔ میں تمہارے گھر میں جتنا کام کرتی ہوں اگر کسی دوسرے کے گھر میں کروں تو گزارہ کر سکتی ہوں۔" جب سنت کمار یہ دلیل پیش کرنا چاہتا ہے۔ کہ وہاں تمہاری وہ عزت نہیں ہوگی۔ جو اس گھر میں ہوتی ہے۔ تو وہ لیڈی ڈاکٹر کی مثال پیش کرتی ہے۔ "لیکن میں نے مس ٹیلر کو تمام عمر کنواری رہ کر عزت سے زندگی بسر کرتے دیکھا ہے۔" اس ناول میں طلاق اور بحث کا یہ رخ ظاہر کرتا ہے۔ کہ سنت کمار سے جو بیوی سے پریم کا سوانگ بھرتا ہے۔ اور جو آگے چل کر اس سے بھی زیادہ سوانگ بھرے گا۔ پشپا کا نباہ نہیں ہوگا۔ لیکن یہ بات بھی طے ہے۔ کہ وہ ودیا کی طرح خودکشی نہیں کرے گی۔ اس کی ذہنی افتاد ودیا سے مختلف ہے۔ وہ عورت کی آزادی اور نجات کی راہ کو بخوبی سمجھتی ہے۔ اس لئے پشپا کسبِ معاش کا کوئی باعزت ذریعہ اختیار کر کے الگ رہے گی۔ اور سنت کمار کو دکھا دے گی کہ عورت پیٹ بھرنے کے لئے مرد کی محتاج نہیں ہے۔ ممکن ہے پریم چند جو پہلے طلاق کے قائل نہیں رہتے۔ اب ہو گئے ہوں۔ اور آخر میں ان دونوں میں طلاق ہی کرا دیتے۔

ملتی بھی تدریجی ترقی میں ہمیں "گئودان" کی ملتی کی شروع اور آخر زندگی کی جھلک پہلے ہی باب میں مل جاتی ہے۔ وہ نئی تہذیب کی تتلی ہے۔ اسے اپنے حسن پر ناز ہے۔ اور وہ اپنے سطحی علم کی نمائش کرنا بھی خوب جانتی ہے۔ لیکن وہ ایثار پسندی جو بقول پریم چند ہر نیک انسان کے دل میں چھپی رہتی ہے۔ ملتی کے دل میں بھی موجود ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس بیزار کن اور نمائش پسند ماحول سے اوپر اٹھنے کا ذرا بھی موقع ملے تو وہ اسے ہاتھ سے نہیں جانے دے گی۔ اس کا ذکر مہتہ سے ان حالات سے ابھرنے میں اس کی مدد کرے گا۔ جلد وجلد ہی اس کے کردار کی تمام کمزوریاں دور ہو جائیں گی۔

طبقاتی جدوجہد کا آغاز اس ناول میں بھی ہو گیا ہے۔ چار ابواب میں پریم چند نے اس سے متعلق [illegible] پیدا کر دیئے ہیں۔ گردھر داس مہاجنی تہذیب ہے۔ کہ جو [illegible] ہے۔ "گئودان" کے چندر پرکاش کھنہ کی طرح وہ بھی دیس بھگت کہلانے اور اپنا کاروبار چمکانے کے لئے [illegible] کھدر کے تھان کے تھان [illegible] دیتا ہے۔ اور پھر مہنگے داموں بیچ دیتا ہے۔ اس کا بھی ایک شوگر مل ہے۔ وہ اپنے باپ کی طرح قدامت پسند نہیں ہے۔ وہ [illegible] کے نام سے پڑھتا ہے۔ اور [illegible] خیرات کے خلاف اس نے ایک کتاب بھی لکھ ڈالی ہے۔ اپنے آپ کو مہذب اور روشن خیال ظاہر کرنے کے لئے وہ [illegible] کی عزت کرتا ہے۔ اور اس کی کچھ خدمت کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ لیکن جب دیکھتا ہے کہ وہ لاکھ کی جائیداد کو بیس ہزار میں [illegible] کی بات پر اڑا ہے۔ اور عدالت میں جانے کے بجائے رشتوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے کی بات کہتا ہے تو گردھر داس کا باعزت چہرہ [illegible] پر جا آتا ہے۔ یعنی مہاجنی ناخن جو اس نے شرافت کی نرم گدی میں چھپا رکھا تھا۔ وہ تیز اور تند ہو کر باہر نکل آتے ہیں۔

یہ گردھر داس سماج میں لوٹ کھسوٹ کا مجسمہ ہے "گئودان" کا چندر پرکاش کھنہ بھی اس گردھرداس کا بھائی بند ہے۔ ان لوگوں کی دلی بگی ساکھ، عزت، شرافت محض دکھاوے کی چیزیں ہیں جس طرح کھنہ کے شوگر مل میں ہڑتال ہوئی تھی۔ اس طرح گردھر داس کے شوگر مل میں بھی ہڑتال ہونا ضروری ہے ۱۹۳۶ء میں جب پریم چند یہ ناول لکھ رہے تھے۔ مزدور تحریک اور مزدوروں کی ہڑتالوں کا زور بڑھ رہا تھا۔ اور وہ مزدور یونینوں میں منظم ہو رہے تھے۔ گاندھی جی اچھوت ادھار کا کام سنبھال کر سیاست سے "الگ" ہو گئے تھے۔ سوشلسٹ اور کمیونسٹ پارٹیاں سرگرم عمل تھیں کانگریس کی باگ ڈور جواہر لال نہرو کے ہاتھ میں تھی۔ اور اس وقت وہ سوشلزم کے سب سے بڑے ترجمان بنے ہوئے تھے۔ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ امر کانت جو مستقل مزاج اور سنجیدہ طبیعت کا نوجوان ہے۔ جو سیاسی تحریکوں میں پہلے بھی دو بار قید کاٹ چکا ہے۔ آگے چل کر گردھر داس کے مل کے مزدوروں کی تنظیم کرے گا اور لوٹ کھسوٹ کے خلاف ان کی ہڑتالوں کی رہنمائی کرے گا۔ ملتی بھی اس جدوجہد میں حصہ لے گی۔ سنت کمار کا سوانگ، خود غرضی اور ریا کاری زیادہ دنوں چھپی نہیں رہے گی۔ اور وہ اصلی پریم ساد ھو کمار سے پائیگی۔ عملی جدوجہد میں ان دونوں کرداروں کا ارتقار ہوگا۔ اور عین ممکن ہے۔ آخر میں ان دونوں کی شادی ہو جائے۔ ملتی کہتی ہے۔ میں بیاہ کو پریم بندھن کے روپ میں دیکھ سکتی ہوں۔ دھرم بندھن یا رواج بندھن تو میرے لئے ناقابل برداشت ہو جائے گا۔ ان کا یہ بیاہ پریم بندھن ہی ہوگا۔ اور نئے سماج میں پریم بندھن ہی بیاہ کی ترقی یافتہ صورت اور واحد رسم ہوگی۔ ——— دیکمار کے متعلق لکھا ہے —— "ادبی خدمت کے علاوہ انہیں اور کسی کام سے دلچسپی نہیں تھی۔ اور پیاں دھن کہاں؟ نام ضرور پایا ان کے دلی اطمینان کے لئے اتنا ہی کافی تھا":

لیکن یہ اطمینان اس وقت تک رہا جب تک دیکمار بھی "گئودان" کے ہوری کی طرح آدرش وادی بن کر اس سماج اور اس کے رسم و رواج اور قانون قاعدوں کو مانتا رہا۔ وہ تبھی تک اس نے سنت کمار کی اس تجویز کی مخالفت کی کہ بزرگوں کی کھوئی جائداد کو دوبارہ حاصل کرنے کے لئے گردھر داس پر دوبارہ نالش کی جائے۔ دیکمار کو اپنے قول کا پاس تھا۔ وہ اس سے انحراف کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جب اس سماج کی پابندیوں کے تقدس کا بھوت سر سے اتر گیا تو سوچا۔ بیشک وہ مہاجن کے بیس ہزار کا قرضدار ہے۔ اخلاق کا تقاضا ہے۔ کہ اس جائیداد کو فروخت کر کے اس کے بیس ہزار چکا دیئے جائیں۔ باقی اسے مل جائیں۔ اگر قانون قرضدار کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ تو قرضدار بھی قانون میں جتنی کھینچ تان ہو سکے اتنا کر کے مہاجن سے اپنی جائیداد واپس لینے میں کسی بداخلاقی کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔" یہ خیال اب کس طرح بھی ذہن سے نہیں نکلتا۔ اگرچہ اس سے ان کے پرانے سنسکاروں (رجحانات) کی بنیادیں ہل گئی تھیں لیکن وہ اس نئے خوش تھے۔ کہ بچ رہے نہیں سماتے تھے۔ گویا انہیں کوئی "نیا جیونی منتر" مل گیا ہو۔

ہمارا خیال ہے۔ کہ "منگل سوتر" "گئودان" سے چار قدم آگے ہی ہوتا۔ اس میں "گئودان" کی وہ کمزوریاں نہ ہوتیں جن کی طرف ہم پہلے اشارہ کر چکے ہیں۔ پریم چند کا ذہنی ارتقار برابر جاری تھا۔ وہ اپنے طویل ادبی سفر میں کسی مقام پر رکے نہیں "مہاجنی تہذیب" ان کا آخری مضمون ہے۔ جو ان کی موت کے ایک ماہ بعد "ہنس" میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے روس کی اس نئی تہذیب کو خوب سراہا ہے جس میں لوٹ کھسوٹ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی ہے۔ اور جس نے ایک نئے انسان کو جنم دیا ہے۔ اس کے ذریعہ انہیں انسانی مستقبل روشن نظر آتا تھا۔ یہی عقیدہ وہ "نیا جیون منتر" ہے۔ جسے لے کر وہ "منگل سوتر" تخلیق کر رہے تھے۔

قتیل شفائی

منزل منزل

فضاؤں میں سفاک سورج کی حدت
ہواؤں میں قاتل شعاعوں کی آنچ
بڑھتی گئی —

جبینوں پہ سیال تاروں کے جھرمٹ
نظر تاب چنگاریوں کی طرح
دہکتے رہے —

نہ بادل، نہ سایہ، نہ ٹھنڈک، نہ راحت
نگاہوں پہ اک حسرتوں کا سراب
چھایا رہا —

بہ ایں تشنگی اپنی روحِ تجسس
ابابیل بن کر افق تا افق
بھٹکتی رہی —

یہ گنگ و جمن ہیں، یہ نیل و فرات
کہیں تو ملے گا نشانِ حیات

ش۔ صحیٔ

غزالہ کے نام

(سانیٹ)

مری چشمِ تمنا کی نمی تم نے نہیں دیکھی!!
لبوں پر میرے اکثر اک تبسّم تم نے دیکھا ہے
تبسّم کے پسِ پردہ جو غم کی ایک دُنیا ہے
جھلک اُس ایک دُنیا کی ابھی تم نے نہیں دیکھی!
اندھیروں میں سسکتی روشنی تم نے نہیں دیکھی!
تمہیں آسودۂ آئینہ و شانہ جو پایا ہے
تمہارے گیسوؤں کی ہی قسم میں نے یہ سوچا ہے
کہ زُلفِ زندگی کی برہمی تم نے نہیں دیکھی!

مری پلکوں کی یہ اُمڈی ہوئی تازہ نمی سے لو!
تمہارے غنچۂ دل کی نئی تشکیل ہو جائے
ربابِ غم سے میرے آج تم کچھ نغمگی سے لو!
کہ اندازِ تبسّم کی ذرا تکمیل ہو جائے
غزالہ! زندگی کے گیسوؤں کی برہمی سے لو!
ذرا فطرت کے بھی احکام کی تعمیل ہو جائے

نقشِ بہار

نقرئی قہقہے سے ہم آہنگ گنگناتی ہوئی فضائے ملول
دندناتی ہوئی رواں سائیکل اور سکڑتا ہوا سڑک کا طول
بادِ صرصر کے ساز پہ دو دل ایک دُھن کی الاپ میں مشغول

...

زلفِ پرپیچ مائلِ پرواز رہگزر میں اڑی اڑی سی دھول
پھولا پھولا سا زرد پیراہن! جیسے جوبن پہ فصلِ گل میں ببول!
لہریں کھاتا ہوا گداز بدن جھیل میں جس طرح کنول کا پھول

...

اپنے اپنے خیال میں دونوں جائیں دانستہ جیسے رستہ بھول
حسنِ نومید کی خلافِ قیاس جیسے ہو جائیں آرزوئیں قبول
عشقِ مجبور کا دلِ مایوس بعدِ مدت بنے کلی سے پھول
جیسے شاعر کے ذہن میں بس کر ایک رنگین خیال بہرِ نزول
نوکِ کلکِ رواں پہ آجائے
نظم بن کر ورق پہ چھا جائے

مُنیر نیازی

گیت

لو پھر سانولی رجنی نے تاروں بھرا آنچل لہرایا

بیتے ہوئے سب سمے سہانے
گائے ہوئے اب گیت پُرانے
آ گئے دِل کا درد بڑھانے

دھیرے دھیرے سُونے نگر پر پھیلی دُکھ کی چھایا

روپ نگر کے رہنے والو
جھوٹے سپنوں کے متوالو
کاجل سے آنکھوں کو سنوارو
پھُولوں سے بالوں کو سنبھالو

بھور ہوئی تو مٹ جائے گی سندر رات کی مایا

گئے سمے کا سوگ منائیں
چندرماں کی جوت جلائیں
سندرتا کی دھوم مچائیں

ایسی ہی کتنی سوچوں سے جیون کا پنچھی گھبرایا

[illegible]

امتیاز جبیں ایم اے

اس کی خواب گاہ کے دریچوں پر پھیلی ہوئی جوہی کی بیلوں میں سے چھن چھن کر آتی ہوئی سورج کی پہلی کرنوں نے جب اپنی نازک انگلیوں سے اس کے تخیل سے چھو چھو کر جھنجھوڑ دیا۔ ملیح انگڑائی لیتی ہوئی اپنے نرم بستر سے اٹھ گئی۔ پھر کھڑکی کے درمیان میں دو ایک جماہیاں لے کر اس نے اپنی خوبصورت آنکھوں سے نیند کے لچھے سے بوجھل پپوٹوں کو دونوں ہتھیلیوں سے ملتے ہوئے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ ارے یہ سب کچھ دیسے کا دیسا ہی ہے ہر چیز اتنی ہی پرانی اور جانی پہچانی ہے جتنی کل تھی۔ صبح کا چھیلتا ہوا ہلکا ہلکا سا اجالا کل کی طرح آج بھی دھندلا اور سوگوار ہے۔ فرش پر کہیں کہیں جلے ہوئے پتنگوں اور برساتی کیڑے مکوڑوں کی خاک بے سر و سامان پڑی ہے مزہ، پھیکی اور ہزاروں سال پرانی کہانی دہرا رہی تھی جس کا انجام ہمیشہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ کہانی کل اور کل سے پہلے بھی دہرائی گئی تھی۔ اور بالکل اسی انداز میں یہ سب کچھ دہی ہے۔ یہ سب کچھ وہی ہے۔ کہیں سے بھی تو کچھ بدلا نہیں ہے۔ اور نہ ہی پرانی چیزوں میں کوئی فرق آیا ہے!۔

وہ برسات کی ایک بھیگی ہوئی صبح تھی۔ اس کی خوابگاہ کے باہر اگست کے مہینے میں چلنے والی آوارہ ہوائیں بغیر رکے تھمے یوں ہی چلی جا رہی تھیں گویا کہ بڑی مشقت کے ساتھ دل لگا کر کوئی کلاسیکل ناچ سیکھ رہی ہوں۔ جب کبھی ہوا کا کوئی تیز جھونکا جوہی کی گھنیری بیلوں کو زور زور سے ہلا دیتا تو اس کی پتیوں پر رات کی بارش کے ٹھہرے ہوئے قطرات ڈھلک ڈھلک کر نیچے زمین پر گرنے لگتے تو اس وقت ایسا معلوم ہوتا جیسے کسی نے سارے دریچوں پر ٹھنڈی اوس کے ننھے بوندوں کی شبنمی چادر ڈال دی ہو۔ اور جب کبھی ہوا کا کوئی فدا اور تیز جھونکا اس کی خوابگاہ میں سے ہو کر کچھ مدھم سے سروں میں کوئی بھولا بسرا گیت گاتا ہوا گزرنے لگتا تو اس کے ساتھ ہی صحن پر سارے سے ہلکے گلابی رنگ کے پردے فضا میں لہرا اٹھتے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی رومان پرست نوجوان لڑکی عالم خیال میں اپنے الف لیلوی تصورات کی سنہری بلندیوں پر کھڑی ہو کر شفق سے نرم نرم تنکوں کو اپنی آغوش میں سمیٹ لینے کے لئے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے افق کی طرف محو پرواز ہو۔ ہوا کے جھونکے تازگی بخش، خوشگوار اور ٹھنڈے تھے۔ ان کے لطیف لمس سے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کسی ٹھنڈے پانی کی جھیل کے بہتے ہوئے سوتے سوتے اٹھ کر ادھر بھاگ آئے ہوں۔

اس نے دریچے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ساری فضا میں ملیح طرح کا انوکھا نکھار اور نیا پن کروٹ لے رہا تھا۔ جیسے کسی نے سارے درو دیوار اور سامنے کے مناظر پر سے نیا رنگ پھیر دیا ہو۔ بات باہر کی دنیا کتنی نئی نئی سی ہے۔ اور اس کے کمرے کے اندر کی اندر کی چھوٹی سی دنیا کتنی پرانی۔ اس کے دل میں یہ خیال آیا! آسمان بالکل صاف تھا۔ اور اس کے نیچے پھیلی ہوئی نرم اور چمکیلی دھوپ میں ہر چیز دھلی دھلائی، صاف اور نکھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ درختوں کی بھیگی بھیگی پتیاں آئینے کی طرح سورج کی تیز کرنوں کو ادھر ادھر پھینک رہی تھیں۔ اس کے دریچے کے سامنے شیشم کے اونچے اونچے پیڑوں کی پھنگیوں سے اوپر جھانکتی ہوئی گھنٹہ گھر کی چوٹی نظر آ رہی تھی۔ اور جلیبیہ کالج کے گنبد کا سنہری کنگورہ آسمان کی نیلی وسعتوں میں اپنا ننھا سا مغرور سر بڑے فخر کے ساتھ اٹھائے ہوئے کھڑا تھا۔ دریچے سے ایک صوت کا چھوٹا گل مہر کا ایک درخت تھا۔ اس کی بہت سی کمزور اور بہت سی دیکھنے میں مضبوط ٹہنیاں ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ اور اس کے نیچے کی ساری زمین ان کے سرخ سرخ پھولوں سے ڈھک گئی تھی۔ بڑی نازک ڈالیاں ہوتی ہیں۔ گل مہر کی!! ـــــ اس نے اس طرح سوچا گویا ان کے ٹوٹ جانے

کاؤں کو بھی بڑا افسوس ہوا وہ گل مہر کے اس درخت کو اپنے بچپن کے دنوں سے جانتی تھی۔ جب وہ ذرا سی بچی تھی۔ تب یہ درخت بھی ننھا سا ایک پودا تھا۔ تب ہی سے اس نے اپنے دل میں اس ننھے سے پودے کی ایک بڑی امید افزا تصویر بنا رکھی تھی۔ ایک دن وہ آئے گا۔ جب یہ ننھا سا پودا بڑھ کر جوان ہوگا۔ اس کی شاخیں جو ابھی اس قدر چھوٹی چھوٹی اور کمزور ہیں۔ بڑھ کر ہر طرف پھیل جائیں گی۔ اور ان سے دہکتے ہوئے کول ماسے اس کے مکان کی دوسری منزل کو جس میں وہ رہتی تھی۔ اپنی ٹھنڈی گود میں لے لیں گے۔ ان میں سرخ رنگ کے پھول آئیں گے۔ نت نئی شاخیں پھوٹیں گی اور اس طرح گل مہر کا یہ درخت بڑھتا، پھیلتا اور پھولتا رہے گا۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ بھی زندگی کی نئی بہاروں سے دوچار ہوگی اس کی زندگی کے آنگن میں رومانی خوابوں کی حسین تعبیروں کی چاندنی اس کو مسرت کے نئے امکانات، خوشی کے نئے وعدوں کی جھلک دکھائے گی۔ اس نے کتنی ہی صبحیں، دوپہریں اور شامیں بچپن کی معصوم گھڑیوں سے لے کر اپنی عمر کے پچیسویں سال کے دھڑکتے، جاگتے اور سوچتے لمحات تک گل مہر کے اس سایہ دار درخت کے نیچے بیٹھ کر گزاری ہیں۔ تنہائی کے اوقات میں اسی درخت کے سائے میں اس نے عجیب و غریب باتیں سوچی ہیں۔ جن کی حماقت پر کبھی کبھی اس کو بے تحاشا ہنسی بھی آگئی ہے اس کی لچکیلی شاخوں کو پکڑ کر جھومتے ہوئے اس نے جیتے جاگتے کتنے خوش آئند سپنے دیکھے ہیں۔ اور کبھی کبھی تو ننھے منے بچوں کی طرح اس کے تنے سے لپٹ کر اس نے سرگوشی کے انداز میں کتنے ہی پیار سے پیارے گیت گائے ہیں اور اپنے دل کے پوشیدہ راز تک اس سے کہلائے ہیں۔ اور آج وہ درخت اس کے بچپن کا ساتھی اس طرح اکھڑ گیا تھا۔ لیکن وہ کرتی کیا؟ رات کا طوفان ہی کچھ اس قدر تیز تھا۔ ہر طرف اندھیرا، بہت ہی گہرا اندھیرا۔ ہوا کی تیز رفتاری کا یہ عالم تھا گویا وہ کہ یہ گمان ہوتا کہ شاید کبھی آئندہ اس سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہوا نہ چل سکے۔ وہ موسلا دھار بارش میں نہاتے ہوئے درختوں کے جھنڈ ہوا میں زور زور سے وحشت انگیز شیطانی سیٹیاں بجاتی رہی بجلی تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد بڑی ڈراؤنی گرج کے ساتھ آسمان کی اندھیاری میں ایک بہت ہی تیز چمکیلی اور فوراً مٹ جانے والی لکیر کھینچ دیتی۔ پھر اندھیرا کچھ اور گہرا ہو جاتا۔ طوفان کی شدت کچھ اور بڑھ جاتی اور ہوا سے لچکتے ہوئے درختوں کے پتے کچھ اور زور سے چیخنے لگتے۔ اس کی خوابگاہ کے روشن دانوں اور بند دریچوں کے شیشوں پر بارش کی تیز بوچھار مستقل اپنی میٹھ مگر ٹتی رہی اور ان پر کچھ سیدھے کچھ آڑے ترچھے اور کچھ گول گول پھولوں کے خاکے بنتے رہے۔ لیکن ابھی مشکل ہی سے کوئی ایک خاکہ مکمل ہو پاتا کہ ہوا کے بے رحم ہاتھ اس کو مٹا دیتے۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ گرتے ہوئے پانی کی تیز دھار دوسرا خاکہ بنانے لگتی۔ یہ ادھورے خاکے یوں ہی تمام رات بنتے اور بگڑتے۔ بگڑتے اور بنتے رہے۔ اور کمرے کے پوربی کونے میں ایک طرف رکھے ہوئے میز پر بجلی کے لیمپ کے سبز رنگ کے شیڈ سے نکلتی ہوئی مدھم روشنی میں وہ یہ تماشہ دیکھتی رہی اور بستر میں پڑے پڑے کروٹیں بدل بدل کر اپنی بوجھل آنکھوں سے روٹھی ہوئی نیند کو بلانے کی کوشش کرتی رہی۔ لیکن نیند اس رات نہ جانے کہاں کھو گئی تھی۔ اس نے تو یوں سوچا تھا۔ یہاں سے دور، بہت دور نیلے سمندروں کے اس پار ایک چھوٹا سا خوبصورت جزیرہ ہے۔ جہاں سال بھر پھولوں کے شگوفے مسکراتے رہتے ہیں۔ اور ایک پھول مرجھانے نہیں پاتا کہ دوسرا پھول کھل جاتا ہے۔ وہیں پھولوں کے ایک مہکتے ہوئے کنج میں نیند کی آرامگاہ ہے۔ اور ہر رات وہ اسی جزیرے سے دن بھر کی محنت سے تھکے ہارے انسانوں کی دنیا میں میٹھی میٹھی لوریاں گاتی ہوئی چلی آتی ہے۔ آج کی بھیانک رات میں جب کہ باہر ہر طرف طوفان اس طرح بپھرا ہوا ہے۔ چنگھاڑ رہا ہے۔ وہ راستے میں کہیں نہ کہیں ضرور بھٹک گئی ہوگی۔ یہ اور ایسی بہت سی دوسری بے سر پیر کی باتیں اس کے بے چین دماغ میں چکر لگاتی رہیں۔ پچھلی رات کے آخری حصے میں جب کہ ہوا اور بارش کا طوفان ذرا کچھ تھک کر دھیما پڑ چکا تھا۔ اس کی نیند سے اچاٹ آنکھیں نہ جانے کیسے ذرا سا جھپک گئیں اور چند جاگتے ہوئے لمحات کے لئے اس کی آنکھ لگ گئی۔ اور پھر نہ جانے کب سویرا ہو گیا۔

اس نے دستے پکڑے کمرے سے باہر نظر دوڑائی۔ رات کی تیز بارش سے خوب اچھی طرح دھل جانے کی وجہ سے کولتار کی سیاہ سڑک یوں چمک رہی تھی۔ جیسے جاڑے کے ایام میں نہانے کے بعد کسی لڑکی کے کھلے ہوئے بھیگے بھیگے بال نرم دھوپ میں سکھاتے ہوئے چمکتے ہیں۔ اس وقت

سڑک بالکل خاموش تھی۔ اور آگے پیچھے اور دور دور تک کوئی آتا جاتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ کتنی خاموش ہے یہ سڑک!! ۔۔۔ بالکل کسی مکتب کی اس جماعت کی طرح جہاں ہر روز شور و غل کے بعد جب شام گھٹی ہو جاتی ہے۔ اور سارے بچے اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ تو وہاں ایک بھی آواز نہیں ابھرتی ۔۔۔ پھر اس نے خاموشی اور ویرانی کی تصویریں اپنے ذہن میں بٹھانا چاہیں ۔۔۔ کیا اس سڑک کی ویرانی اس بے گھاس پات میدان کی طرح ہے جہاں ہر طرف سنسان معلوم ہوتا ہے۔ یا اس سڑک نے یہ خاموشی کسی بڑے ویران کھنڈر سے مستعار لی ہے تبھی تو ایسا لگتا ہے۔ جیسے یہ سڑک اپنے وجود سے بیزار ہو کر خود سو گئی ہے ۔۔۔ یا یہ سڑک اس کی اپنی زندگی ہے۔

اور کچھ دنوں سے اس کی عادت ہو گئی تھی۔ کہ ہر خاموش اور اداس چیز کو دیکھ کر وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچنے لگتی۔ وہ ایسا محسوس کرتی جیسے اسی طرح کی اداسی اور خاموشی، کبھی نہ ختم ہونے والی گھٹن اور ویرانی کا احساس اس کی رگ رگ میں سرایت کر گیا ہو۔ جیسے اپنے چاروں طرف کی ہر چیز سے وہ کچھ بے تعلق اور کچھ خفا خفا سی ہو۔ جیسے وہ اپنے آپ ہی سے۔ روٹھی ہوئی ہو جب وہ اپنی حالت پر غور کرتی تو وہ اپنے آپ کو پرانی کہانیوں کی اس شہزادی کی طرح پاتی جو کسی سنسان جنگل میں بنے ہوئے محل میں ایک مدت سے اس انتظار میں سوئی ہوئی ہے۔ کہ کبھی کوئی پیارا شہزادہ شکار کھیلنے کی غرض سے ادھر نکلے گا۔ اور اس کے جسم کو اپنی جادو بھری انگلیوں سے چھو کر اس کو جگا دے گا۔ پھر وہ کہے گی۔ میرے پیارے شہزادے! آخر تم آ ہی گئے! مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی ہے۔ کہ وہ شہزادہ ادھر آنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ شاید یہ بھی ممکن ہے۔ کہ بادشاہت چھن جانے کی وجہ سے اس نے شکار کھیلنا ہی چھوڑ دیا ہو۔ اور آجکل کے بادشاہ شہزادوں یعنی نئے دور کے نوابوں کا تو اور بھی پتلا حال ہے۔ جب سے یو پی میں زمینداری ٹوٹ گئی ہے۔ بے چارے نوکری کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں۔ اب ان کو ان حسین لغویات کی فرصت کہاں!؟!

کبھی ہوا کبھی تیز ہو کر آ کر اس کے گالوں کو بار بار اپنی ٹھنڈی انگلیوں سے چھوتی، اس کے بکھرے ہوئے بالوں کو چھیڑتی اور پھر کمرے کے سارے پردوں کو ہلاتی ہوئی دوسری طرف نکل جاتی۔ اس روز اتوار تھا۔ سڑک خاموش تھی۔ وہ بھی چپ تھی۔ اور دریچے سے باہر سڑک کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے سناٹے کی دھند میں گم ہواؤں کی صدا بڑے غور سے سن رہی ہو پھر دھیرے دھیرے بیتے دنوں کی یاد نے اس کو اپنے اندر دبا لیا۔ بہت سی آوازیں، ایک دوسرے سے مختلف، محبت سے بھرے ہوئے چہروں کے خد و خال ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو کر اس کے سامنے سے گذرنے لگے۔ اس نے ان کو بے اختیار روکنا چاہا، میری گذری ہوئی زندگی کی یادو! ذرا تم جاؤ بس چند لمحوں کے لئے رک جاؤ میں آج تمہیں اپنے سینے سے لگانا چاہتی ہوں۔

پھر اس کے ذہن کی آنکھوں کے سامنے تین تصویریں ابھریں۔ یہ تینوں ہی اس کی اپنی تصویریں تھیں۔ پہلی تصویر اس وقت کی تھی۔ جب وہ ہائی اسکول کی چھوٹی جماعتوں میں پڑھتی تھی۔ اور اس پر دھنک کے رنگ کے انوکھے خواب اترتے تھے۔ اور دنیا کی ہر چیز پر ایک موہوم سا سنہری جال پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔ دوسری تصویر اس زمانے کی تھی۔ جب وہ بی اے میں پڑھتی تھی اور عمر کے سولہویں سال کی شیریں سنجیدگی نے کئی قدم آگے رکھ دئیے تھے۔ اور اس کو یہ گمان ہو چلا تھا جیسے اب دنیا خوابوں سے نکل رہی ہو۔ اور انسانی خیالات حقیقت کی ٹھوس دیواروں سے ٹکرا رہے ہوں۔ تاہم وہ ہمیشہ ایک سنہرے امید کے سہارے آگے بڑھتی رہی کہ آئندہ کچھ نہ کچھ بہتر ضرور ہو جائے گا۔ اور تیسری تصویر حال ہی کی تھی۔ اس کو ایم اے پاس کئے ہوئے کئی سال بیت گئے تھے۔ اس نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی تھی۔ اس کے سارے خواب ٹوٹ کر مٹی میں مل گئے تھے۔ اور وہ سوچتی تھی۔ کہ یہ کیا ہو گیا۔ یہ بات یوں کیوں ہوئی یوں کیوں نہ ہوئی۔ وہ اپنے چاروں طرف کی ہر چیز کو بڑی بیزار نگاہوں سے دیکھتی اور ہر چیز میں کچھ نہ کچھ کمی محسوس کرتی۔

اس نے اپنی پہلی تصویر کو غور سے دیکھا۔ کچھ دھندلی لکیریں نمودار ہوئیں۔ کچھ مٹے مٹے سے نقوش اس کے سامنے آئے اور وہ اپنے بچپن کی پرانی دنیا میں پہنچ گئی۔ اس نے تھوڑی دیر کے لئے ایسا محسوس کیا۔ جیسے ساری سڑکیں، ساری شاہراہیں اسی دنیا کی طرف بھاگی جا رہی ہیں۔ جس کو وہ بہت

چھوٹی سی دنیا تھی وہ نہایت ہی حسین اور آباد تھی۔ لیکن اب اس کے گزرے پڑے کھنڈر صرف اس کی یادوں میں رہ گئے تھے۔ بالکل ویسی ہی تھی۔ اس میں رہنے والے کتنے اچھے تھے۔ ان کے خیالات کتنے معصوم تھے۔ بچپن کی اس دنیا میں رہتے ہوئے ایسا لگتا جیسے سارے لوگ قوس قزح کے جھولے میں جھول رہے ہوں۔ کتنے دن کتنے مہینے اور سال اس خوبصورت جھولے میں جھولتے گزر گئے۔ اس کو ٹھیک ٹھیک یاد نہیں تھا۔ بالکل بھی یاد نہ تھا۔ کہ وہ بہت سے خوبصورت دن اور خوبصورت راتوں کا ایک طویل سلسلہ تھا۔ البتہ کبھی کبھی ایسا ہوتا کہ اس کے دل کے نہاں خانوں میں اس کے اسکول کے سالانہ جلسوں کی یاد گونج گونج جاتی اور وہ زندگی کے چند لمحات خوشی کے سائے میں گزار لیتی۔ اسکول سے کتنے سہانے دن تھے۔ سب لڑکیاں اس سالانہ جلسے کا انتظار بڑی بے چینی کے ساتھ کرتیں۔ جس کو "اسکول ڈے" کہا جاتا تھا۔ اس روز تمام لڑکیوں کو بڑی معصومیت کے ساتھ یقین آجاتا کہ یہ زندگی تمام تر کھیل کود، ہنسی ٹھٹھا اور ننھی منی مسرتوں سے بھری ہے۔ اور جیسے ساری دنیا پر بچوں کا راج ہے۔ بس اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ یہ تو اسکول کی دنیا کا حال تھا۔ اس کے گھر کی چھوٹی سی دنیا تو اور بھی اچھی تھی۔ ماں باپ، بھائی بہن کا پیار، کتنی بڑی نعمتیں تھیں یہ۔ اس کے علاوہ اس کے بڑے بھائی سے ملنے کیسے کیسے لوگ ملنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ ان سب کی متفقہ طور پر یہ رائے تھی کہ امتیاز جیسی بہت اچھی لڑکی ہے۔ وہ سب اس کے گھر روز آتے اور ان میں سے کچھ ایسے بھی تھے۔ جو دوسروں کی آنکھیں بچا کر اس کی بڑی آپا کے پاس نہ جانے کیا کیا تحفے تحائف بھیجا کرتے۔ آخر کیوں؟ ——— آخر کیوں؟ وہ اکثر سوچتی لیکن بہت دور تک سوچ نہ پاتی۔ ان سب کے علاوہ اس کے ہاں سندیلہ کا ایک لڑکا آیا کرتا تھا۔ جو امی کا دور کا رشتہ دار بھی ہوتا تھا۔ اس کا نام عمر تھا۔ یا اس سے عمر میں وہ ایک سال بڑا۔ شاعر تھا۔ اور تنہا تخلص کرتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ آئندہ وہ ایک بہت بڑا شاعر ہونے کا ارادہ رکھتا ہے۔ بہت بڑا شاعر اتنا بڑا کہ بس۔۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ ہاتھ اٹھا کر اس کو اس طرح بتاتا کہ ہم شاعر نہیں بلکہ ایک بڑا دیو ہیکل انسان ہونے والا ہے۔ وہ بڑا ہی شرارتی تھا۔ اور بات بات پر اس کو خوب خوب چھیڑا کرتا۔ جب کبھی وہ کتاب لے کر پڑھنے بیٹھتی تو وہ بہت دبے دبے قدم رکھتا ہوا اس کے پاس چپکے سے آکر کہتا۔

"ہلو گڑیا! کیا کر رہی ہو؟"

اور وہ اس کے مخل ہونے پر منہ بگاڑ کر جواب دیتی۔

کیا تمہاری آنکھیں پھوٹ گئی ہیں۔ دیکھ تو رہے ہو۔ کہ اسٹڈی کر رہی ہوں۔

"آپ اور اسٹڈی! کیا دماغ پھر گیا ہے آپ کا؟" وہ اس کو اور چھیڑتا۔ تب وہ ذرا اکڑ کر جواب دیتی۔

نہیں تو اور کیا! اس سال میں اپنی کلاس میں ٹاپ کرنے کا ارادہ رکھتی ہوں، آپ کا خیال شریف میں؟

"جی ہاں! بڑا نیک خیال ہے۔ لیکن پہلے ذرا اپنی شکل تو آئینے میں دیکھ لیجئے۔ یہ منہ اور مسور کی دال!" وہ جملہ ختم کرنے کے بعد اپنی زبان منہ سے باہر نکال کر گردن ذرا جھکا دیتا۔

اس پر وہ سچ مچ خفا ہو جاتی اور چلا کر کہتی۔

"کچھ نہیں! تم سارے لڑکے ہم لڑکیوں کے ٹاپ کرنے سے جلتے ہو۔" اور وہ رو ہانسی ہو جاتی۔ اس پر ان دونوں کے درمیان مرد و عورت میں کون برتر ہے کے موضوع پر اس قدر زور دار بحث چھڑ جاتی اور وہ دونوں اپنے طفلانہ معروضات ایک دوسرے کے سامنے اس طرح رکھتے کہ سننے والوں کو بے تحاشہ ہنسی آجاتی۔

یکایک ہوا کا ایک تیز جھونکا کمرے میں شور مچاتا ہوا داخل ہوا اور دریچوں کے سارے پٹ آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اس طرح چلانے لگے۔ کہ اس کے خیالوں

کی دوشیزگی بھی رہا کہ وہ کچھ دیر تک اپنے بچپن کی خوبصورت دنیا میں بھولا بھولی رہی تھی۔ دفعتاً تراخ سے ٹوٹ گئی۔ اور دھڑام سے پھر سی دنیا میں آگری جو بچپنے کی ... بڑی ہے۔ باب ... کا نام ہی نہیں لیتی۔ کہاں گئے بچپن کے یہ معصوم خیالات کے پراسرار محل۔ کہاں گئے وہ سارے جگمگ جانتا رہ نے ... زندگی کے راستے روشن تھے۔ کوئی بتائے کہ وہ ساری باتیں کہاں کھو گئی ہیں۔ . . . . ؟

سامنے ... کی ایک ... کی طرف سے ذنّاٹے کے ساتھ آئی اور سڑک کا سینہ چیرتی، پانی کے چھینٹے اڑاتی ہوئی دھن کی جانب نکل گئی۔ اس ... کو پھیکا۔ وہ بے ساختہ ہی تیزی کے ساتھ ویمنس کالج کے موڑ سے گھوم کر دارٹ رو ڈ کی طرف نکل گئی۔ کار تو نظروں سے اوجھل ہو گئی لیکن ... نہ سکے ... اس کی نظریں ویمنس کالج کے در و دیوار سے جا لگیں۔ اسی وقت کامن روم کے چھت پہ لگے ہوئے ریڈیو کے ایریل کے تار پہ ایک چیل ... کہاں سے اڑتی ہوئی آکر بیٹھ گئی۔

تب کا ایک ایک ... لگا۔ جیسے اس کے وہ سارے دن ایک ساتھ مل کر آواز دے رہے ہوں۔ جو اس نے ویمنس کالج میں گزارے۔

وہ ایک عجیب سی دنیا تھی ——— کالج کی دنیا ——— اسکول کی دنیا سے نکل کر کالج کی دنیا میں آجانا ایسا ہے جیسے کوئی دھندلکوں سے نکل کر اجالے میں آجائے۔ جیسے کوئی آنکھیں چکا چوند کر دینے والے خواب دیکھتے دیکھتے حقیقت کو پالے۔ وہ ایک عجیب سی دنیا تھی ——— چھوٹی سی محدود سی دنیا۔ . . جس کے چاروں طرف "حرم" کے پاسبانوں نے فصیلیں کھینچ رکھی تھیں۔ وہ دنیا صرف لڑکیوں کی دنیا تھی ——— مختلف شکل، رنگ اور ذہن کی لڑکیاں۔ بڑی لڑکیاں، چھوٹی لڑکیاں ... بھی لڑکا نہیں۔ اس کا سایہ بھی نہیں۔

جب وہ پہلے پہلے کالج کی اس نئی دنیا میں داخل ہوئی تو وہاں کی ہر چیز نے اس کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ وہ ہر چیز سے مرعوب ہو گئی۔ عمر کی جس سرحد پر وہ کھڑی تھی، وہاں بچپن اور جوانی گلے مل رہے تھے۔ اور اس کے من میں نئی نئی امنگوں کی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔ کالج کی اس خوبصورت سی نرالی دنیا میں رہنے والی تقریباً ہر لڑکی کا یہی حال تھا۔ وہاں کی ہر لڑکی وہی ایک لڑکی تھی۔ جس کو احمد عباس نے کئی سال پہلے ایک لڑکے سے گھنٹہ گھر کے پاس ملنے کا وعدہ کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہاں کی ہر لڑکی وہ ... بھی تھی۔ جس کو عصمت چغتائی نے سمجھا اور دوسروں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ وہ سب بڑی اچھی لڑکیاں تھیں۔ ان کی باتیں بڑی خوبصورت اور خواب بہت سہانے۔ غضب ہی خواب۔ کبھی کبھی تو ایسا معلوم پڑتا۔ کہ وہ کالج نہیں ہے۔ بلکہ ایک بہت بڑی سی خواب گاہ ہے۔ جہاں ہر لڑکی کوئی نہ کوئی خواب دیکھ رہی ہے۔ بہت سی لڑکیاں ایسی تھیں۔ جو سوتے جاگتے یہ خواب دیکھ رہی تھیں کہ آئندہ وہ فلم ایکٹرس بن جائیں گی۔ آخر نرگس، مینا، نادرہ، مینا اور نگار بھی تو ان سے پہلے اسی کالج میں رہ کر یہی خواب دیکھ چکی تھیں۔ وہ بھی اسی کالج کی پیداوار ہیں۔ تو ان کے لئے یہ کون سی ناممکن بات تھی۔ بہت سی لڑکیاں ایسی تھیں۔ جو یہ خواب دیکھتی تھیں کہ ان کی شادی کسی بڑے افسر سے ہو جائے گی۔ اور پھر آرام سے وہ اپنی نفیس کاروں میں بیٹھ کر سیر کریں گی۔ کلبوں میں جائیں گی۔ بڑے بڑے جلسوں میں انعامات تقسیم کریں گی۔ اور سوسائٹی میں ہر طرف ان کو لوگ عزت کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور بہت سی لڑکیاں یہ خواب دیکھتی تھیں کہ ان کو کوئی نہایت شاندار جسم کا ہیرو ٹائپ لڑکا چاہ رہا ہے۔ اور وہ دن رات حسین خیالوں کے ہالے میں کھوئی رہتی تھیں۔ اور وہ اپنے بالوں کو اینگلو انڈین لڑکیوں کی طرح جھاڑی کی شکل میں بنا کر رکھتیں۔ ایک ہی رنگ کا بلاؤز، ساڑی، سینڈل ... اور نت نئے فیشن کے کپڑے بھی پہنتیں جس سے ان کے جانے تک ... ملتی تھی۔ اور وہ سامنے کالج میں بہت ہی فیشن ایبل لڑکیاں گنی جاتی تھیں کچھ لڑکیوں پرنسپل بننے کا بھوت سوار تھا۔ وہ موٹی موٹی کتابیں پڑھتی تھیں ... کل جب صبح کو وہ سو کر اٹھیں گی۔ تو ان کو یہ دنیا بدلی ہوئی ملے گی۔

... بھی ان ہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس کے بھی وہی خواب تھے۔ جو ان ساری لڑکیوں کی آنکھوں میں ناچ رہے تھے۔ اس کے خیالات میں بھی ... دھنک پھیلی ہوئی تھی۔ جو ساری لڑکیوں کو بیخود رکھتی تھی۔ وہ خواب دیکھتی تھی ——— اونچے ترانے، بانکے اور سنہری خواب

وہ جیسے ہی ایک خواب دیکھ چکتی تو دوسرا خواب دیکھنے لگتی۔ کبھی وہ خواب دیکھتی کہ وہ چاند تاروں کی دنیا میں پہنچ گئی ہے۔ لیکن آنکھ کھلتے ہی جب اپنے آپ کو اسی دنیا میں پاتی تو اس کی آنکھوں میں کچھ اسی قسم کے دوسرے خواب جھلملانے لگتے۔

وہ یوں ہی خواب دیکھتی رہی۔

ایک سال، دو سال، تین سال، اب وہ بی اے کے آخری سال میں تھی۔ اور بی اے پاس کرتے کرتے اس نے محسوس کیا کہ خواب چاہے کتنے ہی حسین ہوں، کتنے ہی تابناک ہوں۔ پھر بھی خواب ہیں۔ ان کی حقیقت ایک مبہم سے سایہ یا دھبے سے زیادہ ہرگز نہیں ہوتی۔ خوابوں کے جال ٹوٹتے دیر نہیں لگتی اور جب حقیقت کے چہرے سے پردہ سرک جاتا ہے اور انسان خوابوں کی دنیا سے نکل جاتا ہے۔ تو اس کو بڑی مایوسی ہوتی ہے۔

اور جب اس نے حقیقت کی دیواروں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو سچ مچ اس کو بڑی مایوسی ہوئی۔ بات ہی مایوسی کی تھی۔ وہ ساری لڑکیاں جو فلم اسٹار بننا چاہتی تھیں۔ اور اس کا اٹھتے بیٹھتے خواب دیکھا کرتی تھیں۔ وہ کچھ بھی نہ بن سکیں۔ ان کو ان کا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اپنی اداکاری کے جوہر دنیا کو دکھلا سکیں۔ وہ ساری لڑکیاں جو آئی اے ایس، او پی سی، ایس ایس افسروں سے شادی کرنا چاہتی تھیں۔ ان کے سارے خوابوں کے محل آن کی آن میں زمین پر آ رہے۔ جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ سی ایس ایس افسر ہوتے ہی کتنے ہیں۔ اور جو ہوتے بھی ہیں۔ وہ بھلا ان لڑکیوں سے شادی کیوں کرنے لگے۔ اور پھر زندگی سے تنگ آ کر وہ لڑکیاں یا تو دو سو روپے پر بی ایڈ، بی ٹی کرنے کے بعد کسی اسکول میں استانی ہو جاتی ہیں۔ اور ہر جماعت کی لڑکیوں سے اپنا دماغ لڑاتی ہیں اور جھک مارتی ہیں یا کسی کلرک یا کسی تھرڈ گریڈ لکچرر سے شادی کر کے زندگی بھر کے لئے بور ہو جاتی ہیں۔ اور وہ لڑکیاں جو فیشن کی دلدادہ تھیں۔ اور اپنے محبوبوں کے لئے سجنے کو نت نئے فیشن اختیار کرنے والی تھیں ان کا حال تو اور بھی برا ہوا۔ پہلے تو ان کو محبوب ملے ہی نہیں۔ دوسرے جب یہ معلوم ہوا کہ سارے فیشن جو اپنی ایجاد سمجھتی تھیں وہ ہرگز ان کی ایجاد نہیں تھے۔ اب ان بیوقوف لڑکیوں کو کون بتائے کہ یہ سب فیشن کی کرشمہ سازیاں سرمایہ داروں کے معمولی ہتھکنڈے ہیں۔ وہی (consumer's soeragnity.) کو کنٹرول کرتا ہے۔ اور ساری انٹلکچول لڑکیوں کو یہ معلوم کر کے کتنا دکھ ہوتا ہے کہ کتابوں کی دنیا کے علاوہ بھی ایک دنیا ہے۔ بہت لمبی چوڑی اور یہ دنیا بہت مشکل سے بدلے گی۔ اور ان سے کوئی شادی کرنے کو شاذ ہی تیار ہو، کیوں کہ ان سے شادی کرنا کتابوں سے شادی کرنا ہے۔

تو یہ تھیں وہ ساری لڑکیاں اور ان کے ٹوٹے ہوئے سہانے خواب یہ تھیں وہ ساری سلمائیں، ریحانائیں اور شہنازیں جن کو ان کے خوابوں کی تعبیر نہ مل سکی، جن کے دلوں میں آرزوؤں اور تمناؤں کا دیا ٹمٹما کر بجھ گیا۔ اور وہ کچھ بھی نہ کر سکیں۔ وہ ساری لڑکیاں کچھ نہ کر سکیں جو اپنی زندگی میں جانے کیا کیا کرنا چاہتی تھیں۔ وہ نجمہ بھی کچھ نہ کر سکی جس کو موسیقی سے انتہائی شغف تھا۔ وہ شہلا بھی کچھ نہ کر سکی۔ جو مصور بننا چاہتی تھی۔ اور خالدہ جو شاعرہ بننا چاہتی تھی۔ وہ بھی کچھ نہ بن پائی۔ نجمہ کے ہاتھوں سے ستار چھین کر پھینک دیا گیا۔ شہلا کا برش توڑ دیا گیا۔ اور خالدہ کی ساری ہوائی نظمیں کالج کی چہار دیواری میں گھٹ کر رہ گئیں۔ وہ سب مجبور تھیں۔ وہ کیا کرتیں۔ نجمہ نے کہیں شادی کر لی اپنے ماں باپ کی مرضی سے، اور پانچ لڑکیوں کی ماں بن گئی۔ شہلا کا برش ٹوٹ گیا۔ تو اس کا دل بھی ٹوٹ گیا۔ اور وہ بھری جوانی میں اپنی شاہکار تصویریں بنائے بغیر اپنی آرزوئیں لئے مر گئی اور خالدہ بیچاری نے شاعری چھوڑ دی اور بڑی کوششوں کے بعد ایک معمولی سے لڑکیوں کے مدرسے میں معمولی سی تنخواہ پر ملازم ہو گئی۔ لیکن یہ دنیا کیسی ہے۔ جہاں انسان جو کچھ چاہے وہ نہ کر سکے۔ اس کے فطری جوہر کھلنے نہ پائیں۔ اس کی آرزوؤں کا گلا دبا دیا جائے۔ یہ دنیا کیسی ہے؟ یہ دنیا کیوں ایسی ہے کوئی بتائے؟۔

وہ بھی ان ہی لڑکیوں میں سے ایک تھی۔ اس کی بی اے پاس کرنے کی تمام پونجی تھی بھی کیا۔ چند بیکار دن، کچھ ادھورے سپنے

کر گیت گانے کی عادی تھی۔ لیکن نادم سی، کچھ مسکراہٹیں جنہیں وہ اپنے ہونٹوں پر بکھیر سکتی تھی اس کی ٹریجڈی تھی۔ یہاں ساری لڑکیوں کی ٹریجڈی تھی۔ یا اس معاشرے کی ٹریجڈی تھی۔ جس کی وہ پیداوار تھی۔ وہ نظام، وہ معاشرت ہی خراب تھی۔ جس میں وہ رہتی تھی۔

وہ چپ چاپ کھڑکی میں یوں ہی کھڑی تھی۔ اور باہر پھیلی ہوئی کائنات کو دیکھ رہی تھی۔ اور سوچے چلی جا رہی تھی۔ گویا آج ہی وہ سب کچھ سوچ کر ختم کر دے گی تاکہ اس کے لئے کچھ بھی سوچنے کو باقی نہیں رہ جائے گا۔ اتنے میں اس کی کھڑکی کے دریچے کے نیچے سے گزری وہ بہت لہک لہک کر گاتی ہوئی جا رہی تھی "چھن چھن چھن چھن پائل باجے۔ کیسے جاؤں پی سے ملن کو۔ لاج کی ماری مروں کون جتن کر۔ رام ماما! چھن چھن ...... " وہ میس کے ناشتے کے لئے ... جا رہی تھی۔ وہ باہر دیکھتی گاتی ہوئی دور نکل گئی۔ دیر تک لڑکی کے گھنگھرؤں کی جھنکار سے اتنا خوف لگتا ہے۔ تو اس کو اتار کیوں نہیں پھینک دیتی۔ (اس نے سوچا) وہ یونیورسٹی کے بانا سکی طرف چلی گئی۔

یونیورسٹی کا خیال آتے ہی اس کے سامنے اس کی زندگی کے وہ دو سال آگ فرش کی طرح بچھ گئے۔ جو اس نے وہاں گزارے تھے۔ یونیورسٹی کے سارے سائے پھیلے ہوئے چند اور اونچے کھمبوں والی عمارتیں اس کو اپنی طرف بلانے لگیں۔ اور اس نے اپنی یونیورسٹی کی زندگی کے متعلق سوچنا شروع کیا۔ دو سب ویمنس کالج کی چہار دیواری سے نکل کر یونیورسٹی میں داخل ہوئی تھی۔ تو اس کو عجیب سا لگا تھا۔ یونیورسٹی کی دنیا بھی اس کے لئے ایک نئی دنیا تھی۔ وہاں صرف ایم اے کے کلاس ہوتے تھے۔ اور ساتھ لڑکے بھی پڑھتے تھے۔ لیکن لڑکیوں کی دنیا میں رہ کر لڑکوں کی اس دنیا میں آکر وہ ہر بات میں کافی جھجک محسوس کرتی تھی۔ ہر طرف لڑکے، بہت سارے لڑکے۔ اور لڑکیاں بس گنتی کی چند اور پھر ہر ہر قدم پر یونیورسٹی کے نافذ کردہ اصولوں کی پابندی۔ اس راستے سے آؤ، اس راستے سے جاؤ۔ یہاں خالی گھنٹوں میں بیٹھو۔ اس کو یہ قانون اور ضابطے سخت برے لگتے کیونکہ ان ہی پر چلتے چلتے اس کی زندگی بیت گئی تھی بچپن سے لے کر بی اے پاس کرنے تک ساری سختیاں اور ڈسپلن اس نے جھیلے تھے۔ اور یہاں یونیورسٹی میں آکر بھی ان سے چھٹکارا نہیں ملا تھا۔ وہ پہلے ہی سے اپنے آپ سے مایوس تھی۔ کیونکہ اس کے سارے خواب ٹوٹ چکے تھے۔ لیکن وہ ایک ہلکی سی آس لئے ایم اے کرنے چلی آئی تھی۔ جس سے شاید اس کے بگڑے ہوئے کام بن جائیں۔ شاید اس کی زندگی کوئی نئی کروٹ لے اور اس کی مردہ شدہ تمنائیں جنم لے سکیں۔ لیکن یہاں بھی کچھ نہ ہو سکا۔ وہاں جتنے لڑکے تھے۔ سب لڑکیوں کے بھوکے۔ تمام استاد صرف چند ایک کو چھوڑ کر، لڑکیوں کے بھوکے ہونے تھی مہربانیاں ہوتی ہیں۔ لڑکے کہتے ہم سے یہ نوٹس لے لو استاد کہتے ہم سے اپنے گھر پر بلا کر پڑھ لو بہت سے لوگ جو اس سے بہت پہلے اسی مضمون میں ایم اے کر چکے تھے اور اب اسی مضمون کے لیکچرار ہو گئے تھے۔ اس کے پاس روز ہی آتے اور نہایت مہربانی کے ساتھ پیش آتے اور کہتے کہ ہمارے ایم اے کے سارے نوٹس لے لو۔ تم کو یقیناً "فرسٹ کلاس" مل جائے گی۔ اور نجانے کیا کیا۔ ارے بھئی کیوں لے لیں ہم تمہارے نوٹس کیا ہم خود اپنے نوٹس نہیں تیار کر سکتے۔ کیا ہم نرے چغد ہیں۔ ہمارے دماغ میں عقل نہیں ہے۔ لیجائیے اپنے نوٹس مہربانی کر کے۔ وہ اپنا دانت پیس کر کہتی اور سوچتی کہ یہ مرد بھی کتنے غیر ذمہ دار قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ یوں تو ایک طرف یہ فرماتے ہیں۔ کہ عورتیں اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جائیں۔ اور اپنے آپ پر بھروسہ کریں۔ اور زندگی کی ہر راہ میں آگے بڑھیں لیکن خود عورتوں کو تقریریں لکھ کر دیں گے جنہیں رٹ کر وہ طوطے کی طرح جلسے میں بولیں ان کے نام سے خود مضامین لکھ کر رسالوں میں چھپوا دیں گے۔ وہ جب اپنے کالج کی میگزین کی ایڈیٹر ہوئی تھی۔ تو اس کو کوئی بھی کام نہیں کرنا پڑا تھا۔ سارا کام اس کے بھائی کے ایک دوست نے جو یونیورسٹی میں لیکچرار تھے کر دیا تھا اور نام اس کا ہوا تھا۔ اسی وجہ سے وہ مردوں سے سخت خوف کھاتی تھی اور ان سے بچنے کی کوشش کرتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ کہ یہ مرد لڑکیوں کو بدنام کر دیتے ہیں۔ اور لڑکیاں بے چاری مردوں کی بنائی ہوئی اس دنیا میں بے بس اور لاچار ہوتی چلی گئیں۔

اس نے یونیورسٹی میں دو سال تک پڑھا۔ اس درمیان میں اس کی زندگی میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ صرف اس کا ایک ہم جماعت عاشق تھا کہ اس کو مزید جاننا چاہتا اس کو ہر قدم پر متاثر کرنا چاہتا تھا اور اس کے سامنے ہی آنے کی کوشش کرتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ایک مرتبہ اس کو اس کی کچھ ساتھی لڑکیاں ایک ادبی جلسے میں لے گئی تھیں، جہاں اس کو کچھ بڑے بڑے ادیبوں سے ملنے کا موقع ملا۔ وہ جلسہ اس کے لئے دلچسپ تھا۔ کیونکہ وہی ایک جلسہ تھا جس میں وہ گئی ورنہ وہ جلسوں سے بھاگتی تھی۔ اور اس کی اس حرکت پر اس کی ساتھی لڑکیاں کہتیں۔ کہ آہستہ آہستہ یہ بھی دن بدن فلسفی ہوتی جا رہی ہے۔

یونیورسٹی کے وہ دو سال بھی گزر گئے۔ کالج کے دنوں میں اس کو جو اپنی دنیا سے چڑ ہو گئی تھی۔ اس کو اس دنیا کی غلط فہمیاں دور ہونے سے نفرت ہو گئی تھی وہ اب اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس لئے کہ جب وہ ایم اے میں داخل ہوئی تھی۔ تو اس کو پوری امید تھی۔ کہ ایم اے کرنے کے بعد اس کو کسی اچھے سے کالج میں یا کہیں اور کوئی بڑی جگہ مل جائے گی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس نے بہت ہاتھ پیر مارے بہت سفارشیں کرائیں تب جا کر وہ ایک مقامی پرائیویٹ کالج میں ڈیڑھ سو روپے پر لیکچرار ہو گئی۔ اس نے اس کو غنیمت جانا کیوں کہ اس کی دوسری ساتھی لڑکیاں ابھی تک بیکار تھیں اور اس تلاش میں تھیں۔ کہ اگر نوکری نہیں ملتی تو کم سے کم شادی کر کے اپنا معاشی مستقبل تو محفوظ کر لیں۔

ملازمت مل جانے کے بعد اس نے ذرا اطمینان کا سانس لیا۔ چلو اگر کچھ نہیں ہوا۔ تو اتنا ہی کیا کم ہوا کہ آئے دن کی دوڑ دھوپ اور الجھن اور پیسے کی پریشانی ذرا کم ہوئی۔ اس کو ایسا محسوس ہوا کہ جیسے اب زندگی میں کچھ ٹھہراؤ پیدا ہوا۔ کچھ سکون نصیب ہوا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو چھوڑ کر اب کچھ بڑی گمبھیر باتوں کی طرف جھکنے کا جی چاہتا ہے۔ جی تو یوں ہی چاہتا ہے۔ اس کا تو کام ہی ہے۔ کہ ہمیشہ کچھ نہ کچھ چاہے جاؤ۔ لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ انسان اس کے دھوکے کھاتا ہی رہے؟ اور کبھی کبھی تو وہ سوچتی کہ ٹیلیفون کی بجتی ہوئی گھنٹیوں، موٹروں کی تیزی سے بھاگتی ہوئی کاروں، مشینوں اور کارخانوں اور پانچ سالہ پلانوں کے ملک میں بھلا کس کو فرصت ہے کہ وہ بڑے بڑے مسائل پر غور کرے۔ آخر جاننے والے ہی کر سکتے کیا ہیں؛ یہی نا کہ ملک اور عوام کے بڑے بڑے مسائل پر اتنے ہی بڑے پیمانے پر سوچ بچار۔ تاہم کچھ باتیں ایسی تھیں جن کی طرف اس کا دھیان چلا ہی جاتا۔

ان سب باتوں میں سب سے اہم بات یہ تھی۔ کہ آخر اس زندگی کا انجام کیا ہے۔ جو اس قدر بے مصرف اور بلا وجہ ہے۔ وہ اپنے ماحول سے کچھ اس طرح مایوس اور بیزار تھی۔ کہ کبھی کبھی تو اس کے من میں آتا۔ کہ کاش یہ دنیا ایک گیند ہوتی جس کو وہ شدت سے ٹھوکر لگا کر پامال کر دیتی وہ خوشی کی تلاش میں تھی۔ جس کا اس کی زندگی کی شاہراہ میں کوسوں کوئی پتہ نہیں تھا اس نے اس کو تلاش کرنا شروع کیا۔ اس نے ہر وہ کام کیا جس میں اس کی تھکی ہوئی آتما کو خوشی مل سکے۔ اس نے ناول پڑھنا شروع کیا۔ گھنٹوں ریڈیو کے پاس بیٹھی رہتی ہر قسم کا کنسرٹ سنتی، سینما دیکھنے جاتی۔ لیکن سب بے سود۔ اس کی ماں نے اس سے کہا کہ شادی کر لو۔ لیکن کس سے؟ یہ نہیں معلوم۔ اس کی ماں سمجھتی تھی۔ کہ کوئی نہ کوئی لڑکا اس کی نگاہ میں ضرور ہو گا۔ لیکن لڑکے کا نام آتے ہی اس کی زبان پر یہ شعر۔

یہ مل رہی ہے مرے ضبط کی سزا مجھ کو!
کہ ایک زہر سے لبریز ہے شباب مرا

آ جاتا اور وہ شادی کے مسئلے پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنے لگتی۔ وہ شادی کرے۔ لیکن اس سے بڑی ایک بہن بھی تو ہے جس کی شادی اس سے پہلے ہونی چاہیے۔ لیکن اس کی شادی نہیں ہوتی۔ وہ اس سے عمر میں دو سال بڑی تھی۔ لیکن جب اس کے ماں باپ اس کی شادی لگاتے تو لڑکے والے اس قدر کثیر رقمیں مانگتے کہ ان کی ہمت چھوٹ جاتی۔ دو ایک جگہ کچھ سستے رشتے ملے تو اس کی بہن نے خود انکار کر دیا۔ یہ بھی کیا کہ لڑکی کو

بن اور لڑکا دسویں فیل اور اس کی بہن بھی اب اپنی شادی سے مایوس ہو چکی تھی۔ ابھی اس روز اس کی خالہ جان اس کے گھر آئی تھیں۔ اس کی بہن نے ان کو سلام کیا۔ انہوں نے دعا دی کہ خدا کرے تیری جلدی سے شادی ہو اور لڑکے بالے ہوں۔ تو اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے کہا کہ خالہ جان اب شادی کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔

اور پھر آجکل کے لڑکے بھی الٹی سمجھ کے ہوتے ہیں۔ ان کو ایسی بیویاں پسند آتی ہیں جو نہ ہی گھریلو ہوں۔ یہ بھی خوب رہا۔ کہ وہ لڑکی جو نئی تعلیم کے اثر سے باہر نکل گئی تھی۔ اس سے پھر گھر گرہستی کرانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے یونیورسٹی میں کچھ لڑکیوں نے بی اے کے ساتھ امور خانہ داری کے مضامین پڑھنے شروع کر دیئے تھے۔ اور سینٹ، مانہ ایم اے اردو کو طاق پر رکھ دیا تھا۔ اور وہ لڑکی جس کا نام سعیدہ تھا کتنی محنت سے پیاری پیاری سویٹر بنا کرتی تھی۔ کیونکہ اس کے منگیتر نے یہ کہہ دیا تھا کہ جب تک وہ انگریزی میں ایم اے نہیں کر لے گی وہ ہرگز اس سے شادی نہیں کرے گا اور نسیم اقبال نے اپنے پردوں میں گھر گرہستی باقاعدہ کرنا چاہا مرت اس لئے سیکھنا شروع کیا تھا۔ کہ اس کا ہونے والا شوہر کچھ دن شانتی نکیتن میں رہ چکا تھا اور اس کو ناچ سے دلچسپی تھی۔ اس کی کچھ سہیلیاں ایسی بھی تھیں۔ جو پہروں بن سنور کر کلب میں اس طرح جاتی تھیں۔ پوری طرح مسلح ہو کر ———

آج وہ سب کچھ جیت لیں گی۔ اور سب کو قابو میں کر لیں گی۔ لیکن ان کو دیکھ کر کوئی ایسے لڑکے چونک پڑتے اور کہتے کہ یہ سب لڑکیاں شادی ہونے پر زیادہ تر بے ڈھنگی بیویاں بن جائیں گی۔ اور شادی سے پہلے تو یہ سب اتنی آزاد ہیں۔ اس کے بعد ان کا کیا حال ہوگا۔ اور یہ سب کچھ دیکھ کر وہ یہ سوچتی کہ ان پڑھی لکھی لڑکیوں سے بی اے اور ایم اے پاس لڑکیوں سے تو کسی حد تک وہی لڑکیاں بہتر ہوتی ہیں۔ جن کی تعلیم میرے سرتاج سلامت رہو تک محدود ہوتی ہے۔ لیکن عورت ذات بھی بڑی وہ ہوتی ہے کبھی جب وہ شادی کے معاملے میں بغاوت پر اترآتی ہے۔ تو اندھی ہو کر اپنے ڈپٹی کلکٹر باپ کے ڈرائیور تک سے شادی کر کے اپنے سماج کا منہ چڑاتی ہے۔ کبھی وہ شادی کے معاملے میں لڑکوں کو بیوقوف بناتے بناتے اس طرح بیوقوف بن جاتی ہے کہ تمام زندگی انتقاماً شادی ہی نہیں کرتی۔

اس کو چند باتوں سے خاص چڑ تھی۔ مثلاً یونیورسٹی کی تعلیم جو انسان کو بالکل ناکارہ بنا دیتی ہے۔ وہ اس سے فارغ ہونے والوں کو غلط قدم اٹھانا سکھا دیتی ہے۔ وہاں کوئی یہ نہیں بتاتا کہ زندگی کا آرٹ دنیا کے ہر آرٹ سے زیادہ اہم ہے۔ بلکہ وہاں یہ بتایا جاتا ہے کہ زندگی صرف کھانے کمانے کا نام ہے۔ جھوٹی قدروں کے پاس کا نام ہے۔ اور علم اس چیز کا نام ہے۔ جو انسان کی زندگی میں کام نہ آسکے۔ وہ جب یونیورسٹی کے اونچے میناروں کی طرف دیکھتی تو اس کو خیال آتا کہ ان کی اونچائی ہماری تعلیم کی کم مایگی کی گہرائی کا نشان ہے۔ وہ جب اپنی سہیلیوں کو جوائس اور ٹیلے کی ناولوں کو پڑھتے دیکھتی تو اس کو بے حد افسوس ہوتا۔ کیونکہ وہ ان کو بغیر سمجھے صرف اپنی لیاقت کے اظہار کے لئے پڑھے جاتی تھیں۔ اور جب کبھی وہ کچھ لڑکیوں کو شوقیہ طور پر نفسیات کی موٹی موٹی کتابیں پڑھتے دیکھتی تو منہ سے اپنے آپ ہی نکل جاتا۔ اللہ! یہ لڑکیاں ان موٹی موٹی "تندرست" کتابوں کو پڑھ کر کن بیچارے شوہروں کا نفسیاتی تجزیہ کریں گی۔ اور تو اور یونیورسٹی میں جو اشتراکی خیال کی لڑکیاں تھیں۔ وہ بھی دکھاوے اور شہر کی زندگی سے نہ بچ سکی تھیں۔ اگر ایسا نہیں تھا۔ تو پھر وہ جلسوں میں جتنی مرتبہ جاتی تھیں۔ اتنی ہی مرتبہ لباس بھی کیوں تبدیل کرتی تھیں۔ وہ سیاسی پمفلٹ پڑھ پڑھ کر ڈرائنگ روموں میں بیٹھ کر انقلاب لانے کے خواب دیکھتی تھیں۔ خود اس کے گھر کا ماحول بھی اس سے نہ بچ سکا تھا۔ وہ متوسط طبقہ کی ایک فرد تھی۔ لیکن اس کے خاندان والے بلا وجہ اپنا رشتہ اونچے طبقہ والوں سے جوڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ اور ان ہی کے طور طریقوں کی نقل کرتے تھے۔ آخر ان رنگین پردوں کی کیا ضرورت تھی۔ اتنے سارے گلدستوں اور دیواروں پر سجی ہوئی اتنی تصویروں کی کیا ضرورت تھی۔ ان کے بغیر بھی تو کام چل سکتا تھا۔ اور یہ لڑکیوں کے نام انگریزی میں رکھنا بھی تو اسی طبقہ کی نقل تھی۔ مسلمان لڑکیوں کا نام روزی، ڈائمنڈ اور زولیا کیوں رکھا جاتا ہے۔ خود اس کا اصلی نام کچھ اور تھا۔ لیکن

اس کی ماں نے اس کا ایک اور نام بھی رکھ چھوڑا تھا۔ تب ہی تو اس کے مکان پر نکہت آرا ایم۔ اے کے بجائے امتیاز جبیں ایم اے کا پلیٹ لگا ہوا تھا۔

یہ سب باتیں تھیں جن کو وہ نہیں چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ انسان انسان بنے۔ دکھاوا چھوڑ دے اور زندگی سے اس چیز کو نکال دے۔ جو پیسہ کی صورت میں انسان کی چھٹی حس بنی ہوئی ہے۔ جب تک انسان کو پیسہ چھوٹے بڑے طبقات میں تقسیم کئے رکھے گا۔ تب تک یہ سب باتیں ہوتی رہیں گی۔ اور وہ کہتی رہے گی۔ کہ اے زندگی پکار۔ کہ ابھی تو بدلی نہیں ہے۔ اے زندگی پکار کہ ابھی تک تو اندھیرے میں راستہ ٹٹول رہی ہے اور صبح کا ابھی کوئی پتہ نہیں ہے۔ لیکن اس اندھیرے کے بعد اجالا ضرور ہوگا۔ جو زندگی کا نیا پیام لے کر آئے گا۔ زندگی کے نئے معمار اس اجالے کو قریب تر لانے میں لگے ہوئے ہیں۔

ہوائیں چلتے چلتے ذرا رک گئی تھیں۔ اور آسمان پر بادل گھر آئے تھے۔ اس کی نوکرانی یونیورسٹی مارکیٹ کی طرف سے خالی ہاتھ چلی آ رہی تھی۔ اس کو دودھ نہیں ملا تھا۔ اس لئے کہ رات کی بارش کی وجہ سے دودھ والا اس وقت تک بازار نہیں آیا تھا۔ وہ گاتی ہوئی چلی آ رہی تھی! "دور کوئی گائے، دھن یہ سنائے۔ تیرے بن چھلیا رے، باجے نہ مرلیا رے" وہ گاتی ہوئی گھر کے اندر چلی گئی۔ بادل آسمان پر اٹھتے چلے آ رہے تھے۔ ہوا بہت ہی دھیمے دھیمے چل رہی تھی۔ موسم بہت ہی رومانٹک ہوا جا رہا تھا۔ اور ایسے ہی موسم میں اپنے تمام ذہنی انتشار اور چیزوں کو اپنی مرضی کے مطابق نہ پانے کی وجہ سے پیدا ہونے والی بیزاری کے باوجود اس کے اندر وہی شاعرانہ انگڑائی لینے لگتا۔ جو اس کے دل میں کالج کی زندگی کے ابتدائی دنوں میں اس کے خیالات کے بنتے ہوئے دھاروں میں رنگ انڈیلتا تھا۔ وہ اس روز بھی سوچنے لگی۔ کہ اگر یہ ساری دنیا حسین ہو جائے۔ تو کیا ہو۔ بدصورتی کا کہیں نام بھی نہ رہ جائے جوہی کی یہ لتائیں جھوم جھوم کر ساری دنیا کو اپنی باہوں میں لے لیں۔ تو کیا ہو؟ اتنا مزہ آئے۔ وہ آنکھیں بند کئے اپنے بستر پر اطمینان سے لیٹی رہے اور بیٹھے بیٹھے رومانی سپنے دیکھا کرے۔ اور کوئی نرم سر دل میں گائے "برسے" "سپنوں کی رانی تم چھم چھم کرتی آؤ" ——— لیکن ہمیشہ یہ خیالات بڑے وہ ہیں۔ رومانی حقیقت کی ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جاتے ہیں۔

ایسے ہی موسم میں جب کہ بادل گھرے ہوں۔ ہوائیں رس برسا رہی ہوں، اور ساری فضا پر مستی طاری ہو تو اس کو اپنے آپ ہی اس شرارتی لڑکے کی یاد آ جاتی جو اس کو ایم اے کلاس میں پڑھنے کے زمانے میں روز روز چھیڑا کرتا تھا۔ وہ ہر روز اس کے سامنے بیٹھتا اور اس کو گھور گھور کر دیکھتا۔ وہ اس سے الگ بیٹھنے کی کوشش کرتی۔ لیکن وہ ہمیشہ سامنے آ جاتا اور خود اس کو مخاطب کرتا۔ وہ اس سے بچنے کے خیال سے کئی کئی دن تک یونیورسٹی نہیں جاتی تھی۔ لیکن وہ اتنا شاطر تھا۔ کہ بھلا اپنی حرکتوں سے آسانی سے باز آنے والا تھا۔ وہ اس کو ہر دم چھیڑتا۔ اور خاص کر گرمی کے دنوں میں جب وہ زرد رنگ کا ریشمی اوور کوٹ پہن کر آتی تو وہ نعرہ لگانے کے انداز میں چلا کر اپنے ساتھی لڑکوں سے کہتا کہ بھائیو! ایسا ہی لباس جاپان میں مہاتما بدھ کی دیو داسیاں پہنتی ہیں۔ اور اس پر وہ جل جاتی۔ وہ جب کبھی سمینار لائبریری سے کتابیں اپنے نام ایشو کراتی تو وہ اس کے پاس آ کر کہتا! "مس امتیاز جبیں! آپ ان ساری کتابوں کو پڑھ کر کیا کیجئے گا۔ کہیں آپ کے خوبصورت بالوں میں چھپا ہوا یہ چھوٹا سا سر پھٹ نہ جائے" اس پر وہ اور خفا ہو جاتی لیکن وہ ہر مہینہ کے آخر میں اس سے آ کر معافی مانگتا اور کہتا کہ آئندہ وہ ہرگز بدتمیزی نہیں کرے گا۔ وہ ہر روز اس کے سامنے بیٹھتا اور اس سے آنکھیں چار کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ خوب خفا ہوتی۔ یہ بھی کیا بدتمیزی ہے بلکہ بدتمیزی کی انتہا ہے۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا کر شرم سے سرخ ہو جاتی۔ سمٹی ہوئی، لجائی ہوئی وہ بڑی دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہتی۔ لیکن جب وہ گردن اوپر اٹھاتی تو اس کو پھر ان ہی مشتاق نگاہوں کا سامنا ہوتا پھر وہ کچھ دنوں کے بعد اس کی عادی ہو گئی۔ لیکن وہ بھی ہر مہینے میں کچھ دنوں کے لئے اس سے کترانے لگتا۔ اس کے سامنے بیٹھنا چھوڑ دیتا۔ تب اس کو عجیب سا لگتا۔ کچھ کمی سی محسوس ہوتی۔ اور ساتھ ہی ساتھ اس کو اس بات کا اندیشہ بھی لگا رہتا۔ کہ کہیں وہ اس کو چاہنے تو نہیں لگی ہے۔ لیکن وہ شاید اس کے حد سے

تھا وہ معصوم چہرے سے یہ جانب گیا تھا کہ اس کا نسیم کرائی کا ہے۔ اور اس میں جذبات موجزن ہو ہی نہیں سکتے تاہم وہ اس کو چھیڑتا رہا۔ اور اس کو برا نہیں لگتا۔

ایک دن امتحان کے زمانے میں وہ اس کے گھر آیا۔ اس کو کوئی کتاب لینی تھی۔ وہ پہلے تو بہت گھبرائی کہ اس سے کیا باتیں کرے گی۔ لیکن وہ آیا اور بڑی سنجیدگی کے ساتھ امتحان کی تیاری کے متعلق اس سے گفتگو کرتا رہا۔ وہ اس دن اس کو بہت اچھا لگا۔ اس سے اس نے کہا کہ وہ دوسرے دن آکر کتاب لے تو اچھا ہو۔ کل تک کتاب سے فارغ ہو جائے گی۔ وہ دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے چلا گیا۔

دوسرے دن وہ نہیں آیا۔ شام کو آندھی آگئی تھی۔ وہ آندھی ختم ہونے کے بعد بھی بڑی دیر تک اس کا انتظار کرتی رہی شام ڈھل گئی رات آگئی لیکن وہ نہیں آیا۔

پھر امتحان کے بعد اس سے ملے بغیر وہ اپنے گھر چلا گیا۔ جانے کہاں ہوگا۔ بیچارہ اس وقت کس حال اور کن مصیبتوں میں ہو سکتا ہے۔ کہیں کلرکی کر رہا ہو۔ یا اس کی طرح کسی اسکول یا کالج میں اپنے بیکار دن گزار رہا ہو۔ اور وہ اس کو بھول چکا ہو۔ لیکن وہ اس کو نہیں بھول سکی۔ وہ آج بھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔ کاش ان جھکے ہوئے بادلوں کے سائے میں ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے ارغنوں کے ساتھ وہ آ جائے۔ وہ آکر اس کو خوابوں میں پکارنا شروع کر دے۔ تو پھر زندگی کی سوکھی ٹہنیوں میں پھر سے کونپلیں پھوٹ نکلیں اور زندگی کے ویران راستے پھر سے سنور جائیں۔





حمیدہ اختر

پتھریلے دیس میں

ایک گٹھڑ بغل میں دابے اور دوسرا سر پر رکھے اور دائیں ہاتھ میں ڈول اور رسی پکڑے ۔ بیلا لہ اونچی نیچی پگڈنڈیوں سے گزرتی ہوئی کنوئیں کی طرف جا رہی تھی ـــــ وہ کئی بار کھانس چکی تھی ـــــ اور اُس کی ٹانگیں کئی بار لڑکھڑا چکی تھیں ۔ پھر بھی وہ چلی جا رہی تھی ۔ دشوار گزار راستے پر برابر قدم بڑھا رہی تھی ۔ کہیں کہیں وہ رُک بھی جاتی تھی اور جب تنفس درست ہو جاتا تھا تو پھر چل پڑتی تھی ۔ جب وہ کنوئیں کے قریب پہنچ گئی تو گٹھڑ زمین پر رکھ کر یوں محسوس کرنے لگی ۔ جیسے تھکاوٹ کی وجہ سے اب وہ ایک قدم بھی آگے نہیں اٹھا سکے گی ۔ وہ ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی ۔ آج وہ اس قدر تھکاوٹ کیوں محسوس کر رہی ہے ؟ ؟ وہ سوچنے لگی ـــــ اور جب اُس کی سوچ میں ڈوبی ہوئی نظریں اپنے ہاتھوں پر پڑیں ۔ تو وہ اُسے پہلے کی طرح سفید اور توانا دکھائی نہ دیئے ـــــ اچانک اُس کے دل میں خوف کا ایک سایہ اُبھر آیا ـــــ اور اس کے ساتھ ہی اُس کا تصوّر آزاد فضاؤں کے اُس پار پشاور کی ایک تنگ اور غلیظ سی گلی میں ایک تاریک اور شکستہ مکان کی طرف چلا گیا ـــــ جس کی بالائی چھت پر مالک مکان ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑا چوبیس گھنٹے کھانسا کرتا تھا ـــــ اُس کا سارا گوشت جل گیا تھا ـــــ اُس کے رخسار اندر کو گھنس چکے تھے ۔ اور اُس کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں ـــــ اور اُس کا رنگ پنڈلیوں کے پھول کی طرح زرد ہو چکا تھا ـــــ اُس ماحول کا خیال آتے ہی بیلا لہ کا جی گھبرا گیا ـــــ اس طرح جب اُس اندھیرے صحن میں بیٹھے بیٹھے اُس کا جی گھبرا اُٹھتا تھا ۔ تو وہ چھت پر چلی جاتی تھی ـــــ مگر وہاں بھی تو اُسے سکون نہ ملتا تھا ۔ وہاں بھی ہڈیوں کے اُس ڈھانچے کو جب وہ مسلسل کھانستے ہوئے دیکھتی تھی ـــــ تو اُس کا جی چاہتا تھا ـــــ کہ اُس تاریک مکان اور تنگ گلی میں سے بھاگتی ہوئی چلی جائے ـــــ اور درہ خیبر پہنچ کر علی مسجد کے قریب سے ریتیلے راستے پر سے ہوتی ہوئی ـــــ سامنے کی پہاڑی کو عبور کر کے لنڈی کوتل پہنچ جائے ـــــ اپنی شاداب اور آزاد دُنیا میں ـــــ !! مگر وہ وہاں سے کیوں نہ فوراً بھاگ آئی ؟ ؟ اُس کے دل نے سوال کیا ۔ اور پھر اُسے یوں لگا ـــــ جیسے وہ پشاور کی اُس تنگ گلی والے تاریک مکان کی بالائی چھت پر اُس شکستہ چارپائی پر پڑی ہے ـــــ اور ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے ـــــ اور مسلسل کھانس رہی ہے ـــــ اُس کے ذہن میں دھواں سا اُٹھا ـــــ اور اُس کی آنکھوں کے سامنے گہرا اندھیرا چھا گیا ـــــ مگر وہ فوراً سنبھل گئی ـــــ اُس نے آنکھوں کو زور زور سے ملا ـــــ "کتنی عجیب ہوں میں" ۔ عجیب عجیب ۔ خیال دل میں لاتی ہوں ـــــ کیا کوئی یونہی کھانسا نہیں کرتا ؟ کسی کا رنگ یونہی زرد نہیں پڑ سکتا ؟ زرسانگہ ترو تازہ گلاب کے پھول کی طرح تھی ـــــ مگر اب وہ کتنی کمزور اور زرد ہو گئی ہے ۔ ـــــ وہ بیمار تھوڑی ہے ـــــ " اور بیلا لہ کا مضطرب دل تسکین سی پا گیا ـــــ

سامنے کے پہاڑ پر سے سائے ڈھلنے لگے تھے ۔

وہ اُٹھی ـــــ اور رسی کو چرخی کے ساتھ باندھا ـــــ

اور ڈول کنوئیں میں گرا دیا ——— ڈول تیزی سے پانی کی طرف لپکنے لگا ——— چرخی لرزنے لگی ——— اور ڈول پانی میں ڈوبا اور ڈوب کر پھر اُبھرا ——— وہ جُھک کر کنوئیں میں دیکھنے لگی ——— اس کی نگاہیں تاریکیوں سے گزر کر گہرائیوں میں چمکتے ہوئے پانی پر جا پڑیں ——— جس کی سطح پر کئی بھنور پیدا ہو چکے تھے ——— بھنوروں کو غور سے دیکھنے لگی ——— جب وہ زور زور سے کھانستی ہے۔ تو اُس کی نظروں کے سامنے بھی تو ایسے ہی دائرے پیدا ہوتے ہیں ——— ! مگر اب ایسا کیوں ہوتا ہے؟ پہلے تو وہ اگر کبھی کھانسا کرتی تھی۔ تو ایسا نہیں ہوا کرتا تھا ——— کیا بخار اور کھانسی والی بیماری میں ایسا ہوا کرتا ہے؟!
اور اس کا چہرہ پھر فکر مند ہو گیا ——— اُس کے دونوں ہاتھ اُوپر چرخی پر پڑے تھے۔ اُس نے اپنا سر اُن کے درمیان رکھ دیا۔ ——— اُس کی آنکھوں سے کئی آنسو نکلے۔ اور چرخی پر پھسل گئے۔ ——— سنگلاخ سرزمین کی ہوا کا ایک تیز جھونکا آیا۔ اور اس کے چہرے اور ہاتھوں کو مَس کرتا ہوا آگے بڑھ گیا ——— اور اُس کے واسے دوپٹے کا پلّو لہرایا۔ اور لہرا کر اس کے سر پر زور سے جا پڑا ——— اُس نے دائیں ہاتھ سے اُسے نیچے جھٹک دیا ——— اور اس کے ساتھ ہی اسے یاد آیا ——— کہ اُس بیمار کی بیوی کہا کرتی تھی کہ اگر اس بیماری کے آغاز میں مریض کو تازہ ہوا اور روشنی میسّر آ جائے۔ تو بیماری جاتی رہتی ہے ——— اور اُسے تو تازہ ہوا اور روشنی میسّر ہے ——— ! اور اُس کی بیماری پُرانی بھی نہیں ! اور اُس کے چہرے پر مسرّت کی لہریں چمک اُٹھیں ——— ہڈیوں کا ڈھانچہ نہیں بنے گی۔ اُس کی آنکھیں باہر کو نہیں نکلیں گی۔ اس کا رنگ بنڈیوں کے پھول کی طرح زرد نہیں ہو گا ——— اور وہ چارپائی پر پڑے پڑے چوبیس گھنٹے کھانسا نہیں کرے گی ——— اور وہ آزاد فضاؤں کی صاف ہوا میں گہرے گہرے سانس لینے لگی۔
اور اپنی گھنی اور لمبی پلکیں اٹھا کر آزاد فضاؤں میں چمکنے والے سورج کو اس انداز سے دیکھنے لگی۔ گویا وہ ابھی اُس کی ساری روشنی اپنی آنکھوں میں جذب کر لے گی ——— اور جب اس کا ہاتھ چرخی پر سے پھسل کر کنوئیں میں لٹکی ہوئی رسّی سے جا لگا ——— تو اُسے جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آ گئی ——— اس نے گھڑوں پر نظر ڈالی اور جلدی جلدی چرخی گھمانے لگی۔ رسّی چرخی کے ساتھ لپٹتی جانے لگی۔
اور پانی سے بھرا ہوا ڈول اچھلا اچھلا کر اُوپر آنے لگا ———
جب بیلاآں نے دونوں گھڑے پانی سے بھر لئے۔ تو چرخی سے رسّی کھول کر ڈول میں ڈال دی۔ اور ایک گھڑے میں دایاں ہاتھ ڈالا۔ اور اُسے اُوپر اُٹھایا۔ اور بایاں ہاتھ اُس کی پینٹ پر رکھ ایک جھٹکے کے ساتھ اُسے سر پر رکھ لیا۔ مگر اُس کی دونوں بانہوں میں سخت لرزش ہوئی ——— وہ چونک گئی۔ اور اُس کے چہرے پر سے خوشی کی لہریں غائب ہو گئیں ——— گھڑا اٹھاتے وقت اُس کی بانہیں کانپنے کیوں لگی ہیں؟ اُس میں اتنی کمزوری کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ کیا اُس کی بیماری پُرانی ہو چکی ہے؟ ——— کیا وہ ———

سامنے کے پہاڑ پر سائے گہرے ہو گئے تھے۔ ———
وہ اُداس دل سے ذرا جھکی۔ اور دائیں ہاتھ سے دوسرا گھڑا اٹھالیا۔ اور بایاں ہاتھ پھیلا کر اُسے بائیں بغل میں لے لیا۔ اور دائیں ہاتھ میں ڈول اٹھا لیا ——— اور فکر میں ڈوبی ہوئی گھر کی طرف جانے لگی۔
چلتے چلتے اُس کی نظریں یونہی سامنے اُٹھ گئیں ——— دُور بل کھاتی ہوئی پگڈنڈیوں پر باغی شاہ تیز تیز قدم اُٹھائے چلا جا رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بھول گئی ——— اُس ساری دُنیا کو بھول گئی ——— اور گنگناتے ہوئے چشموں کے کنارے ——— پہ کھو گئی ——— اور اُس کے خمیدہ اور سُرخ لبوں پر مسکراہٹیں جاگ اُٹھیں۔ ان مسکراہٹوں میں گنگناتے ہوئے میٹھے پانی کے ٹھنڈے چشموں کی چمک تھی۔ اُس کا جی چاہا۔ کہ وہ زور سے پکارے ———

"باغی شاہ ــــ مگر ایسا ممکن بھی ہے ؟ کوئی سن لے تو ؟ کیا کہے گا ؟ اور مارے شرم کے اُس کی پیشانی پر پسینے کے کئی قطرے لرزنے لگے ــــ اور باغی شاہ اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر سے ہوتا ہوا غائب ہونے لگا۔ بیلالہ کے قدموں کو غیر معمولی طاقت نے جیسے چھو لیا۔ چکر کھاتی ہوئی پگڈنڈیاں پیچھے کی طرف بھاگنے لگیں۔ اور وہ تیزی سے گھر کے قریب ہوتی گئی۔

دروازے کے قریب پہنچی۔ اور چاہا۔ کہ دایاں پاؤں اندر رکھوں۔ کہ اُسے خیرنتہ کی آواز سنائی دی اور اُس کے پاؤں دروازے کے باہر ہی رُک گئے۔

خیرنتہ باغی شاہ سے باتیں کر رہی تھی۔ بیلالہ کی باتیں !! اور بیلالہ دروازے کے باہر کھڑی سنتی رہی ــــ اور اُس کے خمیدہ اور سُرخ لبوں پر مسکراہٹیں سو گئیں ــــ اور اُسے یہی محسوس ہونے لگا۔ کہ خیرنتہ اُس کا گلا دبا رہی ہے۔ مارے تکلیف کے اس کا جسم زور سے کانپا۔ اور سر پر دھرا ہوا گھڑا زور سے لرزا اور لرز کر زمین پر آ رہا ــــ اور ٹوٹ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

باغی شاہ جلدی سے دروازے کے قریب آ گیا۔ بیلالہ نے اُس کی طرف دیکھا ــــ اور ایک بار پھر وہ اس ساری کائنات کو بھول گئی ــــ اور اپنی جنت میں داخل ہو گئی۔ اور باغی شاہ کے قدموں میں مسکراہٹوں کے پھول برسانے لگی۔ "تم"۔ باغی شاہ نے ایک پتھر پھینکا۔ اور اندر لوٹ گیا۔

وہ کتنی نادان ہے ــــ وہ سوچنے لگی۔ اور مایوسی کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر ہنسی پھیل گئی۔ اس ہنسی میں اپنی ناسمجھی کا احساس رچا ہوا تھا ــــ۔

بیلالہ نے سچ مچ بڑی نادانی کی تھی۔ وہ جان گئی تھی۔ کہ باغی شاہ سب کچھ جان چکا ہے۔ اور پھر بھی اُس نے اُس کی راہ میں پھول برسائے !! ــــ شاید پتھریلے دیس کی عورت یہ بھول گئی تھی۔ کہ اُس کے دیس میں پھول بڑی بڑی چٹانوں اور بھاری بھاری پتھروں کے دامن میں اُگا کرتے ہیں ــــ اور جب پتھریلے دیس پر سنسناتی ہوئی ہوائیں چلنے لگتی ہیں۔ تو یہ بڑی بڑی چٹانیں اور بھاری بھاری پتھر اپنی جگہوں سے کھسک جایا کرتے ہیں اور مسکراتے ہوئے پھول ــــ اُن کے نیچے دب کر مرجھا جایا کرتے ہیں ــــ !!

بیلالہ نے گھڑا زمین پر رکھ دیا۔ اور خود چپ چاپ زمین پر بیٹھ گئی ــــ اُس کے دل کی دھڑکنوں میں ایک نیا غم بس گیا تھا۔ اُس نے باغی شاہ کی طرف بالکل نہ دیکھا۔ وہ پتھروں کی تاب نہ لا سکتی تھی۔ البتہ جب اُس نے کچھ دیر بعد خیرنتہ پر ایک نگاہِ غلط ڈالی۔ تو اس کے احساسات میں سمندر کے طوفانوں جیسا اضطراب چھا گیا ــــ سمندر کا پانی جب طوفانوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ تو اپنی راہ میں حائل بڑی بڑی چٹانوں سے بھی ٹکرا جاتا ہے بیلالہ خیرنتہ سے ٹکرا جانے کو تیار ہو گئی ــــ اُس نے اپنے ہاتھ پاؤں میں گرمی سی محسوس کی۔ اور ایک دم چارپائی پر سے اُٹھی۔ اور کوٹھڑی کی طرف لپکی ــــ اور ایک کونے میں لگے ہوئے ڈھیر میں سے جوار کے دانے جھولی میں بھر کر لے آئی۔ اور پھوس کے چھپر تلے سفید چکی میں ڈال کر چکی زور زور سے چلانے لگی ــــ دیکھتے ہی دیکھتے سارے دانے پس گئے ــــ اور آٹے کا ڈھیر لگ گیا ــــ

بیلالہ کے حلق میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ مگر اُس نے ہونٹ دانتوں تلے دبا لئے ــــ اور لپک کر مٹی کے مٹ میں سے کٹورہ بھر لائی۔ اور جلدی جلدی آٹا گوندھنے لگی۔ مگر اب کے وہ باغی شاہ کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی کہ کہیں اُس کی آنکھوں میں اُمنڈتے ہوئے آنسوؤں پر اُس کی نظر نہ پڑ جائے۔ اور اُس کی راہ میں چٹانیں کھڑی ہو جائیں۔

باغی شاہ نے بیلالہ کو اس پھرتی سے کام کرتے ہوئے !! کئی بار سوالیہ نظروں سے ماں کی طرف دیکھا ــــ مگر وہ ہر بار گھبرا کر

نظریں پھراتی رہی۔

جب بیلاں آٹا گوندھ چکی۔ تو تنور کی طرف گئی۔ اُس وقت اُس نے کنکھیوں سے خیر بتہ کی طرف دیکھا۔ وہ گھبراہٹ سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اور بیلاں کا جی چاہا کہ وہ طنز سے ہنس دے۔

بیلاں نے تنور کے منہ پر پڑا ہوا مٹی کا گھڑا اٹھا کر زمین پر رکھ دیا اور تنور میں اُپلے ڈالنے لگی۔ اور ماچس جلا کر تیلی تنور میں پھینک دی۔ تنور میں دھواں سا بھر گیا۔ اور کچھ دھوئیں میں اندر سے آگ کا ایک تیز دیا جل اُٹھا۔ اور پھر آگ سی لگ گئی۔ جب تنور گرم ہو گیا۔ اور آگ بجھ گئی۔ تو وہ روٹیاں بنا بنا کر لگانے لگی۔

روٹیاں لگاتے لگاتے اس کے حلق میں خارش سی ہونے لگی۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے ——— اور اس کی آنکھیں باہر کو نکل آئیں۔

سورج غروب ہونے لگا۔ اور آسمان پہ سرخیاں پھیل گئیں۔ اور روز کی طرح اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اور اُس کا جسم گرم ہونے لگا۔ — مگر طوفان تو بھاری بھاری پتھروں کو بھی بہا کر لے جاتے ہیں ——— فوراً ہی اُس کے ہاتھ پھر حرکت کرنے لگے ——— جب روٹیاں پک چکیں۔ تو اُس نے پانی کا بھرا ہوا کٹورہ بھی روٹیوں اور پیاز کے ٹکڑے کے ساتھ چنگیر میں رکھ دیا ——— اور چنگیر باغی شاہ کے آگے لا کر رکھ دی۔ اور خود خیر بتہ سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئی۔ اور جوار کی روٹی کے ساتھ پیاز کھانے لگی۔ ایک دم اُس کے حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں ——— اُس نے جھٹ پیالہ اُٹھایا۔ اور پانی کے کئی گھونٹ پی لئے ——— مگر اُس کے حلق میں سوئیاں برابر چبھتی رہیں۔ پھر ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کے لب وا ہو گئے۔ اور وہ زور زور سے کھانسنے لگی۔

خیر بتہ نے جوار کی روٹی سے نوالہ توڑتے توڑتے باغی شاہ کی طرف فاتحانہ نظروں سے دیکھا ——— اور بیلاں نے جو گھبرا کر باغی شاہ پر نگاہ ڈالی۔ تو اُس کی آنکھوں کی چمک میں بڑی بڑی چٹانوں کے سایوں کو بدستور موجود پایا ———

"کل اچھی روٹی کھاتے تھے" ——— اُس نے چٹانوں کو اپنی راہ سے ہٹانے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"ہوں" ——— باغی شاہ نے کہا۔ اور ہنس کر ماں کی طرف دیکھنے لگا۔ بوڑھی خیر بتہ کے چہرے پہ طنز بھری ہنسی پھیل گئی۔

آسمان نیلا تھا۔ اور شوخ تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ وہ تمام رات جاگتی رہی۔ اُس کے حلق میں چیونٹیاں رینگتی رہیں۔ پھر وہ ہونٹ بھینچے رہی ——— "میں بالکل اچھی ہوں۔ میں بالکل اچھی ہوں ——— باغی شاہ میرا ہے۔" مگر دوسرے ہی لمحے وہ حسرت سے بھری ہوئی نظریں اپنے ارد گرد ڈالنے لگی۔ مایوسی اور رنج نے اس کے محسوسات کو بالکل بے تاثر کر دیا تھا۔

"تم پانی بھر کر لا سکو گی؟" ——— دوسرے دن خیر بتہ نے طنز سے کہا۔

"ہاں"۔ بیلاں کے لہجے میں ایک شکست خوردہ انسان کی ضد کی سی کیفیت تھی۔ اور اُس نے فوراً ایک گھڑا اُٹھا کر سر پہ رکھا۔ اور دوسرا بغل میں دابا ——— اور دائیں ہاتھ میں ڈول اور رسی اُٹھالی ———

"دیکھنا کہیں پھر گھڑا توڑ نہ دو۔ میرے بیٹے کی حرام کی کمائی نہیں ہے۔" خیر بتہ نے جیسے بیلاں کے مستقبل کے متعلق ایک پہیلی کہی ——— اور بیلاں کا جی چاہا۔ کہ وہ کہے۔ کہ یہ پہیلی میں جانتی ہوں ——— "تم بہت ظالم ہو۔" مگر اُس کے حلق میں خارش ہونے لگی۔ اور وہ ہونٹ دانتوں تلے داب کر گھر سے نکل گئی۔

"ٹھہرو میں بھی آتی ہوں" ——— گلی کے دائیں طرف کے ایک دروازے میں سے مہربانو جھانکتے ہوئے بولی۔

بیلاں رُک گئی۔

"ڈول اور رسی تو ہو گی۔ تمہارے پاس؟" مہربانو گھڑے اُٹھاتے ہوئے

دروازے ہی سے بولی۔

"ہاں"

مُونابہ گلی میں آگئی۔ اور وہ دونوں گلی سے نکل کر اُونچی نیچی پگڈنڈیوں سے ہوتی ہوئی چپ چاپ کنوئیں کی طرف جانے لگی۔

"میں پشاور جا رہی ہوں" ——— مُوبانہ نے سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ اُس کا لہجہ مسرت انگیز تھا۔

"بھائی کے ہاں"

"ہاں"

"نہ جاؤ تم" ——— بیلا لہ مضطرب ہو کر بولی۔

"کیوں؟" اُس نے تعجب سے پوچھا ———

"وہاں بیماری ہے لوگوں کو بخار ہوتا ہے۔ وہ کھانستے ہیں اور پھر مر جاتے ہیں" ——— وہ آہستہ سے کھانس کر بولی۔

"میرا بھائی تو وہاں مدت سے رہتا ہے۔ وہ تو بیمار نہ ہوا۔"

"کیا کرتا ہے۔ تمہارا بھائی وہاں؟"

"آپسے کے علاقے میں کتابوں کی دکان ہے اُس کی"

"جانتی ہو۔ پشاور کی گلیاں تنگ تنگ سی ہیں۔ اور ان میں تاریک مکان ہیں۔ وہاں سانس گھٹ جاتا ہے ہر وقت۔ کہتے ہیں۔ اس لئے وہ بیماری ہوتی ہے۔ لوگوں کو"

"واہ ——— میرا بھائی تو شہر سے باہر ایک بڑی سی سرائے میں رہتا ہے۔ اور پشاور میں تو بڑے بڑے بازار ہیں۔ اُونچے اونچے اور کھلے کھلے مکان ہیں۔"

اور بیلا لہ کو اپنے بھائی سے شکایت ہونے لگی۔ وہ کیوں ایک تنگ سی گلی کے تاریک مکان میں رہتا ہے۔ اور اس نے اُسے بڑے بڑے بازار اور اونچے اونچے کھلے کھلے مکان کیوں نہ دکھائے ———"

تمہارے بھائی کی پشاور میں تھوے کی دکان ہے۔"

"ہاں گنج کے علاقے میں۔"

"تم بھی تو گئی تھیں نا پچھلے دنوں شاید اپنی ماں کے ساتھ" ——— مُونابہ کو جیسے ایک بھولی ہوئی اہم بات یاد آگئی۔

"ہاں" بیلا لہ نے گلوگیر آواز میں کہا۔

"تمہارا بھائی وہاں تنگ گلی میں رہتا ہے۔ تاریک سے مکان میں۔ وہاں بیماری ہے۔"

"نہیں تو" بیلا لہ نے اس طرح ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ گویا مُونابہ کوئی عجیب بات کہہ رہی ہو ———

"تو پھر؟"

"میں نے سُنا ہے کہ تمہارا بھائی تنگ گلی اور اندھیرے مکان میں رہتا ہے۔" وہ لہجے میں سنجیدگی پیدا کرتے ہوئے بولی۔

کون کہتا ہے یہ؟" مُونابہ نے تعجب سے پوچھا۔

اور بیلا لہ کا حلق خشک ہونے لگا۔ اور اُس نے ہونٹ بھینچ سی لئے۔ وہ کنوئیں کے قریب پہنچ گئیں ———

بیلا لہ کا حلق بالکل خشک ہو گیا۔ اور اُس کے ہونٹ خود بخود کُھل گئے۔ اور وہ زور زور سے کھانسنے لگی۔

"تم کھانستی کیوں ہو؟" مُوبانہ نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

بیلا لہ برابر کھانستی رہی۔ اور کوئی جواب نہ دے سکی۔

مُوبانہ نے اب غور سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے سُرخ رنگ میں اُسے زردی گھلتی ہوئی نظر آئی۔ اور وہ اُسے پہلے سے کچھ کمزور سی دکھائی دی ——— مُوبانہ نے اُس کی کلائی پر ہاتھ رکھ دیا۔

"تمہیں تو بخار ہے" ۔ وہ بولی

اور بیلا لہ کا جی چاہا۔ کہ وہ دوڑ کر۔ جائے گی اور گرمے کے تمام حصوں میں یہ بات پھیلا دے۔ کہ وہ بیمار ہے۔ اُسے بخار ہوتا ہے۔ کھانسی ہوتی ہے۔ یہ بیماری وہ پشاور سے لائی ہے اس بیماری سے وہ جلد مر جائے گی۔ ہاں اس طرح بھی تو خیریت کی

[illegible] ہے۔ اور باغی شاہ کے ہاتھوں میں ایک پانی [illegible] گیا ۔۔۔ لیکن اگر اُسے وزیرستان یا [illegible] علاقوں میں سے گئے تو ؟ ؟ ۔۔۔ تو وہ [illegible] سے ہمیشہ کے لئے جُدا ہو جائے گی۔ [illegible] چلی جائے گی ۔۔۔ یہ اُس کا [illegible] اس سے چھین لیا جائے گا۔ خواہ کچھ بھی ہو۔ [illegible] جائے گا ۔۔۔

[illegible] کھائے تھے بہت ۔۔۔ اس سے کھانسی [illegible] خراب ہو گیا ہے ۔۔۔ اور بخار تو مجھے محسوس نہیں ہو رہا ۔۔۔ اُس نے مُرتابہ کی طرف دیکھ کر اُسے یقین دلانے کے [illegible] کہا ۔۔۔

"اچھا" ۔۔۔ مُرتابہ نے کہا۔ مگر اُسے کچھ شُبہ سا ضرور ہو گیا تھا۔ رسی کو چرخی سے باندھتے وقت اُس نے ایکبار پھر بیلاآلہ کا جائزہ لیا اور جب ڈول پانی میں پھینک چکی ۔۔۔ تو بیلاآلہ کی آنکھیں [illegible] کھانسی والی بیماری تلاش کرنے لگی۔

ڈول پانی میں [illegible]۔ ڈوب کر پھر اُبھرا ۔۔۔ کانپتی ہوئی چرخی ایک [illegible] کے ساتھ تھم گئی۔ اور چمکتے ہوئے پانی میں کئی گرداب پیدا ہو گئے۔

بیلاآلہ جھک کر کنوئیں میں دیکھنے لگی

"کیا دیکھتی ہو؟" مُرتابہ نے پوچھا۔

"کچھ نہیں" بیلاآلہ بولی۔ اور کنوئیں سے ہٹ کر ایک پتھر پر بیٹھ گئی۔ اور نظریں سامنے پہاڑ پر گاڑ دیں۔

پہاڑ کے دامن میں کئی بکریاں چر رہی تھیں۔ اور عجب گل ایک پتھر پر بیٹھا اُس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

بیلاآلہ کے احساسات میں ہلچل مچ گئی۔ اور اُس کا سانس [illegible] عجب گل اس کی طرف کیوں دیکھ رہا ہے۔ کیا اُس [illegible] ہے؟ اور وہ زبردستی زور زور سے کھانسنے لگی

اور پھر اُسے اچانک وزیرستان اور تیراہ کے انجانے اور دُور کے علاقوں کا خیال آگیا ۔۔۔ اور اُس نے فوراً کھانسنا بند کر دیا ۔۔۔ اور چہرے پر ایک صحت مند انسان جیسا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اور اُس کا جی چاہا ۔۔۔ کہ کرشتے میں رہنے والا عجب گل اب اچھی طرح اُس کی طرف دیکھے ۔۔۔

مُرتابہ نے پانی سے بھرے ہوئے کئی ڈول نکالے۔ اور گھڑے بھر لئے۔ اور چرخی پر سے رسی اتار کر ہاتھ پر چڑھائی۔ اور گیند سا بنا کر ڈول میں ڈال دیا ۔۔۔ دونوں نے پانی سے بھرے ہوئے گھڑے اُٹھائے۔ بیلاآلہ نے دائیں ہاتھ میں ڈول بھی پکڑ لیا۔ اور دونوں گھروں کی طرف جانے لگیں۔

"سامنے دیکھو"۔ مُرتابہ نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

بیلاآلہ نے سامنے دیکھا۔ تو اُس کی نظریں باغی شاہ پر پڑیں۔ وہ کندھے پر بندوق دھرے لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا دُور کھیتوں کے اُونچے نیچے کناروں پر سے جا رہا تھا ۔۔۔

"معلوم ہوتا ہے۔ بڑا ضروری کام در پیش ہے۔ باغی شاہ کو ۔۔۔ دیکھو کتنی تیزی سے جا رہا ہے تمارا شوہر" ۔۔۔

بیلاآلہ کی نظریں تھرتھرا گئیں۔ باغی شاہ اتنی تیزی سے کیوں جا رہا ہے ۔۔۔ کیا وہ عجب گل کا فیصلہ معلوم کرنے جا رہا ہے ؟ ؟

"خوشی سے خاموش ہو گئی ۔۔۔ بولتی کیوں نہیں"۔ مُرتابہ ہنستے ہوئے بولی۔

"خوش تو ہوتا ہی ہے نا" بیلاآلہ نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔۔۔ "تم خوش نہیں ہوا کرتیں ۔۔۔ سید افضل کی طرف دیکھ کر" بیلاآلہ کچھ دیر خاموش رہ کر بولی۔

"ہاں ۔۔۔ بہت خوش ہوا کرتی ہوں۔ اُس بھینگے کی طرف دیکھ کر" مُرتابہ برابر ہنسے جا رہی تھی۔

"تو باغی شاہ سے تو"

"تم ہاشی شاہ کب ہو گئے؟"

"کل۔ سہ پہر سے۔"

"تو پھر وہ بیٹھا کیا کرتا ہے — گل نے قہقہہ لگا کر کہا۔"

"بیلا ہی مل جائے۔ گل کے تکے سے ابھرتا ہوا قہقہہ"

پہنچنے سے پہلے ایک تڑپ بیلا کے ہونٹوں پر مچلنے لگی۔

ہاشی شاہ جلے جلے قدم اٹھاتا ہوا گل محمد کے حجرے کی طرف مڑ گیا —

گل محمد اپنے حجرے میں بیٹھا چلم پی رہا تھا۔

"سنو گل محمد — ہاشی شاہ نے کندھے پر سے بندوق اتار کر چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا — میں ایک ضروری کام کے لئے آیا ہوں۔"

"خیر تو ہے" — وہ دھواں چھوڑتے ہوئے بولا۔

"خیر ہی ہے — مجھے بیلا کے متعلق بات کرنی ہے تم سے۔"

بیلا کے متعلق بات؟؟ گل محمد کچھ گھبرا کر بولا۔

"ہاں — میں اُسے بیچنا چاہتا ہوں"

"اوہ — یہ بات ہے — وہ مطمئن ہو کر بولا۔ مگر کیوں؟ — اُس نے چلم کا ایک لمبا کش لیتے ہوئے کہا۔

"وہ مجھے پسند نہیں۔"

"دو سال تک پسند رہی — اب ایک دم کیسے ناپسند ہو گئی — گل محمد تعجب سے بولا — اور چلم ہاشی شاہ کے آگے کر دی۔

"یہ غلط ہے — وہ مجھے کبھی بھی پسند نہ تھی۔" ہاشی شاہ نے چلم کا کش لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر؟"

"تم یہ بات گوٹھ میں پھیلا دو"

"سنا ہے — لال داد کوئی عورت خریدنا چاہتا ہے"

"اُس کی ایک بیوی مر گئی ہے؟"

"ہاں"

"تو تم اُس سے بات کرو"

"اچھا اُس نے بیلا کو نہیں دیکھا ہو گا؟"

"وہ ہزار دفعہ [illegible]

اُس سے آنکھ وہ کہیں چھپ کر دیکھ سکتے۔"

اور دوسرے دن سہ پہر کو جب بیلا [illegible] — آ

اخروٹوں کے درختوں کی گھنی گھنی اور لمبی لمبی شاخوں میں سے دو آنکھیں جھانکتی ہوئی محسوس ہوئیں — اُس کے قدم رک گئے — اور اُس کا سانس اکھڑ گیا — وہ ایک دم رک گئی — [illegible] طور پر گھور کر دیکھنے لگی — سبز سبز اخروٹوں سے بھری ہوئی لمبی شاخیں زور زور سے کانپیں۔ اور اُن میں سے جھانکتی ہوئی آنکھیں غائب ہو گئیں —

بیلا نے گھڑے زمین پر رکھ دیئے۔ اور [illegible] کے کنارے بیٹھ گئی — مگر کیا یہ کوئی دھوکا تھا؟؟

عجب گل نے اُسے ناپسند کر دیا؟؟ وہ اس کا دیوانہ تھا؟؟ مگر اُس نے اُس کی طرف گھور کر کیوں دیکھا؟ وہ جھنجھلا گئی — یہ اس نے کیا کر دیا؟ یہ بھی انکار کرنے کو؟؟ اور اُسے [illegible] اور تیراہ کے علاقوں کا خیال آ گیا — اور اُس کی آنکھوں کے سامنے چمکیلے قطرے جانے سے بننے لگے۔ اور پھر [illegible] اُس کے کاسے دوپٹے میں جذب ہونے لگے

ہوا تیز تیز چلنے لگی۔ سبز سبز اخروٹوں سے بھری ہوئی شاخیں آپس میں ٹکرانے لگیں۔ اور اخروٹ شاخوں سے [illegible] نیچے گرنے لگے —

جب سورج دائیں طرف [illegible] پیچھے جانے لگا تو وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔ [illegible]

"پانی نہیں لائی ہو آج؟" [illegible]

[illegible] تھا ۔

[illegible] کاٹتے گئی ۔

[illegible] کے نشان اور کچھ [illegible]

[illegible] ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا

[illegible] طرف سے سر ہٹا ۔ اور دوسرا بائیں طرف

[illegible] ۔ کتان کی اور بکھاتی ہوتی ۔

[illegible] پہاڑ کے دامن کی طرف چلی گئی ۔

[illegible] پہاڑ کے دامن میں بھر رہی تھیں ۔ اور باقی شاہ [illegible] کی چادر اوڑھے ایک پتھر پر سر رکھے سو رہا تھا ۔

"باقی شاہ ۔" خیر بخت نے چادر ہٹا کر اس کا شانہ ہلایا ۔

باقی شاہ اٹھ کر بیٹھ گیا ۔

"کیا ہے اوتے؟" وہ حیران ہو کر بولا ۔

"بیٹا بہت بیمار ہو گئی ہے ۔ آج وہ خالی گھڑے سے گھر گئی ۔ پانی بھی بھر کر نہ لا سکی ۔ اس کا کہیں جلد انتظام کرو" ۔

"انتظام تو کر رہا ہوں اوتے" ۔

"ذرا جلدی کرو ۔ لوگوں کو علم ہو گیا ۔ تو کیا ہو گا؟"

"تم فکر نہ کرو ۔ یہاں کام دبا ۔ تو اسے تیراہ لے جاؤں گا یا [illegible]"

"لیکن وہاں بھی نہیں لے جانے چاہئیں ۔ اگر وہ دیکھنے میں کمزور ہو گئی ۔ تو اچھی قیمت نہ مل سکے گی" ۔

"[illegible] کتنا ہوا ہے؟"

"[illegible] ہزار کیا ۔ دو ہزار تو اس کے باپ کو نقد دیئے [illegible] ہر تہوار پر ایک جوڑا [illegible] آٹھ سیر گھی ۔ اور [illegible] ۔ اور شادی پر تین [illegible] من چاول جس میں سیر گھی اور سوجی گھول دیا تھا ۔"

"ہوں ۔" باقی شاہ قدرے پریشان ہو گیا ۔

"اور ہاں ۔ شادی پر اس کی نانی ۔ ماں اور دونوں بہنوں کو جوڑے دیئے تھے ۔ اور اس کے ماموں نے پچاس روپیہ الگ نقد لیا تھا ۔ اور رخصتی کے وقت چچا نے چالیس روپے دھاڑے پر لئے تھے" ۔

"اوتے ۔ یہ تین ہزار روپے بنتے ہیں" ۔ باقی شاہ تین ہزار پر زور دے کر بولا ۔

"تین ہزار روپے؟"

"اور اس کی نانی ہمیشہ کہتی رہتی ہے کہ میرے لئے چپلیاں خریدنی ابھی باقی ہیں" ۔ باقی شاہ بولا ۔

"اچھا ہوا ۔ ابھی تک نہیں لے کر دیں" ۔ خیر بخت نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا ۔

"تم گھر جاؤ ۔ اوتے ۔ میں گل خمیر سے بات کر کے آتا ہوں" ۔

"میں ایک بار پھر کہتی ہوں ۔ کہ وہ کافی کمزور ہو گئی ہے ۔ بیٹا ماس کا جسم بہت بھاری ہے ۔ اس لئے کمزوری کا خاص پتہ نہیں ۔ وہ حقیقت میں بہت بیمار ہے ۔ ہر وقت کھانستی رہتی ہے ۔ اور ہر روز اسے بخار ہوتا ہے ۔ وہ ایک دم سے گرے گی ۔ اس لئے جلدی کرو" ۔

یہ کہہ کر خیر بخت اٹھی ۔ اور گھر کی طرف جانے لگی ۔

دیسی ساخت کی بندوق سرہانے رکھے گل خمیر اپنے حجرے میں سو رہا تھا ۔ باقی شاہ نے اسے آواز دی ۔ "گل خمیرا" ۔ اور گل خمیر نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں ۔ اور فوراً دایاں ہاتھ بندوق پر رکھ دیا ۔

"میں ہوں ۔ بندوق کو کیا کرتے ہو؟" باقی شاہ بولا ۔

"میں سمجھا ۔ قادر خان ہو ۔ سنا ہے کہ وہ مجھے قتل کرنا چاہتا ہے" ۔

"تو جیسے تم آزادی سے حجرے میں پڑے ہو ——— جیسے گھر کے اندر سوتے ہو تے ——— اچھا تو لال داد کے متعلق کوئی اچھی خبر سناؤ۔"

لال داد آج صبح مجھ سے ملا تھا ——— کل جب بیلا لہ پانی بھرنے گئی۔ تو اُس نے اخروٹوں کے درختوں میں چھپ کر اُسے دیکھ لیا۔ وہ اُس کے حسن کی بہت تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے۔ بڑی تندرست عورت ہے۔"

باغی شاہ کے چہرے پر پُراسرار ہنسی چھا گئی۔ "ہوں۔ تو وہ خریدے گا بھی ——— ؟"

"ہاں ——— کہتا ہے ——— دو ہزار روپے دوں گا"

باغی شاہ کے فکر مند دل کو مسرتوں نے گھیر لیا۔

"ڈھائی ہزار پر معاملہ چکاؤ" ——— باغی شاہ کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔

"ڈھائی ہزار نہیں دے گا وہ ——— اقدر کی لڑکی تو تم نے دیکھی ہوگی۔ کتنی خوبصورت ہے وہ ——— فقیر گل نے اُسے دو ہزار میں خریدا ہے۔ اور پھر بیلا لہ عورت ہے۔ تمہیں تو اس کی زیادہ قیمت مل رہی ہے۔"

باغی شاہ چپ ہو گیا۔

"چُپ کیوں ہو گئے ہو ——— کہدوں لال داد سے ——— کہ معاملہ طے ہے ——— " گل خمیر بولا۔

"کہہ دو ——— تمہاری مرضی"

وہ ایک سرد صبح تھی۔ کالے کالے بادلوں نے نیلگوں آسمان کو چھپا رکھا تھا ——— اور درۂ خیبر کے قریب کے قبائلی علاقے ——— زخا خیل اور آفریدیوں کے دیس کہرے میں جھکے ہوئے تھے ——— اور ارد گرد کے پہاڑوں کی چوٹیوں کو چھوتے ہوئے گزر رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے کالا کالا دھواں بل کھا کھا کر لپٹ رہا ہے ———

"لال داد کسی کام کی وجہ سے پشاور جا رہا ہے۔ کہتا ہے بیوی کے لئے بالیاں بھی لاؤں گا۔ اس نے تمہاری بالیاں خریدنے کے لئے مانگی ہیں" ——— باغی شاہ نے بیلا لہ کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

بیلا لہ نے باغی شاہ کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ محبت کے چشمے بالکل خشک ہو چکے تھے۔ "میں بالکل اچھی ہوں۔ زندگی کی راہ پر مجھ سے نہ بچھڑو۔" فریاد بیلا لہ کے ہونٹوں میں تھرتھرا کر رہ گئی ——— اُس نے چپ چاپ بالیاں اتار کر باغی شاہ کے پھیلے ہوئے ہاتھوں پر رکھ دیں ———

باغی شاہ اور خیر نتہ کے چہروں پر خوشی کی لہریں ناچ اُٹھیں۔

"لال داد کی گائے بیمار ہے۔ دودھ نہیں دے رہی وہ۔ آج ایک کٹورہ بھر کر اُس کے ہاں دے آؤ" ——— تھوڑی دیر بعد باغی شاہ نے بیلا لہ سے کہا۔

پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے کالے کالے دھوئیں نے تیزی سے بڑھ کر جیسے بیلا لہ کے گرد ہالہ سا بنا دیا۔ اور اُس کا سانس گھٹنے لگا۔ اور آنکھیں جھپک جانے لگیں۔

خیر نتہ نے کٹورہ اُٹھایا۔ اور مٹی کی ہانڈی میں سے اُس میں دودھ ڈالا ——— اور لا کر بیلا لہ کے بے جان ہاتھوں میں تھما دیا۔

"مجھ سے نہیں جایا جاتا" ——— بیلا لہ نے ڈوبی ہوئی آواز میں کہا ———

"تو بیٹا میں جاؤں؟ کل سے میرے گھٹنوں میں درد ہے"۔ خیر نتہ نے محبت سے کہا ——— اور مُنہ موڑ کر دانت پیسنے لگی ———

"انہیں ایسی ہی ضرورت ہوئی۔ تو کسی کو بھیج دیں گے" بیلا لہ کی آواز میں درد تھا۔

"میں کہہ کر آیا ہوں۔ کہ ہم خود ہی بھیج دیں گے ——— میں بھی مسجد جا رہا ہوں۔ اب تمہیں جانا ہی پڑے گا ——— " باغی شاہ اپنا غصہ دبا کر نرمی سے بولا۔

[illegible] اب کوئی بڑا ہی چھے گا ــ بیلا لہ کے دل نے [illegible] کہا ــ اور بھاری بھاری قدم اٹھاتے وہ [illegible] گئے جانے کے بعد اس نے چپ کر [illegible] کیا ــ [illegible] فضا اسے میں گھری تھی ــ اسی کے جھونپڑوں والے [illegible] تھی ــ بیلا کی جوان آنکھوں تلے چھائے ہوئے [illegible] ہو گئے ــ

کالے کالے بادل ــ اور جھک آتے ــ اور اونچے اونچے پہاڑوں کے دامن تک پھیل گئے اور زنخیل آفریدیوں کی سرزمین پر ایک سیاہ چادر بچھ گئی۔

بیلا لہ لال داد کے گھر کے قریب پہنچ گئی۔ اس کا دم اور تیزی سے گھٹنے لگا ــ اور آنکھیں جھپک جانے لگیں ــ وہ چپ چاپ دروازے کے قریب کھڑی ہو گئی۔

اتنے میں باہر سے لال داد کا منجھلا لڑکا آ گیا ــ بیلا لہ کی طرف اس نے دیکھا ــ اور اندر بھاگ گیا ــ تھوڑی دیر بعد لال داد کی ماں دروازے پر آئی۔

"اندر آ جاؤ" ــ وہ بولی ــ

بیلا لہ اندر چلی گئی ــ لال داد کی ماں نے دودھ کا کٹورہ اس کے ہاتھوں سے لے لیا ــ "بیٹھ جاؤ" وہ کہنے لگی ــ

بیلا لہ چپ چاپ کھڑی رہی ــ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں ــ اور آدھا چہرہ کالے دوپٹے میں چھپا ہوا تھا ــ

لال داد نے جا کر دروازے کو کنڈی لگا دی ــ

"بیٹھ بھی جاؤ" ــ لال داد کی ماں پیار سے بولی ــ

بیلا لہ چارپائی کے ایک کونے میں بیٹھ گئی ــ

"اب یہی تمہارا گھر ہے ــ" وہ اپنی طرف سے بیلا لہ کو حقیقت حال سے باخبر کرتے ہوئے کہنے لگی ــ نشان جان اور [illegible] تمہارے [illegible] ہے"

"[illegible] گھر کب چلا جانے ہو؟ اس پتھریلے دیس میں کسی

عورت کا کوئی گھر نہیں ہو سکتا" بیلا لہ کا دل درد سے پکار اٹھا ــ اور اس کے حلق میں چیونٹیاں رینگنے لگیں ــ اور وہ پہلی بار بے فکر ہو کر کھانسنے لگی ــ ایک دم اسے دور کے انجانے قبائلی علاقے تیراہ اور وزیرستان کا خیال آ گیا ــ اور اس نے فوراً ہونٹ بھینچ لئے ــ

شاید سہ پہر کا وقت ہو گا ــ گل خمیر نوٹوں کا بنڈل لے کر باغی شاہ کے گھر گیا ــ

"پہ خیر راغلے گل خمیرا" (خوش آمدید) خیرزنہ کی نظریں اس پر پڑیں اور وہ مسرت سے چلا اٹھی ــ

"پہ خیر اوسے اوتے" (خیریت سے رہو) گل خمیر نے کہا ــ

"بیلا لہ گئی ــ" اس نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا ــ

"ہاں" ــ باغی شاہ نے کہا ــ

"طلاق کس وقت دی تم نے؟"

"آج صبح ــ گل بادشاہ کے حجرے میں ــ تمہارا بہت انتظار کیا ــ مگر تم نہ آئے"

"میں سمجھا وہ پہر کو دو گے ــ ہاں تو گواہ کون کون تھے؟"

"حکیم خان اور خیال سید"

"لال داد نے تمہیں اسی وقت روپے کیوں نہ دیئے؟"

"خدا جانے ــ کہنے لگا ــ دوپہر تک بھیجدوں گا"

"یہ ابھی مجھے دے کر گیا ہے ــ بہت جلدی میں تھا ــ میں اس سے کچھ پوچھ ہی نہ سکا" گل خمیر نے نوٹوں کو باغی شاہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ــ

"چائے پیو گے؟" خیرزنہ خوشی سے بے قرار ہو کر بولی ــ اس کی نظریں نوٹوں کے بنڈل پر جمی ہوئی تھیں ــ

"نہیں اوتے ــ میں ابھی پی کر آیا ہوں"

باغی شاہ روپے گننے لگا ــ

"ذرا آہستہ آہستہ گنو بیٹا ــ" وہ چولہے کے پاس سے اٹھ

...کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے بولی۔

"بیلا کا نکاح عید کے بعد ہی لال داد سے ہو گا۔ عید تک اُس کی طلاق کو تین ماہ پورے ہو جائیں گے۔" گل نگینہ بولا۔

"میں کل ہی تھانہ سے سید آپا کو لا لاؤں گی۔ وہ مرد وہ ہزار جھمیلے میں راضی ہو جائے گا۔"

"مرتابہ سید آپی کی پھوپھی ہے؟"

"ہاں"

"وہ بہت فتنہ پرور عورت ہے — تو یہ — بھتیجی بھی ویسی ہو گی۔"

"وہ کیسے؟" خیر زتہ حیران ہو کر بولی۔

لال داد کو اُس نے بتایا تھا۔ کہ بیلا کو بخار اور کھانسی والی بیماری ہے۔"

باغی شاہ اور خیر زتہ نے دوسرے کو تعجب سے دیکھا۔

"تو پھر —؟" — خیر زتہ نے جلدی سے پوچھا۔

"وہ مجھے کہنے لگا۔ کہ میں نے بیلا کو خود دیکھا ہے — وہ صحت مند عورت ہے۔"

باغی شاہ اور خیر زتہ کے چہروں پہ حیرت کی ...

"اُسے مرتابہ کی بات پہ غصہ بھی آیا — کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں، کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔ مگر اُسے کیا پتا؟ ... اُس نے تو شبہ کیا تھا کہ لال داد اپنے بھائی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اُس کی زمین پہ قبضہ کر لے۔ اور اُس کی بیوہ سے نکاح کر لے۔ حالانکہ میرے ذہن میں کبھی ایسا خیال بھی نہیں آیا۔"

"ہوں — اور تم نے کیا کہا — بیلا کے بارے میں؟" باغی شاہ نے پوچھا۔

"مجھے تو کچھ کہنا ہی نہ پڑا!! مرتابہ اور اُس کے گھر والے تو خود ہی بُرا بھلا کہنے لگ پڑے۔ میں نے یہی کہا۔ کہ اگر وہ بیمار ہوتی، تو کیا مجھے علم نہ ہوتا؟ اور اگر بالفرض وہ بیمار ہی نکلی۔ تو کیا ہے میں خود اُسے وزیرستان لے جاؤں گا۔ تیراہ لے جاؤں گا۔ اور ... کوئی مشکل کام تو درپیش نہیں ہو سکتا۔"

پتھریلے دیس پر ایک دھماکہ ہوا — کالے کالے بادلوں میں بجلی کی باریک سی سنہری لکیر لہرائی۔ اور لہرا کر غائب ہو گئی — اور کالے کالے بادل زور سے چیخ پڑے۔

[illegible]

بوڑھاپے کا لڑکپن

(تمثیل ایک باب میں)

کردار

استاد

نوجوان — سکول کا سابق طالب علم

لڑکا — سکول کا طالب علم

مشیر — سکول کا ریٹائرڈ استاد

منظر :- ایک سکول کے ہیڈ ماسٹر کے مطالعے کا کمرہ ۔ بائیں طرف کھلی ہوئی کھڑکی سے خوبصورت دیہاتی باغ کا منظر نظر آ رہا ہے ۔ کھڑکی کے ساتھ آتش دان ، [illegible] ایک دروازہ جو غالباً کے [illegible] کو جاتا ہے ۔ آتش دان معمولی قسم کے اونی کپڑے سے ڈھکا ہوا ہے ۔ ساتھ ہی دیوار میں تھوڑی سی جگہ ہے جس پر [illegible] ہے ۔ دائیں جانب کتابوں سے بھرے ہوئے بک شیلف رکھے ہیں ۔ اس کے ساتھ ایک اور دروازہ ہے جو مکان کے اندرونی حصے میں کھلتا ہے ۔ کمرے کی [illegible] استاد کے ذوق کی آئینہ دار ہے ۔ دیواروں پر ہلکے رنگ کے کاغذ چپکائے ہیں اور فرش پر [illegible] رنگ کا قالین بچھا ہے ۔ دیواروں پر [illegible] کی تصاویر لگی ہیں جو آسانی سے پہچانی نہیں جاتیں ۔ سگریٹ ، سگار ، پائپ ، تمباکو اور ماچسیں بڑی تعداد میں پڑی ہیں ۔ درمیان میں ایک میز ہے ۔

وقت :- سردی کا دن [illegible] اندھیرا نہیں ہوا ۔ آتش دان میں کافی آگ جل رہی ہے ۔

[illegible] دروازے میں سے ادھیڑ عمر کا استاد نمودار ہوتا ہے ۔ اس کے پیچھے پیچھے فارغ التحصیل نوجوان (جو کافی مدت پیشتر اس سکول میں پڑھتا رہا ہے) داخل ہوتا ہے ۔ (نوجوان کی عمر تیس برس کے قریب ہو گی)

استاد :- [illegible] ہے تم اس کمرے سے واقف ہو ۔

نوجوان :- [illegible] واقف ! ..... میں تو اس کے چپے چپے سے واقف ہوں ، ذرا ٹھہریئے مجھے غور سے دیکھنے دیجئے (سانس روک کے [illegible] دیکھتا ہے) ---- وہی کتابیں ہیں ---- (کتابوں کو غور سے دیکھتا ہے) ---- میں تو ان کے نام تک بتا سکتا ہوں ---- [illegible] ---- وہی تصویریں ---- (تصویریں دیکھتا ہے) ---- اور یہ پرانا کلاک !

[illegible] ابھی تک ٹھیک وقت دے رہا ہے ۔

نوجوان ۔ (دیکھتا رہتا ہے، جو اندر بند ہو گیا ہے کہ استاد کی بات سن ہی نہیں پاتا) ——— اور پھر یہ کھڑکی! باہر کا منظر ——— (کھڑکی سے باہر جھانکتا ہے) ———
یہ سیب کے درخت . . . . دیکھئے یہ درخت ہمیشہ سے اسی جگہ پر کھڑے ہیں! ——— بڑی اکتانہ بات ہے کہ [illegible] انسان
حیران رہ جاتا ہے۔

اُستاد ۔ (کھڑکی کے قریب نوجوان کے پاس جا کر) اور یہ دیکھو ہم نے اب کے ٹینس کورٹ کے اندر گرد جالی لگوا دی ہے۔

نوجوان ۔ جی ہاں میں دیکھ رہا ہوں! کیا کہنے اس کے!! (پھر اپنے خیالوں میں کھو جاتا ہے) ...... یہ کمرہ ...... اس کا یہ ماحول .... یہ کتنی اثر انگیز ہے ...... یہی وہ چیز ہے جو انسان کو سکول چھوڑنے کے بعد میسر نہیں آتی ...... نہ کوئی رنگ ہے دآرائش نہ سجاوٹ ......
میرا خیال ہے کہ اب بڑے لڑکوں کو اچھے اچھے کمرے مہیا کرنا تو قریباً ناممکن ہو گا؟ ...... کیونکہ وہ تو ہیں ہی سر پھرے! ...... شاید ان کے لئے اس قسم کے سادہ اور بے رنگ کمرے ہی مناسب ہیں ...... لیکن مجھے ...... مجھے اسکول کے دنوں میں ایک اچھے سجے سجائے کمرے میں رہنے سے بے انتہا خوشی ہوتی تھی۔ اور قالین پر کھڑے ہو کر ایک آرام کرسی اور اس پردے ——— ؟؟؟ (پردہ اٹھا دیتا ہے)
...... ارے اس پردے کے پیچھے کیا ہے؟ یہ میرے لئے ہمیشہ ایک راز ہی رہا!۔

اُستاد ۔ (پردے کو ہٹا دیتا ہے) بیٹ اور کوٹ!

نوجوان ۔ (غور سے دیکھتا ہے) ارے یہاں تو صرف کپ بورڈ ہے۔ مجھے تو آج تک سان گمان بھی نہیں تھا یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے میں نے قطب شمالی دریافت کر لیا ہے۔ ...... (پردہ گرجاتا ہے) کہئے آپ اب بھی سزا دینے کے لئے چھڑی استعمال کرتے ہیں ——— (ایک کونے میں دیکھتا ہے)

اُستاد ۔ ان دنوں تم چھڑی کو اس کونے میں نہیں پاؤ گے کیونکہ مجھے ایک دفعہ بڑا برا تجربہ ہوا تھا۔

نوجوان ۔ جی ہاں! جی ہاں!! میں نے بھی سنا تھا!!!

اُستاد ۔ ۔ اصل گبن کی کتاب "سلطنتِ روما کا عروج و زوال" سے تو چھڑی کا خاص تعلق ہے۔ اس کتاب کو پڑھاتے ہوئے اس کا استعمال ضروری ہے
چھڑی کی یاد بھی خوب آئی۔ لو میں اسے نکالتا ہوں۔ (چھڑی نکالتا ہے) آج سکول کے بعد ہوتے ہی ایک لڑکے کو سزا بھی دینی ہے۔

نوجوان ۔ (حیرت زدہ) جی میں یہ چھڑی دیکھ سکتا ہوں؟ (چھڑی پکڑ لیتا ہے) ارے اس میں تو ذرا بھی تبدیلی نہیں آئی!

اُستاد ۔ (ہنستا ہے) افسوس تمہیں غلطی لگی۔ میاں تمہارے جانے کے بعد میں اب تک چند چھڑیاں لے چکا ہوں۔

نوجوان ۔ (سادگی سے) سب کی سب ٹوٹ گئیں؟

اُستاد ۔ ہاں سب کی سب زوال کے ازلی قانون کی نذر ہو گئیں!

نوجوان ۔ (چھڑی کو غور سے دیکھتا ہے) یہ ...... یہ تو بالکل ویسی ہی نظر آتی ہے۔ (چھڑی کو گھماتا ہے) یہ تو بالکل اسی طرح گھومتی ہے۔
ایسے لگتا ہے جیسے کل ہی .... (پھر خیالات میں غرق ہو جاتا ہے)۔

اُستاد ۔ اس وقت بیٹے دنوں کی کونسی یاد تازہ کر رہے ہو؟

نوجوان ۔ (چونک کر) جی! ...... ہاں! ہاں!! مجھ پر بھی تو ایسے کئی حادثے گزرے ہیں؟ میں بھی کیسا احمق، غلیظ اور فقیر سا تھا ...... دیکھئے ان دنوں میں کتنا پیٹو ہوتا تھا۔ مغلظات بکا کرتا تھا۔ اور میری زبان انتہائی گندی ہوا کرتی تھی ...... کتنا سست تھا۔ عام خیال تھا کہ میں ناقابلِ اصلاح ہوں۔ ان سب باتوں کی یاد کیسی عجیب سی لگ رہی ہے ...... میں آپ کو کس کس ڈھب سے تنگ کیا کرتا تھا! ...... آپ

[illegible] میرے متعلق کیا سوچتے رہتے ہوں گے!!

اُستاد:- میرے دوست!

نوجوان:- اور میرے دوسرے قابلِ احترام اُستاد جو ہیں مسٹر سٹاڈرٹ تھے ...... کافی پاٹ ..... اور پنڈلفرز تھے۔ اور وہ کہن سال اُستاد ...... وہی مشیر صاحب ...... ہیں نا؟

اُستاد:- ہاں مشیر صاحب ...... کتنے اچھے تھے! میرا خیال ہے تم نے ان کی سبکدوشی کی خبر تو سُن ہی لی ہوگی۔

نوجوان:- جی؟ ..... کیا وہ کنٹی ڈیل سے چلے گئے ہیں؟

اُستاد:- انہوں نے کالج کی ملازمت چھوڑ دی ہے .... دراصل ان کا اپریشن ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کی صحت گر گئی تھی اس لئے انہوں نے ملازمت ترک کر دی ...... ویسے وہ یہیں شہر میں مقیم ہیں ..... تم انہیں اکثر کالج کے میدانوں میں گھومتے پھرتے دیکھو گے .... وہ اب بھی کالج کے کئی کاموں میں برابر دلچسپی لیتے ہیں .... گپ بازی کے لئے تو وہ اکثر تشریف لایا کرتے ہیں۔

نوجوان:- (متاثر ہو کر) بڑے اچھے انسان تھے وہ! دراصل وہ فلسفی تھے فلسفی ...... آپ کا کیا خیال ہے؟ مجھے یاد ہے کہ وہ اکثر یونانی اور لاطینی زبانوں کے ترجمے کا کام کراتے کراتے درمیان میں ہی ماترلنک کے "شہد کی مکھی کی زندگی" اور کہن سالی کے متعلق باتیں بتایا کرتے تھے۔

اُستاد:- مشیر صاحب بڑھاپے میں بڑے توانا اور مضبوط نظر آتے ہیں۔ میں تو ان دنوں ان کا شاگرد رہ چکا ہوں جب ابھی تم نے غالباً جنم بھی نہیں لیا ہوگا۔

نوجوان:- ارے آپ بھی ان کے شاگرد ہیں؟ ..... خوب خوب ...... مگر اب تو وہ بڑے بوڑھے ہوں گے ..... وہ کتنے بلند نظر انسان تھے ...... اور کتنی جلدی انسان کے دل کی گہرائیوں تک جا پہنچتے تھے۔ اور کیسے آپ کے سارے حالات جان لیا کرتے تھے۔ مجھے وہ دن تو کبھی نہیں بھولے گا ...... جس دن ہم ان سے آخری بار سبق پڑھ رہے تھے۔ میری عمر تو چودہ سال کی ہوگی ..... وہ ہر ایک کو پاس بلاتے تھے اور اس کی سال بھر کی سرگرمیوں پر خیالات کا اظہار کر کے پھر اس کو رخصت کر دیتے تھے ..... جب میری باری آئی تو انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہت آہستہ اور بڑے مؤثر انداز میں کہا۔ "ٹیمپیسٹ تم جب تک زندہ رہو گے تمہیں یہ افسوس ہی رہے گا کہ تم نے یہ سال ضائع کر دیا" ـــــ اس فقرے نے میری تمام تعطیلات کا ستیاناس کر دیا۔

اُستاد:- (بے تاب ہو کر) کیا ان کی پیشین گوئی صحیح نکلی؟

نوجوان:- میں تو اسے فراموش کر چکا ہوتا لیکن زیادہ عرصہ نہیں گذرا جب میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں بھی اپنے خیالات کا اظہار کروں۔ ـــــ میرے دل میں کوئی شے تخلیق کرنے کا جذبہ جاگ اٹھا ـــــ خیر نہیں میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اسے آپ سمجھ بھی رہے ہیں کہ نہیں ـــــ بہرکیف میری یہ خواہش کسی "سنسنی خیز" چیز کی دریافت میں میری رہنمائی کرنے لگی ...... مگر افسوس کہ میں اپنے خیالات کا اظہار نہ کر سکا .... کیونکہ مجھے نثر لکھنے کا کوئی طریقہ ہی نہیں آتا تھا ...... میں کوئی اسلوب ہی نہیں جانتا تھا!

اُستاد:- اچھا!

نوجوان:- جی ہاں .... مجھے صرف ایک شے تحریر کا اسلوب بخش سکتی تھی اور وہ تھی لاطینی زبان سے واقفیت ...... اور صرف ایک انسان تھا جو مجھے لاطینی زبان پڑھا سکتا تھا ...... لیکن جس سال مجھے اس انسان کی شاگردی کا فخر حاصل ہوا وہ سال میں نے یونہی ضائع کر دیا ....

اور اس کے بعد مجھے کوئی موقع نہ ملا ..... جس کی وجہ سے میں پیچھے رہ گیا ۔ میں اپنا تمام پڑھائی نہ کر سکا ۔ اب میں کیا ہوں ۔ ملازمت کے پورے ایک فرد ۔ اور کچھ بھی نہیں ... مجھے عمر بھر اس چیز کا افسوس رہے گا ۔ (وقفہ)

اُستاد: ہم میں سے کونسا انسان ایسا ہے جس نے اپنی زندگی ـــ خصوصاً ابتدائی زندگی ـــ میں کوئی نہ کوئی شے نہیں کھوئی ۔ جس کا اسے افسوس نہ ہو ؟ .... جب مجھے اپنے سکول کے دن یاد آتے ہیں تو ....

نوجوان: سکول کی زندگی کتنی عجیب ـــ کتنی دلچسپ ہوتی ہے ! ..... یہ ہیجان .... یہ لڑائیاں ...... یہ جھگڑے ۔ یہ سب کتنی سنجیدگی سے وقوع پذیر ہوتے ہیں ۔ ...... ان دنوں کی تلخ ترین یادوں میں بھی کتنی لذّت ، کتنی کشش اور کتنا مزا ہوتا ہے ..... اور وہ پرانی چھڑی ..... اور یہ اس کی ہمزاد چھڑی .. ..

اُستاد: (مسکراتے ہوئے) میرا خیال ہے تم اس چھڑی والا موضوع چھوڑو گے نہیں !

نوجوان: جی ہاں اسکول کی تمام زندگی سمٹ سمٹا اس میں ہی تو آجاتی ہے ..... اور دیکھئے نا چھڑی سے انسان کو ہمیشہ ضرب ہی پہنچی ہے نا

اُستاد: مجھے ان باتوں سے بڑی خوشی ہوئی ہے ۔

اُستاد: جی میرا اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں سزا اور تمام قصوں کا تذکرہ کرنے لگا ہوں ..... نہیں بلکہ میں فقط اُن ابتدائی تیاریوں کا ذکر کروں گا جو سزا سے پہلے کی جاتی تھیں ..... اس وقت میرے سامنے تمام منظر آ رہا ہے ...... میں ڈرتے ڈرتے دروازے پر دستک دیا کرتا تھا ..... اندر سے آواز آتی تھی .... آجاؤ .... پھر ایک تحیّر کن وقفہ آتا ..... اس کے بعد میں خاموشی کو توڑتا .....
" مجھے آپ نے طلب فرمایا ہے ؟ " ..... " ٹمپیسٹ تم جانتے ہو میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے ؟ " ..... اس کے بعد پھر وقفہ آتا ۔
..... " ٹمپیسٹ تمہیں یاد ہے پچھلی مرتبہ میں نے تم سے کیا کہا تھا .... یاد ہے نا ؟ " ...... " جی ہاں " ...... " تو پھر کیا تم نے ٹھیک نہ ہونے کی قسم کھا رکھی ہے ..... ٹمپیسٹ تم کبھی بھی درست نہیں ہو گے ؟ " اور پھر میں کہا کرتا " پتہ نہیں جناب "

اُستاد: (ہنستے ہوئے) یہی کچھ ہوتا تھا ۔ بھئی سب اُستاد یہی کچھ کیا کرتے ہیں ۔

نوجوان: پھر آپ ہونٹ سکیڑ لیتے ، اور کہتے ' اچھا یہ بات ہے تم اسی چیز کی توقع کرتے ہو ۔ تو پھر پاؤ سزا " ـــ آپ چھڑی نکالتے اور کہتے ' اب کے تمہیں چار بید ماروں گا اور اگر آئندہ ایسی حرکت کی تو چھ .... اس کرسی پر جھک جاؤ ' ..... اس کرسی پر (کھڑکی کے پاس پڑی ہوئی کرسی کے بازو کو پکڑ کر اشارہ کرتے ہوئے) ..... یہی کرسی تھی نا ؟ کیوں جی درست کہہ رہا ہوں نا ؟ (اُستاد سر ہلاتا ہے) پھر میں اس پر جھک جاتا (کرسی پر جھک جاتا ہے) ..... ایک اور وقفہ آتا ...... یہ وقفہ انتہائی خوفناک اور ..... اور طویل نظر آتا ...... اور پھر ......

اُستاد: بھئی میرا خیال ہے اور مناسب یہی ہے کہ یہ ذکر یہیں رہنے دو ۔

نوجوان: جی ہاں یہ وقت انتہائی نازک ، اور مشکل ہوتا تھا ..... اور اس کے بعد جب یہ کام ختم ہو جاتا .... تو میں باہر چلا جاتا ... باہر شوریدہ سر اور زندہ دل لڑکوں کا ہجوم موجود ہوتا .... میں آپ کے کمرے سے نکلتے ہی ان کا ہیرو بن جاتا کیونکہ جو لڑکا بغیر روئے اتنے بید کھا لیا کرتا تھا وہ وقتی طور پر لڑکوں کا ہیرو بن جایا کرتا تھا ۔ اور خوش قسمتی سے اس مار کے نشان دوسری صبح تک موجود رہتے اور اس وقت نہانے کے دوران نظر آتے ... . ماسٹر صاحب یہ اعزاز بھی کوئی معمولی اعزاز نہ تھا (اس کے چہرے سے خوشی کے آثار مٹ جاتے ہیں اور وہ

لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے بیٹھ جاتا ہے) —— Ehue Fugaces

اُستاد۔ مجھے تمہیں اتنی ہی واقفیت آتی ہے!

نوجوان۔ (متأسفانہ) یہ دن میری زندگی کے حسین ترین دن تھے اور اب یہ کبھی بھی واپس نہیں آئیں گے (اُستاد اپنی گھڑی نکالتا ہے) —— میری باتوں سے آپ پریشان تو نہیں ہو رہے؟

اُستاد۔ نہیں بالکل نہیں ..... بات صرف اتنی ہے کہ ابھی چند لمحوں میں میری اس چھڑی کا شکار آنے والا ہے اس وقت تمہیں ذرا باہر جانا پڑیگا

نوجوان۔ مگر اس نے کیا گناہ کیا ہے؟

اُستاد۔ وہی گناہ جس کے تم مرتکب ہوا کرتے تھے۔

نوجوان۔ دوسرے اُستادوں کی رپورٹیں؟

اُستاد۔ ہاں .... اس لڑکے کا یہ پانچواں سال ہے بے انتہا شریر ہے۔ بالکل بندر کی طرح —— مجھے سخت تنگ کر رکھا ہے۔

نوجوان۔ آپ اسے کتنے بید ماریں گے؟

اُستاد۔ تم سمجھتے ہوگے کہ بہت سے بید ماروں گا ..... ہیں ..... دیکھو تم ذرا کھانے والے کمرے میں ٹھہرو ... ہیں ..... جاؤ نا اب ...... راستہ تو تم جانتے ہی ہو!

(جانے کے لئے اندرونی حصے میں کھلنے والے دروازے کی طرف جاتا ہے)

نوجوان۔ (ملتجیانہ) دیکھئے مجھے اس پردے کے پیچھے چھپ جانے دیجئے۔

اُستاد۔ کیا!

نوجوان۔ مجھے یہ تمام منظر دیکھنے دیجئے۔ کاش آپ جانتے کہ میں اس سے کیا سبق حاصل کروں گا۔ .... آپ اجازت دے دیجئے نا ..... میں اس کے عوض ہر چیز دینے کے لئے تیار ہوں۔

اُستاد۔ لیکن یہ اچھی بات نہ ہوگی؟

نوجوان۔ اس کو کیا علم ..... اسے کچھ بھی معلوم نہیں ہوگا اور اگر اس نے دیکھ بھی لیا .... تو .... تو ..... خیر کوئی بات نہیں ...... یہ بھی تو ایک معرکہ ہوگا! ..... میں اپنے ماضی کو دوبارہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں گا۔ .... میں آپ سے درخواست کرتا ہوں۔

اُستاد۔ بھئی یہ بہت بری بات ہے ......

نوجوان۔ لیکن اگر آپ نے اجازت نہ دی تو میں رو دوں گا۔

اُستاد۔ (ہچکچاتے ہوئے) ٹمپیسٹ تم ہی بتاؤ اب میں کیا کروں؟ ... (دروازے پر دستک ہوتی ہے) میں .... میں ..... ویسے مجھے یہ بات پسند نہیں ہے .....

نوجوان۔ لیکن آپ مجھے اجازت تو دے دیں؟ (اُستاد اثبات میں سر ہلاتا ہے) اوہ ..... شکریہ .... بہت بہت شکریہ ماسٹر صاحب میں آپ کا یہ احسان کبھی فراموش نہ کروں گا۔ (جلدی سے اسی جگہ جا کر چھپ جاتا ہے)

اُستاد:۔ اندر آجاؤ۔

(باہر کی طرف کھلنے والے دروازے سے گھنگھریالے بالوں والا ایک چھوٹا سا سفید رنگ کا لڑکا داخل ہوتا ہے۔ اس کا کالر اور سوٹ سخت گندا ہے۔ چہرہ اور اُنگلیاں سیاہ ہیں۔ عمر بارہ تیرہ سال کے قریب ہوگی۔)

لڑکا:۔ (ریاکارانہ معصومیت سے) جناب آپ نے مجھے بُلایا ہے؟

اُستاد:۔ (سنجیدگی سے) ہم فورڈ میرا خیال ہے تم جانتے ہو کہ میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے (لڑکا اپنا سر لٹکا دیتا ہے) مجھے مسٹر ڈیٹنگٹن کی طرف سے ابھی ابھی ایک رپورٹ پہنچی ہے (لڑکا بڑی کوفت محسوس کرتا ہے) ہم فورڈ جانتے ہو میں نے تم سے پچھلی بار کیا کہا تھا؟ (لڑکے کی جواب نہیں) کیوں ہم فورڈ؟

لڑکا:۔ (قریباً سرگوشی میں) جی ہاں جناب!

اُستاد:۔ (ایک لمبی سانس لے کر) ہم فورڈ کیا تم کبھی نہیں سنبھلو گے؟ بولو؟

لڑکا:۔ پتہ نہیں جناب!

اُستاد:۔ اچھا ...... اب تم جانتے ہی ہو کہ میں تم سے کیا سلوک کرنے والا ہوں .... میں تمہیں تنبیہہ کرتا ہوں۔ کہ اب کے تو تم کو سزا کے طور پر چار بید رسید کروں گا مگر آئندہ ایسی حرکت کی سزا چھ بید کی ہوگی۔ (وہ اپنی چھڑی اُٹھاتا ہے) ..... ادھر جھک جاؤ۔

(لڑکا کچھ اس انداز سے کرسی کے پاس جاکر جھک جاتا ہے جیسے یہ اس کا روزمرہ کا کام ہے ..... نوجوان کا سر پردے کے پیچھے سے نمودار ہوتا ہے۔ استاد اپنا گلا صاف کرکے بید اُٹھاتا ہے۔ نوجوان چیخ مار کر اپنی پناہ گاہ سے نکل آتا ہے۔ اور لڑکے کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے)

نوجوان:۔ (ہیجانی جذبات میں) میاں صاحبزادے ...... تم خوش قسمت ہو ..... بڑے خوش قسمت۔ مجھے تم پر رشک آرہا ہے .... کاش میں تمہاری جگہ لے سکتا۔

(اُستاد بڑے غصے سے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ لڑکا بھی حیران سا ہوکر نوجوان کی طرف آتا ہے)

تمہارا کیا نام ہے؟ ...... ہم فورڈ ...... ارے تم کتنے گندے، غلیظ اور نالائق ہو۔ (اُستاد سے) حضور! میں اپنی اس مداخلت کی معافی چاہتا ہوں (پھر لڑکے سے) بے وقوف! احمق!! تم نہیں جانتے کہ تم کتنے خوش نصیب ہو ..... میرے یہ الفاظ دل پر نقش کرلو .... میں بھی انہی راہوں سے گزرا ہوں جن سے تم آج کل گزر رہے ہو ...... میں اس سکول کا پرانا طالب علم ہوں .... میں یہاں سات سال تک پڑھتا رہا ہوں اور یہاں مجھے فٹ بال کا اچھا کھلاڑی ہونے کے اعزاز میں انعام بھی ملا تھا۔ مجھ پر بھی سینکڑوں بار وہی کیفیت گذری ہے جو آج تم پر گذر رہی ہے۔ میں بھی اس کرسی کے اوپر دل میں یہ دُعا لئے جھکا ہوں کہ کاش زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں .... آہ کتنے پُر مسرت ...... کتنے حسین تھے وہ دن تم نے فاؤسٹ کی کہانی سُن رکھی ہے نا؟ نہیں سنی .... خیر کوئی مضائقہ نہیں۔ سو سنو فاؤسٹ اپنی روح شیطان کے ہاتھوں فروخت کر دیتا ہے۔ اور اس کے عوض اپنی کھوئی ہوئی جوانی حاصل کرتا ہے ....، اگر مجھے کبھی کوئی ایسا موقعہ پیش آیا تو میں بھی فاؤسٹ کے نقش قدم پر چلوں گا۔ میں بھی اپنی روح کے عوض ماضی کے حسین ترین دن خرید لوں گا۔ سُن رہے ہو نا؟ ...... میں پھر یہاں واپس آجاؤں گا اور تمہارے ساتھ ڈیسکوں پر بیٹھ کر سوالوں کے جواب دیا کروں گا .... اور سکول میں چھٹی ہوتے ہی انتہائی وحشیانہ انداز میں گھر بھاگ جایا کروں گا اور پھر اپنا فلینل کا پاجامہ پہن کر گندی مٹھائیاں کھایا کروں گا۔ اور سگریٹ کی خالی ڈبیاں

پشیمان ہوں گا ۔ اور پھر سال بھر بعد قطار میں کھڑے ہو کر اپنے کئے کی سزا پایا کروں گا ۔ ...... میں بڑی خوشی سے اس سزا کو جھیلوں گا ..... دیکھو میں ابھی اس کرسی پر جھک جاتا ہوں اور تم جتنا چاہو مجھے مارو ..... اپنی پوری طاقت سے مجھے مارو ..... لیکن مجھے صرف ان احساسات کی ہلکی سی بازگشت سن لینے دو ...... مجھے جان لینے دو کہ اس وقت احساسات کی رَو کس طرف بہتی ہے ۔ جب ہم لڑکپن میں اس کرسی پر جھک جاتے ہیں تاکہ استاد حضرات کی چھڑیوں کا نشانہ بنیں .... لیکن ... لیکن میں اب ان احساسات سے آشنا نہیں ہو سکتا .... وہ گذر گئے ہیں .... وہ ماضی کا واہمہ بن کر رہ گئے ہیں .... وہ لمحے واپس نہیں لائے جا سکتے ..... میرے خوش قسمت دوست ! ...... تم بے انتہا خوش نصیب ہو ...... یقین جانو تم بڑے خوش قسمت ہو ۔

(وہ نڈھال ہو کر ایک کرسی پر گر جاتا ہے ۔ لڑکا بے معنی نظروں سے اسے تکتا رہتا ہے ۔ اُستاد اس دوران میں بالکل ساکت و جامد رہتا ہے) ۔

اُستاد ۔ تم فوراً اب تم جا سکتے ہو ۔

لڑکا ۔ (اپنے کانوں پر مشکل اعتبار کرتے ہوئے) اوہ ..... شکریہ جناب !

(وہ بڑی خاموشی سے باہر نکل جاتا ہے .... پھر ایک وقفہ)

نوجوان ۔ (سر اٹھاتے ہوئے) میں معافی کا خواستگار ہوں جناب ۔ افسوس میں ضبط نہ کر سکا ۔ میں نے جو کچھ کیا ہے مجھے اس کا احساس ہے .... میں نے بہت بُری حرکت کی ہے ۔ لیکن میں مجبور تھا ۔ میرے جذبات اس قدر مشتعل ہو چکے تھے کہ میں ان پر قابو نہ پا سکا .... کیا آپ مجھے کبھی معاف نہیں فرمائیں گے ؟

اُستاد ۔ (بڑی سنجیدگی سے اور اپنے اوپر ضبط کر کے) میاں میں بڑی کشادہ دلی سے تمہیں معاف کرتا ہوں ۔ آخر تم نوجوان جو ٹھہرے !

نوجوان ۔ (زخم خوردہ) نوجوان ؟

اُستاد ۔ ہاں نوجوان ! بالکل نوجوان !!

نوجوان ۔ (حیران سا ہو کر) آپ سنجیدگی سے کہہ رہے ہیں (اُستاد اثبات میں سر ہلاتا ہے) تو پھر معاف کیجئے ۔ مجھے اس شرط پر معافی نہیں چاہئے ۔ دراصل آپ نے مجھے غلط سمجھا ہے ۔ میں درحقیقت نوعمری کی منزل سے گزر چکا ہوں (اُستاد کنکھیوں سے اسے دیکھتا ہے) !!! !!! !!! آپ کے اس خیال کے پیچھے بے پناہ طنز اور انتہائی تلخی ہے جسے میں نہیں نگل سکتا ۔ میں جانتا ہوں میں بڑی گھٹیا سی جذباتی تقریر کر رہا تھا ۔ مگر کم از کم اس میں خلوص ضرور تھا اور جہاں تک میرا خیال ہے اس کا لب لباب بھی میں نے واضح کر دیا تھا ۔

اُستاد ۔ ٹھیک ہے تم نے اپنا مقصد واضح کر دیا تھا ۔ میں بھی یہی کہہ سکتا ہوں نا ۔

نوجوان ۔ تو پھر ؟ .... کیا آپ اس کی شدت سے متاثر نہیں ہوئے ؟ آپ اور آپ جیسے دوسرے لوگ ؟؟؟ .... دراصل ایک اسکول ماسٹر مجبور ہوتا ہے کہ تمام عمر ایسے ماحول میں گزار دے جہاں قدم قدم پر دلوں کے شیشے چکنا چور ہو جاتے ہیں ۔ اگر میں یہاں رہوں تو میں ہر وقت گزرے ہوئے سہانے دنوں کو یاد کرتے کرتے پاگل ہو جاؤں گا ۔

اُستاد ۔ (بے تابانہ) ٹھیک ہے تم نے مجھے پہلے بھی یہی کہا تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ سکول ماسٹر بڑے قدامت پسند اور بے دماغ ہوتے ہیں ۔ مگر تم ہم سکول ماسٹروں میں سے کسی ایک بھی کو اپنے ماضی کے سہانے دنوں کو یاد کرتے ہوئے اور ان کا حوالہ دیتے ہوئے سن لو تو میں تمہارے ہاتھوں پھانسی پر چڑھنے کے لئے بھی تیار ہوں ۔

نوجوان:- (ضد سے) ماضی کو یاد کرنا قدامت پسندی اور بے دماغی تو ہو سکتی ہے مگر یہ ہے تو حقیقت۔

اُستاد:- ہا! ہا!! ہا!!!

نوجوان:- آپ ہنستے ہیں ...... شاید آپ اسکول کے ایام میں خوش نہیں تھے ؟

اُستاد:- ان دنوں مجھے انتہائی خوشی حاصل تھی۔

نوجوان:- اور اب ؟ اب آپ کیسے ہیں ؟ اوہو ٹھیک میں سمجھ گیا ...... در اصل آپ کو اپنے موجودہ ماحول سے کوئی گلہ اور کوئی شکایت نہیں آپ قطعی مطمئن ہیں۔ میرا خیال ہے کہ جب میں آپ کی عمر تک پہنچ جاؤنگا تو میں بھی مطمئن ہو جاؤنگا۔ لیکن کہیں آپ کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کو ان دنوں بھی اتنی ہی خوشی حاصل ہے۔ جتنی سکول کے دنوں میں تھی ؟

اُستاد:- تم بتاؤ کہ تم کو اس وقت ان دنوں والی خوشی نہیں حاصل جو تم نے سکول میں گزارے ہیں ؟

نوجوان:- نہیں .... بالکل نہیں ..... کاش آپ جانتے کہ ......

اُستاد:- اگر میں جانتا ہوتا تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ....

نوجوان:- میں بعض اوقات حیران رہ جاتا ہوں کہ دنیا میں کوئی انسان ایسا بھی ہے جو میری طرح تخیل کی دُنیا میں اس درجہ بلند پرواز ہے ؟ ...... لیکن اس کے باوجود مجھے یقین ہے کہ میں غیر معمولی انسان نہیں ہوں۔ یقیناً دوسرے لوگ بھی احساس، خواہشات، اور مقاصد رکھتے ہیں۔ مگر شاید میں اس معاملے میں ان سے کمزور ہوں۔ مجھے تو ہمیشہ ایسے لگتا ہے جیسے میں سُولی پر چڑھا ہوا ہوں ..... اور سولی کی یہ تکلیف اگر آسمان کی بلندی نہیں تو کھجور کی اونچائی ضرور ہے ...... یہ دُکھ، یہ مصیبت .... ایک جہنم ہے جہنم۔ اس سے زیادہ خوفناک اور کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔

اُستاد:- بھئی میں سگریٹ پی لوں بُرا تو نہیں مانو گے ؟ (ایک سگریٹ نکالتا ہے)

نوجوان:- انسان سکول کو چھوڑ کر کتنی سادگی، خلوص اور اعتماد، کتنے شوق اور معصومیت سے اس عظیم دنیا میں داخل ہوتا ہے۔ پہلے پہلے یہ دنیا بڑی خوبصورت اور خوشیوں کا گہوارہ نظر آتی ہے۔ لیکن جیسے ہی وہ اس میں قدم دھرتا ہے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ اس کا حسین خواب پریشان ہو جاتا ہے اور تار تار ہو کر بھیانک سراب کا روپ بھر لیتا ہے۔ میں بھی پہلے پہل اسی طرح سوچا کرتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ہر چیز میری قدرت کے احاطے میں ہے۔ لیکن مجھے اب یہ پتہ چلا ہے کہ میں تو کچھ بھی نہیں .... کچھ بھی نہیں ..... دنیا کو میری کوئی ضرورت نہیں ...... میں تو صرف ردی کاغذ کا ایک پرزہ ہوں ..... بدوضع اور بے ضرورت ...... مجھے اپنی زندگی کا کوئی جواز نظر نہیں آتا ..... اور آج میرے ہاتھ سے ہر اُمید کا دامن چھوٹ چکا ہے۔ یقین اور اعتماد چھن گئے ہیں ..... زندہ رہنے کی تحریک ختم ہو چکی ہے ..... دیکھا آپ نے دنیا نے مجھے کیا کچھ کر دیا ..... دنیا نے میرے لئے کیا کچھ کیا ...... آہ یہ بدکار درندہ صفت دنیا! مجھے اس دنیا سے نفرت ہے! مجھے اپنے آپ سے نفرت ہے!! مجھے ہر انسان سے اور ہر شے سے نفرت ہے!!!

اُستاد:- واقعی .....

نوجوان:- میرا خیال ہے کہ میرا یہ انداز، یہ روّیہ آپ کو پریشان کر رہا ہوگا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ لیکن در حقیقت ان پچھلے برسوں میں زندگی نے مجھ پر ہر راہ بند کر دی ہے ..... صرف یہی ایک راستہ بچا ہے .... صرف یہی ایک ذریعہ رہ گیا ہے جس سے میرے مشتعل جذبات

شکلیں بدلنے لگتے ہیں ...... مجھے امید تھی کہ میں دنیا سے دور ـــــ بہت دور کسی ایسی جگہ چلا جاؤں گا جہاں صرف پرانی یادوں کے سہارے زندگی کے دن پورے کر دوں گا ..... اور پھر میں ان تلخ تند و تیز اور بے رحم یادوں کو فراموش کر دوں گا۔ جو سایوں کی طرح میرا پیچھا کر رہی ہیں ...... میں ان یادوں سے ہی دامن بچانے کے لئے یہ معمولی باتیں اس انداز میں آپ سے بیان کر رہا ہوں۔

اُستاد:۔ ٹھیک ہے ... ٹھیک ہے۔

نوجوان:۔ میں زندگی سے قطعی طور پر مایوس ہو گیا تھا ..... اس لئے میں نے ایسی ایسی جگہوں کا سفر کیا جن کو دیکھنے کی خواہش مجھے بچپنے سے تھی۔ لیکن میرے درد کا درماں کہیں نہ ملا۔ بلکہ تکلیف اور بڑھ گئی ... جیسے ہی میں ان مقامات کو دیکھتا میرے خیالوں کا طوفان اور آتش خیز ہو جاتا ..... اور جب ایک خاص انسان سے دور رہ کر زندگی کے تسلسل کو برقرار رکھنا ناممکن نظر آتا تو میرا ناسور شدت سے رستا اور درد کی نہ تھمنے والی ٹیسیں جاگ اٹھتیں ....

اُستاد:۔ پھر ......

نوجوان:۔ میں نے کہہ تو دیا .... کہہ دیا ہے نا ؟ ..... میں جانتا ہوں کہ میں ..... (رکتا ہے۔ اس کے چہرے پر کرب ناک سایے لہرا جاتے ہیں اور دل میں ناقابلِ بیان درد جاگ اٹھتا ہے)

اُستاد:۔ اور پھر تمہیں ایسے وقت میں اپنے پرانے سکول کا خیال آیا ؟

نوجوان:۔ جی ہاں ..... ! چانک مجھے الہام سا ہوا ..... اور مجھے یوں لگا جیسے میں نے ایک چھوٹے سے خوبصورت گھر کا خوبصورت باغیچہ دریافت کر لیا ہے۔ جہاں انسان سنہری دھوپ اور قدرت کی نیرنگیوں میں کھو کر دنیا بھر کو فراموش کر دیتا ہے۔

اُستاد:۔ مگر وہ انسان ؟

نوجوان:۔ وہ ! ..... وہ تو میرے احاطۂ اختیار سے باہر ہو گیا۔

اُستاد:۔ (سنجیدگی سے) اوہو .... بڑا افسوس ہے۔

نوجوان:۔ لیکن میرے یہاں آنے سے بھی میرا مقصد پورا نہیں ہوا !

اُستاد:۔ ہیں ..... نہیں ہوا ..... مگر باغ تو .....

نوجوان:۔ جی ہاں میں بھی یہی کہہ رہا تھا کہ میں اس باغیچے میں آ تو گیا ہوں مگر آ کر بھی میں دنیا کو بھول نہیں سکا۔ اس سے تو میرا زخم اور بھی گہرا ہو گیا ہے ...... میں جب ان خوش فکر اور غمِ حیات سے بے نیاز لڑکوں کو دیکھتا ہوں تو مجھے وہ وقت یاد آ جاتا ہے جب میں بھی ان جیسا تھا ...... (اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپا لیتا ہے)

(اُستاد ایک ہلکا سا اشارہ کرتا ہے جس سے اس کی بے تابی کا اظہار ہوتا ہے)

نوجوان:۔ (چہرے سے ہاتھوں کو ہٹاتے ہوئے) مجھے تو کبھی ایسا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ دنیا انسان کو اتنی بے دردی سے کچل دیتی ہے اور اس کی آغوش میں غم و آلام کے تختے ڈال کر آگے بڑھ جاتی ہے۔ میں نے بچپن میں اپنی آئندہ زندگی کی بڑی خوشگوار اور چمکیلے رنگوں والی تصویریں کھینچی تھیں (زیرِ لب ہنستا ہے) جب مجھے اس بات کا خیال آتا ہے تو کتنا عجیب سا لگتا ہے ! ...... اف ماسٹر صاحب آپ میری ان باتوں کا برا تو نہیں مان رہے ؟ ..... دراصل ذہن کو اس طرح خالی کرنے سے بڑا آرام اور بڑا سکون ملتا ہے .... یقین کیجئے میں نے

اُستاد۔ (اپنی چھوٹی آنکھوں سے اُسے گھورتے ہوئے) تم حیران ہو کہ میں پھر بھی تمہاری زندگی پر رشک کرتا ہوں۔۔۔۔ دیکھو ابھی تم آزاد ہو۔۔۔ اور تمہارے سامنے مستقبل کے لاتعداد امکانات پھیلے ہوئے ہیں۔۔۔۔ لیکن میں!۔۔۔۔ میں جو ایک غلام ہوں۔۔۔۔ اپنی زندگی کے دن پورے کر چکا ہوں اور اب آخری منزل کے دروازے تک پہنچ چکا ہوں۔۔۔۔ میں نے اپنی آدھی زندگی سوتے سوتے گزار دی اور باقی ماندہ آدھی زندگی کو کولہو کے بیل کی طرح ایک ہی بے رنگ دبلا اور تیرہ و تار راستے پر گزار دوں گا۔۔۔۔ میرے دل میں ہمیشہ آنے والے کل کی تابناکی دھڑکتی رہی۔۔۔۔ میں ہمیشہ کل کل کرتا رہا۔۔۔۔ دن پر دن، ہفتوں پر ہفتے اور سالوں پر سال گزرتے رہے اور میں اس پرانی ڈگر پر انہی پرانی کتابوں میں گم رہا۔۔۔۔ ایک ہی قسم کے طالبعلموں سے الجھتا۔۔۔۔ ایک ہی قسم کی مشکلات، کامیابیوں اور ناکامیوں کا مسلسل شکار ہوتا سالہا سال تک چلتا رہا اور اب ایک منزل پر پہنچ گیا ہوں جہاں مجھے ہر چیز سے نفرت ہے۔۔۔۔ مگر میرے اس مقدر کے لکھے کو کون مٹا سکتا تھا؟ میں نے ابتدا میں کوشش بھی کی مگر وہ تو ایک لہر تھی آئی اور گزر گئی۔۔۔۔ میں تو اس بادشاہ کا کھیل کھیل رہا تھا جو کنارے پر بیٹھ کر سمندر کی موجوں کو اپنی اطاعت کا حکم دیا کرتا تھا اور جب موجیں اس کو گیلا کر جایا کرتیں تو وہ اپنے درباریوں سے کہا کرتا کہ موجیں اسے سلام کرنے کے لئے آتی ہیں۔۔۔۔۔۔

اور اب تمہارے ذہن کی اختراعی قوت بھی ختم ہو رہی ہے۔ اب تم بھی ایک دھڑے پر آ جاؤ گے۔۔۔۔ یہاں میری یہ بات لکھ لو کہ یہ حالت صرف ایک سکول ماسٹر ہی کی نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ تو کم و بیش ہر انسان پر گزرتی ہے۔ اور یہ حالت تم پر بھی گزرے گی۔۔۔۔ سنو۔۔۔۔ غور سے سن لو۔ کہیں کوئی غلطی نہ کر بیٹھنا۔۔۔۔ اب تو تم اپنی حالت کا خیال کر کے خودکشی کا ارادہ کرتے ہو مگر تم ان خیالات سے بڑی آسانی سے دامن بچا سکتے ہو۔۔۔۔ اس معاملے کو یہیں چھوڑ دو سن رہے ہو نا۔۔۔۔ تم جانتے ہو کہ کونسی چیز ہم عمر رسیدہ لوگوں کو خودکشی سے روکتی ہے؟۔۔۔۔ صرف یہی کہ اس سے سخت تکلیف ہوتی ہے۔۔۔۔ یہ تکلیف ہم سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ ہم میں اتنی طاقت نہیں کہ ہم اس کو برداشت کر سکیں اور ہم جو آہستہ آہستہ موت کا شکار ہو رہے ہیں کیوں نہ ایک ہی دفعہ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کر دیں۔ مگر ہم میں اس کی ہمت نہیں۔۔۔۔ میری ان باتوں کو پلّے باندھ لو اور پھر اپنی تکلیفوں کا مقابلہ دوسرے لوگوں کے مصائب سے کرو۔۔۔۔ یہاں مجھے بھی ہمدردی کی ضرورت ہے۔۔۔۔ مجھے اس بڑی دنیا میں اپنے ہمدرد کی تلاش ہے۔۔۔۔ سن رہے ہو نا مجھ ایسے بڈھے۔۔۔۔ گناہ گار کو ہمدردی کی ضرورت ہے!

نوجوان:۔ میں۔۔۔۔ میں نہیں جانتا کہ اب کیا کروں۔۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔۔۔۔ مجھے تو اس کا گمان بھی نہیں تھا کہ۔۔۔۔۔۔۔

(اندرونی جانب کھلنے والے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ ڈاکٹر مشیر داخل ہوتا ہے۔ اس کی داڑھی سفید ہے۔ اس کے چہرے پر گہری لکیروں کا جال بچھا ہوا ہے۔۔۔۔ وہ آگے بڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے)

اُستاد:۔ (ادھر دیکھ کر) اوہ مشیر صاحب!

مشیر:۔ بھئی۔ میں آ جاؤں کوئی حرج تو نہیں؟ اگرچہ مجھے اجازت باہر سے طلب کرنی چاہئے تھی۔۔۔۔ کہئے کوئی خاص بات تو نہیں ہو رہی۔

(آکر نوجوان کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے) تمہارا چہرہ مجھے کچھ مانوس سا دکھائی دیتا ہے۔

نوجوان:۔ (استاد سے) انہیں میرا نام نہیں بتایئے گا (وہ منہ موڑ لیتا ہے) مجھے کچھ شرم محسوس ہو رہی ہے۔

مشیر:۔ (مسکراتے ہوئے) اوہ۔۔۔۔ جی۔ ایف۔ ایس۔ ٹیسٹ۔۔۔۔

نوجوان ۔ جی ہاں وہی احمق جو کبھی لکھنے کا انداز نہ اپنا سکے گا ۔

اُستاد ۔ (خوفزدہ ہنستے ہوئے) اور مشیر صاحب اب وہی نوجوان شاعری کرتا ہے ۔

مشیر ۔ جی شاعری ! تو کیا اس نے آپ کو کچھ سنایا بھی ہے ؟

اُستاد ۔ جی ہاں غیر شعوری طور پر ــــ وہ ہر بات شعر میں کرتا ہے ۔

مشیر ۔ یہ تو بات ہے !

اُستاد ۔ (مرکو جھٹکتے ہوئے) اس نے تو میری رشک کی آگ بھڑکا دی ہے ۔

مشیر ۔ حسد اور رشک کی آگ ؟

اُستاد ۔ معاف کیجئے گا میں بھی ضرورت سے زیادہ جذباتی ہو گیا ہوں ۔

مشیر ۔ آخر کس لئے ؟

اُستاد ۔ اپنی مصیبتوں کے لئے ۔

مشیر ۔ (حیران ہو کر) آپ ..... ارے آپ کب سے ان بکھیڑوں میں اُلجھنے لگے ؟

اُستاد ۔ دیکھئے مشیر صاحب کم از کم آپ تو اس معاملہ میں میری تائید کریں گے ہی ..... میں اپنے اس دوست کو ضعیف العمری کے متعلق کچھ بتا رہا تھا کہ بوڑھے ہو کر انسان کی کس قسم کی حالت ہو جاتی ہے ۔

مشیر ۔ خوب بہت خوب (بے تحاشہ قہقہے لگاتا ہے)

اُستاد ۔ آپ ہنس رہے ہیں ؟ ..... ٹھیک ہے آپ تو ہمیشہ ہنستے ہی رہتے ہیں ... آپ کا تو زندگی کے متعلق ایک مخصوص نظریہ ہے ۔ اور سچ پوچھئے تو جب انسان کا زندگی کے متعلق ایک مخصوص نظریہ ہو جاتا ہے پھر اس کے لئے زندگی مشکل نہیں رہتی اور نہ ہی اسے بڑھاپا بُرا لگتا ہے ۔

مشیر ۔ نظریہ ؟ ارے لعنت بھیجئے اس پر ..... ہاں یہ بتائیے کہ آپ بھی اپنے آپ کو "بوڑھا" کہتے ہیں ؟

اُستاد ۔ جی ہاں میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں ....

مشیر ۔ (پھر بے تحاشہ قہقہے لگاتا ہے) ٹھیک ہے ..... مگر آپ اپنے آپ کو بوڑھا کہنا صرف زیادتی اور انتہائی تعجب کی بات ہے اور صاحب اگر آپ اپنے آپ کو بوڑھا کہتے ہیں تو بتائیے میں اپنے آپ کو کیا کہوں ؟

اُستاد ۔ (قدرے وحشت زدہ) آپ ؟ ...... آپ ؟؟

مشیر ۔ میرے دوست مجھ سے سنئے کہ آپ دراصل کون سی منزل میں ہیں ؟ میرے ایسے عمر رسیدہ اور کہن سال انسان کی بات پلے باندھ لیجئے کہ آپ ..... یعنی آپ انتہائی خوش بخت انسان ہیں !

اُستاد ۔ لیکن اس سے ..... اس سے آپ کا مطلب ؟

مشیر ۔ دیکھئے اگر دنیا میں انسان کے لئے کوئی تسلی اور اطمینان کی منزل آتی ہے تو وہ منزل ہے جس میں ان دنوں آپ کا قیام ہے .... مگر آپ پر یہ بات کبھی منکشف نہیں ہوئی کہ آپ زندگی کی درمیانی اور انتہائی پُر مسرت فضاؤں میں سانس لے رہے ہیں ۔ آپ کی تسکین و

راحت کے لئے ہر قسم کا سامان موجود ہے۔ آپ اس وقت پوری طرح مطمئن ہو سکتے ہیں۔

اُستاد۔ مگر میں تو زندگی کی انتہائی مشکلات، وہ منزل تک پہنچ گیا ہوں۔ میرے مصائب کا پیمانہ لبریز ہو کر چھلک رہا ہے۔

مشیر۔ کیا کہتے ہیں آپ بھی!

اُستاد۔ مجھے آپ کہیں کوئی ایسا مرد یا کوئی ایسی عورت بتائیے ......

مشیر۔ پہلے میں آپ کو آپ کی ذات ہی سے روشناس کراؤں گا۔ اور اس کے بعد جب آپ مطمئن ہو جائیں گے تو پھر میں آپ کو ایسا مرد یا عورت دکھاؤں گا۔ جو واقعی مطمئن ہو ..... لیکن آپ کہہ کیا رہے تھے؟ ...... یہ کہ خوشی اور مسرت کے خزانے لٹ گئے ہیں! ہاں تو سرِ دست بمبئی میں سنئے یہ بات مجھے فقط بزرگوں سے سنی ہے ..... آپ بھی سن لیجئے .... دیکھئے کہ ایک آدمی اپنی بھرپور جوانی میں اپنی پسندیدہ عورت سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے ..... پھر اس کے اولاد صحت مند، ہونہار، اور غیر معمولی خوبصورت کے بچے بھی کھیلنے لگتے ہیں ..... وہ خود بھی صحت مند ہے اور اپنے کام کو اچھی طرح سرانجام دے رہا ہے ..... اسے بچوں کا بھی کوئی غم نہیں کیونکہ اسے یقین ہے کہ وہ بھی اپنی زندگی کامیابی سے گزار جائیں گے ..... وہ آدمی خود ایک اعلیٰ درجے کا کام کر رہا ہے۔ یعنی وہ بہت سے دماغوں کی تربیت کر رہا ہے اور یہ کام ایسا ہے جس میں تنوع ہے .... دلچسپی ہے۔ خوش آئند کشش و خواہش ہے .....
اس طرح یہ آدمی ایک مثالی زندگی گزار رہا ہے۔ اب اس سے زیادہ اس آدمی کو اور کیا چاہیئے ...... آپ سمجھ رہے ہیں نا؟

اُستاد۔ (اداس سا ہو کر) جی آپ ہی بتائیے اس آدمی کو اب کیا کرنا چاہیئے؟

مشیر۔ (آہستہ سے) اسے خود معلوم ہو جائے گا کہ اسے کیا کرنا ہو گا میں تو اسے صرف اتنا کہوں گا کہ وہ انتظار کرے اس وقت تک انتظار کرے جب تک وہ حقیقتاً بوڑھا نہیں ہو جاتا ..... یعنی میری عمر کو نہیں پہنچ جاتا ..... جب تک اس کا پیشہ نہیں چھن جاتا ..... جب تک اس کے ہم نسلوں کے یار دوست ..... اس کے عزیز ترین رشتہ دار اور اس کے جگری دوست موت کا شکار نہیں ہو جاتے ..... جب تک اس کی کمزوریاں اس کی زندگی کو زندگی نہیں ..... بلکہ بوجھ نہیں بنا دیتیں ..... اور جب تک اس کی زندگی سے ہر چیز بالکل علیحدہ نہیں ہو جاتی جس کے سہارے وہ زندگی گزار سکے ...... اور جب اس کی یہ حالت ہو جائے تب اسے اس قسم کے شکوے شکایت کرنے دیجئے ..... اور اپنے مصائب کا ذکر ہمارے کرنے دیجئے تب وہ اپنی گزشتہ زندگی پر ایک نظر ڈالے اور ماضی و حال کا تقابلی مطالعہ کرے۔
..... اپنی کھوئی ہوئی خوشیوں کو یاد کرے ..... تب اگر وہ ناشکری اور عدم اطمینان کے الفاظ کہے تو اس سے شکایت نہیں ہو سکتی!

(اچانک اپنے اس سنجیدہ لہجے پر قہقہہ لگاتا ہے)

اُستاد۔ مشیر صاحب! مجھے بہت افسوس ہے ..... یقین جانئے مجھے اپنی باتوں کا بہت افسوس ہے۔ میں پشیمان ہوں۔

مشیر۔ (اٹھتے ہوئے) بہت خوب ..... آمین! ثم آمین!! آپ تو کچھ سمجھے ..... دیکھئے یہاں پر پہلا سبق ختم ہوتا ہے۔

اُستاد۔ آپ کی گفتگو میں بے پناہ منطق اور وزنی دلائل ہیں .... میں اب آپ کی بات سمجھا۔

مشیر۔ (پُراسرار انداز سے) ہیں منطق اور دلائل۔ بڑی حیرانی کی بات ہے ....

اُستاد۔ یعنی آپ کا مطلب ہے کہ میں بے پناہ دلائل اور خوفناک منطق کو قطعی نہیں سمجھ سکتا؟ ..... مگر ٹھہریئے ..... دراصل ان پر شکوک اور خوفناک دلائل میں کوئی اہل نہ جس وجہت ہے ..... آپ غلط کہہ رہے ہیں .... آپ یقیناً غلط کہہ رہے ہیں .... آپ کو اس گل

تجربہ کیسی ہو ہوگا جس کا منتظر ہیں ...... !

زہرا ...... !

مشیر: دیکھئے آپ کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ اب چھوڑیئے اس بات کو یہیں رہنے دیجئے۔ اس کے متعلق کوئی بات بھی نہ کیجئے۔

اُستاد: ...... صاحب! آپ اس معاملے میں اتنے سخت دل کیوں ہو جاتے ہیں؟ کہیں یہ محض کٹ حجتی اور جنون تو نہیں؟

زہرا: ایک ساعت ٹھہریئے ــــــــ (آہستہ سے) دیکھئے مجھے سب کچھ نظر آ رہا ہے ...... میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں ...... میں نے ایک بہت بڑا نکتہ نکالا ہے ...... وہ درست کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے مشیر صاحب درست فرماتے ہیں ...... (آہستہ سے) اور آپ بھی ٹھیک کہتے ہیں ...... اور میں بھی ٹھیک کہتا ہوں ...... اور وہ لڑکا ...... وہ طفل نادان بھی راہِ راست پر تھا ...... ہم سب راہِ راست پر ہیں اور گمراہ بھی ...... ہم درست بھی ہیں اور غلط بھی ...... ہم سب خوش ہیں اور ہم سب دل شکستہ بھی ...... ہم جب اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں تو شکستہ دل نظر آتے ہیں مگر جب دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں ہم بہت خوش و خرم ہیں ...... اب میں یہ سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ دراصل زندگی خود ایک بہت بڑا مذاق ہے ...... ایک لطیفہ (مشیر جمائیاں لیتا ہے) جی ہاں ...... ایک مذاق ایک لطیفہ ...... لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک حادثہ ایک المیہ بھی ہے ...... ایک خوفناک خواب ...... (مشیر صاحب سے جو بے چینی سے انتظار کرتے ہیں) کہئے صاحب میں واہیات اور بے معنی باتیں کر رہا ہوں!

مشیر: جی ......

زہرا: دیکھئے میرے لئے یہ سب باتیں یاوہ گوئی نہیں ...... ان کا ایک مطلب ہے ایک مقصد ...... یہ میرا انداز نظر ہے ...... میں کہتا ہوں زندگی ایک مذاق ہے ...... مجھے تو یہ مذاق ہی نظر آتی ہے ...... ایک ایسا مذاق جو مجھ سے کیا گیا ہے۔ جو ہم سب سے کیا گیا ہے ...... نہیں بلکہ تمام وحدانیت سے کیا گیا ہے۔ اور انسانیت ہی کے نام پر کیا گیا ہے! ...... دراصل ہم تو ایک کھیل کھیل رہے ہیں ...... نہیں ہم خود نہیں کھیل رہے بلکہ ہم کو کھیلایا جا رہا ہے۔ اور ہم سب اس کھیل کو ایک خوبصورت نام دیتے ہیں ...... !!!! ...... ایک حسین نام! ...... سب یہی سوچتے ہیں کہ یہ عیش و عشرت اور سکون و اطمینان کہاں ہیں؟ ...... مگر یہ تو خلاؤں میں تیر مارنے والی بات ہے نا ...... ہر کوئی سمجھتا ہے کہ اس کا ہمسایہ مطمئن ہے۔ خوش ہے۔ اس کے لئے زندگی ایک حسین عطیہ ہے ...... وہ اپنے ہمسائے پر رشک کرتا ہے ...... حسد اور نفرت کی آگ میں جلتا ہے ...... لیکن وہ اپنے ہمسائے سے کبھی نہیں پوچھتا کہ کیا وہ واقعی خوش ہے مطمئن ہے۔ اسے سکون اور چین میسر ہے؟ ...... سکون اور چین جو اس دنیا میں کہیں بھی نہیں ...... کسی اور دنیا میں بھی نہیں ...... آپ ہی کہئے کہاں ہے خوشی، اطمینان، سکون، راحت؟ ...... کہیں بھی نہیں ...... کسی جگہ بھی نہیں ...... نہ بچپن میں ...... نہ جوانی میں ...... نہ ادھیڑ عمر میں ...... نہ ہی ایامِ پیری میں ...... یہ تو ایک واہمہ ہے۔ ایک فریب ...... ایک بہت بڑا سراب ...... اور بس ...... ہا! کتنا خوبصورت مذاق ہے ...... اگر کوئی انسان اس دنیا میں زندہ رہے اور بہت دور سے اس تماشے کو دیکھتا تو وہ یہ تمام مناظر دیکھ کر کتنا ہنستا ...... کتنا لطف اٹھاتا ......

(اب اندھا اس کا ساتھ نہیں دے سکتا اس لئے درمیان میں ایک وقفہ آ جاتا ہے)

مشیر: (آہستہ سے) یہیں کہہ چکے؟

زہرا: (آہستہ سے) جی!

(ڈاکٹر کمرے سے ایک دوسرے کمرے میں جاتا ہے اور زہرا کے سر سے ٹوپی اتار کر درمیان میں جا گرتا ہے۔)

اُستاد:۔ (غصے سے کھڑکی کی طرف جاتا ہے) مجھے معلوم تھا کہ یہ بدتمیزی ہو کر رہے گی ..... ایک بار کیا لاکھ بار منع کر چکا ہوں۔ (غصے سے) ...

..... ارے کون سے لڑکے نے گیند کو کِک ماری ہے (وقفہ)

ایک لڑکے کی آواز:۔ (باہر سے) جناب م ..... م

اُستاد:۔ ارے تم ..... تم ..... تم فرینڈ :..... کم بخت نظر سے اوجھل ہوتے ہی پھر شرارتیں شروع کر دیں۔ بدبخت مجھ کو کہاں ملے تم سے بارہا کہا ہے کہ میری کھڑکی کے سامنے اس قسم کی حرکتیں نہ کیا کرو ..... اب دیکھتے جاؤ۔ چھٹی کا دودھ یاد کرا دوں گا ..... ادھر آؤ تم ذرا ..... ہاں ہاں ابھی آؤ ..... فوراً (واپس مشیر کے پاس آ جاتا ہے) .... بدمعاش! ..... مشیر صاحب آپ ہی اس کم بخت کا علاج نکالئے

مشیر:۔ آپ اسی لڑکے کے متعلق اگلے روز مجھ سے ذکر کر رہے تھے نا؟

اُستاد:۔ جی ہاں ..... یہ تو مجھے ناقابلِ اِصلاح نظر آتا ہے ...... دیکھئے میں نے اسے بُلایا ہے .... آپ اسے ایک نظر دیکھ لیجئے ..... پھر آپ ہی بتایئے اس کا کیا کیا جائے (لڑکا سر کو جھکائے اندر داخل ہوتا ہے) ...... تم فرینڈ ..... بتاؤ اپنی اس حرکت کا اب کیا جواز پیش کرو گے (لڑکا خاموش رہتا ہے) ..... کچھ بھی نہیں؟ حسبِ معمول کوئی وجہ نہیں! ارے تم خوب جانتے ہو کہ تمہیں اس میدان میں کھیلنے کی قطعی اجازت نہیں؟

لڑکا:۔ جی ماسٹر جی میں بھول گیا تھا!

اُستاد:۔ بُھول گئے تھے! ارے بھُول گئے تھے؟ اچھا یہ بات ہے تو اب ہمیں تمہاری اس یادداشت کا کچھ نہ کچھ بندوبست کرنا ہوگا (مشیر سے) مسٹر ٹائیگر آپ کا کیا خیال ہے؟

مشیر:۔ (لڑکے سے) میرے بچے تم کیوں ان کا حکم بھُول گئے تھے؟

لڑکا:۔ (ڈرتے ڈرتے) جی ... جی .... میں کچھ جوش میں آ گیا تھا۔

اُستاد:۔ جوش!

لڑکا:۔ جناب میں بے انتہا خوش تھا۔

مشیر:۔ ہو ہو (نوجوان بھی حیرانی سے اپنے کان کھڑے کر لیتا ہے) یہ رہی بات!

اُستاد:۔ (لڑکے سے) خوش تھے؟ ہُوں؟ اس لئے کہ آج تمہیں سزا نہ مل سکی؟ کیوں اسی لئے خوش تھے نا؟

لڑکا:۔ (سرخ ہو کر) جی ہاں

اُستاد:۔ سُنا آپ نے مشیر صاحب؟

مشیر:۔ جی ہاں میں سن رہا ہوں ..... اور میرا خیال ہے کہ میرا نوجوان دوست ٹیپسٹ بھی سن رہا ہوگا؟

اُستاد:۔ آپ کا مطلب ہے کہ ......

(وہ موضوع کی تبدیلی میں کچھ ہچکچاتا ہے)

مشیر:۔ دیکھئے نا اس لڑکے کا معاملہ تو خوشی کے متعلق اس قانون کے مطابق ایک استثنائی حیثیت لئے ہوئے ہے جس کا ذکر ابھی ابھی میرا نوجوان دوست کر رہا تھا۔

نوجوان :- ٹھیک کہتے ہیں، یہی وہی استثنائی کیفیت ہے جو قانون کو قانون بناتی ہے۔

اُستاد :- صرف ایک استثنائی حالت! (لڑکا چپکے چپکے آنکھوں سے ان سب کو دیکھتا ہے)۔

نوجوان :- جی ہاں یہ لڑکا اسی طبقے کا نمائندہ ہے جو اس استثنائی حالت کا خالق ہے ..... دیکھئے میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹ رہا ..... بلکہ دراصل اب حقیقی مقصد کی طرف واپس آ رہا ہوں (اُستاد سے) شاید آپ کو گفتگو یاد ہوگی جو مسٹر ٹائگر کے آنے سے پیشتر اسکول کے ایام کے متعلق کر رہے تھے اور ان کو زندگی کا حسین ترین حصہ خیال کر رہے تھے۔ اب میں اپنے اس دعوے کو دہراتا ہوں کہ تعلیمی ایام ہی زندگی کا حسین ترین حصہ ہوتے ہیں ..... زندگی میں صرف یہی ایک وقت ہوتا ہے جب انسان کو حقیقی مسرت کا تجربہ ہوتا ہے ..... دیکھئے نا یہ لڑکا خود اعتراف کرتا ہے کہ آپ کی سزا سے بچ نکلنے پر وہ انتہائی مسرور اور شادماں تھا .... اس خوشی کا تجربہ صرف سکول ہی کے دنوں میں ہوتا ہے ..... یہی غیر ذمہ داری ہے جو مسرت و انبساط کا موجب ہے ..... آپ ہی بتائیے کہ بعد میں زندگی میں صرف اتنی سی بات پر کہ وہ بید مارنے سے بچ گئے کون اتنا خوش ہوتا ہے .... انسان کب اتنی معمولی معمولی باتوں پر حیران ہو کر خوشی سے اچھل پڑتا ہے؟ (اسے لڑکے کی موجودگی کا احساس ہوتا ہے) ..... اور ہر معاف کیجئے گا میں خواہ مخواہ مداخلت کر رہا ہوں۔

اُستاد :- (لڑکے پر ایک نظر ڈال کر) دیکھئے یہ سوال تو اب اور بھی عملی طور پر زیادہ توجہ چاہتا ہے کہ کیا واقعی خوشی کے لئے معمولی معمولی واقعات جو پر مسرت پریشانی کا باعث بنتے ہیں دہرائے جائیں یا کہ نہیں؟ .... مسٹر ٹائگر آپ اس معاملے کے متعلق کچھ کہیں گے؟

مشیر :- بھئی میرا تو خیال ہے کہ اس قسم کی پر مسرت پریشانیوں کی ہمیشہ حوصلہ افزائی ہونی چاہئے کیونکہ ان سے انسان کے قلب و دماغ وسیع ہوتے ہیں۔

اُستاد :- (لڑکے سے) ٹھیک ہے ..... میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہیں دوبارہ خوش ہونے کا موقع مزید دے دوں ..... تمہیں اس کے لئے مسٹر ٹائگر کا شکر گزار ہونا چاہئے ۔۔ (لڑکا جانے کے لئے مڑتا ہے)، لیکن میں تمہیں اتنا کہوں گا کہ اس خوشی میں بہت زیادہ آگے نہ بڑھ جانا۔

لڑکا :- بہت اچھا جناب (دوبارہ واپس جانے کے لئے مڑتا ہے)،

اُستاد :- مناسب ہے کہ فٹ بال بھی ساتھ لیتے جاؤ (لڑکا فٹ بال اٹھانے کے لئے آگے بڑھتا ہے)

مشیر :- (تم فوراً کو فٹ بال دینے سے پیشتر ایک خیال آتا ہے) بھئی دیکھو اس واقعہ سے مجھے ایک بات یاد آگئی ہے ..... مسٹر سینٹ تم فٹ بال کے کھلاڑی تو نہیں ہو؟

نوجوان :- جی میں تین سال تک سکول کی "فسٹ الیون" میں کھیلتا رہا ہوں۔

مشیر :- بہت خوب! میرا خیال ہے کہ پرانے طالب علموں کی ایک ٹیم بنا کر اسے اگلے ہفتے سکول میں کھلایا جائے ..... میرا خیال ہے کہ تم بھی ٹیم میں کھیلو گے؟

نوجوان :- (بہت خوش ہو کر) جی ..... واقعی آپ ٹیم بنا رہے ہیں؟ اگر یہ بات ہے تو میں بڑی خوشی سے کھیلوں گا اگرچہ میں مدت تک نہیں کھیلا اور مشق نہیں کر سکا مگر میں بڑی خوشی سے کھیلوں گا .....

مشیر :- دیکھو بھئی ابھی اس میں ایک آدھ ہفتہ تو ہے ہی ..... تم اس عرصے میں مشق کر سکتے ہو۔

نوجوان :- جی ہاں ..... میں خود بھی اس معاملے میں بڑا مشتاق ہوں ..... بخدا مجھے یہ سن کر بے انتہا خوشی ہوئی ہے ..... میرے دل میں جوش

کوشش کر رہا ہے۔

مشیر:۔ (مسکراتے ہوئے) بالکل!

نوجوان:۔ (کسی قدر توجہ سے) فوراً یوں محسوس ہوگا۔ جیسے پرانے دن لوٹ آئے ہیں۔ پھر وہی کھیل کھیلتے ہوئے کتنا مزا آئے گا! ... سامنے آج سے میں ناشتے سے پیشتر کھیلنے کی مشق کیا کروں گا۔ (مشیر سے) جناب کہیئے میں کس حیثیت سے کھیلوں گا؟

مشیر:۔ خیر یہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ ... تم یہ بتاؤ کہ تم کون سی جگہ پر کھیلتے رہے ہو؟

نوجوان:۔ سنٹر فارورڈ۔ خیر چھوڑیئے اس کو۔ میں آپ کی ترتیب کو گڑبڑ نہیں کرنا چاہتا ... آپ مجھے جہاں کہیں گے میں وہیں بڑی خوشی سے کھیل لوں گا۔

اُستاد:۔ بہت اچھا ... (نوجوان سے) تم کو ہر جگہ کھیل کر بڑی خوشی ہوگی! خوشی ہوگی نا! میں نے تم سے خوشی کے متعلق کیا کہا تھا؟

نوجوان:۔ اے میرے اللہ ... مگر میں اس طریقے پر تو نہیں سوچ رہا تھا...

اُستاد:۔ میاں انسان تمہاری عمر میں سوچ ہی کب سکتا ہے! کیوں مشیر صاحب! نوجوانی کی حیثیت تو یہی کچھ ہے کہ فٹ بال کے کھیل ہی سے خوشی اور مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور بس؟ ... کھیل صرف کھلی فضا میں کھیلنے سے ہی جوانی کا دل بہل جاتا ہے ... میاں جب انسان کی یہ حس، یہ جبلت، یہ کھلاڑی ہونے کا احساس ختم ہو جاتا ہے تو اس کی زندگی میں کچھ نہیں رہتا ... اس کے بعد تو انسان ایک بوڑھا ڈھانچہ ہوتا ہے ... خواہ اس ڈھانچے کی عمر ساٹھ برس کی ہو جائے یا چالیس کی مگر ہوتا ڈھانچہ ہی ہے۔ (وقفہ)

لڑکا:۔ (مشیر سے) جناب میں فٹ بال لے سکتا ہوں؟

مشیر:۔ اوہ فٹ بال...

لڑکا:۔ اور (اچانک اُستاد کی طرف مڑ کر) جناب مجھے یاد آیا کہ جب میں سکول میں چھٹی ہونے کے بعد آپ کے پاس آیا تھا تو اس وقت اپٹن میجر نے مجھے یہ پیغام آپ تک پہنچانے کے لئے دیا تھا...

— (سوچتا ہے) ... اور پھر میں وہ بھی بھول گیا۔

(مشیر فٹ بال لڑکے کو دے دیتا ہے)

لڑکا:۔ (فٹ بال کو پکڑتے ہوئے) جی مجھے یاد آیا۔ اسے وظیفہ مل گیا ہے۔

اُستاد:۔ (بے حس و حرکت کھڑا ہو جاتا ہے) کیا؟ کیا کہا؟

لڑکا:۔ جی اپٹن میجر کو وظیفہ مل گیا ہے۔ اس نے مجھ سے کہا تھا کہ میں یہ اطلاع آپ تک پہنچا دوں۔

(واپس جانے لگتا ہے)

اُستاد:۔ وظیفہ (بے انتہا خوش ہوتا ہے) ... ٹم فرینڈ ادھر آؤ ... (ٹم لوٹ آتا ہے) اپٹن میجر نے تم سے یہی کہا تھا کہ اسے وظیفہ مل گیا ہے؟ ... مگر اس نے خود مجھ سے اس کا تذکرہ کیوں نہیں کیا؟

لڑکا:۔ اس نے مجھ سے یہی کہا تھا کہ میں آپ کو اطلاع دے دوں ... وہ خود اپنے عزیزوں کو مطلع کرنے گیا ہے۔ جب میں ادھر آ رہا تھا تو وہ مجھے بڑے دروازے میں ملا تھا اس نے مجھے صرف یہ پیغام دیا اور خود چلتا ہو گیا۔

استاد:- (بے انتہا بڑی مسرت ہے، خوب .... بہت خوب مگر مجھے یقین نہیں آرہا کیونکہ لڑکے سے تو کہا گیا تھا کہ وہ وظیفہ حاصل کرنے میں ناکام

مشیر:- یہ بھی ہوتا ہے۔

استاد:- لیکن میرا اپنا بھی تو یہی خیال تھا..... میرے اور آپ کے درمیان اس کے متعلق گفتگو بھی ہوئی تھی۔ لڑکے کی عمر بمشکل سترہ برس کی ہوگی۔

..... (لڑکے سے) میاں تمہیں یقین ہے کہ تم نے غلط پیغام تو نہیں دیا؟ ..... کیوں یہ پیغام ٹھیک ہی تھا؟

لڑکا:- بالکل جناب بالکل درست!

استاد:- اچھا..... مجھے اس سے بے انتہا خوشی ہے کہ میں بیان نہیں کرسکتا (مشیر سے) اب تو اس لڑکے کے سامنے راہیں کھل گئی ہیں.... اس نے یہ اعزاز کسی خاص محنت کی بنا پر نہیں لیا۔ پچھلے برس اسے کرکٹ کا اعزازی نشان دیا گیا تھا۔ وہ سکول کی ٹیم میں فٹ بال بھی بڑی اچھی طرح کھیلتا ہے۔ ادھر قیام گاہ میں بھی وہ بڑی خوش اسلوبی سے رہتا تھا۔ دوسرے لڑکوں پر اس کا بڑا اچھا اثر تھا۔ اس کے سکول چھوڑنے سے پیشتر جماعتی یہ قیام گاہ پندرہ سال میں پہلی بار اتنی پسندیدہ نظروں سے دیکھی جائے گی! مشیر صاحب وہ لڑکا تھا ہی غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک ..... خیر چھوڑیئے اس بات کو لیجئے سگار نوش فرمائیے (مشیر اور نوجوان ماسٹر اس بے انتہا مسرت پر ایک دوسرے کو کن انکھیوں سے بڑی پر معنی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ماسٹر بھی بھانپ جاتا ہے) اوہ میرے خدا.... مجھے معلوم ہے اب آپ کیا کہنے والے ہیں..... میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا اندازہ بالکل درست ہے۔ میں اپنے آپ کو اس وقت لا انتہا بلندیوں پر محسوس کر رہا ہوں (لڑکے کی طرف دیکھتا ہے) ارے تم اب یہاں کیا کر رہے ہو؟ بھاگ جاؤ۔ اور دیکھو انچارج سے کہنا کہ واپس آتے ہی سیدھا میرے پاس آئے ——— (لڑکا چلا جاتا ہے) ——— مشیر صاحب آپ کا خیال بالکل درست ہے۔ آپ کی رائے ہمیشہ درست ہوتی ہے۔ آپ نے جو کچھ کہا تھا وہ حرف بحرف سچ ثابت ہوا۔ ہم درحقیقت خوش قسمت ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی خوش قسمت ہے۔ اگرچہ ہماری بھی مشکلات ہیں۔ مگر وہ آپ کے مصائب کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ ہم ان مشکلات سے فرار حاصل کرسکتے ہیں۔ ہم انہیں بھول سکتے ہیں اور ہم ان مشکلات سے کچھ نہ کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں مگر آپ اس نعمت سے محروم ہیں۔ صرف آپ ہی ایک ایسے انسان ہیں جس کے لئے خوشی کا حصول بہت مشکل ہے۔

..... خوشی آپ کی پہنچ سے باہر ہے اور سچ پوچھئے تو آپ ایسے انسان کے لئے خوشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مشیر:- کیا یہ سب کچھ میں نے کہا تھا؟

استاد:- اور نہیں کیا؟

نوجوان:- جی .... آپ کی باتوں سے یہی نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے ..... اور میں ...... میں نے تو اپنے آپ کو پست سطح پر لا کر بہت بڑی زیادتی کی ہے۔

استاد:- آپ نے مجھے تنبیہہ کر دی ہے۔ آپ نے مجھے راستہ دکھا دیا ہے اس وقت جبکہ میں نے بھی اپنی گذشتہ زندگی کے متعلق بڑا جذباتی رویہ اختیار کر لیا تھا۔

مشیر:- مگر چھوڑیئے ان باتوں کو دہرانے سے فائدہ۔

نوجوان:- اور مشیر صاحب جب ماسٹر صاحب اس قسم کی باتیں کر رہے تھے تو آپ ان پر بے تحاشہ قہقہے لگا رہے تھے!

مشیر:- بھئی میں اپنی اس حرکت پر نادم نہیں بلکہ خوش ہوں۔

اُستاد۔ آپ کا مطلب ہے کہ آپ یہ باتیں سنجیدگی سے نہیں کر رہے تھے ؟

مشیر۔ ارے پھر وہی پرانا سوال !

اُستاد۔ آپ جواب دیجئے .... کیا آپ واقعی اتنے ناخوش ہیں ؟ ..... یا کبھی کبھی آپ بھی اس بوجھ کو ..... اس تھکا دینے والے بوجھ کو بھول جایا کرتے ہیں۔

مشیر۔ میں ..... میں (پھر سے قہقہہ لگاتا ہے)

نوجوان۔ نہیں آپ اس بوجھ سے کبھی بھی غافل نہیں ہوتے - میں جانتا ہوں ..... اور اچھی طرح جانتا ہوں۔

مشیر۔ (پھر زور سے ہنستے ہوئے ' ایسی ہنسی جس میں ٹھکن پایا جاتا ہے) نہیں ! نہیں !! یہ بات مجھ تک ہی رہنے دو ..... تم دونوں نہیں جانتے کہ تمہاری زندگیاں کتنی پُر لطف ہیں !

اُستاد۔ (سختی سے) لیکن میرے سوال کا جواب یہ تو نہیں ہے۔

مشیر۔ (اسی سختی سے) اس کے برخلاف میں تو یہ کہوں گا کہ آپ کے سوال کا یہی مکمل مفصل اور آخری جواب ہے۔ آپ نہیں سمجھے ؟ (پھر ہنس پڑتا ہے)

اُستاد۔ (بے تابانہ) ایسے لگتا ہے جیسے آپ کی مذاق کی حس غیر معمولی تیز ہے۔

مشیر۔ (لطف لیتے ہوئے) لیکن یہی تو اصل نکتہ ہے۔

نوجوان۔ نکتہ ؟

مشیر۔ ارے تم ابھی تک میری سوچ ' میرے دماغ اور میری باتوں سے اس کا اندازہ نہیں لگا سکے ؟ .... میری باتوں سے تمہیں کوئی اشارہ نہیں ملا ؟ کہو نا ..... بولو ...... یا میں خود ہی اپنے آپ کے متعلق زیادہ مکمل کر کہہ دوں۔

اُستاد۔ جی ہاں - ضرور

مشیر۔ ارے کیا فضول بات کی ہے .... خیر چھوڑیئے اسے - آپ یہ بتایئے کہ کیا میں ناخوش نظر آتا ہوں ! کیا میرا رویہ کچھ اس قسم کا ہے جیسے میں آپ سے رحم اور ہمدردی کا طلب گار ہوں ؟

اُستاد۔ (بمشکل یقین کرتے ہوئے) مگر آپ .... آپ خود نہیں بتایئے گا ؟

نوجوان۔ آپ اتنی ذرا سی بات بتا کر کیوں ہمارے ذہنوں کو نجات نہیں دے دیتے ؟

مشیر۔ بھئی آپ دونوں ہی کتنے پُر لطف آدمی ہیں - مگر کہیں دونوں کو یہ خیال تو نہیں کہ میں آپ دونوں پر رشک کرتا ہوں ؟ (دونوں کے چہروں پر نیم رضامندی ' اور احتجاج کا اظہار ہوتا ہے) ٹھیک ہے تمہارا یہی خیال ہے - تم یہی سوچ رہے ہو ..... خیر اب تمہارے زندگی کے متعلق علم میں تھوڑے اضافہ تو ہوا ..... لیکن خدا کی قسم تمہاری نظر تو میری زندگی کے صرف خوشگوار پہلو پر ہے - (وہ بیٹھ جاتا ہے اور لمبے لمبے سانس لیتا ہے) مگر سنیئے مجھے کوئی مصیبت درپیش نہیں نہ میں ایسے مصائب سے دوچار ہوں جن کے بیان سے ہی آپ کو بھی دکھی کر دوں (وہ اپنے سروں کو ہلاتے ہیں) —— میکانکی نقطۂ نظر سے دیکھئے تو اس حقیقت سے انکار نہیں کہ میں ایک بوڑھا آدمی ہوں لیکن اس بڑھاپے کے تجربے کو خوش اسلوبی سے ادا کرنے کے لئے دو چیزوں کی ضرورت ہے .... ایک بے داغ ضمیر اور دوسری بہترین یادداشت ..... اور

مجھے اس کا شوق ہے کہ میرے پاس یہ دونوں چیزیں موجود ہیں ...... اس کے علاوہ جیسا کہ آپ نے کہا ہے میرے پاس ایک اضافی خصوصیت بھی ہے اور وہ ہے حسِ مذاق ! ...... اور یہ خصوصیت ایسی ہے جس سے بڑھاپے کا تجربہ اور بھی خوش گوار ہو جاتا ہے ۔ (اس کا جوش بڑھتا جا رہا ہے) حضرات یہ دنیا تو ایک بڑا پُر لطف تماشہ ہے .... ایک ایسا تماشہ جس کا مشاہدہ ایک آرام دہ جگہ پر بیٹھ کر کرنے اور اس پر مسکرانے سے بڑا لطف دیتا ہے ۔ اور اس کا مطلب اڑانے میں تو بے پناہ لطف آتا ہے ۔ اگرچہ یہ لطف بعض اوقات بڑا مبہم ہوتا ہے ...... مگر اس کے ابہام میں بھی معنی پوشیدہ ہوتے ہیں .... اور یہی لطف ہے جس کی رہنمائی میں میں انسانیت کی یہ طربیہ تمثیل تیار کر رہا ہوں ..... انسانیت کی یہ طربیہ تمثیل جو بڑی سادہ ، بڑی حسین اور بڑی دلچسپ ہے ..... یہ طربیہ تمثیل تو سکول کے دنوں سے زیادہ جوش انگیز ، ایک نوجوان کے خیال و دل سے زیادہ حیرت خیز ، ایک ازلی سکول ماسٹر کی زندگی بھر کے کارناموں سے زیادہ پرکشش اور جاذبِ توجہ ہے ...... یہ ہے وہ عالمگیر طربیہ تمثیل ..... جو آفاقی بھی ہے اور شاید ابدی بھی (خیر ہمیں اس ابدیت کے مسئلے سے کوئی سروکار نہیں) ...... مگر مجھے تو ایسے لگتا ہے کہ یہ اب ختم ہوئی کہ ہوئی ... مگر یہ جب بھی ختم ہوتی ہے اس کا انجام پُر مسرت اور طربیہ ہی ہوتا ہے .... جی ہاں مجھے اس بات کا مکمل یقین ہے ...... خیر ان باتوں کو چھوڑیئے ...... مختصراً یہ تمثیل یہ تماشہ ...... بنیادی طور پر بڑا بڑا اچھا ، بڑا پر لطف اور صحت مند ہے (آہستہ سے ایک لمبا سانس لیتا ہے) میں اس تماشے سے بڑا لطف اٹھا رہا ہوں ..... اور جتنا مطمئن میں آج ہوں اس سے پیشتر کبھی بھی نہ تھا ۔ (خاموش ہو جاتا ہے)

اُستاد ۔ (نرمی سے) مشیر صاحب مجھے آپ پر رشک آنے لگا ہے ۔

نوجوان ۔ اور مجھے بھی !

مشیر ۔ (بیٹھے ہوئے) ! ! ! ! ! کیا تماشہ ہے ۔ کیسی طربیہ تمثیل ہے ۔ ...... یہ آسمان سے اتری ہوئی انسانیت .... یہ ہر طرف پھیلے ہوئے ننھے ننھے بچے ..... ہو ہو ہو ..... کتنا اچھا لگتا ہے یہ سماں (اٹھتا ہے) جاؤ اب بھاگ جاؤ اور اس کھیل میں شریک ہو جاؤ (ٹھٹک کر) ہاں مجھے یہی کہنا ہے .... میں کیا خواب دیکھ رہا ہوں .... نہیں .... مجھے تو بھاگ کر جانا چاہیئے .... (گھڑی کو دیکھتا ہے) ۔ ساڑھے چھ ! ..... ارے خوب ۔ اب بیگم کی جھڑکیوں کا مزا ..... !

(وہ ہیٹ اور چھڑی اٹھا کر دروازے کی طرف مڑتا ہے)

اُستاد ۔ (جاتے ہوئے) خدا حافظ میرے کہن سال دوست !

مشیر ۔ (آہستہ سے) خدا حافظ میرے جوان ساتھیو !

(اندھیرا بڑھ رہا ہے ۔ مشیر ان دونوں کو پیچھے اپنے خیالات میں غرق چھوڑ کر چلا جاتا ہے)

ہادیؔ مچھلی شہری

خدا گواہ کوئی لطفِ زندگی نہ رہے — خودی کے ساتھ اگر کیفِ بے خودی نہ رہے
الٰہی پاؤں کو رہ آشنائے منزل کر — خضر کی بھی مجھے پروائے رہبری نہ رہے
جو نام کا ہے تغیّر وہ کب تغیّر ہے — خوشی وہ کوئی خوشی ہے جو دو گھڑی نہ رہے
ذرا سی دیر میں رازِ جمال کھل جائے — نگاہِ جلوہ طلب میں جو بے خودی نہ رہے
یہ فصلِ گل کا ہو عالم تو پھر خزاں کیا ہے — کہ گل تو ہوں مگر ان میں شگفتگی نہ رہے
نگاہ سینکڑوں جلوے تراش لیتی ہے — ہٹے جو پردہ تو یہ مشقِ آذری نہ رہے
وہی نگاہِ حقیقت شناس ہے جس میں — الم، الم نہ رہے اور خوشی، خوشی نہ رہے
نگاہِ شوق سے ہے عرضِ حسن کی تحریک — جو یہ نہ ہو تو تقاضائے جلوہ گی نہ رہے
یہی ہے گردشِ دوراں کا ماحصل شاید — کہ دو دلوں میں کوئی ربطِ دوستی نہ رہے
دلِ حزیں کے تقاضے کہ حالِ دل کہہ دوں — وفا کی شرط کہ ہونٹوں پہ آہ بھی نہ رہے
یہ کیا ستم ہے کہ اے چرخِ واژگوں نظام — تری خوشی تو رہے اور مری خوشی نہ رہے
وہ بے خودی ہے غلط ہوش سے جو خالی ہو — وہ زندگی نہیں جس میں خود آگہی نہ رہے

فلک کسی کو مٹائے نہ اس طرح ہادیؔ
کہ مٹنے والے کی دنیا میں خاک بھی نہ رہے

شوخیٔ بختِ رسا دیکھی ہے — زیست کی زد میں قضا دیکھی ہے
اک نئی صبح کی رہ میں ہم نے — تیرگی آبلہ پا دیکھی ہے
ایک ساغر کے پیچھے ملتی ہوئی — قسمتِ شاہ و گدا دیکھی ہے
ہم ستاروں سے ہوں کیونکر نازاں — ہم نے سورج کی ضیا دیکھی ہے
حُسن بیمار کو دے آئے کوئی — دستِ عاشق میں شفا دیکھی ہے

ہم نے دیوارِ گلستاں کے پرے — قید میں بادِ صبا دیکھی ہے
خشک صحرا کا تصور جیسے — ایک ایسی بھی گھٹا دیکھی ہے
ہم نے مٹتی ہوئی بزمِ شب میں — خونِ لالہ کی حنا دیکھی ہے
اِنقلابات کے آئینے میں — صورتِ راہنما دیکھی ہے
زندگی ایک نیا رُخ بدلی — جب بھی خاموش نوا دیکھی ہے

ہم تیرے قلب سے ہو کر گذرے — تیری ہر ایک رضا دیکھی ہے
ہمیں غیروں سے ڈرائے نہ کوئی — ہم نے اپنوں کی ادا دیکھی ہے
دل کسی طور بہلتا ہی نہیں — وہ نظر جب سے خفا دیکھی ہے
عشق کس بات پہ اب ناز کرے — ذِلّتِ جنسِ وفا دیکھی ہے

کنجِ زنداں میں بھی ہم نے باقی
زندگی نغمہ سرا دیکھی ہے

ظہور نظر

کون اب آپ کی محفل میں ہے فرزانہ میں سب جانتا ہوں
کس لئے آج مجھے کہتے ہو دیوانہ میں سب جانتا ہوں

بادہ کیوں زہر ہے کیوں چور ہے پیمانہ میں سب جانتا ہوں
کس طرح اجڑا ہے میخانے کا میخانہ میں سب جانتا ہوں

میں یونہی بیٹھا ہوں، بھولا نہیں، اے قافلے والو جاؤ!
دور ہے شہر کہ نزدیک ہے ویرانہ میں سب جانتا ہوں

دھوپ میں شمعیں جلاتے ہو مجھے کہتے ہو آؤ جل جاؤ
شمع کب جلتی ہے، کیوں جلتا ہے پروانہ میں سب جانتا ہوں

اِس طرف بھی کبھی اے موسمِ گل، ابرِ بہار آؤ کبھی
خونِ دل، خونِ جگر ہے ترا نذرانہ میں سب جانتا ہوں

مجھ سے پوچھ اہلِ چمن کیسے ہیں آزادی تو کیونکر ہے
کس طرح، کس نے بنایا ہے یہ افسانہ میں سب جانتا ہوں

مڑ کے مت دیکھ! کہ غربت میں نظر ایک غمِ دل کے سوا
دور تک کوئی نہ اپنا ہے نہ بیگانہ میں سب جانتا ہوں!

لوگوں کی ملامت بھی ہے، خود دردِ سری بھی
کس کام کی یہ اپنی وسیع النظری بھی

کیا جانئے کیوں سست تھی کل ذہن کی رفتار
ممکن ہوئی تاروں کو مری ہم سفری بھی

راتوں کو کلی بن کے چٹکتا تھا ترا جسم
دھوکے میں چلی آئی نسیمِ سحری بھی

کس عشق کو اِس معرکۂ دل میں ہوئی جیت؟
اِک چیز ہے لیکن یہ مری بے جگری بھی

سننے کو تو ہم نے بھی سُنی چارہ گروں کی
پوچھو کہ میاں تم سے کوئی چوٹ بھری بھی؟

فرقت کے شب و روز میں کیا کچھ نہیں ہوتا
قدرت پہ ملامت بھی، دعائے سحری بھی!

اِک فرد کی اُلفت تو بڑی کم نظری ہے
ہے کس میں مگر اہلیتِ کم نظری بھی

عمل احمد صدیقی

وہ چاند ستارے ڈوب چلے ہنگامِ سحراب کیا ہوگا
اُسے قلب کی دھڑکن کیا ہو گا اُسے دردِ جگراب کیا ہوگا

کچھ عہدِ طرب کا ذکر کرو، کچھ موسمِ گل کی فکر کرو
جو رقصِ شرر ہم دیکھ چکے، وہ رقصِ شرراب کیا ہوگا

ہم جلوۂ جاناں دیکھ چکے، اب بھی ہے وہی ویرانیٔ دل
خوابوں کا فسوں بھی ٹوٹ گیا، اُسے ذوقِ نظراب کیا ہوگا

گم کردۂ منزل بھی تو ہمیں آوارۂ منزل کہتے ہیں —
اُسے آبلہ پائی کیا کیجیے، اُسے ذوقِ سفراب کیا ہوگا

تسکینِ دلِ مضطر کیلئے اب اور ہی کچھ تدبیر کریں —
یوں اس کا تصور کرنے سے اُسے دیدۂ تراب کیا ہوگا

ہم مسلکِ عشق سے ناواقف؟ ہم اہلِ جنوں ہیں؟ یونہی سہی!
طعنوں کا ترے اے واعظِ ناداں ہم پہ اثراب کیا ہوگا

یہ کوئی فریبِ نظر تو نہیں، یہ دُنیا ہے، اس دُنیا پہ
اور اس سے بڑا الزام کوئی اربابِ نظراب کیا ہوگا

مٹے مٹے سے ہیں نقوشِ حیات چمکاؤ
پھر ایک بار محبت کی بات دہراؤ
بجھی پڑی ہیں اُمیدوں کی دیپ مالائیں
نقاب اٹھاؤ، مری خلوتوں میں آجاؤ
بچھے ہوئے ہیں ہر اک سمت رنگ و نور کے جال
کہ جیسے حدِ نظر تک زمیں کا پھیلاؤ
نئی حیات کے خاکے ابھی ادھورے ہیں
گلوں کا رنگ، ستاروں کی روشنی لاؤ
یہ تیرگی، یہ اُداسی، یہ بے حسی، یہ سکوت
مرا رباب، مری کائنات سے آؤ
وہ رقص کرتی ہوئی آرہی ہے صبحِ حیات
ستارے ڈوبتے جاتے ہیں، بھیروں گاؤ
سفر کی رات یکایک نکھر گئی ہے مگر
کوئی پکار رہا ہے، ذرا ٹھہر جاؤ

نئے نغمے، نئی محفل، نیا مہتاب ہے ساقی
رباب فکر کا لیکن وہی مضراب ہے ساقی

ہمارے ہی لئے ساحل کا دل بیتاب ہے ساقی
مگر یہ کیا کہ حائل عقدہ گرداب ہے ساقی

بنام اضطراب مستقل، مطلوب ہے مجھ کو
وہ ساغر جس میں صہبا کے عوض سیماب ہے ساقی

ہزاروں تلخیوں سے دل کا پیمانہ لبالب ہے
مرے ہی خوں سے مری تشنگی سیراب ہے ساقی

بڑی مدت سے مجھ کو جستجوئے آدمیت ہے
یم ہستی میں یہ گوہر ابھی نایاب ہے ساقی

جلا دے تو حجابات نظر کو سوز بادہ سے
کہ فطرت خود نمائی کے لئے بیتاب ہے ساقی

ترے اس میکدے کا ذرہ ذرہ گرم جولاں ہے
یہ دور جام ہے یا گردش دولاب ہے ساقی

اشارے

جاگ ایراوتی

[illegible] کے افسانے پہلی بار اس وقت منظر عام پر آئے ـــــ جس وقت ترقی پسند ادب اپنے عروج پر تھا۔ ادبی رسالے پابندی کے ساتھ شائع ہوتے رہتے تھے۔ ادبی محفلیں منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ جدید ادب کے ہوا خواہوں میں جان تھی۔ اور ادیبوں کی تعداد بھی کافی معقول تھی ـــــ [illegible] پہلے اور تقسیم کے زمانہ بعد لاکر ہے۔ اس وقت سے حمید کے افسانوں نے پڑھنے والے طبقے کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ [illegible] کی جان [illegible] کی دعا میں بھی بیان تھیں۔ ایک تو یہ کہ یہ افسانے ترقی پسند ادب کی روش پر چلتے ہوئے معاشرے کے [illegible] کی ترجمانی کرتے تھے ـــــ دوسری یہ کہ ان طبقوں سے متعلق افسانوں کی مخصوص کمی کے ساتھ ساتھ افسانہ نگار کے یہاں اسلوب کی [illegible] بھی تھی۔ چنانچہ جب پہلے پہل لوگوں نے حمید کے جھیروں، ایالن کے جنگلوں میں ڈوستے ہوئے کنووں اور بھیگی ہوئی شاموں [illegible] [illegible] ایک بڑی خوش گوار توقعات وابستہ کرنے لگے پھر ہوا یہ کہ ایک کامیاب فلم کے ڈائرکٹر کی طرح [illegible] کو اپنے انداز میں دہرانا شروع کر دیا ـــــ چنانچہ چار پانچ سال بعد بھی وہ "جاگ ایراوتی" میں وہیں پر ہے ـــــ [illegible]

"جاگ [illegible]" [illegible] سے شروع ہوتا ہے جس میں لے حمید کا اپنا مخصوص انداز نمایاں تو ہے لیکن یہاں کچھ چاشنی قرۃ العین حیدر کی بھی ہے ـــــ [illegible] کی ہیروئن سے قاری کا تعارف افسانے کے درمیان میں ہوتا ہے ـــــ لے حمید کے یہاں تین قسم کی ہیروئنیں ملتی ہیں۔ پہلی قسم [illegible] کی ہیروئن ہے۔ [illegible] خوبصورت پہاڑی لڑکی ـــــ دوسری قسم "کچھ یادیں، کچھ آنسو" اور اسی طرز کے دوسرے افسانوں کی ہیروئن ہے [illegible] متوسط طبقہ کی قبول صورت سادہ لڑکی ہے۔ اور جاندار ہونے کے باعث قاری کے لئے اپنے اندر بڑی جاذبیت رکھتی ہے ـــــ تیسری قسم کی ہیروئن زیتون ہے ـــــ اور جہاں تک میرا خیال ہے ـــــ زیتون لے حمید کے افسانوں کے انحطاط کی بہت [illegible] ہے۔ زیتون ہمیشہ اونچے یا اونچے متوسط طبقے کی فرد ہوتی ہے ـــــ اس میں اپنے طبقے کی چند خصوصیات کے سوا اور کوئی انفرادیت [illegible] ـــــ وہ [illegible] کپڑے پہنتی ہے ـــــ کوٹھی میں رہتی ہے ـــــ کسی بڑے اونچے قسم کے کالج میں پڑھتی ہے۔ اور [illegible] استعمال کرتی ہے ـــــ جانے کیسے اور کہاں وہ ہیرو سے متعارف ہوتی ہے۔ اور کسی پر اسرار تعلق یا شاید سے جذبات [illegible] محبت کرنے لگتی ہے ـــــ کتنے عرصے تک ملاقاتیں جاری رہتی ہیں ـــــ بالآخر زیتون کے باپ تک رشتے کی منزلت [illegible] کیونکہ وحید رشتے کی درخواست کے وقت ساز اور پھولوں پر دیتا ہے۔ اور ہیروئن کا باپ بڑے غیر [illegible] کی توجہ چند اور چیزوں کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہے۔ مثلاً کھانے پینے اور رہنے سہنے کے لوازم۔ آمدنی کے ذرائع وغیرہ ـــــ [illegible] لڑکی اور شخص ہونے سے لوازم مہیا کر سکتا ہے۔ شادی کرکے زیتون کو لے جاتا ہے۔ اور وحید بڑی محرومی حیرت کے عالم [illegible] سامنے پر لکھتا کیا ہے۔

بڑی اہم بات میں کوئی بھی نئی نظر نہیں آتی۔ اور جب سے اس نے انحطاط کا راستہ اختیار کیا ہے [illegible]
کے لئے بڑی دلچسپ باتیں ظاہر ہوتی ہیں ——— سب سے پہلی بات جو قاری کو کشمکش میں مبتلا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وحید کیسے گوشی لال اور چیک بک [illegible]
یہ بنیادی طور پر گوشی لال اور چیک بک کی دنیا میں رہنے والی ہو، محبت کیسے ہو گئی ——— ذہین کا گھر اس [illegible] اس کا
دو [illegible] اس کا پاؤڈر کا سیٹ۔ اس کی [illegible] کی کتاب ——— یہ سب کچھ اس کے والد کی چیک بک کا ہی مرہون منت ہے ——— اگر شعوری طور
نہیں تو کم از کم غیر شعوری طور پر ہی وحید کو اس کا احساس ضرور ہوگا ——— اس صورت میں دو باتوں میں سے ایک کا فیصلہ ضرور ہو جانا چاہئے ——— یا تو چیک
بک اور اس کی مہیا کردہ سارے لوازم بیکار اور قابلِ نفرت ہیں۔ اور اس صورت میں ذہین خود قابلِ نفرت ثابت ہوتی ہے۔ یا پھر چیک بک کو [illegible] کا ایک
پیسے مختصر محصور طبقے میں محدود ہو جانا قابلِ مذمت ہے۔ اور اس صورت میں یہ واقعہ ایک منفرد واقعہ نہیں رہتا ——— بلکہ طبقاتی کشمکش کے بہت سے رخوں میں سے
ایک رخ بن کر رہ جاتا ہے۔ اگرچہ دیکھنے میں افسانہ اول الذکر صورت کا حامی نظر آتا ہے لیکن اس کے انجام میں ایک مضحکہ خیز تضاد ہے [illegible] صورت
اختیار کر لیتی ہے ——— لیکن ہمارا یہ فیصلہ بھی کہ افسانہ طبقاتی کشمکش کے ایک رخ ——— مختلف طبقوں کے افراد کی آپس میں شادی ——— پیش کرتا ہے۔
افسانے کی ساخت میں منطقی تضاد کو دور نہیں کرتا ——— ایک طبقاتی معاشرے میں جہاں ابھی طبقے اپنی پوری قوت سے قائم ہیں اگر ذہین کا باپ کسی ذہنی تبدیلی کے
زیر اثر اچانک وحید سے اپنی لڑکی کی شادی کرنے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ ——— محبت ایک ذاتی جذبہ ہے۔ شادی ایک معاشرتی اقدام ہے بحیثیت [illegible] کی بنا پر
مرد اور عورت ایک دوسرے سے لئے محسوس کرتے ہیں۔ شادی ایک معاہدہ ہے جبکہ دوسرے عورت کیلئے ضروریات زندگی مہیا کرتا ہے ——— اور عورت اس کے عوض سے
بے فکر ہو کر افزائش نسل کا فرض سرانجام دیتی ہے ——— اس معاہدے کی رو سے شادی کے بعد یا تو ذہین کو اپنا گھر، اس کی سہولتیں، اپنا لباس، اپنی چال ڈھال سب کچھ
تبدیل کر دینا ہوگا۔ اور وہ بھی نچلے متوسط طبقے کی ایک فرد بن کر رہ جائے گی جس سے طبقے تو الگ [illegible] صرف ایک فرد ایک طبقے سے دوسرے طبقے میں
منتقل ہو جائے گا ——— یا پھر ذہین باپ کے گھر کی تربیت اور شوہر کے گھر کے فرائض میں توازن نہیں کر سکے گی۔ اور یہ امکان اغلب ہے ——— کیونکہ ذہین کے کردار میں سوائے
ایک وقتی جذباتیت کے اور کوئی بنیادی طور پر انقلابی عنصر نظر نہیں آتا ——— اس صورت میں نہ تو وحید اس کیلئے آسائش کے وہ سارے لوازم مہیا کر سکے گا جس کی وہ عادی ہے۔ نہ ذہین وحید کی
شرمیلی بہنوں اور شفیق ماں کی خصوصیات اپنا کر انکے بیان کے مطابق گھر میں ہی [illegible] رہیگی۔ اور یہ ایک ناکامی ہوگی ——— جسے طبقاتی حد قائم رکھنے کے حامی اپنے دلائل کے ثبوت
میں پیش کریں گے ——— فیض کے ساتھ "گلشن میں چند چاک گریباں ہوئے تو ہیں!" کیونکہ شاید ہم بھی اکثریت کی اقتصادی بدحالی کے خلاف اس نوعیت کی کمزور جذباتیت پر
اکتفا کر لیتے لیکن ڈر یہ ہے کہ جذبہ جد کی سمت غلط ہو جائے جیسے اُلٹا نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ پھر جذبہ جد میں قوت کا یہ قطعی فقدان جو مصالحت کر دینے والا ہے [illegible]
کردار میں ہے ایک فضا اپنے راستے کا تعین کر چکے تھے اپنے آہنی عزم کے سامنے محبت کو ایک حقیر کیڑے کی طرح مسل کر آگے بڑھتے رہے۔ ادھر [illegible] اپنے
طبقے کی لڑکیوں سے محبت کرنیکے باوجود ان سے شادی پر آمادہ نہیں ہوئے ——— دوسری طرف ہمارے ادب میں وحید کی قسم کے کردار ہیں جنہیں طبقاتی کشمکش کا احساس ہی اسی وقت
ہوتا ہے۔ جس وقت انہیں کسی جذباتی کشمکش میں شکست ہوتی ہے ——— ایک بات جو ملاحظہ طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ اس دور کے تقریباً سارے ادیب ایک محاذ پر متحد ہیں۔ اور وہ محاذ ہے
اکثریت کی اقتصادی بدحالی کے خلاف احتجاج ——— لیکن اکثر و بیشتر ان کوششوں میں یہ احتجاج کوئی معین صورت نہیں اختیار کر سکا۔ کردار جذباتیت کے دائرے میں قید ہی
چکر لگاتے رہتے ہیں! اور انہیں اس بات کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ کہ ذرا ٹھہر کر اپنے آپ سے سوال کریں۔ آخر ہم معاشرے کو کس سانچے میں ڈھالنا چاہتے ہیں؟ اور
ڈھالنے کا فرض کون ادا کرے گا ——— ہر ملک میں چھوٹے یا بڑے انقلاب کی پشت پر ادیب ہوتے ہیں ——— فرانس کے انقلاب کی پشت پر روسو اور والٹیر تھے۔ روس کے
انقلاب کی پشت پر روسی ادیبوں کا ایک پورا مجمع تھا۔ ٹالسٹائی۔ چیخوف۔ گورکی۔ ترگنیف۔ انگلستان میں ایک معمولی سی اصلاح ——— کارخانوں میں بچوں سے [illegible]
کی پشت پر بھی ادیب تھے ——— ادب ایک نسل کو دوسری نسل سے منسلک کرتا ہے۔ ایک نسل کا ادب دوسری نسل کے عمل کے لئے سنگِ بنیاد کا کام دیتا ہے [illegible]
حقائق کی روشنی میں آسانی سے فیصلہ ہو سکتا ہے۔ کہ نئی جذباتیت کے طوفان کس حد تک مستقبل کی ہواؤں کی سمت مقرر کر سکیں گے!

منظر و پس منظر

فلم کی تشکیل

فنونِ لطیفہ میں تخلیقی عمل کو ایسے مختلف درجوں یا حصوں میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ کہ ایک کی تشکیل و تکمیل دوسرے سے بے نیاز ہو کر ممکن ہو سکے۔ چنانچہ ایک مصور کے ذہن میں جب کوئی خیالی پیکر انگڑائی لیتا ہے۔ تو اس کے خدوخال خواہ دھندلے اور غیر واضح ہوں۔ لیکن مکمل تصویر کا ایک خاکہ اس کے نقش و نگار، خطوط اور رنگ مصور کے ذہن میں ضرور لہرا اٹھتے ہیں۔ چاہے وہ کتنے ہی ہلکے اور مبہم کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح فلم میں بھی جب افسانہ نگار موضوع کا انتخاب کرتا ہے۔ تو اس کے ساتھ ہی مرکزی خیال کی افسانوی صورت اور فلمی تشکیل کا تصور ناگزیر ہوتا ہے۔ البتہ فلم کے زنجیری مراحل اس کے تدریجی ارتقا کے فنی اور تکنیکی پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے اسے تین درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے۔ عملی طور پر یہ تقسیم ممکن نہیں۔

۱۔ موضوع یا مرکزی خیال کا انتخاب

۲۔ موضوع یا مرکزی خیال کی افسانوی صورت

۳۔ افسانے کی فلمی تشکیل

موضوع یا مرکزی خیال

موضوع یا مرکزی خیال کا انتخاب بہت نازک اور اہم مسئلہ ہے۔ خصوصیت سے اس لئے کہ کسی بھی خیال کو فلم کا موضوع قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور موضوع کی سماجی افادیت سے قطع نظر افسانہ نگار کی ذہنی اور جمالیاتی تہذیب و تربیت کے علاوہ اور کوئی معیار ایسا نہیں۔ جو اس انتخاب میں رہبری کر سکے۔ البتہ تکنیکی نقطۂ نظر سے چند ایک خصوصیات ایسی ہیں۔ جو اگرچہ اس انتخاب کو محدود تو نہیں کرتیں۔ لیکن مجموعی طور پر فلم کے محاسن و معائب پر اثر انداز ضرور ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم مرکزی خیال کی ڈرامائی اہمیت ہے۔ اگر موضوع ڈرامائی نقطۂ نظر سے کمزور ہے۔ تو دوسرے محاسن کے باوجود فلم کے لئے غیر موزوں ہے۔ کامیاب فلم کے لئے دوسری شرط مرکزی خیال کا اختصار ہے۔ مرکزی خیال کا انتخاب کرتے وقت یہ نظر انداز نہیں ہونا چاہیئے کہ فلم ایک محدود لمبائی اور نمائش کے لئے ایک محدود وقت کی پابند ہے۔ اس لئے ایک کامیاب فلم کے لئے اختصار اور جامعیت بنیادی خصوصیات ہیں۔ مرکزی خیال میں پھیلاؤ زیادہ ہونے کی صورت میں جزئیات

پیدا نہیں ہو سکتی۔ جس کے بغیر نظم کا پلاٹ منظر پر اس طرح ابھر نہیں پاتا اور نظم میں وہ جذباتی کیفیت جو ... صورت
پیدا نہیں ہو سکتی جو قاری کے احساسات کو نظم کے بنیادی تصور سے ہم آہنگ کر سکے۔ جیسی کہ خصوصیت و موزونیت ... ہوتی ہے
اگر مرکزی خیال لاشعوری پیچیدہ اور الجھا ہوا ہو تو ظاہر ہے کہ اس کی افسانوی صورت سے افسانے کی تشکیل میں ... تو فنی حسن پیدا نہیں ہو سکتا۔

مرکزی خیال کو افسانوی صورت دیتے وقت منظر نگار کے لئے ضروری ہے۔ کہ واقعات کو اس طرح ... واقعات میں منطقی تسلسل اور فطری بہاؤ پیدا کر سکے۔ کہانی کو بتدریج نقطۂ عروج تک لے جائے۔ کرداروں کی شخصیت اور ان کی ... واقعات کے پس منظر کو اس طرح ابھار کر رکھے۔ جو داخلی احساس اور خارجی ماحول میں ایک مناسبت اور ہم آہنگی پیدا کر سکے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ واقعات کو ترتیب دیتے وقت ان کی معنوی اہمیت کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ ... سے زیادہ ... واقعات کے اظہار میں اگر معنوی محاسن پیدا نہیں ہو سکتے۔ تو وہ اپنی تمام تر جذباتی نزاکت اور نفسیاتی خصوصیت کے باوجود فنی اعتبار سے قابل ... نہیں۔ عام افسانوں میں بعض اوقات ایک فقرہ، ایک لفظ اپنی اشاریت اور ایمائیت سے افسانے کے پس منظر کو ابھار دیتا ہے۔ لیکن ... تاثر پیدا کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ ایسے نفسیاتی اشاروں کا خارجی اظہار بھی ممکن ہو۔ جس کے لئے منظر نگار کو افسانہ نگار سے زیادہ ... سے سوچنا پڑتا ہے۔

منظر نگاری کا آخری مرحلہ افسانے کی فنی تشکیل ہے۔ جس کے لئے افسانے کو نفسیاتی تسلسل کے اعتبار سے مختلف حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اور ان حصوں سے مختلف مناظر اور مناظر سے مختلف قاش ترتیب دیئے جاتے ہیں۔ اس مرحلے پر منظر نگار کے لئے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے تمام مواد کو اس انداز سے ترتیب دے۔ جس سے ڈرامے کے تدریجی ارتقا، عروج اور عمل میں فطری بہاؤ اور توازن برقرار رہ سکے۔

یہاں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا۔ کہ مرکزی خیال کی افسانوی ترتیب اور بالخصوص اس کی فنی تشکیل میں حالات کا بہت دخل ہوتا ہے۔

جائزے

• انجمن ترقی اردو (ہند) کی دو کتابیں

[illegible] کے بارے میں تحقیقی کتابوں کی اشاعت برِ عظیم کے کسی ادارے سے پیچھے نہیں رہا ہے۔ یہ دو کتابیں انجمن کے زیرِ [illegible] مقصد سے شائع ہوئی ہیں۔ بلکہ آپ کے مخصوص اسلوب کے اعتبار سے بھی [illegible] کتاب "کاروانِ معیشت" ہے [illegible] کتاب "[illegible]" کا اردو میں نجم الدین شکیب ایم اے نے [illegible] سلیس اسلوب میں منتقل کیا ہے۔ کارل مارکس کے [illegible] کے بعد انسانی زندگی کی معاشی جدوجہد کو خاص اہمیت حاصل ہو چکی ہے اور آج کل جہاں کہیں بھی کسی قوم کی تہذیب و تمدن کے [illegible] تاریخی واقعات کو اقتصادی کوائف سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاتا بلکہ تاریخی [illegible] کی توجیہ اقتصادی حرکات کی روشنی میں کی جاتی ہے [illegible] کے پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ کتاب کاروانِ حیات کے طویل سفر کی داستان ہے جسے بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ انسان جب اس دنیا میں آیا تو کن حالات سے دوچار تھا، شروع شروع میں اس کے سامنے کیا دقتیں تھیں، ان دقتوں کا اس نے کس طرح [illegible] نے اسے کس طرح ہتھیار بنانے پر مجبور کیا، آلاتِ پیداوار کے تغیر کے ساتھ ساتھ اس کی اجتماعی زندگی کس طرح متاثر ہوتی رہی اور [illegible] کس طرح بڑھتا چلا گیا۔ مصنف نے ان تمام سوالوں پر بحث کی ہے اور اس سلسلے میں جو کچھ لکھا ہے سائنٹفک وضاحت کے ساتھ [illegible] کتاب [illegible] اور صحیح معلومات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے اور اس کی اشاعت انجمن ترقی اردو کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔

[illegible] ۲۲۴، کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت غیر مجلد چھ روپے۔ مجلد چھ روپے آٹھ آنے۔ مقامِ اشاعت: انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ۔ یوپی۔

[illegible] کتاب کا نام "احوالِ غالبؔ" ہے۔

[illegible] مختار الدین احمد نے "علی گڑھ میگزین" کا غالب نمبر شائع کیا تھا جو ہر جگہ بڑی قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا تھا۔ احوالِ غالب میں [illegible] اس نمبر کے تمام مضامین کو ترمیم و تنسیخ اور رد و بدل کے بعد شائع کر دیا گیا ہے بلکہ چار نئے مضامین بھی شامل کئے گئے ہیں اور یہ اضافہ نہایت مفید اور قابلِ قدر ہے۔ غالب پر بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں ان کتابوں کے ہجوم کو دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جاتا تھا کہ غالب کی شخصی زندگی اور شاعرانہ ذہنیت کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہوگا جس کی تشریح نہ ہو چکی ہو مگر احوالِ غالبؔ کے مطالعہ کے بعد پتہ چلتا ہے کہ ابھی اردو کے اس عظیم فنکار پر کام کرنے کی کافی گنجائش باقی ہے اور شاعری کی انفرادی و شعری [illegible] کو نئے زاویۂ نگاہ سے دیکھنے کی ضرورت بدستور موجود ہے۔ ڈاکٹر مختار الدین احمد کا یہ کارنامہ غالبیات کا ایک نہایت اہم باب ہے [illegible] ایسی معلومات کو اپنی اس کتاب میں فراہم کر دیا ہے جو غالب کے احوالِ حیات کے سمجھنے میں نہایت مفید ثابت ہو سکتی ہیں احوالِ غالبؔ عبدالماجد صاحب کے قول کے مطابق غالب اور غالبیات پر انسائیکلو پیڈیا کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ مجموعہ ان لوگوں کے لئے مشعلِ راہ کا کام دے گا جو غالب پر مزید ریسرچ کرنا چاہتے ہیں۔

[illegible] کتاب میں شامل مضامین میں سے اکثر مشاہیرِ ادب کے قلم سے نکلے ہیں۔ مضامین کے علاوہ کتاب میں غالب کی ایک رنگین اور کئی سادہ تصاویر [illegible] کے بارے میں مرتب کتاب کا ایک جامع مقالہ بھی درج ہے۔

[illegible] اچھی ہے۔ قیمت نو روپے۔ ضخامت ۲۹۶۔ انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ

چودھری افتخار علی پرنٹر پبلشر نے اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر مکتبہ اردو سے شائع کیا

دنیائے افسانہ

منتخب افسانوں کے چند مجموعے

چند روز اور	خدیجہ مستور	تین روپے
در و دیوار	احمد ندیم قاسمی	دو روپے آٹھ آنے
تیسرا آدمی	شوکت صدیقی	تین روپے
منزل کی طرف	انور	تین روپے آٹھ آنے
بادشاہت کا خاتمہ	سعادت حسن منٹو	تین روپے
منٹو کے افسانے	سعادت حسن منٹو	چار روپے
چپ	ممتاز مفتی	تین روپے آٹھ آنے
جگا	بلونت سنگھ	دو روپے بارہ آنے
چاندی کے تار	مہندر ناتھ	دو روپے بارہ آنے
طلسم خیال	کرشن چندر	دو روپے
ٹوٹے ہوئے تارے	کرشن چندر	دو روپے
زندگی کے موڑ پر	کرشن چندر	دو روپے
ان داتا	کرشن چندر	دو روپے آٹھ آنے
جنگل	میرزا ادیب	دو روپے آٹھ آنے
کلیاں اور کانٹے	اختر اورنیوی	دو روپے بارہ آنے
ایک لڑکی	خواجہ احمد عباس	ایک روپیہ آٹھ آنے

ڈراما

قید حیات
اوپندر ناتھ اشک
دو روپے

چرواہے
اوپندر ناتھ اشک
دو روپے

تین عورتیں
سعادت حسن منٹو
ایک روپیہ بارہ آنے

سحر ہونے تک
ناصر شمسی
تین روپے

مکتبہ اردو، لاہور

Regd. No. L. 3521

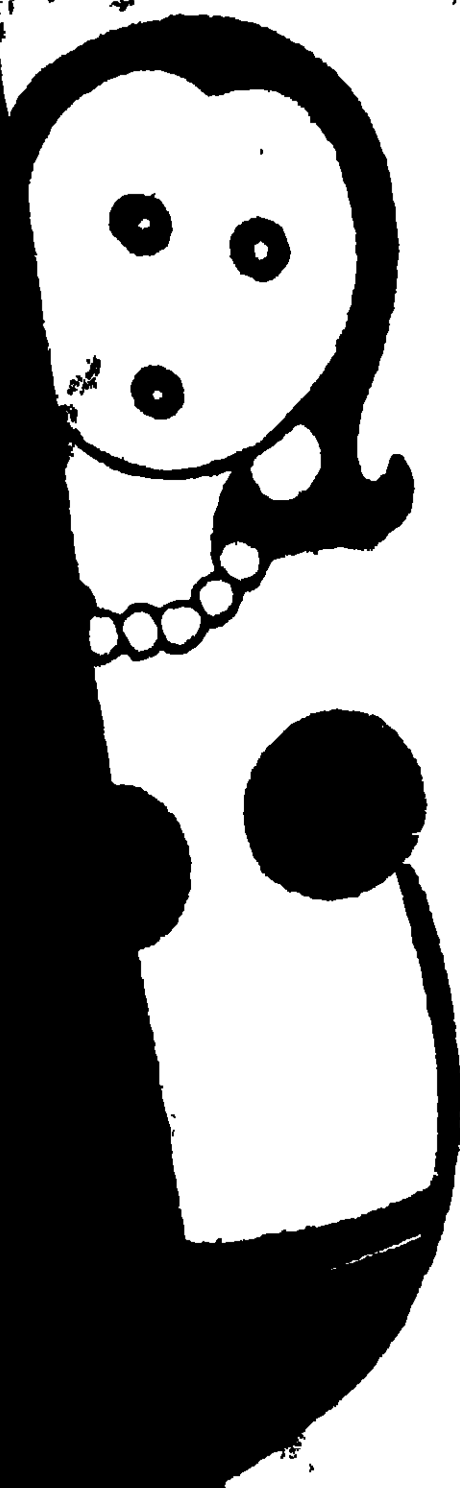
بہترین ادب

۱۹۵۲ء

بہترین ادب

مکتبہ اردو
لاہور

ONLY TITLE PRINTED AT ASHRAF PRESS, 7 AIBAK ROAD, LAHORE



ادبِ لطیف

نومبر

۱۹۵۲

نیا ادب

تنقید

بحث و نظر	ڈاکٹر سید عبداللہ	پانچ روپے
تنقیدی زاویے	ڈاکٹر عبادت بریلوی	چار روپے
نئی قدریں	ممتاز حسین	چار روپے

ناول

جھیل اور کنول	اے حمید	چار روپے
ڈربے	اے۔ حمید	چار روپے
نئی پود	مترجمہ: انتظار حسین	تین روپے آٹھ آنے
بامبی	مترجمہ: ظہور الحسن ڈار	دو روپے
ڈرپوک	ابو سعید قریشی	دو روپے آٹھ آنے
تہمت	ابو سعید قریشی	تین روپے

اے۔ حمید کی تازہ ترین تصنیف

جہاں برف گرتی ہے

(ناولٹ) دو روپے چار آنے

جنگل روتے ہیں — اے۔ حمید — چار روپے

طنز و مزاح

داستان غریب حمزہ

اے۔ حمید کے فکاہی مضامین

قیمت دو روپے آٹھ آنے

مکتبہ اردو، لاہور

ادبِ لطیف

جلد ۳۷ شمارہ ۱

مینجنگ ایڈیٹر ـــــ افتخار علی چودھری

ایڈیٹر ـــــ میرزا ادیب

پاکستان میں
زرِ سالانہ ، آٹھ روپے
غیر ممالک
زرِ سالانہ ، بارہ روپے
فی پرچہ ۱۲ر آنے

مکتبۂ اردو ـ لاہور

ترتیب

اداریہ

پیرایۂ آغاز

جوشؔ کی ایک نظم

کچھ عرصہ ہوا دہلی سے اردو نظموں کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا جس کا نام "شکستِ زنداں" ہے اور جسے اردو کے نامور شاعر جناب غلام ربانی "تاباںؔ" نے مرتب کیا ہے۔ اس مجموعے میں مرتب نے اردو کی صرف انہی نظموں کو یکجا کرنے کی کوشش کی ہے جو بلا واسطہ یا بالواسطہ ایشیا کی موجودہ بیداری اور ایشیائی ممالک کی مختلف ترقی پسند تحریکوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ہمیں اس وقت اس مجموعے کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں البتہ ہم اس نظم کو نظرانداز نہیں کر سکتے جو اسی نام سے جوشؔ ملیح آبادی کے قلم سے "نقوش" کے تازہ شمارے میں شائع ہوئی ہے جوشؔ نے اس نظم پر ایک نوٹ بھی دیا ہے جس کے اجزائے ترکیبی کا جائزہ لیا جائے تو ذیل کے امور واضح ہو جاتے ہیں :

۱۔ جناب جوشؔ کو پہلی شکایت یہ ہے کہ اس مجموعے میں ان کی ایک ایسی نظم کو شامل کیا گیا ہے جو ناتمام و ناتراشیدہ ہے اور جو نظرِ ثانی کی ورکشاپ سے ہنوز باہر نہیں آئی تھی اور کاتب کی غلطی اور اس سے زیادہ میری غفلت کی بنا پر میرے جدید مجموعے میں شامل ہو چکی ہے۔"

۲۔ "شکستِ زنداں" میں جن نومشق و نوجوان شعراء کو شامل کیا گیا ہے ــــــ ان کے عقائد سے اختلاف کے تصور کو بھی میں کفر سے بدتر خیال کرتا ہوں لیکن جہاں تک کہ شاعری کا ، جس میں کلامِ موزوں داخل نہیں کیا جا سکتا مجھے ان نو واردانِ کوچۂ شعر سے شدید اختلاف ہے۔"

۳۔ نوجوان شعراء کی "فنی بیماریوں اور ادبی خامیوں پر کب سے دل ہی دل میں کڑھ رہا ہوں ــــــ اور اب خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ اگر بزرگ یونہی چپ سادھے بیٹھے رہیں گے تو طرود اپنا اور اپنے ساتھ شاعری کا بیڑا بھی غرق کر دیں گے ــــــ اپنے قفلِ خاموشی کو مجبوراً توڑ دیا ہوں۔"

۴۔ "ہو سکتا ہے میری اس نظم سے شدید اختلاف کیا جائے ــــــ اور نوخیز جذبات کے ناسنجیدہ تموج و تلاطم کی بنا پر اس تخاطب کی لے یہاں تک بڑھ جائے کہ میرے سے قدامت مند و روایت گداز انسان کو قدامت پرست و روایت دوست کا خطاب بھی عطا فرما دیا جائے۔"

۵۔ ــــــ اور آخر میں "ان نوخیز شعراء سے میری نیت کی طرف سے بدگمانی کا اظہار کیا جائے گا تو واقعی میرے دل کو ایک شدید ضرب لگے گی۔"

یہ تو ہے اس نوٹ کا ماحصل جو نظم کے اوپر دیا گیا ہے۔ نظم کے ستائیس شعروں میں سے بائیس شعروں میں مختلف تشبیہات و اسناد ات کا سہارا لے کر نوخیز شعراء کی "وجیہہ و ذوالاکرام شعر سازی" اور "بے وقار و بے ناموس شعریت" کا حسبِ معمول شاعرانہ اظہار کیا گیا ہے

اور باقی پانچ شعروں میں " ان گدایانِ کوئے دانش " کی خوش فہمیوں کو ہدفِ ملامت بنایا گیا ہے۔

اس سے پیشتر کہ ہم ان امور کا تجزیہ کریں، جناب جوش کے بارے میں دو ایک باتیں عرض کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

جوش برعظیم کے ان شعراء کی صف میں سمجھے جاتے ہیں جن کا احترام' ہند و پاکستان کا ہر مدرسۂ فکر کسی نہ کسی حد تک ضرور کرتا ہے۔ انہوں نے اردو کی نیچرل شاعری میں نہایت اہم اضافہ کیا ہے اور قطع نظر ان کے لہجے کی بے اعتدالیوں کے بعض انقلابی نظموں میں ملک کی ترقی پسند قوتوں اور صحت مند رجحانات کی بڑی شدت و خلوص کے ساتھ ترجمانی بھی کی ہے ایسے محترم شاعر کا جن کا رویہ اصولاً نوجوان نسل کے ساتھ نہایت مشفقانہ ہونا چاہیے، نوجوان و نوخیز شعراء پر اس انداز سے گرجنا اور اس طرح برس پڑنا نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ مختصر نوٹ میں انہوں نے جدید شاعروں کے لئے دو مرتبہ " نوجوان"۔ ایک مرتبہ " خورد"، ایک مرتبہ "نومشق" اور ایک جگہ " نوخیز" کے الفاظ استعمال کئے ہیں اور خود کو بزرگ کہا ہے۔ کیا کسی بزرگ کی شان کے یہ شایاں ہے کہ وہ اپنی ترکشِ ملامت و تضحیک کے تمام تیر نوخیز، نومشق، نوجوان اور خورد نسل کے سینے میں ترازو کر دے ؟

اگر جوش کو اس بات کی شکایت ہے کہ ایک غیر مکمل اور ناتراشیدہ نظم کو شریکِ مجموعہ کیا گیا ہے تو اس میں ان کا اپنا قصور ہے اور وہ خود اپنی غفلت کا اعتراف کر چکے ہیں ——— اور اگر شکایت ہو بھی سکتی ہے تو مرتب سے' اس میں نوخیز شعراء کا کیا قصور ؟ اس بات کا غصہ (غیر شعوری طور پر) انھوں نے نئی نسل پر کیوں نکالا ہے !

دوسری بات جو جوش نے کہی ہے وہ یہ ہے کہ ان نوخیز و نومشق شعرا کے عقائد سے اختلاف ان کے نزدیک ایک کفر سے بھی بدتر ہے —— انھیں شکایت ان کے شعروں کی فنی خامیوں اور زبان و بیان کی ناپختگی سے ہے ایک طرف تو مبالغے کی انتہا یہ ہے' ان کے عقائد سے اختلاف کو کفر سے بدتر امر سمجھا جاتا ہے اور دوسری طرف صورتِ حال یہ ہے کہ ان کی فنی خامیوں کو دیکھ کر ان پر "مینڈکوں کا جلوس" کی پھبتی کہی جاتی ہے۔

حیرت ہے جوش جیسا باشعور عقائد و تصورات کو نظر انداز کر کے صرف اسلوب اور ہیئت کو اہمیت دیتا ہے۔ جوش کے قلم سے یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کیونکہ ان کی انقلابی شاعری میں جس چیز کو اہمیت حاصل ہے وہ باغیانہ تصورات کی آتشیں لہر ہے ——— ورنہ اسلوب ان کے یہاں بھی فرسودہ، پٹا ہوا، پرانا اور سخت قسم کا روایتی ہے۔ ان کی انقلابی شاعری بلند بانگ تصورات کی شاعری ہے ——— ہیئت میں انھوں نے ایک انچ بھی آگے قدم نہیں اٹھایا۔ جہاں تک اسلوب کا تعلق ہے وہ ہیئت پرست اور ساتھ ہی روایت پرست بھی ہیں پھر انھیں یہ کہنے کا کس طرح حوصلہ پڑتا ہے کہ نوجوان شاعروں کے ہاں ——— " شعر سازی و جبہہ و ذوالکلام ——— شعریت بے وقار و بے ناموس "

ہے ـــ فن کے معاملے میں یہ نوخیز شاعر سخت غیر سنجیدگی کا اظہار کرتے ہیں ـــ لیکن اس کا مطلب یہ تو نہ ہونا چاہئے کہ شکایت کرتے ہوئے خود غیر سنجیدہ انداز اختیار کرلیں اور ایسی سطح پر اتر آئیں جسے علمی سطح نہیں کہا جاسکتا۔ یہ باتیں کوئی اور لکھتا تو ہم انھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھتے ـــ مگر قیامت یہ ہے کہ جوشؔ جیسا بلند پایہ شاعر نوخیز شاعروں کے ساتھ ایسا رویہ اختیار کرتا ہے جو ایک بزرگ کی شان و سنجیدگی کے سخت خلاف ہے !

ایک اور بات بھی ہے جس کی طرف اشارہ کرنا شاید غیر مناسب نہ ہو۔

اپنے نوٹ میں جوشؔ نے ایک جگہ کہا ہے :

" اتنے قربِ روحانی کے باوصف میری نئی نسل نے اب تک مجھے پہچانا ہی نہیں ہے اور ان کی مردم شناسی کی صلاحیت اس عبرتناک حد تک سقیم و ناقص ہے کہ ان میں آج تک اس رندِ خرابات کی معرفت ہی حاصل نہیں ہوئی ہے ۔"

یہ سطریں پڑھ کر جب ہم نظم کے آخری حصے پر پہنچتے ہیں جہاں جوشؔ نئے شاعروں پر بُری طرح برس پڑے ہیں تو ذہن میں یہ شک پیدا ہو جاتا ہے کہ شاید نئی نسل نے اس رندِ خرابات کے ساتھ کسی نہ کسی رنگ میں ضرور گستاخی کی ہے ـــ یا معرفت حاصل کرنے میں کوتاہی کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ ـــ

حیف ان بچگانِ خامی پر — کہ سمجھتے ہیں خود کو جالینوس
ان گدایانِ کوچۂ دانش میں — کوئی دارا ہے کوئی کیکاؤس
صرف اک بوند بھر ذرا سی جان — اس پہ یہ ضد ہمیں کہو قاموس
سرِ اقدس حباب کے مانند — اور دستار بحرِ اوقیانوس

آفریں بر غلامِ ربانی
کیا نکالا ہے مینڈکوں کا جلوس

اس ناخوشگوار ذکر کے ساتھ ہمیں ایک اور بات ـــ تلخ ہی سہی ـــ کہنا ہے : جوشؔ کی شکایت بالکل بے جا بھی نہیں اگرچہ کہنے کا ڈھنگ سخت بے جا ہے۔ نئی نسل فن کی تخلیق میں جگر کاوی کی قائل نہیں رہی ہم میں سے بیشتر ادیب سمجھتے ہیں کہ ایک بات کہنے کیلئے جتنا بلند آہنگ اختیار کرلیا جائے اتنا ہی بلند ادب پیدا ہوتا ہے۔ کچھ کہنے سے پیشتر کہنے والی چیز پر غور کرنے، بار بار غور کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی ـــ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ جذبے کی گہرائیوں میں سے نکلتا ہی نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ ادبی اور فنّی اعتبار سے سخت ناقص ہوتا ہے ـــ جوشؔ کو صرف فنّی خامیوں کی شکایت ہے ـــ ہم کہتے ہیں بعض لوگوں میں کچھ کہنے کیلئے ہوتا ہی نہیں اور وہ جھٹ "ادب پارے" تخلیق کرنے لگتے ہیں۔

آخر ایسا کیوں ہو رہا ہے ـــ یہ روش کیوں قائم ہے ـــ ادبی معیار کیوں روز بروز پست ہوتا چلا جا رہا ہے ـــ اس کی ذمہ داری ان مرتّبین پر بھی عاید ہوتی ہے جو ذرّے کو محض اس بنا پر آفتاب کہتے ہیں اور کہلوانا چاہتے ہیں کہ ہر ذرّہ خوش قسمتی سے ان کی پارٹی ـــ یا حلقۂ اثر ہی کی فضا میں پرواز کر رہا ہے۔ جب سردار جعفری جیسی ذمے دار شخصیت نیاز حیدر کو بہت بڑا شاعر کہے اور مجروحؔ کی نہایت معمولی غزلوں میں شاعری کا بہترین حسن دیکھے اور ربّانی انتخاب کرتے وقت اپنے "حلقۂ اثر" سے باہر نہ نکل سکے تو اس ادب کی کیونکر ہمت افزائی نہ ہوگی تو اس "ادب" کی کیونکر ہمت افزائی نہ ہوگی جو مواد اور ہیئت کے اعتبار سے ناقص ہے۔

پروفیسر صفی حیدر دانش

ہمارے ادب میں قنوطیت

قنوطیت کے معنی مایوسی کے ہیں۔ اس لئے اس لفظ کے کانوں میں آتے ہی غم و اندوہ اور نالہ و شیون کا تصور آجاتا ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ غم و اندوہ کا اظہار ہمیشہ قنوطیت سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ ادبیات کے دائرے میں قنوطیت کا لفظ ایک اصطلاح کی حیثیت رکھتا ہے۔ اظہارِ درد و ملال کی ہر وہ صورت جو حقیقی اسبابِ غم سے پیدا ہو۔ قنوطیت قرار نہیں دی جا سکتی۔ مثلاً مرثیوں میں خواہ وہ عام ہوں یا مذہبی حیثیت کے ہوں، درد و الم کی ترجمانی ضرور ہوتی ہے۔ لیکن اس قسم کے اظہارِ ملال کو قنوطیت نہیں کہا جا سکتا۔ مثنویوں میں المیہ واقعات کے سلسلے میں ناکامیوں اور اشک افشانیوں کے بہت سے سامان ملتے ہیں لیکن وہ بھی قنوطیت کے دائرے میں شامل نہیں کئے جا سکتے۔

قنوطیت کسی ہنگامی یاس و ناکامی کے اظہار کا نام نہیں بلکہ وہ ایک مخصوص و مستقل اندازِ فکر اور طرزِ احساس کا نام ہے۔ اس میں ایک نظریاتی شان ملتی ہے۔ وہ ایک شدید ذہنی میلان ہے۔ جس میں ایک انسان زندگی کے محض تاریک پہلو کا مشاہدہ کرتا ہے اس کی نگاہیں زندگی کے روشن پہلو کی طرف سے گویا بند ہو جاتی ہیں۔ ایسا شخص کائنات کے نظام، اس کے ہنگاموں اور اس کے تمام مرغوباتِ دلچسپی کو بیکار و مہمل سمجھتا ہے۔ غرضکہ قنوطیت دراصل رجائیت کی ضد ہے جس میں آزردہ خاطری ایک خاص شعار اور مسلک بن کر رہ جاتی ہے۔

قنوطیت اگرچہ فرد کی افتادِ مزاج سے گہرا تعلق رکھتی ہے مگر ساتھ ہی عصر و ماحول کے اثرات بھی اس کی نشو و نما کا باعث ہوتے ہیں۔ یہ میلان روایتی اور تقلیدی امور سے بھی تقویت پذیر ہوتا ہے۔ اس لئے کسی ادب میں قنوطیت سے بحث کرتے وقت متعدد انفرادی، قومی اور تاریخی مسائل محلِ نظر ہو جاتے ہیں۔ اور ان کے موجبات و اثرات، فوائد و نقصانات کی دلچسپ تفصیلات کے سلسلے میں بہت سی اہم باتیں معرضِ بحث میں آجاتی ہیں۔

ہمارے ادب میں قنوطیت کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس سے ہماری بعض ادبی و ملکی خصوصیات کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو ادب دنیا کے جدید ترین ادبوں میں سے ہے۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ قنوطیت پسندانہ جذبات و خیالات سے اس قدر مالامال ہے کہ اس کی مثال کسی پرانے ادب میں بھی ذرا مشکل سے مل سکتی ہے۔ قنوطیت کی افراط ہمارے ادب میں موردِ اعتراض بھی رہی ہے تاہم اس میں ایک ایسی جامعیت اور دلچسپی ہے جو ایک خاص عظمت و اہمیت رکھتی ہے۔

ہماری نثر کی تصانیف میں قنوطیت کا عنصر تقریباً مفقود ہے۔ پرانے قصے عموماً طربیہ ہیں۔ قدما کی مذہبی اور اخلاقی تصانیف میں بھی قنوطیت کا کوئی عنصر نہیں۔ عہدِ جدید کے بعض ناولوں اور افسانوں میں المیہ انداز تو ہے لیکن وہ بھی قنوطیت نہیں ہے۔ جدید نظموں میں کہیں کہیں عدمِ اطمینان، اندوہ ہنائی اور جھلاہٹ کے مضامین مل جاتے ہیں لیکن قنوطیت کا انداز ان میں بھی نہیں ہے۔ قنوطیت کا تمام

سرمایہ ہمارے یہاں دراصل غزلوں میں ملتا ہے۔ غزل ہمارے ادب کی سب سے وسیع اور مقبول ترین صنف ہے جو داخلی کیفیات سے تعلق رکھتی ہے۔ ہماری غزلوں کا ایک بڑا حصہ اندوہ و یاس کا سرمایہ ہے اور اس میں شدید تاثر، نشتریت اور سوز و گداز کی بجلیاں پوشیدہ ہیں۔ غزلوں میں اس میلان کی ترقی اور مقبولیت کے متعدد اسباب ہیں جن کی مختصر کیفیت یہ ہے:۔

غزل کا موضوع محبت ہے۔ یہ ایک ایسا جذبہ ہے جس کے طاری ہونے کے بعد آرام و آسودگی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتی ہے۔ عشق ایک اضطرابِ مسلسل کا نام ہے۔ محبت کی دنیا کاوش و جستجو کی دنیا ہوتی ہے۔ جس میں حصولِ مقاصد کے بعد بھی طمانیت و آسودگی پیدا نہیں ہوتی۔ اس لحاظ سے جذباتِ محبت کی شدت قنوطیت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔

ہمارے یہاں غزل ایران سے آئی۔ اور اندوہ و یاس کی کچھ روایات لے کر آئی۔ اس کے کئی وجوہ تھے۔ فارسی غزلوں میں قنوطیت پسندانہ میلانات، صوفیانہ مذاق کی بدولت بہت تقویت پذیر ہوئے۔ تیسری اور چوتھی صدی ہجری میں مذاقِ تصوف اہلِ ایران میں ہر گیر ہو چکا تھا۔ جس کا اظہار کچھ آگے چل کر غزلوں میں بڑی شد و مد سے ہونے لگا۔ صوفیوں کے نزدیک مادی زندگی ایک ہجر و فراق کا عالم ہے۔ صاحبانِ طریقت کی روح محبوبِ حقیقی کی جدائی محسوس کرتی ہے اور ان جلوؤں کی یاد میں بے قرار رہتی ہے جن کا نظارہ یومِ الست کیا تھا۔ یہ کیفیت ایک کرب و اضطراب کا عالم پیدا کرتی ہے۔ پھر وصالِ محبوب کے لئے جو ریاضتیں کی جاتی ہیں وہ بھی بہت شاق و شدید ہوتی ہیں۔ ترکِ دنیا اور نفس کشی کے تمام طریقے اختیار کئے جاتے ہیں اور ان سب کا نتیجہ ایک طرح کی قنوطیت پسندی کی صورت میں نمودار ہوتا ہے یہاں تک کہ عشق دنیا کے تمام غموں کا مجموعہ بلکہ خود لفظ غم کا مترادف قرار پا جاتا ہے۔ ایران کا مشہور صوفی شاعر عراقی کہتا ہے ؎

بہ عالم ہر کجا درد و بلا بود　　　بہم کردند و عشقش نام کردند

حضراتِ صوفیا کا عقیدۂ توحید وجودی بھی کائنات کے لاموجود اور بے اصل ہونے کا تصور پیدا کرتا ہے۔

یہ حالات چل ہی رہے تھے کہ ایران پر تاتاریوں کا حملہ ہو گیا، ملک پر تباہی آگئی، لاکھوں جانیں ضائع ہو گئیں۔ قتل و غارت کے بے پناہ طوفان نے حیات و کائنات کی بے ثباتی کے نقش دلوں پر بٹھا دئے۔ ادھر سے ادھر تک خوف و ہراس کی فضا چھا گئی اور اندوہ و بے کسی کے جذبات دلوں پر طاری ہو گئے۔ صنفِ غزل ان حالات سے بہت زیادہ متاثر ہوئی۔ اس کے لب و لہجہ میں یاس و الم کا انداز اور بھی بڑھ گیا۔ اور ایران کی شاعرانہ فضا پر قنوطیت کے گہرے بادل چھا کر رہ گئے۔

اردو شعراء نے اسی قسم کی ایرانی شاعری کا تتبع کیا۔ اس لئے ان کے یہاں شروع ہی سے قنوطی انداز پیدا ہو گیا۔ ولی کا شعر ہے ؎

گروہِ غم، آب تیغِ عشق کے معمار نے لے　　　خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

سراج بھی دکن کے ایک پرانے شاعر ہیں، وہ کہتے ہیں ؎

چلی سمتِ غیب سے اک ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا　　　مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

یہ قنوطی رنگ عرصے تک یونہی چلتا رہا لیکن اس میں بھرپور صداقت اور سچی تاثیر کا عنصر کم تھا۔ یاسیاتی شاعری کا شاندار دور ہمارے ادب میں میر تقی میر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ پہلے شاعر ہیں جنہوں نے قنوطیت کو محض تقلیدی طور پر نہیں بلکہ اپنی فطرت سے

تقاضے سے شاعری میں جگہ دی۔ انہوں نے اس روایت کو حقیقت بنا دیا، شرابِ یاس انہوں نے پہلے خود پی پھر دوسروں کو پلائی۔ وہ اس راہ کے میرِ کارواں تھے۔ میرؔ صاحب فطرتاً یاس پسند تھے۔ پھر اُن کی ابتدائی تربیت نے اُن میں عشق و نالہ پیشگی کی رغبت پیدا کر دی۔ درویشانہ ماحول میں تربیت پا کر وہ پہلے ہی سے بے ثباتیٔ حیات کا اثر قبول کر چکے تھے۔ پھر کم سنی میں یتیم ہو کر، بے کسی، مفلسی اور بے نوائی کے ہاتھوں غمِ روزگار کی اُلجھنوں میں مبتلا ہو گئے، اور بعد میں دُرّانیوں اور مرہٹوں کے ہنگاموں اور خونریزیوں کے مناظر دیکھ کر وہ اندوہ و عبرت کا ایک مرقع بن کر رہ گئے، سیاسی انحطاط کے باعث ملک کی فضا خوف و ہراس کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ دہلی اور اس کے گرد و نواح میں لوگوں کی طبیعتیں دردمندانہ جذبات کی پذیرائی کے لئے آمادہ تھیں، اس شکست خوردہ ذہنی ماحول میں میرؔ صاحب نے اپنے پُر اثر اور دلخراش انداز میں دل کے مرثیے اس طرح سنائے کہ تمام ادبی فضا کو ماتم کدہ بنا دیا۔ وہ ایک مخصوص دبستانِ قنوطیت کے مؤسس ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے قنوطیت کو بہت مقبول بنا دیا اور دوسرے شعراء پر اُن کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ اس کی صدائے بازگشت آج تک سنائی دیتی ہے۔ میرؔ صاحب قنوطیت کے اظہار میں بڑا سلیقہ رکھتے ہیں۔ اُن کے اشعار جس طرح دل میں اُتر جاتے ہیں اس کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے ؎

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

دل تڑپے ہے جان گھلے ہے حال جگر کا کیا ہوگا　　مجنوں مجنوں لوگ کہے ہیں مجنوں کیا ہم سا ہوگا

ہمارے آگے ترا جب کسو نے نام لیا　　دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

میرؔ عمداً بھی کوئی مرتا ہے　　جان ہے تو جہان ہے پیارے

کیا پوچھتے ہو عاشق راتوں کو کیا کرے ہے　　گاہے بکا کرے ہے، گہے دعا کرے ہے
ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن　　سینے میں جیسے کوئی دل کو مَلا کرے ہے
کیا جانے کیا تمنّا رکھتے ہیں یار سے ہم　　اندوہ ایک جی کو اکثر رہا کرے ہے

میرؔ کے شاگرد راسخؔ عظیم آبادی بھی دردمندی کے بڑے دلدادہ تھے۔ صاحبِ گلِ رعنا لکھتے ہیں کہ مشاعروں میں "جب شعرا غزلیں پڑھا کرتے تھے تو یہ آنکھیں بند کئے جھوما کرتے تھے، اپنی غزلیں پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔" ان کے یہاں بھی میرؔ کا سا قنوطی انداز اپنی پوری نشتریت کے ساتھ جلوہ گر ہے، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ اب　　کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

ضبطِ گریہ تو ہے پر دل پہ جو اک چوٹ سی ہے　　قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز

اپنا بھی ماجرائے دلِ اک مرثیہ سا ہے　　　بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر

شعرائے دہلی میں مومن۔ غالب اور ذوق کے کلام میں میر کے انداز کی جھلک ملتی ہے۔ مومن کا رنگ اگرچہ علیحدہ اور مخصوص تھا۔ تاہم وہ اس قسم کے اشعار بھی کہہ جاتے تھے ؎

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی　　　آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

مرزا غالب اپنی شوخیِ طبع اور شگفتہ مزاجی کے باوجود میر سے بہت متاثر ہیں، وہ بھی قیدِ حیات کو بندِ غم ہی سمجھتے ہیں اور اسی قسم کے بہت سے اشعار کہتے ہیں ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج　　　شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

آئے ہے بیکسیِ عشق پہ رونا غالبؔ　　　کس کے گھر جائیگا سیلابِ بلا میرے بعد

ذوق کے یہاں یاس و مہجوری کی بہت سی پُر اثر تصویریں ہیں مثلاً ؎

پھول تو دو دن بہارِ جانفزا دکھلا گئے　　　حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے

لائی حیات آئے قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

اور پھر وہ یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں ؎

نہ ہوا پر نہ ہوا میرؔ کا انداز نصیب　　　ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

ابوظفر بہادر شاہ آخری تاجدارِ دہلی کی زندگی بڑے مصائب میں بسر ہوئی۔ غدر کے بعد دہلی کی تباہی، اعزا کا قتل اور پھر اپنی اسیری و جلاوطنی کے ہاتھوں ان کے یہاں یاس و دردمندی کا انداز آپ بیتی بن گیا ہے۔ اس لئے بہت پر اثر معلوم ہوتا ہے۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

ہم اپنے کنجِ غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں　　　ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد　　　اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

لکھنؤ میں جب تک نوابی کا دور رہا وہاں عیش و نشاط کی ترجمانی ہوتی رہی، لیکن جب واجد علی شاہ معزول ہوئے تو لکھنؤ کا مذاقِ فکر بھی بدلا۔ اندوہ و ملال کے آثار طاری ہو گئے۔ دنیا اور عیشِ دنیا کی بے ثباتی گہرا اثر کرنے لگی محفلیں ویران ہو گئیں اور حصولِ عبرت کے لئے چشمِ تصور گورستان کی سیر کرنے لگی۔ کامل نے غالباً سب سے پہلے یاس و حسرت کے رنگ کو ابھارا اور پھر اس کا مذاق عام ہو گیا۔ یہ بھی قنوطیت نگاری کا ایک مخصوص انداز تھا۔ عزیزؔ لکھنوی کے یہاں یاس و ماتم کی یہ لے بہت تیز ہو گئی۔ ان کی غالباً کوئی غزل ایسی نہ ہو گی جس میں موت اور اس کے متعلقات پر دو چار شعر نہ ہوں۔ ان کی ایک ہی غزل سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے ؎

یہ مشورہ ہم اٹھتے ہیں چارہ گر کرتے　　　اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آتے ہیں ورنہ — ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے
سوادِ شہرِ خموشاں کا دیکھتے منظر — سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے

اور اشتیاقِ نوحہ خوانی کی انتہا یہ ہے کہ :-

حریفِ لذتِ غم تھے اگر نہ کچھ ہوتا — تو نوحہ خوانیٔ ناکامیٔ عدو کرتے

جوش کے بعد یہ قنوطی انداز فانی بدایونی کے یہاں شدت سے نمودار ہوا۔ فانی زندگی بھر ناکامیوں میں مبتلا رہے۔ میر کی طرح ان کا سارا کلام ان کی محرومیوں کا افسانہ ہے۔ وہ دورِ جدید میں یاسیات کے امام مانے جاتے ہیں۔ ابتداء میں لکھنوی رنگ کے زیرِ اثر ان کے یہاں بھی مرگ و لحد کے متعلقات کی کثرت رہی، بعد میں ان کے یہاں ایک فلسفیانہ بصیرت اور غور و تامل کا عنصر شامل ہو گیا۔ اسی کی بدولت قنوطیت کے لب و لہجہ میں وقار و تمکنت پیدا ہو گئی۔ اور انہوں نے دردمندانہ جذبات کو جدید اسالیبِ فکر سے کچھ قریب کر دیا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں :-

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن — جس کو غربت راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی — فانیٔ ناامید کو موت کا آسرا دیا

لیکن پھر مرگ بھی وجہِ تسکین نہیں بنتی ہے

مرگ بے ہنگام تو تھی وجہِ تسکیں ہو چکی — زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

غرض کہ قنوطیت کے زیرِ اثر ہمارے ستم رسیدہ شعراء نے اعلیٰ قسم کے شعر کہے ان میں ایک دائمی گداز اور نشتریت پیدا کی اور درد و تاثیر کے عناصر کو غیر فانی بنا دیا۔ البتہ عام طبائع پر اس کا اثر اچھا نہ ہوا۔ قوائے عزم و عمل میں ایک تعطل رہا اور عرصے تک قومی بیداری و ترقی کی راہیں مسدود رہیں، دبی دبی آہیں ہمارے منظوم ادب میں آج بھی سنائی دیتی ہیں لیکن قنوطیت اب رو بہ انحطاط نظر آتی ہے۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان - راولپنڈی)

پروفیسر دلشاد کلانچوی

ڈاکٹر نذیر احمد کے ننھے کردار

ڈاکٹر نذیر احمد مرحوم کے قلم میں بلا کا زور اور جوش تھا۔ وہ اپنے قلم سے مصوری کرتا تھا بلکہ بے لاگ تصویریں کھینچنے والا مصور۔ جب اسلامی خاندان کی اندرونی معاشرت کے مرقعے پیش کرتا ہے۔ تو اس کا فنی جوش، صداقت اور مشاہدات و تجربات کا بہترین سرمایہ بن جاتا ہے۔ اس کے فن کی یہی خصوصیت اس کے تعلیمی، اخلاقی، مقصدی اور اصلاحی ناولوں کو بھی دلچسپ بنا دیتی ہے۔ اور وہ اپنے فن کے سہارے سے نئے دور کی اقدار سے فائدہ اٹھانے کی صورت ڈھونڈ نکالتا ہے۔ وہ ملکی بدنظمی، بے راہ روی، غربت اور سماجی اور معاشرتی تنزل کو دور کرنے کے لئے گھریلو فضا کو پرسکون اور سازگار بنانا نہایت ضروری سمجھتا تھا۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر اس نے ناول لکھے۔ اور ناولوں میں گھریلو زندگی کے ہر پہلو کو اجاگر بھی کیا۔ اور اس پر تنقید بھی کی۔

گھریلو زندگی اور بچوں میں گہرا نفسیاتی تعلق ہے۔ بچہ سب کچھ یا کم از کم زیادہ کچھ گھر سے سیکھتا ہے۔ گھر کا ماحول اس کی زندگی پر پہلی چھاپ ہوتا ہے۔ گھر ہی سے بچے بگڑتے بھی ہیں اور سنورتے بھی ہیں۔ ایک بچے کی آئندہ زندگی گھریلو ماحول سے اپنا ڈھانچہ تیار کرتی ہے۔ گھریلو فضا کی سازگاری اور استواری اس کی آئندہ زندگی کی سازگاری اور استواری کی آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد بچوں کی نفسیات سے کماحقہٗ واقف نہ تھا۔ اس نے اپنی تعلیمی سکیم کی کامیابی کا دارومدار بچوں پر رکھا ہے۔ اسی وجہ سے اس کے ننھے کردار بھی مقصدیت کا شکار ہو گئے ہیں۔ وہ اصلاح چاہتا تھا۔ اور اسے یہ شعور تھا۔ کہ بڑے کرداروں کی اصلاح مشکل ہے۔ وہ بچوں کو اپنی مقصدیت کے مطابق ڈھال کر ان سے کام لینا چاہتا تھا۔ اور یہ کردار ڈھالنے میں اس نے ٹھوکر کھائی ہے۔ مقصدیت کی لگن اسے بچوں کی مکمل نفسیات نہیں جانچنے دیتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے کرداروں کو ہر منزل پہ مثالی بنانے کی کوشش کی اور کرداروں کے ارتقاء کی طرف کم توجہ کی۔

ننھے کردار گیلی گوندھی مٹی کے تودے ہوتے ہیں۔ جنہیں مکمل صورت اختیار کرنے سے پہلے تھپیڑے کھانے، بگڑنے جانے، بننے سنورنے، آگ میں تپنے اور تپ کر کندن بننے کے مراحل طے کرنے پڑتے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد کے ننھے کردار جلد از جلد مقصد حاصل کرنے کی خاطر یہ سلسلے مراحل ایک ہی جنبش میں طے کر لیتے ہیں۔ ایک ہی رات میں بدل جاتے ہیں۔ یا آغاز زندگی ہی میں مقصدی سانچوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ اور پھر انہی سانچوں میں بڑھنے پھولنے پھلنے لگتے ہیں۔ ویسے بھی ڈاکٹر نذیر احمد کردار نگاری کے گر سے پوری طرح واقف نہ تھے جیسا کہ سب جانتے ہیں۔ بچے کمال کے فرشتے ہوتے ہیں۔ یا شیطان، ننھے کرداروں میں تو فرشتہ پن اتنا زیادہ دکھایا گیا ہے۔ کہ شیطنت کا پہلو کسی ننھے کردار میں دکھائی ہی نہیں دیتا۔ اس لحاظ سے شیطانیت تو کجا بچے کی شوخی اور شرارت بھی یکسر مفقود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس پر بھی وہ اپنے عمل سے فرشتوں کے طور پر زندہ نہیں رہتے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کا تقاضا ہی انہیں زندہ رکھتا ہے۔ ڈاکٹر نذیر احمد کی مقصدیت نے انہیں جاندار بنانے اور زندہ رکھنے کی کوئی کوشش ہی نہیں کی۔ البتہ ایک ننھا کردار ایسا ہے۔ جو جاندار معلوم ہوتا ہے۔ ورنہ ابتدائے زندگی سے ہی ان کرداروں کو مقصد کے پختہ اور پائیدار رنگ میں رنگ دیا جاتا تھا۔ واقعات، حادثات، اور ماحول تک کو ان کرداروں کے مطابق ڈھال لیا جاتا تھا۔ پھر بھی ڈاکٹر نذیر احمد کی ان خامیوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے۔ کہ ان کامل اور مثالی کرداروں کی جیسی مرقع کشی اس نے کی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کا فلسفۂ تعلیم ہی اس کا سب کچھ تھا۔ اس نے اپنے نظریۂ تعلیم میں صحیح طرح کی تربیت، صحبت اہل اللہ سے پرہیز، اطاعت والدین اور اطاعتِ خدا پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ وہ اپنے چھوٹے بڑے کرداروں کی خوبی اور برائی کو اسی کسوٹی پر پرکھتا تھا۔ ننھے کرداروں کی تربیت، اور اس کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اُس نے اپنے ناولوں میں عموماً اور مراۃ العروس اور توبۃ النصوح میں خصوصاً کیا ہے۔ ابن الوقت میں ابن الوقت کے بچپن کا تذکرہ نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف اتنا بتایا گیا ہے کہ اسے بچپن سے تاریخ سے محبت تھی۔ بڑی محنت سے اس مضمون کو پڑھتا تھا تاجروں اور سیاحوں سے ان کے شہروں اور ملکوں کے حالات اور کیفیات، معاشرت و سیاست کی تفتیش کرتا تھا مذہب کے بارے میں اس کی معلومات کتاب الملل والنحل سے کہیں زیادہ تھیں۔ ہم ان باتوں کے تذکرہ سے بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ابن الوقت اگر انگریز دوستی اور انگریزی تہذیب کا دم بھرتا تھا تو کیوں؟ ڈاکٹر نذیر احمد نے ابن الوقت کو جس قسم کا کردار بنانا تھا۔ اس کا بیج اس کے بچپن میں ہی بو دیا تھا۔ وہی غیر ملکیوں سے انس، ان کی تہذیب سے وابستگی،

توبۃ النصوح میں جہاں زیادہ تر ننھے کردار ہیں۔ وہاں ننھے کرداروں میں بھی مثالیت کی انتہا کر دی ہے۔ نصوح کی سب سے چھوٹی بیٹی حمیدہ بھی صفت موصوف ہے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ کچھ بھی۔

نصوح جب گھر کے سدھار اور بچوں کی تربیت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ تو اپنی بیوی کا تعاون چاہتا ہے۔ اور اس سے کہتا ہے "بھلا چھوٹے چھوٹے بچوں کو تو سنبھال لو گی؟" نصوح کی بیوی فہمیدہ ان الفاظ سے ہامی بھرتی ہے۔ اور ساتھ ہی اپنی منجھلی بیٹی حمیدہ کا تعارف کراتی ہے۔ "ان کا درست کر لینا کیا مشکل ہے۔ یہ تو موم کی ناک ہیں۔ جدھر کو پھیر دو۔ پھر گئے۔ بلکہ شاید ان کو منہ سے کہنے کی بھی ضرورت نہ ہو۔ بچوں کا قاعدہ ہے کہ جیسا بڑوں کو کرتے دیکھتے ہیں۔ خواہ مخواہ اس کی نقل کرنے لگتے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔ حمیدہ نے مجھ کو رُلا رُلا دیا ہے۔ کیا تو اس کی چھ برس کی بساط ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ بڑے بوڑھوں کی سی باتیں کرتی ہے۔" ——— بڑے بوڑھوں کی باتیں بچی کے منہ سے مندرجہ ذیل سوالوں کی صورت میں کہلوائی گئی ہیں۔

"اماں جان خدا کیا چیز ہے؟ اور عبادت اس کی کون ہے؟ اماں جان اللہ میاں سے ہمارا کیا رشتہ ناتا ہے کہ اتنے سلوک کرتے ہیں؟ اماں جان تم تو نماز نہیں پڑھتیں۔ کیا تم اللہ میاں کی لونڈی نہیں؟ اور کیا تم اس کی دی ہوئی روٹی نہیں کھاتیں؟ ——— اماں جان، (بُرا کرنے پر) اللہ میاں خفا ہوتے ہوں گے؟"

اب اسی موقعہ کا تھوڑا سا اقتباس ملاحظہ ہو۔ (فہمیدہ اپنی بیٹی حمیدہ سے) خفا ہونے کی تو بات ہی ہے ——— حمیدہ ایسا نہ ہو کہ روٹی بند کر دیں۔ تو پھر ہم کہاں سے کھائیں گے۔ اور اگر نعمی ہوا کا دودھ سوکھ گیا، تو ہماری ننھی روئے گی۔' ——— یہ کہہ کر رونے لگی۔ میں نے اٹھا کر گلے لگا لیا۔ اور پیار کیا۔ لیکن جس قدر اس کو تسلی دیتی تھی۔ وہ اور دگنا روتی تھی۔ مجھ سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ اور مجھ کو روتے دیکھ کر اور بھی بیتاب ہو گئی۔ آخر میں بڑی مشکل سے میں نے اس کو سنبھالا۔ اور کہا: "حمیدہ! تم ڈرو مت۔ اللہ میاں کا یہ دستور نہیں کہ جو لونڈی غلام کام نہ کریں۔ ان کا کھانا بند کر دیں ——— حمیدہ: سچ ——— میں: ہاں ہاں۔ تم مت گھبراؤ۔

اسی باب میں کچھ آگے چل کر ایک اور ٹکڑا ملاحظہ ہو ——— حمیدہ: (گھبرا کر) کیا اللہ میاں یہاں ہمارے گھر میں بیٹھے ہیں ——— میں (فہمیدہ): گھر میں کیا۔ ہمارے پاس بیٹھے ہیں۔ مگر ہم ان کو دیکھ نہیں سکتے۔ ——— یہ سن کر حمیدہ نے جلدی سے اوڑھنی اوڑھ لی۔ اور سنبھل کر مؤدب ہو بیٹھی اور مجھ سے آہستہ سے کہا: "اماں جان سر ڈھک لو۔" اس کے بعد حمیدہ پر کچھ ایسی ہیبت غالب آئی۔ کہ میری گود میں تھوڑی دیر تک سہمی پڑی رہی۔ آخر آنکھ لگ گئی۔ میری ٹانگیں سن ہونے لگیں۔ تو میں نے آہستہ سے چارپائی پر لٹا کر بیدار کو پاس بٹھلا دیا۔ کہ دیکھ باتیں کھلے

ہو۔ ایسا نہ ہو کہ لڑکی سوتے سوتے ڈر کر چونک پڑے" اور میں یہاں چلی آئی۔ مجھ کو تو حمیدہ کی باتوں سے ایسا ڈر لگتا تھا کہ اندر سے کلیجہ تھر تھر کانپا جاتا تھا

نصوح۔ کیوں ڈر کی اس میں کیا بات تھی۔ فہمیدہ۔ میں کہتی تھی کہ ایسی چھوٹی سی لڑکی اور ایسی باتیں کچھ اس کو ہو تو نہیں گیا

مندرجہ بالا مکالمہ، سوالات اور فہمیدہ کے خیالات سے آپ خوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ کہ حمیدہ کا نھا کردار کتنا شاندار اور مکمل ہے۔ اور اسی طرح حمیدہ کا چھوٹا بھائی سلیم بھی اپنے چند دوستوں کی فاتی حضرت جی کے اثر سے صحیح راہ پر چلنے لگ جاتا ہے۔ گھر کے بڑے کردار خصوصاً نعیمہ اور کلیم تو تقریباً ان کے الٹ ہی نکلے۔

مراۃ العروس میں اصغری کا نھا کردار حمیدہ کا خلاف کھیل کود والے کردار سے بڑھ کر ایک عملی اور مثالی کردار ہے۔ اصغری کا تعارف ان الفاظ میں کیا گیا ہے۔

"یہ لڑکی اس گھر میں ایسی تھی۔ جیسے باغ میں پھول یا آدمی کے جسم میں آنکھ۔ ہر ایک طرح کا ہنر ہر ایک طرح کا سلیقہ اس کو حاصل تھا۔ عقل، ہنر، حیا، لحاظ سب صفتیں خدا نے اصغری کو عنایت کی تھیں۔ لڑکپن میں اس کو کھیل کود، ہنسی اور چھیڑ سے نفرت تھی۔ پڑھنا یا گھر کا کام کرنا۔ ان صفات سے متصف نھا کردار نھا کر داری معلوم نہیں ہوتا بلکہ ایک بچہ چست و چالاک، ہشیار اور بڑا کام ہو سکتا ہے۔ یا مریض و بلا پتلا اور بے حس ہو سکتا ہے۔ معصومیت اس میں پائی جائے گی۔ مگر پختگی اور عقلیت کا یہ روپ تو نہ ہوگا۔ ایک ارتقا یافتہ مکمل یا مثالی کردار ایک بچے کو سونپ دینا محض مقصدیت ہی ہے۔ حالانکہ اصغری ان اقتباسات کے مطابق گیارہ سال کی ہے۔ لیکن اصغری کے اس کردار سے پانچ چھ سال پہلے بھی متعارف ہوتے۔ تب بھی آپ اس کو ایسی ہی صفات کا مالک پاتے۔ گیارہ سال کی اس بچی کی معصومیت اور بچپنے کی ایک بات قابلِ ذکر ہے۔ کہ اپنے بہنوئی محمد عاقل کی گود میں بیٹھ کر ان کے اصرار سے اور سلمٰی کی طرف بالارادہ دیکھ کر ان سے عیدی کا روپیہ لے لیتی ہے۔ لیکن دوسری صبح جب گھر کے سارے افراد، چھوٹے بڑے ابھی سوئے ہوتے ہیں۔ یہی اصغری یوں سامنے آتی ہے:

(محمد عاقل) صبح کو اٹھا تو دیکھا اصغری جھاڑو دے رہی ہے۔ اس کو دیکھ کر اصغری نے سلام کیا۔ اور کہا: بھائی صاحب وضو کے واسطے گرم پانی موجود ہے ــــ محمد عاقل نے کہا۔ نہیں بھائی۔ مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھیں گے ــــ اصغری نے کہا بھائی صاحب، چلے نہ جائیے گا۔ آپ کے واسطے چائے بنائی ہے۔ ساری پیجئے گا یا دودھ کی؟ ــــ محمد عاقل نے کہا: جیسی مل جائے۔ اصغری بولی: آپ کی آواز کچھ بھاری ہے شاید نزلے کی تحریک ہے۔ تو دودھ مضر کرے گا ــــ محمد عاقل نے کہا۔ نہیں نزلے کی تحریک تو نہیں۔ رات کو اماں جان کے ساتھ بہت دیر تک باتیں کرتا رہا۔ بدخوابی البتہ ہے ــــ محمد عاقل نماز پڑھ کر واپس آیا۔ تو ساس کو دیکھا۔ نماز سے فارغ ہو کر پان کھا رہی ہیں۔ سلام کر کے بیٹھ گیا۔ اصغری نے سینی لا کر سامنے رکھ دی۔ چائے دانی میں گرم گرم چائے، دو پیالیاں، دو چمچے ایک طشتری میں قند، محمد عاقل نے چائے پی۔ خوش ذائقہ، خوش رنگ، لباس درست، پی کر جی باغ باغ ہو گیا"

اصغری کے ننھے کردار سے آپ پوری طرح واقف ہو گئے ہوں گے۔ اسی اصغری کی بڑی بہن اکبری کا کردار اس کے بالکل برعکس ڈھلا ڈھلایا موجود ہے۔ معلوم ایک ہی ماں باپ کی اولاد، ایک ہی ماحول میں۔ ایک ہی تربیت پا کر کیونکر ایک دوسرے کی ضد بن جاتے ہیں! یہ ساری خامیاں ڈاکٹر نذیر احمد کی اصلاحیت اور مقصدیت کے تحت آجاتی ہیں۔ اور اس کا فن اس کے مقصد کے سامنے دب کر رہ جاتا ہے۔

ڈاکٹر نذیر احمد کے ننھے کرداروں میں سے نسانہ مبتلا کا نھا کردار معصوم فن اور مقصد کا ایک شاہکار ہے۔ اس ننھے کردار کے طبعی رجحانات، میلانات، جذبات۔ اور حرکات کی خوب عکاسی کی گئی ہے جس کے خیال میں ڈاکٹر نذیر احمد کے ننھے کرداروں میں سب سے زیادہ جاندار کردار معصوم ہی ہے۔ بچپن معصومیت، الھڑپن، ضد۔ یہ ساری باتیں بچوں کی سی ہیں۔ یہ کردار نہ شیطان ہے۔ اور نہ فرشتہ، یہ محض بچے کا کردار ہے

اس سے یہ مراد نہیں۔ کہ ڈاکٹر نذیر احمد نے اپنے مقصد سے ہٹ کر یہ کردار پیش کیا ہے۔ مقصدیت یہاں بھی موجود ہے۔ لیکن فن میں مدغم ہو کر بالکل واضح اور دیرپا اثر چھوڑ جاتی ہے (فسانہ کی ہیروئن غیرت بیگم کا چھچھورپن اور بچے سے مدارات نہ کرنا اور اس کی سوکن مہرپالی کا انتظام اور سلیقہ معصوم کے کردار کے توسط سے ہی اظہار پاتا ہے۔ فسانہ مبتلا المعروف بہ محصنات کا قدرے طویل اقتباس سے محض معصوم کا ننھا کردار ملاحظہ

بچوں کا تو قاعدہ ہے کہ وحشی جانوروں کی طرح ہلانے اور پچکارنے سے رام ہوتے ہیں۔ معصوم کا یہ حال ہو گیا تھا۔ کہ غیرت بیگم (حقیقی ماں) کی شکل سے دور بھاگتا اور اس کی پرچھائیں سے ڈرتا۔ چھوٹے گھر میں (اپنی سوتیلی ماں کے ہاں) اس کی ایسی خاطر داری ہوتی تھی۔ کہ اس نے اندر پاؤں رکھا۔ اور ہرپالی نے دوڑ کر اس کو گود میں لیا۔ ہاتھ منہ دھلایا۔ بالوں میں تیل ڈالا۔ کنگھی کی، آنکھوں میں سرمہ لگایا۔ میوہ مٹھائی اس کے لئے لگا رکھی تھی۔ جو کچھ موجود ہوا کھلایا .... بس معصوم سارے سارے دن چھوٹے گھر میں کھیلتا اور اگر بڑے گھر میں آتے تو روتا اور مچلتا ..... لونڈی نے چھوٹے گھر میں جا کر معصوم سے کہا: چلئے میاں بی بی بلاتی ہیں۔ لونڈی کی صورت دیکھ کر اور طلبی سن کر معصوم زمین میں لوٹ گیا۔ پھر لونڈی گود میں اٹھاتی ہے۔ نکل نکل پڑتا ہے۔ اس کشتم کشتا میں تھوڑی دیر لگ گئی۔ اور وہاں غیرت بیگم ہاتھ میں معصوم کے انگرکھے کا اکبرا لیئے (ناپ لینے کیلئے) انتظار کر رہی ہیں۔ آخر دوسری کو دوڑایا اور نسبی معصوم کو بلانے گئی تھی۔ وہیں مرکر رہ گئی۔ بس آپ بھی اس کے ساتھ کھیل میں لگ گئی ہوگی۔ جا، دونوں کو پکڑ کے لا۔ " غیرت بیگم جو بگڑ کر اور خفا ہو کر زور سے بولی تو پینے (دلمحتہ) گھر میں ہرپالی نے بھی سنا۔ اور اس نے جلدی سے اٹھ کر معصوم سے کہا: آہا، بڑی اماں کے یہاں کیسے کیسے بہار کے کپڑے آئے ہیں۔ جلدی بھاگ کر جاؤ۔ کہ تمہاری بھی اچکن بیونت جاتے۔ وہ بڑی اماں بیٹھی کہہ رہی ہیں۔ آنکھیں میچیں کون آئے! آنکھیں میچیں، کون آئے!! "

معصوم سامنے گیا۔ تو غیرت بیگم بولی۔ موئے جان مار، یوں ہی سارے دن خدائی خوار خاک چھانتا پھرا کر۔ دیکھ اب تجھ کو کیسے ظالم استاد کے پاس پڑھنے بٹھاتی ہوں۔ تو بھی یاد کرے ــــــــــ معصوم: میں اپنی چھوٹی اماں کے پاس بھاگ جاؤں گا ـــــــ غیرت بیگم: ملافہ پیٹنے میں ایک بڑا سا انگارہ کہ اس کمبخت ناشدنی کا منہ جلاؤں۔ نگوڑا بے دل کا بد۔ گندی بوٹی کا شوربہ۔ آخر اپنی اصالت پر گیا۔ کنچنی (ہرپالی) کو میا بنا یا۔ میرے سامنے اگر پھر اس مردار کو ماں کہا ہو گا۔ تو جیتو پکڑ کر کاٹ ڈالوں گی" معصوم یہ سن کر آدھی دور سے پھر الٹا بھاگ گیا۔ بسنی پیچھے دوڑی بھی، مگر اب وہ کس کے ہاتھ آتا تھا۔ ڈیوڑھی میں کھڑا ہو غیرت بیگم کے چڑانے کو پکار پکار کر "چھوٹی اماں !! چھوٹی اماں !!" کہتا تھا۔ جہاں غیرت بیگم نے دیکھا۔ تو آڑ میں ہو گیا۔ اور پھر ذرا دیر میں سامنے آکر "چھوٹی اماں ! چھوٹی ماں !!" کہنے لگا۔ غیرت بیگم نے دالان میں سے بیٹھے بیٹھے جوتی کھینچ ماری۔ مگر وہ ڈیوڑھی تک کیا پہنچتی۔ غرض معصوم کو جو دھت ملی۔ تو غیرت بیگم کو اسی طرح گھڑی بھر دق کرتا رہا۔ اور پھر چھوٹے گھر میں جا گھسا۔"

اگر فسانہ عجائب، چہار درویش وغیرہ قصوں کے کرداروں کا ڈاکٹر نذیر احمد کے ناولوں سے مقابلہ کریں۔ تو ڈاکٹر نذیر احمد کے کردار کہیں زیادہ جاندار معلوم ہوتے ہیں۔ فوق البشر کرداروں اور تخیلی زندگی سے ہٹ کر ہم انسانی کرداروں اور گوشت پوست کی زندگی کے قریب آتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگرچہ زندگی کے یہ نقوش بھی تمثیلی ہیں کرداری نہیں۔ پھر وہ کردار نگاری کے سنگ بنیاد اور سنگ میل کا کام ضرور دیتے ہیں۔ دوسرے یہی ڈاکٹر نذیر احمد سے پہلے کے قصوں میں ننھے کرداروں سے واسطہ ہی نہیں پڑتا۔ اگر ایسا کردار ہے تو اتنا کہ جب پیدا ہو کر یکدم اس قابل ہو جاتا ہے کہ کسی ممدوح یا حور وش سے عشق کی پینگیں بڑھا کے اپنے جوان کردار کو پیش کرتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈاکٹر نذیر احمد کو زندگی میں گہری دلچسپی تھی۔ انہیں نفسیات انسانی کا گہرا علم تھا۔ وہ زندگی کا نقاد بھی تھا۔ وہ زندگی کے متعلق ایک خاص نظریہ بھی رکھتا تھا۔ اسی نظریہ کے تحت بچے کی پیدائش، اس کے والدین، اس کے ماحول اور اس کی تربیت کو پیش کیا ہے۔ اصلاح کا کام کرنے اور اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے لئے ایسے ننھے کرداروں کی، قوم کی نئی نسل کی ضرورت تھی۔ اسی ضرورت کی بنا پر اس نے ننھے کرداروں کی طرف توجہ کی۔ اور انہیں نبھانے کی صورت نکالی یہ اور بات ہے۔ کہ اس کا فنی نقص ہر جگہ اس کی مقصدیت کی چغلی کھاتا ہے۔

عابد حسن منٹو

ادب میں نقطۂ نظر کا مسئلہ!

(۲)

(اس مقدمے کا پہلا حصہ ستمبر کے شمارے میں چھپ چکا ہے)

جدلی مادیت کے فلسفے کا اطلاق تاریخ پر کیا جائے۔ تو تاریخی مادیت کا فلسفہ وجود میں آتا ہے۔ تاریخی مادیت تاریخ کا سب سے زیادہ منطقی اور سائنسی نقطۂ نظر ہے۔ اس لئے کہ اس میں نہ صرف مختلف ادوار کے واقعات اور حادثات اپنی ظاہری صورت میں جمع ہوتے ہیں، بلکہ ان واقعات اور حادثات کا تجزیہ کر کے ان کے رونما ہونے کے صحیح وجوہ بھی معلوم کئے جاتے ہیں اور پھر پوری تاریخ جن مختلف ادوار میں تقسیم ہے ان کا تجزیہ کر کے ایک دور کو دوسرے دور سے علیحدہ کرنے والی اور ایک دور کے بعد دوسرے دور کو جنم دینے والی قوتوں کا تعین کیا جاتا ہے۔ اس فلسفے کی رو سے ثابت ہوا ہے۔ کہ تاریخ کا دھارا محض کسی سکندرِ اعظم، یا نپولین یا اکبر کے ہاتھوں اپنی سمت تبدیل نہیں کرتا۔ بلکہ ان ہستیوں کے ہاتھوں جو کام سرانجام پائے ان کے پس پشت در اصل دوسری سماجی طاقتیں سرگرمِ عمل تھیں۔ تاریخی مادیت مختلف ادوار میں انہی سماجی طاقتوں کے تعین کرنے کا نام بھی ہے .... اس نقطۂ نظر کے تحت سماج کی تبدیلی کے جو قوانین مرتب ہوتے ہیں۔ وہ ایسے ہیں۔ کہ محض انہی سے واقفیت کی بنیاد پر آپ مختلف زمانوں کے تہذیبی، سیاسی اور سماجی ڈھانچوں کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ مثلاً تاریخی مادیت نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ مختلف ادوار میں جو مختلف طبقات موجود رہتے ہیں۔ انہی کے تضاد سے نیا سماج جنم لیتا ہے۔ اور پھر یہ کہ ان طبقوں کو جنم دینے والے وہ مخصوص پیداواری طریقے (آلاتِ پیداوار اور ذرائع پیداوار) ہیں۔ جو اس دور میں مستعمل ہوتے ہیں۔ چنانچہ مشین کے زمانے سے پہلے کسی بھی دور میں وہ مزدور طبقہ موجود نہیں تھا۔ جو آج دنیا میں موجود ہے۔ انہی قوانین کی رو سے اگر کسی زمانے کے پیداواری طریقے۔ جن میں آلاتِ پیداوار اور دیگر ذرائع پیداوار دونوں شامل ہیں۔ کا علم ہو، تو اس زمانے کے طبقات اور اس زمانے کے سماجی نظام کی بہت سی خصوصیات سے بغیر کسی دوسرے ذریعے کے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اور اگر کسی زمانے کے طبقاتی رشتوں سے واقفیت ہو تو اور بھی زیادہ آسانی کے ساتھ اس زمانے کے فلسفوں، اور معاشرت پر روشنی ڈالی جا سکتی ہے .... لیکن یہ اصول میکانکی طریقے سے استعمال میں لانے کی چیز نہیں ہیں کیونکہ جب ذرائع پیداوار میں تبدیلی آجاتی ہے۔ اور نیا سماج جنم لے لیتا ہے تو اس کے بعد بھی پرانے سماجی نظام کی بہت سی خصوصیات کافی دیر تک موجود رہتی ہیں۔ خاص کر فلسفہ، ادب اور ثقافت میں، کیونکہ یہ چیزیں صدیوں کے تجربوں کا نچوڑ اپنے اندر رکھتی ہیں۔ اور ان کا ایک لحظہ میں تبدیل ہونا مشکل ہوتا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ نیا نظام اپنے پاؤں میں کھڑا ہو جائے تو پھر بآسانی اس کے طبقاتی رشتوں کی مدد سے اس کی تفصیلات متعین کی جا سکتی ہیں۔

تاریخ کا یہی سائنسی نظریہ جو اندازوں اور تخیل کی بلند پروازی کی جگہ قوانینِ فطرت کے صحیح شعور کو اپنے پیشِ نظر رکھتا ہے۔ ہمارے بھی مدِنظر ہونا چاہیئے۔ چنانچہ اسی کی رو سے ہم اپنے ملک کا تاریخی جائزہ لیں گے۔ اور یہ دیکھیں گے۔ کہ اس وقت ہم ارتقا کی کونسی منزل پر ہیں۔

اور اب ہمارے سامنے کونسا راستہ موجود ہے۔ انگریز سامراج کے ہندوستان پر قبضہ سے پیشتر یعنی مغل شاہی دور میں اس ملک کے سماجی نظام کا بنیادی ڈھانچہ ایک خاص قسم کی دیہی معیشت تھی۔ اس دیہی نظام کی بنیاد زراعت اور گھریلو صنعت کے اتحاد پر تھی۔ زراعت کے سلسلے میں جو بات سب سے اہم ہے۔ وہ یہ ہے۔ کہ زمین پر ایک طرف کاشتکار کی ذاتی ملکیت ان معنوں میں نہیں تھی۔ کہ وہ اسے بیچ نہیں سکتا تھا اور دوسری طرف صوبائی حاکم سے لے کر خود بادشاہ تک۔ کو اسبات کا اختیار نہیں تھا۔ کہ وہ کسی کاشتکار کو بیدخل کر سکے۔ دراصل زمین ان دیہات کی آبادیوں کی مشترکہ ملکیت ہوتی تھی۔ مشترکہ طور پر کاشت ہوتی۔ اور بادشاہ کے لئے ایک مخصوص حصہ لگان کا (جس کی شرح مختلف زمانوں میں مختلف رہی ہے۔ لیکن کل کاشت کی ۱/۳ سے زائد کبھی نہیں ہوئی) علیحدہ کرنے کے بعد باقی پیداوار دیہات کی پوری آبادی کے قبضے میں رہتی تھی ——— ——— اس قسم کی دیہی معیشت ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود تھی۔ (مغل شاہی سے بھی بہت پہلے)۔ اس معیشت کا ایک اور بنیادی اصول ہر دیہہ کا خود کفیل ہونا بھی تھا۔ چنانچہ اس خود کفیلی۔ زمین پر مشترکہ ملکیت وغیرہ نے ان دیہات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے انفرادی حیثیت بخشدی۔ یہ دیہات دراصل اس نظام کی مختلف اکائیاں تھے۔ بہت سے دیہات (جن کا بظاہر ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا ———) ایک ریاست جاگیر یا صوبے میں شامل کر دیئے جاتے تھے۔ یہ ایک ریاست، جاگیر یا صوبہ اس لئے کہلاتا کہ ان کا ایک ہی حاکم ہوتا تھا۔ ورنہ یہ سب اپنی انفرادی تنظیموں کے مالک گاؤں تھے۔ یہ حاکم جسے بعض اوقات جاگیردار کہا گیا ہے۔ دراصل اس صوبے یا جاگیر کا مالک نہیں تھا۔ بلکہ اسکی حیثیت ایک لگان یا محصول جمع کرنے والے صوبائی حاکم کی سی تھی۔ ایسے حاکم کو مرکز کی طرف سے تنخواہ ملتی تھی۔ یہ دیہی نظام ہندوستان میں بہت پہلے سے موجود تھا۔ اور مختلف سلطنتوں کے قیام اور تباہی سے اس میں کسی قسم کا فرق پیدا نہیں ہوا تھا بلکہ خود وہ ملکی حملہ آور جو مختلف وقتوں میں آئے اور یہاں سلطنت قائم کرتے رہے۔ اسی دیہی نظام کے سانچے میں ڈھل گئے ———

اسی سلسلے میں برطانوی دارالعوام کی ایک قدیم رپورٹ کا حوالہ ملاحظہ ہو۔ ——— " ایسے گاؤں کی سرحد بھی شاذ ہی کبھی بدلی ہو۔ اور گو کہ گاؤں کو کبھی کبھی جنگ، قحط یا وبائی امراض سے نقصان پہنچا ہے۔ کبھی کبھی وہ بالکل تباہ ہو گئے ہیں۔ مگر وہی نام وہی حدود وہی مفاد حتیٰ کہ وہی خاندان مدتوں قائم رہے ہیں۔ سلطنتوں کے بگڑنے اور ٹوٹنے پر ملک کے باشندوں نے کبھی دردسر مول لینا مناسب نہیں سمجھا جب تک خود گاؤں سالم رہا۔ انہوں نے مطلق پرواہ نہیں کی۔ کہ اسے کس کی حکومت میں منتقل یا کس سلطان کے سپرد کیا گیا۔ اس کی اندرونی معیشت ایک حالت پر قائم رہی ——— " کئی صدیوں تک اسی طرح ایک ایسے نظام میں رہنے کے باعث جس میں بہت کم تبدیلیاں وقوع پذیر ہوتی تھیں اور جس میں افراد کنوئیں کے مینڈک بن کر رہ گئے تھے۔ ایک خاص قسم کی نفسیات نے جنم لیا۔ اس کے متعلق کارل مارکس نے اپنے ایک مضمون میں ان خیالات کا اظہار کیا تھا۔ " یہی دیہی برادریاں جنہیں رشکِ فردوس کہتے ہیں۔ جو بظاہر بہت بے آزار معلوم ہوتی ہیں۔ حقیقت میں وہ ٹھوس بنیادیں ہیں۔ جن پر ہمیشہ سے مشرق کی استبدادی حکومت کا دارومدار تھا ——— (یہاں اشارہ شاہیت کی طرف ہے۔ م) جنہوں نے انسانی ذہن کو جہاں تک ممکن ہوا بیحد تنگ دائرے میں قائم رکھا۔ اس کو اوہام کا بےبس غلام بنایا۔ روایات کی زنجیروں میں سختی سے جکڑ دیا۔ اور اس کو تمام عظمت اور تاریخی سرگرمیوں سے محروم رکھا۔ ہمیں اس وحشیانہ خود پسندی کو نہ بھولنا چاہیئے۔ جو اپنے حقیر قطعہ زمین پر خاموشی کے ساتھ سلطنتوں کو بگڑتے، اور بڑے بڑے شہروں میں آبادی کا قتلِ عام ہوتے دیکھا کرتی۔ اور اس سے زیادہ کچھ نہ سوچتی کہ یہ قدرتی واقعات ہیں۔ اور اگر کوئی حملہ آور انہیں قابلِ اعتنا سمجھتا تو بےبسی کے ساتھ اس کا شکار بن جاتیں۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہئے کہ یہ جامد، اور بیکار زندگی، یہ حیات جو خود موت کو شرماتی تھی۔ دوسری طرف تخریب کی وحشیانہ، بےمطلب اور غیر محدود قوتوں کی تخلیق کا باعث ہوئی اور اس نے خودکشی کو بھی ہندوستان میں ایک مذہبی

رہ جا دیا۔ ہمیں بھولنا نہیں چاہیے۔ کہ یہ چھوٹی چھوٹی برادریاں بھی ذات پات کے امتیازات اور غلامی کی گندگی سے آلودہ تھیں۔ انہوں نے انسان کو حالات پر قادر کرنے کی بجائے، انسان کو خارجی حالات کا غلام بنا دیا۔ ایک سماجی حالت کو جو آپ ہی آپ نہ ابھر رہی تھی۔ ایک غیر متغیر قسمت بنا دیا۔ اور اس طرح فطرت کی پرستش شروع کر دی، جو انسانیت کے جوہر کو غارت کر دیتی ہے۔ (کارل مارکس اور ہندوستان۔ صفحہ ۲۹

چنانچہ ان دیہی کالکثر امت اسی سبب یعنی تقدیر پرستی۔ اور اوہام پرستی کا شکار ہے ——— یہاں اس تمام بحث سے ہمارا اصل جو بات پیش کرنا مقصود تھی۔ وہ یہ ہے۔ کہ اگرچہ انگریزی سامراج کی آمد سے پہلے کے نظام کو بھی بعض اوقات جاگیری نظام کہا جاتا ہے۔ لیکن اس جاگیری نظام اور انگریز کے پیدا کردہ جاگیری نظام میں کچھ بنیادی فرق تھا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ اگر یہ بنیادی فرق پیدا نہ ہوتا۔ تو انگریز کی حکومت بھی پہلی شاہیوں کی طرح ہی محض مرکز تک محدود رہتی اور اس کا دیہی معیشت میں دخل نہ ہوتا۔ لیکن انگریز کی آمد نے ان دیہی معیشت ہی کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس کی جگہ ایک نئی جاگیری معیشت کو فروغ دیا جس کے سبب سامراج ایک سامراجی طاقت کی حیثیت سے اس ملک پر قابض بھی ہو گیا۔

ہم ہندوستان پر انگریز سامراج نے بتدریج قبضے کی تفاصیل میں جانے سے گریز کرتے ہوئے یہاں محض یہ دیکھنا چاہتے ہیں۔ کہ نیا جاگیری نظام اس ملک میں کیوں اور کیسے پیدا ہوا ——— انگریز کو اپنی مستقل اور براہ راست حکومت کے لئے رائج براہ راست حکومت پہلے موجود نہیں تھی، جیسا کہ کہا گیا ہے۔ پہلے دیہی معیشت نظام کی بنیاد تھی جس میں ہر گاؤں کی اپنی چھوٹی سی حکومت ہوتی تھی ——— اس ملک میں ایک ایسے طبقے کی ضرورت تھی۔ جو اس کے ہندوستان پر قبضے کی حمایت کرے۔ اور اسے یہاں سے خام مال اکٹھا کرنے، اور اپنے ملک کا سامان فروخت کرنے میں مدد دے۔ انگریز نے یہ کام ان صوبائی حکمرانوں سے لیا، جو پہلی حکومتوں کے زمانے میں محض محصول اکٹھا کرنے والے عاملوں کی حیثیت رکھتے تھے۔ انگریزوں نے انہیں مختلف جاگیروں اور ریاستوں کا مالک قرار دے دیا۔ اور ان سے ان کی ریاست کی پیداوار کا ایک بہت بڑا حصہ بطور محصول وصول کرنے کا فیصلہ کیا۔ انگریز سے پہلے محصول کبھی بھی ۱/۶ کی شرح سے نہ بڑھا تھا۔ اور عموماً فصل اور پیداوار کی تبدیلیوں کے ساتھ تبدیل ہو جاتی تھی۔ اور اکثر محصول پیداوار کے ایک حصہ کی صورت میں دیا جاتا تھا۔ انگریز نے نئے جاگیرداروں سے اس کی آمدنی کا ۱۰/۱۱ حصہ لینا ٹھہرایا۔ اور اس کا تخمینہ زمین کے اعتبار سے کیا گیا نہ کہ پیداوار کے اعتبار سے ——— اسی کے نتیجے کے طور پر جاگیرداروں کا یہ نیا طبقہ ——— جو اس سے پہلے مفقود تھا ——— اپنے تمام تر ظلم و تشدد کے ساتھ وجود میں آ گیا ——— جاگیردار طبقہ کی انگریز سامراج کے ساتھ غیر مشروط دوستی کا اظہار مندرجہ ذیل اقتباسات سے ہو سکتا ہے:۔ "حضور والا۔ جاگیرداروں کی پرخلوص اعانت پر ہمیشہ پورا بھروسہ رکھ سکتے ہیں ——" (بنگال کے زمینداروں کے صدر کا وائسرائے کو سپاسنامہ ۱۹۲۵ء) —" اگر ہم بحیثیت ایک طبقہ کے زندہ رہنا ہے تو ہمارا فرض ہے کہ ہم حکومت کے ہاتھ مضبوط کریں۔" (کل ہند زمیندار کانفرنس منعقدہ ۱۹۲۳ء میں مہاراجہ سمین سنگھ کا خطبہ صدارت ——— خود لارڈ ولیم بینٹنک نے کہا تھا۔ " بنگال کا بندوبست دوامی خواہ اور صورتوں میں ناکام بھی سمجھا جائے۔ مگر اس کا ایک فائدہ ہوا ہے کہ زمیندار طبقہ کی پیدائش کے باعث ہوا ہے۔ جو بہت اہمیت کا مالک ہے۔ یہ نیا طبقہ انگریزی نوآبادیاتی نظام کے استحکام اور بدستور قائم رہنے کا بہت خواہش مند ہے۔" Documents on indian Policy vol .1. Page 215

بنگال کا یہ بندوبست دوامی دیہی معیشت کو توڑ کر نئے جاگیری نظام میں تبدیل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ جو بعد ازاں پورے ملک پر مسلط ہو گیا۔

یہ جاگیردار طبقہ سامراجی اقتدار کی ایک ایسی خاصیت ہے۔ کہ کوئی بھی نوآبادیاتی یا نیم نوآبادیاتی ملک ایسا نہیں جہاں یہ طبقہ موجود نہ ہو۔ سامراج

اور یہ جاگیری نظام لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ جہاں کہیں بھی سامراج کے خلاف جد و جہد کی گئی ہے۔ وہاں جاگیری نظام کی بھی مخالفت کی گئی ہے۔ خود ہندوستان میں قومی آزادی کی جد و جہد کے آغاز کے ساتھ ہی ریاستوں میں نوابوں اور مہاراجوں کے خلاف بھی جد و جہد جاری ہوئی کیونکہ ریاستی جاگیرداری اسی جاگیری نظام کا سب سے بڑا مظہر تھی۔ ریاستوں کے علاوہ انگریز سامراج نے کئی اور جاگیریں مختلف خدمات کے صلے میں مختلف ٹکڑوں کو بخشیں اور اس طرح پورے ملک کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ پاکستان بننے کے بعد بھی ہمارے یہاں وہی پرانا جاگیری نظام قائم رہا۔ یہ وہی نظام ہے۔ جس کے متعلق اوپر کہا گیا ہے۔ کہ سامراج اور یہ نظام لازم ملزوم ہیں۔ اسی جاگیری نظام کے ساتھ ہی ہمارے ہاں ایک اور طبقہ بھی ابھرا۔ یہ تاجر طبقہ تھا

سامراج کی ہندوستان پر حکومت کے دوران جب قومی آزادی کی تحریکات نے جنم لیا۔ تو ہمارے ادب نے بھی اس میں بھرپور حصہ لیا چنانچہ تقسیم سے پہلے کے ادب میں جاگیرداری اور سامراج دشمنی کے رجحانات کثرت سے موجود ہیں اور دراصل ہمارے نئے ادب کی سب سے بڑی خصوصیت بھی یہی رہی ہے۔ کہ اس میں ملک کی قومی جد و جہد کا عکس شدید طور پر موجود ہے ——— سامراج موجود ہے؟ جاگیری نظام برقرار ہے اور اس کے ساتھ چند تاجر اور سرمایہ دار جو سامراج کے وفادار ہیں۔ عوام دشمن گروہ میں شامل ہو گئے ہیں۔ اس کے برعکس پورے کے پورے عوام جن میں سب سے زیادہ مزدور، کھیت مزدور اور کسان، اور اس کے بعد درمیانہ طبقہ، چھوٹے جاگیردار اور قومی سرمایہ دار جن کی خصوصیت میں اوپر بیان کر چکا ہوں، اس نیم نوآبادیاتی نظام میں پس رہے ہیں چنانچہ اس وقت ان سب عوام کا مشترکہ مقصد سامراج اور اس کے ساتھ سمجھوتہ کرنے والے بڑے جاگیردار اور سرمایہ دار سے آزادی حاصل کرنا ہے ——— ادھر کچھ عرصہ سے انگریز سامراج کے علاوہ امریکی سامراج بھی اس ملک میں داخل ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور اس نے اوپر کے حکمران طبقہ میں کچھ ساتھی بھی تلاش کر لیے ہیں۔ چنانچہ انگریزی اور امریکی سامراج کا باہمی تنازعہ مشرقِ وسطیٰ کے کئی ملکوں کی طرح ہمارے ملک میں بھی مختلف ہنگاموں کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔

اس صورتِ حالات کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری سماجی زندگی میں وہ فلسفے اور نظریات جو جاگیری نظام اور سامراج کے پیدا کردہ ہیں۔ ابھی تک موجود ہیں۔ مثلاً توہم پرستی، تقدیر پرستی، روحانیت، فحاشی، فن کو زندگی سے علیحدہ کر کے محض بالذات بنانے کا رجحان، حیوانیت وغیرہ ——— ہمارے ادب کو ان تمام رجحانات کا اور براہِ راست سامراجی اقتدار اور جاگیری نظام کا مقابلہ کرنا ہے۔ اور انہیں شکست دینا ہے ——— یا اگر ایک فقرے میں کہا جائے تو ہمارے ادب کو قومی آزادی کی جد و جہد میں بھرپور حصہ لینا ہوگا ——— لیکن اس مرتبہ اسے اس بات کی طرف بھی خاص توجہ دینی ہوگی۔ کہ اس جد و جہدِ آزادی میں ایسے طبقوں کو آگے کرے جو پچھلے طبقوں کی طرح سامراج سے سمجھوتہ بازی نہ کریں۔ یہ طبقہ ظاہر ہے۔ کسان مزدور کا ہوگا، جس کا کوئی مفاد استحصالی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔

نظریاتی طور پر اپنے فرائض سے آگاہ ہونے کے بعد ہم اب اس مسئلے کو حل کرنا چاہتے ہیں کہ ادب میں یہ جد و جہد کس طرح عملی جامہ پہن سکتی ہے کیونکہ ظاہر ہے۔ ادب براہِ راست سیاسی پراپیگنڈہ تو کرتا نہیں۔

ادب کا طریقہ اختیار کیا ہے؟ تمام سماجی علوم سے علیحدہ اور تمام فنونِ لطیفہ کی طرح ادب براہِ راست شعور کو کم اور جذبات کی دنیا کے ذریعے سے زیادہ اپنا مدعا بیان کرتا ہے۔ انسانی جذبات کا خمیر ہماری روزمرہ زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات اور تاثرات سے تیار ہوتا ہے۔ اسی لئے ادب کا کام بھی یہ ہے۔ کہ وہ براہِ راست جاگیرداری مردہ باد کہنے کی جگہ جاگیری نظام اور سامراجی اقتدار کا ہماری روزمرہ زندگی پر اثر متعین کر کے اس اثر کے خلاف نفرت پیدا کرے۔ یہ درست ہے۔ کہ ہمیں بعض اوقات صاف نعرہ بازی سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔ جیسے مولانا ظفر علی کے کلام میں کیا گیا ہے لیکن اکثر ہمیں وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ جو ہمارے ہاں پریم چند نے اختیار کیا۔ اور روس میں گورکی نے۔ پریم چند

نے کسانوں کے مسائل، ان کی جاگیری نظام کے خلاف نفرت اور کہیں کہیں ہلکی ہلکی بغاوت کا نقشہ پیش کیا ہے۔ لیکن یہ سب کچھ انہوں نے ادب کے حدود میں رہ کر کیا ہے۔ گورکی نے بالشویک انقلاب کے متعلق ناول لکھا۔ اس کا ناول براہِ راست جدوجہدِ آزادی کا ایک حصہ ہے۔ لیکن "ماں" کو سیاسی دستاویز یا پراپیگنڈہ کی ایک تصنیف سمجھ کر نہیں بلکہ دنیا کے کامیاب ناولوں میں سے ایک سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ ادیب ایک طرف تو خود ذہنی اور جذباتی اعتبار سے اس تحریکِ آزادی کے ساتھ متعلق ہو، اور دوسری طرف وہ عوام کی روزمرہ زندگی میں اس غیر آزادی اور غلامی کے اثرات تلاش کر کے انہیں محسوس طریقے سے پیش کرے۔ ہمارے ہاں شہری آزادی کا مسئلہ، جمہوریت کا مسئلہ، ہمارے عام تعلقات میں تصنع، ہندی رسوم و رواج میں جاگیری اثرات، شادی بیاہ کے مسائل، عورت مرد کے تعلقات کے مسائل، معاشی مشکلات کے مسائل یہ سب چیزیں ایسی ہیں جن پر بے پناہ لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ ادیب اپنے اردگرد اپنی ذات یا اپنے طبقہ کا حصار قائم کرنے کی جگہ شعور کو پختہ کر کے عوام کی زندگی میں یہ موضوعات تلاش کرے۔ خود ادبی ہیئت میں سامراجی رجحانات، ابہام، بے وجہ اشاریت، فن برائے فن وغیرہ کی صورت میں موجود ہیں۔ ان سے بغاوت بھی اس جدوجہد کا ایک حصہ ہے ——— یہاں یہ کہنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ ادب کا جمالیاتی اور فنی شعور کامیاب ادب پارے کی تخلیق کے لئے بہت ضروری ہے۔ اس کے بغیر ادب کی تخلیق بہت مشکل ہے۔

بظاہر یہ تمام کام ادیب کو غیر ادبی معلوم ہوگا۔ اور شاید کچھ لوگ اسے دخل در معقولات سمجھیں۔ لیکن ادیب اگر محض ادیب نہیں، اس سماج کا ایک باشعور فرد بھی ہے۔ تو اسے یہ سب کچھ کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر (اور سب باتوں کو اگر نظر انداز بھی کر دیجئے تو) خود ادیب کا مستقبل بھی محفوظ نہیں ہے ——— ایسے ادیبوں کو سعادت حسن منٹو کا خط چچا سام کے نام پڑھنا چاہیئے۔ اور ایک مرتبہ پھر اس امر پر غور کرنا چاہیئے کہ کیا اب بھی اس تمام جدوجہد کی ضرورت نہیں ہے۔ جس کا تذکرہ اوپر ہوا ہے ——— ؟

ہم نے اب تک جو بحث کی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ (۱) ادب میں ادیب کوئی نہ کوئی نقطۂ نظر ضرور استعمال کرتا ہے۔ (۲) دنیا میں اس وقت دو ہی نقطۂ نظر موجود ہیں۔ ایک مثالی دوسرا مادی ——— مادی نقطۂ نظر کی جدید ترین صورت جدلی مادیت ہے (۳) جدلی مادیت کے فلسفے کو تاریخ پر منطبق کیا جائے تو تاریخی مادیت کا فلسفہ وجود میں آتا ہے۔ یہ تاریخ کو جانچنے اور اس کا رخ متعین کرنے میں سائنٹفک نظریہ ہے۔ (۴) اس نقطۂ نظر کے ماتحت اگر اپنے حالات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارا ملک ابھی تک ایک نیم نوآبادیاتی ملک کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس میں بڑے بڑے جاگیردار اور بڑے سرمایہ دار عوام دشمن محاذ میں اور مزدور کسان، درمیانہ طبقہ، چھوٹے جاگیردار اور قومی سرمایہ دار اس کے مخالف محاذ میں ہیں اور ہماری منزل قومی آزادی کی منزل ہے (۵) قومی آزادی کی اس منزل میں سب سے زیادہ اہمیت مزدور کسان طبقے کو حاصل ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی مفاد استحصالی نظام کے ساتھ وابستہ نہیں۔ یہی طبقہ اس جدوجہد کا صحیح قائد ہے۔ (۶) ادب براہِ راست سیاسی پراپیگنڈہ نہیں کرتا ہے! اور اس کا ذریعہ جذبات کی دنیا ہے۔ چنانچہ نعرہ بازی سے بچنے کے لئے ادیب کو عام زندگی میں سامراجی اور جاگیری اثرات تلاش کرنے ہوں گے اور اسی طرح جدوجہدِ آزادی کو فروغ دینا ہوگا۔ (۷) ادب میں نظریئے اور فن کا امتزاج ضروری ہے۔ اور ادب کی تخلیق کے لئے دونوں اہم ہیں۔

از جناب
سید ابوالخیر کشفی

بابائے اُردو —— ایک تاثر

انجمنِ ترقی اُردو اور مولوی عبدالحق —— یہ دو نام ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو کر رہ گئے ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ انجمن کی پوری تاریخ مولوی صاحب کی بے لوث مخلصانہ اور مسلسل مساعی کا عملی نتیجہ ہے۔ انجمن ترقی اردو کے لئے وجود میں آئی تھی اور اُردو کیلئے مولوی صاحب نے اپنی جوانی کی رنگینی اور بڑھاپے کا سکون لٹا دیا ہے!

آجکل کراچی میں انجمن کا پنجاہ سالہ جشن منایا جا رہا ہے —— اس موقعے پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ادبِ لطیف کے صفحات پر مولوی صاحب کی ایک جھلک پیش کر دی جائے —— یہ مضمون روزنامہ امروز کے شکریے کے ساتھ نقل کیا جاتا ہے) ایڈیٹر)

آج انجمنِ ترقی اردو کے جشنِ پنجاہ سالہ کے موقع پر میں اُس عبدالحق سے متعلق چند تاثرات پیش کرنا چاہتا ہوں جو گلشن۔ وڈ پا انجمن ترقی اردو کے صدر دفتر کی آخری منزل میں رہتا ہے —— جو جلوت اور ہنگاموں میں بھی اپنے کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ اور جس کے بول پہنچ جانے کتنے اظہار کیلئے ترس کر خاموشی میں بدل جاتے ہیں۔

۱۹۴۸ء کی بات ہے۔ جب میں کراچی آیا اور میرے حالات جب کچھ پُرسکون ہوئے۔ تو مولوی صاحب قبلہ سے ملنے گیا۔ اپنے کمرے کے باہر برآمدے میں ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اور نگاہیں گرد و پیش کے ماحول سے بہت دور کہیں کچھ اور تلاش کر رہی تھیں۔ قدموں کے پاس ایک کالا کتا بیٹھا تھا۔ کتے نے صبر کی حد سے بھی آگے بڑھ کر بڑے ہی جارحانہ انداز میں مجھے خوش آمدید کہا یا احتجاج کیا! کون جانے؟ مولوی صاحب چونکے۔ کتے کو انگریزی میں ڈانٹا میں قریب پہنچا۔ بہت خوش ہوئے "ارے کمبخت تو یہاں بھی آگیا۔ موت کی طرح تجھ سے بھی نجات نہیں" میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں نے کہا "مولوی صاحب آپ کتے کو انگریزی میں ڈانٹتے ہیں" ہنسنے لگے۔ بولے —— "بھئی یہ کتا ایک انگریز چھوڑ گیا ہے۔ میں اسے اردو سکھا رہا ہوں۔ آہستہ آہستہ سیکھ لے گا۔ یہ ابھی عبوری دور میں ہے" ادھر مولوی صاحب کا کتا میرے ساتھ اُن کے حسنِ سلوک کو دیکھ کر کچھ نرم پڑا۔ اور میرے قدموں کے نزدیک آکر بیٹھ گیا۔ کتے کو میں نجس سمجھتا ہوں۔ سیدھا سادا مسلمان جو ٹھہرا۔ مگر مولوی صاحب کو خوش کرنے کے لئے کتے پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتا رہا۔ مولوی صاحب بولے —— "انسانوں سے تو بھئی ہمارا کتا اچھا ہے۔ یقین تو ہے۔ اس کی محبت پر۔ انسانوں سے گھبرا کر میں نے اسی کی محبت کا سہارا لیا ہے":

میں پابندی کے ساتھ انجمن آنے لگا۔ مولوی صاحب قبلہ نے سید ہاشمی صاحب فرید آبادی سے کہا کہ ان سے کچھ کام لو —— یہ پاکستان میں انجمن کی سرگرمیوں کا ابتدائی زمانہ تھا۔ میں قومی زبان میں کچھ لکھنے لگا۔ یوں سمجھئے کہ "قومی زبان" کا کالم نویس ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ قومی زبان کو اردو سے متعلق مضامین اور خبروں کے لئے وقف ہونا چاہیئے۔ مگر سید ہاشمی صاحب اس میں "معلوماتِ عالم" اور "عجائب و غرائب" قسم کی چیزیں چھاپتے تھے۔ میں نے اگر کبھی دبی زبان سے اختلاف کیا۔ تو انہوں نے پسند نہ کیا۔ اور پھر دوری کا احساس کچھ اس درجہ بڑھا کہ میں بے حد تمناؤں اور ارمانوں کے باوجود کچھ عرصہ تک انجمن کے دفتر نہ جا سکا۔

مولوی صاحب اس پیرانہ سالی میں بھی انجمن کی خدمات کا دائرہ بڑھاتے ہی گئے۔ اور کچھ عرصہ کے بعد جب میں انجمن گیا۔ تو مولوی صاحب قبلہ نے سید تقی الدین صاحب سے ملایا۔ تقی الدین صاحب اب انجمن سے متعلق نہیں۔ اُن سے میرے تعلقات بھی بعد میں خوشگوار نہیں رہے۔ لیکن بڑی ایماندا

کے ساتھ میں یہ کہوں گا کہ سچ مچ وہ مخلص تھے۔ کام کرنے کا ڈھنگ انہیں خوب آتا تھا۔ اردو کالج کے قیام میں اُن کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ مولوی صاحب قبلہ اور تقی الدین صاحب کے کہنے سے میں نے اردو کالج میں ایم اے سال اول میں داخلہ لے لیا۔ تقی الدین صاحب نے مجھ سے معافی فیس کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن تعلقات کچھ کشیدہ ہو گئے۔ اور جب امتحان کے قریب میں اپنا رول نمبر لینے کالج کے دفتر میں گیا۔ تو مجھ سے دو سو روپے سے زیادہ کا مطالبہ کیا گیا۔ دو یا تین دن کے بعد میرے امتحانات تھے۔ اور یہ بڑا نازک وقت تھا۔ تقی الدین صاحب مجھے خود سر سمجھتے تھے۔ میری زندگی کے ایک سال کا سوال تھا۔ کہیں بھی تو امید کی کوئی کرن نہ تھی۔ اور آخر میرے ذہن میں روشنی پھوٹ نکلی۔ اور دوسرے لمحے میں مولوی صاحب کے کمرے میں تھا۔ نہ جانے یہ واقعہ مجھے حادثہ کیوں معلوم ہوتا تھا میری آواز بھرا رہی تھی۔ مولوی صاحب گھبرا گئے۔ "ارے سرور تجھے کیا ہو گیا؟" اس وقت خطرات کا کسے ہوش تھا۔ نہ جانے میں نے کن الفاظ میں پوری بات انہیں بتائی اور میری آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ میں نے نظر اٹھائی تو میرا حافظہ، میری نگاہ اور میرے حواس شاہد ہیں۔ کہ مولوی صاحب کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ چپ چاپ اٹھے۔ جہاں وہ روپے رکھتے تھے وہاں سے انہوں نے روپے نکالے اور گننے لگے۔ روپے کم تھے میرے پاس آئے اور جب بیٹھے یہ کہنے لگے: "دیکھو میرے پاس تو دو سو روپے بھی نہیں"۔ میں نے کہا "آپ فیس کیوں نہیں معاف کر دیتے"۔ بولے "کالج ایک انتظامیہ کمیٹی سے مجھے ذاتی طور پر یہ حق کہاں پہنچتا ہے۔ کہ فیس معاف کر دوں"۔ ذاتی غم اور فکر کے اس لمحے میں بھی یہ بات مجھے بہت بڑی اور پر عظمت معلوم ہوئی۔ یہ ہے جذبۂ حق کی خلوت۔ اور ان لمحوں میں بھی انہوں نے انجمن ترقی اردو یا اردو کالج کو اپنی ملکیت نہیں سمجھا۔ بیچ بیچ وہ اپنے آپ کو مجبور سمجھ رہے تھے۔ کچھ دیر وہ سوچتے رہے۔ اور پھر انہوں نے ایک کاغذ پر لکھا کہ "محاسب صاحب، اردو کالج۔ آپ کشفی صاحب کا رول نمبر دے دیں۔ اگر یہ رقم انہوں نے ادا نہ کی۔ تو میں ذاتی طور پر ادا کر دوں گا"۔ یہ کاغذ انہوں نے مجھے دیا۔ اور پھر میں نے اُن کے نرم ہاتھوں کا دباؤ اپنے سر پر محسوس کیا۔ شدتِ جذبات میں میں نے مولوی صاحب کا ہاتھ چوم لیا۔ اور جب میں نے اس "گستاخی" کا احساس کیا۔ تو وہ کاغذ لے کر بھاگ آیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مولوی صاحب کی اس کھری انسانیت کو دیکھ کر مجھے تقی الدین صاحب کی زیادتی کا کوئی دکھ نہ رہا۔

مولوی صاحب کے چاروں طرف جو لوگ جمع ہیں۔ وہ مجھے کبھی اچھے نہیں لگے۔ سوائے چند لوگوں کے میں نے ایک طویل خط میں مولوی صاحب کو لکھا کہ کہیں آپ کے بعد انجمن ترقی اردو کا وہی حشر نہ ہو۔ جو قائد اعظم کے بعد مسلم لیگ کا ہوا۔ آپ نے اپنی ساری زندگی اردو اور انجمن کی خدمت میں گزاری۔ لیکن آپ نے یہ بھی سوچا کہ

" کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد "

میں چاہتا ہوں کہ اگر حالات اجازت دیں۔ تو میں اپنے آپ کو اسی مقصد کے لئے وقف کر دوں۔ میں نے یہ خط سنہ ۵۰ء میں مولوی صاحب کو کانپور سے لکھا تھا۔ اس زمانے میں میں پرمٹ پر عارضی طور پر کراچی سے کانپور گیا ہوا تھا۔ مولوی صاحب نے لکھا کہ میں اس مسئلہ پر آج سے نہیں گزشتہ تیس سال سے سوچ رہا ہوں۔ تم کراچی واپس آؤ گے۔ تو مفصل ملاقات ہو گی۔ مگر میرے حالات نے مجھے انجمن سے دور کر دیا۔

پاکستان میں بابائے اردو کے مزاج کی شگفتگی اور مزاح کا انداز باقی نہ رہا۔ "حال" نے انہیں بہت مایوس کیا ہے۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ بین الاقوامی صنعتی نمائش میں جب انہوں نے دیکھا۔ کہ حکومتِ پاکستان کے اسٹال پر انگریزی کا قبضہ تھا۔ تو ان کے قدم مضمحل ہو گئے۔ اور جب سرخ چین کے اسٹال پر انہوں نے چینی اعداد و نشانوں کو ساتھ ساتھ ہر جگہ دیکھا۔ تو بولے "یہ ہے زندہ قوم کی شان اور انہیں تو ہماری قومیت کا ہم سے زیادہ پاس ہے" یہ کہتے وقت بچپن کی معصومیت ان کے چہرہ پر ابھر آئی تھی۔ حالات سے مایوس ہو کر وہ چڑچڑے ہو گئے ہیں۔ بلا وجہ غصہ آ جاتا ہے انہیں۔ چڑچڑاپن پیدا ہو گیا ہے۔ اُن میں مگر اس چڑچڑے پن کی تہ میں ہماری قومی بے حسی کی کہانی ہے۔ ہم اس ٹریجڈی کو جتنی جلد سمجھ سکیں بہتر ہے۔

مولوی صاحب ۸۰ سال سے زیادہ کے ہو گئے۔ مگر آج بھی اُن میں بڑی قوت ہے۔ اُن کی جھریوں کی راکھ کے پیچھے جوانی اور زندگی کے شعلے آج بھی لپکتے

ہوتے ہیں۔ موجوں کی طرح ان کی طبیعت میں بھی قرار نہیں۔ عمر کے ساتھ ساتھ ان کے لہجے میں بڑے آدمی کی دانائی بڑھتی جا رہی ہے۔ فلسفیانہ انداز ایک عجیب طرح سے ان کی باتوں میں جھلک اٹھتا ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے اجلاس کراچی میں مولوی صاحب نے جو تقریر کی تھی۔ وہ زمانہ دور کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ مجھے۔ اور جب میں ان کی تقریر سن رہا تھا۔ تو میں تھا۔ اور اندیشہائے دور دراز۔ مگر ابھی مولوی صاحب اور ہنیں گے۔ وہ بزدل کی موت مر ہی نہیں سکتے۔ بُرے حالات میں مرنا بھی بزدلی ہے۔ ان کی تقریر کا یہ جملہ مجھے سدا یاد رہے گا۔ کہ "میرا ایمان ہے۔ کہ دنیا کا ہر آدمی نیک ہے۔ سوائے کاہل آدمی کے۔" اور آج بھی مولوی صاحب میں عمل کی اتنی قوت ہے۔ کہ سرسید پر انہوں نے ۵۰، ۶۰ صفحات کا مضمون تین چار راتوں میں بیٹھ کر لکھ دیا۔ رسالہ اردو کے لئے کوئی مناسب مضمون موجود نہ تھا۔ قاضی احمد میاں اختر جوناگڑھی نے یوں ہی مولوی صاحب سے برسبیل تذکرہ کہا۔ مولوی صاحب سن کر چلے گئے۔ اور تین چار دن کے بعد مضمون قاضی صاحب کے ہاتھوں میں تھا۔

بڑے آدمی اکثر کہتے تو ہیں۔ کہ ہمیں ذاتی پروپگنڈے سے نفرت ہے۔ مگر پھر بھی یہی بڑے آدمی اپنے سیکڑوں کو برداشت کرتے ہیں کہ ان کی چاپلوسی کی جائے۔ میں نے عبدالحق صاحب کو ضرور عملی طور پر اس ذاتی پروپگنڈے سے نفرت کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ ان کی عظیم شخصیت کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ میں نے اُن سے ایک بار یوں ہی پوچھ لیا۔ کہ مولوی صاحب آپ کے والد کا اسم گرامی کیا تھا؟ بہت منہ بگاڑ کر مولوی صاحب نے کہا کہ "آپ کو یہ معلوم کر کے کے رکعتوں کا ثواب ہوگا!" میں خاموش ہو گیا۔ عبدالحق صاحب خود نمائی کے نہیں خود پوشی کے قائل ہیں۔ ڈاکٹر عابد حسین نے بڑے سلیقہ سے کتنی سچی بات کہی ہے۔ کہ مولوی عبدالحق ان بزرگوں میں سے ہیں۔ جو "انا الحق" سے "انا" کو حذف کر دیتے ہیں۔

مولوی صاحب کی زندگی بڑی اجلی اور صاف ستھری ہے۔ یہ زندگی ڈھاکے کی ململ کی طرح کسی داغ دھبے کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ان کی زندگی میں اب بھی بڑا نظم و ضبط ہے۔ صبح کو اُن کی چہل قدمی اکثر ورزش کی حدوں کو چھو لیتی ہے۔ اس بڑھاپے میں بھی کلفٹن کی ریت پر مولوی صاحب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا بہت سے نوجوانوں کے لئے مشکل ہوگا۔ مگر او حر دو تین برس میں اُن کی تندرستی بہت گر گئی ہے ——— اور میں تو دانستہ ان جلسوں میں بھی نہیں جاتا۔ جہاں مولوی صاحب شرکت کرتے ہیں۔ تاکہ میں انہیں نہ دیکھوں۔ اُن کے درد کا مداوا میرے پاس نہیں۔

اور اب جب ان کی طویل زندگی پر نظر ڈالتا ہوں۔ تو یہی بات ذہن میں آتی ہے۔ کہ

"اردو کے راستے میں انہوں نے جوانی کی رنگینی اور بڑھاپے کا سکون لٹا دیا"

مغیث الدین فریدی

نیا آفتاب

نئے اُفق سے نیا آفتاب اُبھرا ہے
نیا اُجالا نئے صبح و شام لایا ہے

اس آفتاب کی کرنوں میں وہ حرارت ہے
جو ذہنِ کہنہ کو اِک تازہ روشنی دے گی
ضمیرِ مُردہ کو بخشے گی دولتِ احساس
دلوں کا زنگ چھڑائے گی، زندگی دے گی

غروب ہو گئے رسمِ کہن کے ماہ و نجوم
بساطِ کہنۂ بزمِ جہاں اُلٹتی ہے
نیا سفر ہے نئے راہی نئی ہے راہِ حیات
اُجالا پھیلتا ہے، تیرگی سمٹتی ہے

اس آفتاب کی اِک اِک کرن حیات بدوش
ضمیرِ ارض و سما کو جگانے آئی ہے
نیا تصورِ کیف و نشاط بخشے گی
چراغِ بزمِ تمنا جلانے آئی ہے

نیا نظام گلستاں کو بخشنے کے لئے
نئے شگوفے کھلاتی ہوئی گذرتی ہے
شبابِ جھوم کے سازِ طرب اُٹھاتا ہے
حیات وجد میں آتی ہے، رقص کرتی ہے

سید رضی ترمذی

شہرِ ویراں

مرا شہر — یہ شہرِ ویراں
جہاں روشنی مرگئی
چاندنی بجھ گئی
رہگزاروں میں صبحوں کے اُجڑے ہوئے خواب
شاموں کے مسلے ہوئے گیت
بکھرے پڑے ہیں یونہی رائیگاں
موت کی آہٹیں سونی گلیوں میں آزاد پھرتی ہیں
گرتے ہوئے اور اڑتے ہوئے خشک پتّوں سے کرتی ہیں سرگوشیاں
ایک بے خانماں طائرِ پر شکستہ
گلِ پیڑ کے اک جنازے پہ نوحہ کناں
دمِ نَزع دیکھتا ہے
مرا شہر
یہ شہرِ ویراں !!

• • •

یہاں میں نے دیکھا کہ پھولوں سے رخسار اپنے ہی مژگاں کے کانٹوں نے زخمی ہوئے

اور میں چیخ اُٹھا

میں نے سب کو دکھایا کہ دیکھو یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ کیا ہو گیا؟
میں نے شاخوں پہ اُگتے ہوئے زخم دیکھے تو میں درد سے تلملایا
میں ہر اک سے کہتا رہا "دوستو، ساتھیو، یہ بہاریں نہیں"
میرے پہلو میں نغمہ سی اک آنکھ دیکھتے دیکھتے خوں بن گئی
اور میں کہتا رہا "چھوڑ دو، شہر ویران ہو جائینگے، کھیت جل جائینگے"
رس بھرے ہونٹ گیتوں سے محروم ہوتے ہوئے دیکھ کر
میں نے ہر اک کو آواز دی
"برگِ گُل سے لہو مت نچوڑو، یہ شبنم نہیں ہے"
یہاں شیطنت کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اک مورتی رات بھر
معبدوں میں کراہی،

تو میں خوف سے کانپ اُٹھا
میں نے سب کو جھنجھوڑا کہ "یہ کھیل اچھا نہیں"
"یہ مُقدّس اُجالے نہ غارت کرو، باز آؤ"

* * *

مگر یہ مرا شہر لُٹ ہی گیا
یہ مرا شہر لٹ کر رہا
اب خرابوں میں عفریت پر چم اُڑاتے اُچھلتے پھریں گے!!

الطاف مشہدی

نان و ایمان

لے کے پلکوں میں میکدے کا شباب — جیسے آہو کا دیدۂ بے خواب
مسکرا کر گلاب بنتی ہوئی — گنگنا کر رباب بنتی ہوئی
سرخ ہونٹوں کو پا کے من کا میت — لے رہا ہے جنم عوامی گیت
چھیڑ کر انکھڑیوں میں دیپک راگ — بھر رہی ہے رگوں میں خوں میں آگ
اللہ اللہ یہ برق پاش خرام — تیز رو ہو گیا ہے "نام" سے "کام"
نور ماتھے کا کر رہی ہے عام — ذرّہ سورج سے لے رہا ہے سلام
چھیڑ کر زندگی کے افسانے — توڑنا چاہتی ہے بُت خانے
لے کے شانوں پہ گیسوؤں کا سحاب — آ رہی ہے وہ جانِ رُوحِ شراب

سوچتی ہے کہ کیا کرے اِنسان
اِک طرف نان اِک طرف ایماں

کرپال سنگھ بیدار

دعوتِ بہار

اُردو پڑھنے والوں کے ذہن میں کرپال سنگھ بیدار کی یاد آج بھی بیدار ہے —— بیدار پہلی مرتبہ مولانا تاجور مرحوم کے "ادبی دنیا" میں چمکا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی شعری فضاؤں پر اس طرح چھا گیا تھا —— کہ شعر و شاعری کا کوئی تذکرہ اس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا تھا —— برِعظیم کی تقسیم کے بعد جہاں اور بہت سے ادیبوں کے متعلق یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔ وہاں کرپال سنگھ بیدار کے نام کو بھی نگاہیں بے سود تلاش کرتی رہیں۔ مگر چند روز ہوئے دفترِ ادبِ لطیف میں ایک لفافہ آیا۔ اور یہ مسرت انگیز خبر لے کر آیا کہ بیدار مشرقی پنجاب میں اپنی طویل علالت کے باوجود بدستور فکرِ سخن میں منہمک ہے اور یہ نظم اس کے اسی فکری انہماک کا نتیجہ ہے۔

ہم اپنے محترم دوست کا بڑی خوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ کرپال سنگھ بیدار کا ایک لمبی مدت کے بعد دوبارہ بزمِ سخن میں آنا واقعی ایک بہت بڑا خوشگوار ادبی حادثہ ہے

ایڈیٹر

پھر فصلِ بہار آئی　　اُٹھ جام اُٹھا ساقی
ہم پیاس کے ماروں کو　　بھر بھر کے پلا ساقی
رندانہ سخاوت کے　　اعجاز دکھا ساقی
بیتے ہوئے صدیوں کی　　ہر یاد بھلا ساقی
ہر داغ مٹا ساقی
پھر فصلِ بہار آئی　　اُٹھ جام اُٹھا ساقی

جلوؤں سے حجاب اُٹھا　　دیدار کے دن آئے
انکار کے پردے میں　　اقرار کے دن آئے
پھر چاہ کے دن آئے　　پھر پیار کے دن آئے
اب دور نہ جا ساقی!　　آنکھیں نہ چرا ساقی!
آغوش میں آ ساقی
پھر فصلِ بہار آئی　　اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

یارانِ جواں مشرب　　پیتے ہیں پلاتے ہیں
گاتے ہیں بجاتے ہیں　　ہنستے ہیں ہنساتے ہیں
کچھ ہوش میں آتے ہیں　　کچھ ہوش سے جاتے ہیں
خاموش ہے کیوں اب تک؟　　اُٹھ دھوم مچا ساقی!
ماحول پہ چھا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی　　اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
شاداب ہیں ویرانے　　گلزار مہکتے ہیں!
اشجار لہکتے ہیں　　رندانہ بہکتے ہیں!

خاموش پرندے بھی   مستانہ چہکتے ہیں!
وہ تان اُڑاتے ہیں   تو ہوش اُڑا ساقی!
مدہوش بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
کیا جلوہ نمائی ہے   پُر نور فضاؤں میں!
کیا روح فزائی ہے   مسرور ہواؤں میں!
کیا ہوش رُبائی ہے   مخمور گھٹاؤں میں!
اب دیر ہے کیا ساقی!   لا جلد پلا ساقی!
باتیں نہ بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی
مینا سے چھنک اُٹھی   الہام نما ہو کر
صہبا سے مہک اُٹھی   آلام رُبا ہو کر
ساغر سے کھنک اُٹھی   خیام نوا ہو کر
اب نیم دلی کیسی؟   اُٹھ جشن منا ساقی
پی اور پلا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی
بلبل کی نوا سے ہے   اِک سوزِ ازل پیدا
سنبل کی ادا سے ہے   کاکل کا بدل پیدا
قلقل کی صدا سے ہے   حافظ کی غزل پیدا
آ مست ادا ساقی!   رندانہ پلا ساقی!
دیوانہ بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
ہر جام کی تابش میں   جمشید نظر آیا
ہر نقش کے پیکر میں   بہزاد اُتر آیا
ہر پھول کی نکہت سے   نیشگور اُبھر آیا

اُٹھ بزم جما ساقی!   پی اور پلا ساقی!
گا اور بجا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
غالب کی لطافت ہے   پھولوں کی جوانی میں
اقبال کی شوکت ہے   موجوں کی روانی میں
خیام کی آمد ہے   بہتے ہوئے پانی میں
آ موج میں آ ساقی!   جتنی ہے پلا ساقی!
میخانہ لُٹا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
ہر گام پہ سبزے نے   مخمل سی بچھا دی ہے
ہر نرگسِ فتاں نے   ہلچل سی مچا دی ہے
ہر لالۂ صحرا نے   مشعل سی جلا دی ہے
تو بھی مئے روشن سے   فانوس جلا ساقی!
اندھیر مٹا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
گلشن کی فضاؤں سے   طوفانِ شباب اُٹھا
چھلکے ہوئے شیشوں سے   رحمت کا سحاب اُٹھا

محبوبۂ فطرت کے   چہرے سے نقاب اُٹھا
تو بھی رُخِ زیبا سے   زُلفوں کو ہٹا ساقی!
دیدار دکھا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی   اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
خوبانِ پری پیکر   کیا ناز دکھاتے ہیں
نوخیز کرشموں سے   کیا نقش بٹھاتے ہیں
گلرنگ تبسم سے   کیا پھول کھلاتے ہیں
تو بھی لبِ خنداں سے   گلزار کھلا ساقی!

سو رنگ دکھا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
جس بادۂ رنگیں میں گلزار نظر آئے
گلپوش حسینوں کا دیدار نظر آئے
ہر قطرۂ گلگوں میں رخسار نظر آئے
وہ بادۂ رنگیں بھی اِک بار پلا ساقی!

سرشار بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
وہ آتشِ تر جس کو نیرنگِ نظر کہئے
سیال شفق کہئے مراج سحر کہئے
ہر بوند کو تابش میں خورشید و قمر کہئے
اُس آتشِ تر کا بھی اِک جام پلا ساقی!

آلام جلا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
وہ مستِ نظر جس سے صہبا کی چمک اُٹھے
پیمانے کو جب دیکھے پیمانہ چھلک اُٹھے
میخانۂ ہستی کی ہر چیز بہک اُٹھے

اُس مستِ نظر سے بھی دو گھونٹ پلا ساقی!

سرمست بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
یہ خُلد نما عالم صد رنگ نظاروں کا
یہ چاند کی تابانی یہ نور ستاروں کا
فطرت کی یہ رعنائی جوبن یہ بہاروں کا
ایک ایک کو ساغر میں حل کر کے پلا ساقی!

مخمور بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
یہ صبح کی محبوبی یہ شام کی البیلی ادائی
گلزار کی رنگینی کہسار کی رعنائی
وادی کی دل آویزی صحرا کی دل آرائی!
ایک ایک کو صہبا میں تحلیل سے ملا ساقی

رندوں کو پلا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
یہ شوخ حسینوں کے مہتاب ادا جلوے
نکھرے ہوئے چہروں کے مہتاب نما جلوے
کچھ خواب فزا جلوے کچھ خواب ربا جلوے
ایک ایک کے شیشے کی کرنوں سے ملا ساقی!

خورشید بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
یہ فکر، یہ اندیشہ اعمال کی شامت کا
یہ رنج ندامت کا یہ خوف ملامت کا
خدشہ یہ جہنم کا دھڑکا یہ قیامت کا
ایک ایک کو صہبا کی موجوں میں بہا ساقی!

معدوم بنا ساقی

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!
یہ دبدبہ شاہی کا یہ رعب امارت کا
یہ ناز حکومت کا یہ فخر وزارت کا
یہ چال سیاست کی یہ کھیل شرارت کا
سب پہ مئے روشن سے اک برق گرا ساقی!

خاشاک بنا ساقی!

پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

یہ لوگ جو مذہب پر آپس میں بگڑتے ہیں
ناچیز مسائل پر ناکام جھگڑتے ہیں
بے سُود اُلجھتے ہیں بے فائدہ لڑتے ہیں
اِن سب کو مروّت کے آداب سِکھا ساقی!
انسان بنا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

وہ دین جو انساں کو خونخوار بناتا ہے
ہمسائے کے بچوں پر تلوار اُٹھاتا ہے
برسوں کے مُربّی کا گھربار جلاتا ہے
اُس دین کی آفت سے دُنیا کو بچا ساقی!
بیدار مٹا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

وہ پنتھ جو پیرو کو اگیان سکھاتا ہے
تہذیب مٹاتا ہے حیوان بناتا ہے
کمزور نہتّے پر کرپان گھماتا ہے
اُس پنتھ کے فتنوں کو قوّت سے دبا ساقی!
سختی سے مٹا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

وہ مت جو زمانے میں دولت کا پجاری ہے
انصاف سے خالی ہے ایثار سے عاری ہے
مکّار لٹیرا ہے عیّار شکاری ہے
اُس مت کا زمانے سے ہر نقش مٹا ساقی!
ناپید بنا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

وہ دَور جب آپس میں اخلاص کی باتیں تھیں
جب پیار کی راتیں تھیں جب پیم بھی بچے پن تھے
جب شیخ و برہمن میں چالیں تھیں نہ گھاتیں تھیں
اُس دَورِ محبّت کو اِک بار بُلا ساقی!
رُوٹھوں کو منا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

احباب بہم مل کر کیا دھوم مچاتے تھے
کیا جشن مناتے تھے کیا بزم سجاتے تھے
کیا شعر سُناتے تھے کیا رنگ جماتے تھے
اُس عہدِ مسرّت کو پھر کھینچ بُلا ساقی!
بچھڑوں کو ملا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

جو صاحبِ دولت تھے وہ دستِ نگر کیوں ہیں؟
جو بزم کے ساقی تھے وہ تشنہ جگر کیوں ہیں؟
جو ملک کے والی تھے وہ مُلک بدر کیوں ہیں؟
یہ حشر نما عالم عالم سے مٹا ساقی!
فتنوں کو دبا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

اِس موسمِ دلکش میں بیدار حزیں کیوں ہو؟
افسردہ نظر کیوں ہو؟ پژمردہ جبیں کیوں ہو؟
دیرینہ علالت[1] سے دلگیر و غمیں کیوں ہو؟
اس مردِ عزیز کو بھی دو گھونٹ پلا ساقی!!
دلشاد بنا ساقی!
پھر فصلِ بہار آئی اُٹھ جام اُٹھا ساقی!

[1] بیدار کو بیمار ہوئے تین سال ہو چکے ہیں۔ (مصنف)

سید خلیل احمد

اِک تارے جانے کے بعد

میاں صاحب ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھ رہے تھے۔ بجلی کے پنکھے کی ہوا میں اخبار پھڑپھڑا رہا تھا۔ ان کی نوجوان بیوی ان کے سامنے کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھی گدرے گدرے دھندلائے ہوئے آسمان کی طرف اکتاہٹ بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اور اپنی پسینے میں بھیگی ہوئی ململ کی قمیص کو بار بار جسم سے علیحدہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہوا بالکل بند تھی۔ فضا میں ایک گھٹن سی تھی۔ ہر چیز ساکت و مضمحل نظر آ رہی تھی۔ درخت بے بسی کے عالم میں چپ چاپ سرنگوں کئے ہوئے کھڑے تھے۔ صحن کی دیوار کے باہر سڑک کے کنارے نیم کے درخت پر ایک فاختہ اداس سُروں میں کوک رہی تھی۔ بیگم نے اخبار کے پیچھے چھپے ہوئے خاوند کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کی۔ لیکن اخبار ان کے درمیان دیوار کی طرح حائل تھا۔ اس نے جھنجھلا کر منہ پھیر لیا۔ اور قریب بیٹھی ہوئی چھوٹی بہن کی طرف دیکھا۔ وہ خاموش، سر جھکائے زمین کو گھور رہی تھی۔ اس کی ناک پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ اور اس کے بال بکھرے ہوئے تھے ...... "ثریا جاؤ جا کر نہاؤ" اس نے کہا ——— "اچھا آپا" وہ بولی اور ویسے ہی زمین کو گھورتی رہی۔ باورچی خانے میں سے ملازمہ کے برتن دھونے کی آواز آ رہی تھی۔

باہر دروازے پر دستک ہوئی ——— "زینی دیکھنا تو باہر کون ہے؟" میاں صاحب اخبار کے پیچھے سے پکارے ——— زینی باورچی خانے سے نکل کر ڈیوڑھی کی طرف گئی۔ اور کچھ دیر کے بعد واپس آئی۔ "کوئی آپ کو بلا رہا ہے ———" "یہ مقدموں والے بھی صبح صبح آن دھمکتے ہیں" وہ بڑبڑاتے ہوئے اُٹھے اور باہر چلے گئے۔ دونوں بہنوں کی آنکھوں میں امید و انتظار کے دیئے چند لمحوں کے لئے جل اُٹھے اور فوراً بجھ گئے۔ نہ جانے انہیں کس کا انتظار تھا! وہ خود بھی نہیں جانتی تھیں۔ وہ مسلسل امید و انتظار میں دن کاٹ رہی تھیں۔ اسی انتظار میں کہ کوئی ان کے گھر آئے۔ کوئی واقعہ ہو یا کچھ حادثہ ہو۔ جو ان کے بے کیف و بے رنگ شب و روز کے بوجھل جمود اور سکوت کو توڑ سکے۔ جو انہیں کچھ دیر کے لئے ان کی سپاٹ اکتاہٹ سے نجات دلا سکے۔ اور ان کی زندگی کے جوہڑ کے بند گلے سڑے پانی کی خاموش سطح پر چند لمحوں کے لئے ارتعاش اور ہلچل پیدا کر سکے۔ وہ اس کبھی نہ آنے والے لمحے کا انتظار کرتے کرتے مجسم انتظار بن گئی تھیں ——— ڈیوڑھی میں سے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اور ساتھ ہی میاں صاحب کی باتوں اور ہنسی کی آواز آئی۔ ان کی آنکھوں میں دیئے پھر سے جل اُٹھے۔ میاں صاحب اندر آئے۔ ان کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان سوٹ کیس اٹھائے داخل ہوا۔ میاں صاحب کے سرخ و سفید چہرے کے بھاری خدوخال مسکراہٹ کی ان گنت لہروں میں ڈوب گئے تھے۔

"تو بیگم" وہ اپنی نئی بیوی سے اپنے پرانے بیٹے کا تعارف کراتے ہوئے بولے "یہ ہے اپنا اقبال! اور یہ ہیں" وہ اقبال سے مخاطب ہوئے "تمہاری امّ..... اور وہ "اماں" کہتے کہتے رک گئے۔ انہیں جلد ہی اس لفظ کے بے محل اور مضحکہ انگیز ہونے کا احساس ہو گیا تھا۔ اور وہ کھسیانے ہو کر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے اخبار کو نوچنے لگے۔ اقبال نے جھک کر اپنی نئی "اماں" کو سلام کیا۔ اس کی شوخ و شریر آنکھوں میں طنز بھری مسکراہٹ تھی ——— "اور یہ" میاں صاحب اپنی سالی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولے "میری سا... بیگم کی چھوٹی ہمشیرہ ہیں۔ ثریا" ——— ثریا نے مسکراتے ہوئے اپنی بڑی بڑی گائے کی سی مسکین اور اداس آنکھوں سے اس کی طرف پل بھر کے لئے دیکھا اور

مہین سی آواز میں بولی "سلام علیکم۔" ——— "تو آپ میری خالہ ہیں؟" اقبال نے جی ہی جی میں ہنستے ہوئے سوچا ——— "چائے تو پیو گے نا؟" بیگم نے پوچھا ——— "ضرور ضرور لیکن پہلے میں ایک غوطہ لگاؤں۔ بڑی گرمی ہو رہی ہے آج۔" اس نے اپنے جسم سے چپکی ہوئی قمیص کو علیحدہ کرتے ہوئے کہا ——— "ثریا ذرا اٹھ کر چولھے پر پانی کی کیتلی رکھ دو۔" بیگم نے چھوٹی بہن سے کہا۔ وہ اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔

کیتلی پہلے ہی سے آگ پر رکھی تھی۔ وہ آگ سے دور ہٹ کر پیڑھی پر بیٹھ گئی۔ اور گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھ کر آگ میں دیکھنے لگی۔ زیبی برتن سینت سینت کر چوکی پر رکھ رہی تھی۔ اس نے کنکھیوں سے چھوٹی بی بی کی طرف دیکھا "یہ میاں صاحب کے بڑے لڑکے ہیں نا؟" ——— "ہاں" وہ لاپروائی سے بولی۔ اس وقت وہ اپنے خیالات میں گم تھی ——— "کیا نام ہے ان کا؟" ——— "اقبال" ——— "کیا کرتے ہیں؟" ——— "کہیں کام وام کرتے ہوں گے" وہ روکھے پن سے بولی ——— "شادی بیاہ ہو چکی؟" ——— "مجھے کیا معلوم۔ تو چپکے سے اپنا کام کئے جا۔ اور زیادہ باتیں نہ بنا" اس نے اسے جھڑک دیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ اور مایوس ہو کر اپنے کام میں لگ گئی۔

"کم از کم آنے کی اطلاع تو کر دی ہوتی۔" اس کے باپ نے اخبار کے صفحے الٹتے ہوئے کہا ——— "جلدی میں خیال نہ رہا۔" وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا جوتوں کے تسمے کھول رہا تھا۔ "اور پھر اپنے گھر ہی تو آ رہا تھا۔ اطلاع دینے کی کیا ضرورت تھی!" اس نے باپ کی طرف طنز بھری مسکراہٹ سے دیکھا۔ میاں صاحب کرسی میں یوں کسمسائے جیسے اس میں کانٹے اُگے ہوئے ہوں ——— "ہاں۔ ہاں" انہوں نے چہرے کے سامنے اخبار پھیلاتے ہوئے رک رک کر کہا "ہاں بھئی اپنا ہی تو گھر ہے۔" ان کی آنکھوں سے ندامت، پشیمانی اور گہری اداسی جھلکنے لگی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہے "بہن سے ملے تھے؟" انہوں نے منہ کے سامنے سے اخبار ہٹاتے ہوئے پوچھا ——— "جی ہاں پچھلے مہینے وہاں گیا تھا۔ سب خیریت سے ہیں" ——— "بچہ کیسا ہے؟" ——— "بالکل تندرست۔ اب تو گھٹنوں چلنے لگا ہے" ——— "اور اسرار؟ اس کا امتحان ہو گیا یا نہیں؟" ——— "امتحان تو کبھی کا ختم ہو چکا۔ اب تو شاید نتیجہ بھی نکلنے والا ہو" ——— "میں نے اسے یہاں بلایا تھا۔ اسے اور صبیحہ دونوں کو میں نے لکھا تھا کہ امتحان کے بعد بہن کو لے کر یہاں چلا آئے۔ بچے کو دیکھنے کو بڑا جی چاہ رہا تھا" ——— "جی ہاں وہ تو آنے کے لئے تیار بیٹھے تھے۔ لیکن گرمی کی وجہ سے رک گئے۔ اس گرمی میں اتنا لمبا سفر اور وہ بھی چھوٹے بچے کے ساتھ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ موسم اچھا ہو جائے۔ تو دونوں آئیں گے" بیگم خاموش بیٹھی باپ اور بیٹے کی طرف باری باری دیکھ رہی تھی۔ دونوں اپنی باتوں میں اس قدر محو تھے۔ کہ انہیں اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ رہا تھا۔ وہ جل کر رہ گئی۔ اپنی موجودگی کا احساس دلانے کے لئے اس نے اقبال سے پوچھا "اسرار نے کونسی جماعت کا امتحان دیا ہے؟" ——— اقبال نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔ سوتیلی اولاد میں دلچسپی کا اظہار؟ یہ محض دکھاوا تھا یا...... "میٹرک کا" اس نے روکھے پن سے جواب دیا ——— "کیا اس کا کالج میں داخلہ لینے کا ارادہ ہے؟" میاں صاحب نے پوچھا ——— "جی ہاں ارادہ تو ہے بشرطیکہ......" ——— "ہاں۔ ہاں مجھے معلوم ہے" میاں ایکبار پھر اخبار کی آڑ لیتے ہوئے جلدی سے بول اٹھے "کوئی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جہاں تک جی چاہے پڑھتا جائے" ——— وہ پھر تنہا رہ گئی تھی۔ نظر انداز کر دی گئی تھی "تمہارے بھانجے کا نام کیا ہے؟" اس نے ایک بار پھر باپ بیٹے کی باہمی محبت اور قربت کے محدود دائرے میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا ——— "ارشاد" اقبال نے خشک لہجے میں کہا ——— "ارشاد؟" وہ مسکرائی "میرے چھوٹے بھائی کا نام بھی ارشاد ہے" اس نے اس سے بے تکلف ہونے کی کوشش کی۔ لیکن اقبال نے اس کے بھائی میں کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ اور بے تعلقی سے اپنے اردگرد لمبے چوڑے صحن میں دیکھنے لگا۔ کیاریوں میں گلاب، موتیا اور چنبیلی کے پودے سوکھے ہوئے تھے۔ ان پودوں کو خستہ حالت میں دیکھ کر اس کے دل کو ٹھیس سی لگی۔ ایسی

کی ماں کے ہاتھوں کے لگائے ہوئے پودوں کی یہ حالت!— جب اس کی ماں زندہ تھی۔ تو یہی پودے پھولوں سے لدے ہوئے تھے۔ اسقدر پھول اُترتے تھے۔ کہ اس کی ماں ہر صبح آس پاس کے گھروں میں پھول بھیجا کرتی تھی۔ اور رات کے وقت تو پورے کا پورا محلّہ گلِ شبّو کی خوشبو سے مہکا کرتا تھا— "انہیں پانی کوئی نہیں دیتا؟" اس نے اپنے باپ سے پوچھا۔ میاں صاحب چونک کر اخبار کے پیچھے سے نکل آئے۔ ان کے چہرے سے صاف ظاہر تھا۔ کہ وہ اخبار نہیں پڑھ رہے تھے۔ بلکہ دور کے خیالات میں گم تھے "کیا؟— پانی! کس کو؟— ان پودوں کو۔"— "ہاں یہ پودے!— پانی؟— نہیں بھئی یہاں کسی کو شوق ہی . . . . . ." وہ بیوی کی طرف دیکھ کر ذرا رک گئے اور پھر ذرا بدل کر بولے۔ "میرا مطلب ہے کسی کو اتنی فرصت نہیں مجھے اتوار کے دن وقت ملتا ہے۔ تو پانی ڈال دیا کرتا ہوں۔" — "ثریا!" بیگم نے آواز دی۔ ثریا چہرے سے پسینہ پونچھتی ہوئی باہر آئی۔ بیگم نے اُس سے ان میں "شفقت" کے بارے میں کچھ ہدایات دیں۔ وہ واپس چلی گئی— "تو اقبال میاں اٹھو پھر جلدی سے نہا لو۔ چائے بس تیار ہوا چاہتی ہے"۔ اقبال نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور گھسیٹتا ہوا اندر چلا گیا۔ میاں صاحب بھی اپنی عینک اور اخبار سنبھالتے ہوئے اٹھے "میں بھی جانے کی تیاری کروں۔ تم اقبال کے لئے وہ چھوٹا کمرہ تیار کروا دینا۔ وہ اس کا پرانا کمرہ ہے اور— اور . . . . . ." لیکن اپنی بیوی کی نظریں اپنے چہرے پر گڑی ہوئی پاکر وہ گھبرا گئے اور جملہ ادھورا چھوڑ کر اندر چلے گئے۔

وہ پنکھے کے قریب بیٹھی اور اپنی قمیص کے گریبان کو اٹھا اٹھا کر پسینے میں تر اپنے جسم کو ہوا پہنچانے لگی۔ جب سے اس کی شادی ہوئی تھی۔ یہ پہلا ہی دن تھا۔ کہ ان کے ہاں کوئی مہمان آیا تھا۔ اس کی شادی ہوئے چھ سات مہینے ہو چلے تھے۔ نہ جانے کتنے دن رہے! اس نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ سوچا۔ ایک دو دن میں اکتا کر بھاگ جائے گا۔ آخر اس گھر میں رکھا ہی کیا ہے! نہ کوئی چہل پہل نہ کسی کا بول بالا۔ اس کی نظریں بڑے بڑے ویران صحن کا جائزہ لینے لگیں۔ جہاں قبرستان کی سی خاموشی چھائی رہتی ہے۔ وہ تو ٹھہرا شہر کا باسی یہاں اس کا دل کیسے لگے گا۔ اس کی نظریں صحن سے ہوتی ہوئی پھیکے پھیکے آسمان کی گہرائیوں میں گم ہو گئیں۔ وہ اس گھر کی مسلسل خاموشی، ویرانی اور بے رونقی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی چھ سات مہینے یونہی گذر گئے تھے۔ کوئی کام کاج نہیں تھا۔ کوئی شغل نہیں تھا۔ جس سے جی بہلے اور وقت کٹ سکے۔ سارا سارا دن اپاہجوں کی طرح کرسی پر بیٹھے یا چارپائی پر لیٹے لیٹے، بے جان، خاموش در و دیوار کو گھورتے گھورتے، تنہائی میں طرح طرح کی باتیں سوچتے سوچتے اس کے دل میں ہول سا اٹھتا۔ شروع شروع میں گھر میں میاں بیوی کے علاوہ صرف ایک خادمہ تھی۔ جو اس کے ساتھ میکے سے آئی تھی۔ وہ سارا دن گم سم اپنی بیچارگی اور بیوگی کا ماتم کرتی رہتی تھی۔ گو زینب اس کی ہمعمر تھی۔ اور دونوں اکٹھی کھیل کود چکی تھیں۔ لیکن جوانی میں آکر اور خاص طور پر شادی کے بعد ان کے درمیان مالک اور نوکر کا امتیاز نمایاں طور پر پیدا ہو گیا تھا۔ گھر کی روایتی تربیت نے اس کے ذہن پر یہ فرسودہ خیال نقش کر دیا تھا۔ کہ نوکر آخر نوکر ہی ہے۔ اور اس کو منہ لگانا . . . یا بے تکلفی برتنا اچھا نہیں۔ اس لئے دونوں عورتیں ایک دوسرے کے مقام کا لحاظ رکھتے ہوئے ایک دوسرے کی تنہائی میں بے جا مداخلت کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ میاں صاحب صبح سے شام تک کچہری میں رہتے تھے۔ اور وہ اس بھائیں بھائیں کرتے ہوئے گھر میں ایسی کسی وحشی مگر مقید جانور کی طرح اس لمبے چوڑے گھر میں بے مقصد گھوما کرتی تھی۔ آخر کار اس طویل تنہائی اور اکیلے پن سے گھبرا کر اس نے اپنی چھوٹی بہن کو اپنے پاس بلا لیا تھا۔ لیکن وہ سکوت اور جمود جو اس گھر کی فضا پر مسلط تھا۔ پھر بھی نہ ٹوٹ سکا۔ کوئی مہمانداری نہ تھی۔ کہیں آنا جانا نہیں تھا۔ دونوں بہنیں سارا سارا دن ایک دوسرے کا منہ تکتی رہتیں یا اپنے اپنے حافظے کو ٹٹول ٹٹول کر کوئی نئی بات ڈھونڈنے کی کوشش کرتیں۔ اور جب کوئی نئی بات نہ ملتی تو پرانی اور کئی بار دہرائی ہوئی باتیں

کو اندر سرِ نو دہرانے پر ہی قناعت کرتیں۔ لیکن جلد ہی ان پرانی باتوں کا ذخیرہ بھی ختم ہو جاتا۔ اور وہ خاموش ہو کر دھندلائی ہوئی بےنور آنکھوں سے صحن کی بلند دیوار کی اینٹوں کو گننے لگتیں۔ گرما کے بے کیف و بے رنگ پہاڑ سے دن ختم ہونے میں ہی نہ آتے۔ ربڑ کی تار کی طرح کھنچے ہی چلے جاتے۔ صبر آزما حد تک لمبے ہو جاتے اور اس کے ساتھ ان کی موہوم امیدیں بھی بےیقین تر اور کسی انجانی چیز کا انتظار طویل سے طویل تر ہو جاتا۔ دروازے کی ہر دستک پر، قدموں کی ہر آہٹ پر، سڑک پر سے گزرتے ہوئے تانگوں کی ہر گڑگڑاہٹ پر ان کی آنکھوں میں دیئے جل جل اُٹھتے۔ لیکن آج دیئے ایک بار جو جلے تو بس جلتے ہی رہے۔ گو ان کی لو اندیشے اور وسواس بھرے خیال سے رہ رہ کے پھڑپھڑا رہی تھی۔ اس طویل انتظار کے بعد آج واقعی کوئی ان کے گھر آیا تھا۔ نہ جانے کتنے دنوں سے؟ نہ جانے ہمیں کیا سمجھے! اس نے غبار آلود آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ہمیں اپنا کیونکر سمجھے گا؟ سوتیلی ماں جو ٹھہری اور سوتیلی ماں کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ لیکن مجھے تو اس سے کوئی بغض و عناد نہیں۔ کوئی دشمنی نہیں۔ اور اُسے اپنی شادی کی وہ شرط یاد آ گئی۔ جس کی رو سے میاں صاحب کے لئے شادی کے بعد اپنی پہلی اولاد کو گھر پر رکھنا ممنوع قرار پایا تھا۔ اور اگر وہ اپنی اولاد کو اپنے قریب رکھنے کے متمنی تھے۔ تو ان کے لئے علیحدہ مکان لینے کی شرط تھی۔ لیکن اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ اس نے سوچا۔ جو کیا میرے والدین نے کیا۔ مجھے ان شرائط کا کوئی علم نہیں تھا۔ اب اگر وہ سب بچے گھر میں موجود ہوتے تو کتنی رونق ہوتی۔ گھر بھرا بھرا نظر آتا۔ اُسے یہ سب باتیں معلوم ہوں گی۔ معلوم نہیں وہ مجھے کیا سمجھتا ہوگا!؟ کوئی ڈائن ہوں یا چڑیل؟ لیکن مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔ بھلا اس نے کیا بگاڑا ہے؟ میں اس سے کیوں جلوں؟ اس سے دور دور رہنے کی کوئی وجہ نہیں۔ گو خون کا رشتہ نہ سہی۔ لیکن دنیا میں صرف خون کے رشتے ہی تو نہیں ہوتے۔ اور بھی بہت سے رشتے ہیں۔ اگر وہ محض اس لئے مجھے ناقابلِ اعتنا سمجھتا ہے۔ کہ میں سوتیلی ماں ہوں تو اس کا کیا علاج؟ نہیں۔ نہیں۔ میں اُسے یہ نہیں سمجھنے دوں گی۔ میں اُسے بتا دوں گی کہ سوتیلی ماں کوئی ڈائن یا بلا نہیں ہوتی۔ وہ تو میرے چھوٹے بھائی ۔ ۔ ۔ ۔ لاحول ولا قوۃ! لیکن اور کیا کہوں؟ مشکل سے تین چار سال چھوٹا ہوگا۔ اس میں میرا کیا قصور ا ــــ "آپا ناشتہ تیار ہے" ــــ وہ چونک پڑی۔ ثریا اپنے دوپٹے سے پسینہ پونچھ رہی تھی۔ اس کے گال تمتما رہے تھے۔ اس نے اُسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ وہ اُسے بہت پیاری لگی۔ اقبال ابھی کنوارا ہے۔ اس نے چپکے سے سوچا ــــ "اچھا تو باہر میز پر ناشتہ لگا دو۔ وہ بس آتا ہی ہو گا" ــــ ثریا جانے لگی ــــ "ٹھہرو میں خود ناشتہ لگاتی ہوں"۔ اُسے اپنی چھوٹی بہن پر بڑا ترس آیا۔ اس گرمی میں بیچاری سے اتنا کام لے رہی ہوں ــــ "نہیں آپا آپ بیٹھئے، میں خود کر دوں گی" ــــ "ارے نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ تم ذرا بیٹھ کر پسینہ سکھا لو"۔

زینی باورچی خانے میں جھاڑو لگا رہی تھی۔ بیگم ٹرے میں برتن لگانے لگی ــــ "بی بی جی" زینی جھاڑو دیتے ہوئے بولی ــــ "کیا ہے؟" ــــ "اقبال میاں کیا کیا کرتے ہیں؟" اس نے رک رک کر ڈرتے ہوئے پوچھا ــــ "مجھے خود معلوم نہیں کہیں کام وام کرتے ہوں گے" ــــ زینی کچھ دیر خاموش رہی۔ "ان کی شادی ہو چکی؟" ــــ بیگم چونکتے ہوئے بظاہر بے پروائی سے بولیں "نہیں" ــــ زینی کچھ سوچتے ہوئے مالکن کی پشت کو گھورنے لگی۔ وہ کچھ اور بھی پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر ڈر رہی تھی۔ "چھٹی پر آئے ہیں!" ــــ "ہاں" ــــ "کے روز کی؟" ــــ "معلوم نہیں" ــــ "ان کی نوکری تو اچھی ہو گی؟" ــــ "ہوں" وہ ٹرے میں لگے ہوئے برتنوں کی طرف دیکھ کر گنگنائی۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کہ آخر یہ کیا پوچھنا چاہتی ہے! شاید اُسے بھی وہی خیال آیا ہو جو کچھ دیر پہلے اس کے اپنے ذہن میں پیدا ہوا تھا ــــ "بی بی جی"؟ زینی ہچکچاتے ہوئے بولی ــــ "کیا ہے؟" اس نے طویل انتظار سے جھنجھلاتے ہوئے پوچھا

—— "پھو — پھوپی بی — بی — کی ۔ ک ۔ کہیں ۔ ب ۔ با ۔ بات چیت ہو گئی ۔ ۔ ۔ ؟" اس نے رک رک کر ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ اور وہ سوچنے لگی کہ اس کی بات کا جواب دے یا نہ دے۔ آخر نوکر ذات تھی، اور ایسی بات میں نوکر کا دخل بہت غیر مناسب سی بات تھی۔ لیکن اس نے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنے کی ضرورت کچھ اس شدت سے محسوس کی کہ وہ جواب دیئے بغیر نہ رہ سکی: "نہیں ابھی تو نہیں" اس نے اٹھتے ہوئے کہا —— "دیجیے بی بی جی برتن میں لے جاؤں" نزہت اس کے ہاتھ سے ٹرے لیتے ہوئے بولی، باہر آ کر اس نے ایک چھپتی ہوئی نگاہ چھوٹی بی بی پر ڈالی۔ وہ چہرے کو ہاتھوں کے کٹورے میں تھامے خلا میں گھور رہی تھی۔ اور نزہت آپ ہی آپ مسکرا دی۔

وہ نہا دھو کر باہر نکلا۔ دونوں بہنیں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ثریا نے اس کے چمکتے ہوئے بالوں، گورے چٹے چہرے، آسمانی رنگ کی قمیص میں چھپے ہوئے چوڑے چکلے سینے اور گہرے نیلے رنگ کی پتلون کو ایک ہی نظر میں دیکھا اور پھر آنکھیں جھکا لیں۔ لیکن بڑی بہن نہایت ڈھٹائی اور بے حیائی سے اس کی طرف تحسین بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ بیچارہ جھینپ گیا —— "آؤ میاں ناشتہ تیار ہے" بیگم نے اٹھ کر اس کی کرسی میز کے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔ وہ چائے بنانے لگا: "اب نہا دھو کر ذرا ہوش آیا۔ گرمیوں کا سفر بھی عذاب ہے: آپ میں سے چائے کوئی نہیں پئے گا؟" —— "نہیں۔ ہم لوگ تو کبھی کے پی چکے۔" —— "تھوڑی ایک ایک پیالی اور سہی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا "یوں اکیلے اکیلے پینا مجھے کچھ اچھا نہیں لگتا" —— "جاؤ ثریا دو پیالے اور لے آؤ" بیگم نے بہن سے کہا۔ وہ پیالے لے آئی۔ اور اس کے پاس کھڑے ہو کر چائے بنانے لگی۔ بیگم نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے پاس پاس دیکھا۔ تو وہی خیال پھر اس کے ذہن میں عود کر آیا جب ثریا اپنے چائے کی پیالی پکڑ کر اپنی کرسی پر جا بیٹھی۔ تو اس نے مسکراتے ہوئے اقبال سے پوچھا۔ "کیوں میاں شادی کب کر رہے ہو؟" —— اقبال اس غیر متوقع سوال پر بوکھلا سا گیا: "ابھی تو نہیں۔ ایک آدھ سال بعد" اس کے باوجود اسے پھر پسینہ آنے لگا۔ ثریا چائے کی پیالی میں ناک ڈالے بیر بہوٹی بنتی جا رہی تھی —— "کوئی لڑکی ڈھونڈ لی ہے۔ یا ابھی نہیں؟" بیگم پھر ہنسی —— "ابھی تو نہیں۔ جب وقت آئے گا۔ تو دیکھا جائے گا۔" اس نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا اور رومال نکال کر پسینہ پونچھنے لگا —— "چلو تم یہ کام ہم پر چھوڑ دو۔ ہم تمہارے لئے دلہن ڈھونڈیں گے۔" ثریا کی ناک اور بھی چائے میں ڈوب گئی۔ اس کے گال اور کان دہک اُٹھے —— اُسے اپنی سوتیلی ماں کے رویئے پر حیرت ہو رہی تھی۔ سوتیلی مائیں ایسی تو نہیں ہوتیں! اس نے تو ان کے بارے میں کچھ اور ہی سن رکھا تھا۔ بہت بُری ہوتی ہیں، ڈراؤنی اور دل آزار باتیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل الٹ تھا۔ اس کی اور اس کے بہن بھائیوں میں دلچسپی کا اظہار، یہ بے تکلفی کی کوشش، یہ قریب لانے کی سعی، یہ سب کچھ کس لئے؟ یہ محض دکھاوا ہے یا اس میں کچھ سچائی اور خلوص بھی ہے؟ ۔ کوئی خاص مقاصد تو نہیں؟ —— یوں بھی تو بچے کیا اس نے ارد گرد صحن میں نظر دوڑاتے ہوئے سوچا کیا بگاڑ سکتی ہے! اب ہم اس کی دست برد سے محفوظ ہیں۔ اب ہمیں کوئی گزند نہیں پہنچا سکتی۔ اس نے خشک مرجھائے ہوئے پودوں کی طرف دیکھا اور اُسے اپنی ماں یاد آگئی۔ کتنی رونق ہوتی تھی۔ ان دنوں اس گھر میں۔ کتنی گہما گہمی اور شور و غل ہوتا تھا۔ سارا دن آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ سارا دن چائے بنتی رہتی یا گرمیوں میں شربت اور لسی تیار ہوتی رہتی۔ کبھی گھر میں آئی ہوئی عورتوں کے لئے تو کبھی باہر میاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے مردوں کے لئے۔ کتنے سارے نوکر تھے —— ان کے باوجود اس کی ماں گھر کے کام کاج اور مہمانوں کی آؤ بھگت میں مصروف یوں ادھر ادھر دوڑی پھرا کرتی جیسے کوئی نیم پاگل ہو۔ مگر اب اس ویرانی اور شکستگی اس کے وجود میں بھی سرایت کر گئی۔ گھر کی فضا پہ ایک بوجھل خاموشی اور تھکن مسلط تھی۔ اور اس بوجھ کے نیچے تمام گھر اونگھتا کراہتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"کتنے دن کی چھٹی ہے؟" بیگم نے خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا —— "دس پندرہ دن" اس نے چائے ختم کرتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی نظر ایک بار پھر مرجھائے ہوئے پودوں پر پڑی۔ وہ کچھ سوچ کر اُٹھا اور غسل خانے میں چلا گیا۔ دونوں بہنیں حیرت سے اُسے تکنے لگیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ پانی کی بھری ہوئی بالٹی اٹھائے باہر آیا اور ان کے پاس سے گزر کر چپ چاپ صحن میں چلا گیا۔ "یہ کیا کرنے لگے ہو؟" نجم نے پوچھا ۔۔۔ "میں نے سوچا ذرا پودوں کو پانی دے دوں ۔۔۔" "ارے چھوڑئیے میاں میں پانی ڈال دوں۔ آپ کے کپڑے خراب ہو جائیں گے۔" بی بی نے اس کے پاس جا کر اس کے ہاتھ سے بالٹی لینے کی کوشش کی ۔۔۔ "نہیں، رہنے دو کوئی بات نہیں تم جا کر اپنا کام کرو۔" وہ منہ لٹکائے واپس آ گئی۔ دونوں بہنیں گردنیں موڑے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اور سوچ رہی تھیں۔ کہ وہ کیا کریں! ۔۔۔ کیسے اس کا ہاتھ بٹائیں؟ وہ ایک دوسرے کا انتظار کر رہی تھیں۔ کہ پہل کون کرے۔ "آؤ بھی پھر" نجمی اور ایک گلاس اٹھا کر اس کے پاس پہنچ گئی۔ "لاؤ میاں ہم بھی تمہاری مدد کریں۔" وہ مسکرا دیا۔ وہ دونوں پودوں کو پانی دینے لگے۔ ثریا ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اور دل ہی دل میں کڑھ رہی تھی۔ کہ وہ کیوں نہ پہلے اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ کچھ دیر انہیں دیکھتی رہی۔ آخر اس سے نہ رہا گیا اس نے غسل خانے میں جا کر دوسری بالٹی بھری اور اُسے اٹھا کر صحن میں لے گئی۔ اور ان کی طرف پیٹھ موڑ کر مقابل کی کیاریوں کو پانی دینے لگی ۔۔۔ بڑی بہن نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ تھی۔ جس میں ہلکے سے طنز اور مذاق کی جھلک تھی۔ اور بی بی دالان کی دہلیز پر بیٹھی ان تینوں کی طرف کبھی کبھی رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔

شام کو چائے سے فارغ ہو کر میاں صاحب وہیں کرسی میں جم کر بیٹھ گئے۔ اور حقہ گڑگڑانے لگے۔ موسم کچھ بدل گیا تھا۔ صبح کی سی گھٹن اور حبس نہیں تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ باپ اور بیٹا ایک دوسرے سے باتوں میں محو تھے ۔۔۔ "آج آپ باہر نہیں جائیں گے؟" ان کی بیوی نے پوچھا ۔۔۔ "نہیں بھائی" وہ مسکراتے ہوئے بولے "آج بھی کوئی باہر جانے کا دن ہے! اتنے دنوں کے بعد اقبال گھر آیا ہے۔ اس سے دو چار باتیں کر لوں۔" ۔۔۔ آج میاں صاحب بھی اپنا پروگرام بدل چکے تھے۔ ورنہ ان کا روزانہ کا معمول تو یہ تھا کہ چائے پیتے ہی ہاتھ دھو کر باہر نکل جاتے تھے۔ اور پھر رات کو کھانے کے وقت گھر لوٹتے۔ ان کا گھر میں جی ہی نہیں لگتا تھا۔ جی لگتا بھی کیسے! وہ گھر میں گم سم بیٹھ کر کیا کرتے؟ ان عورتوں سے کیا باتیں کرتے! اپنے سونے سونے خاموش گھر کو دیکھ کر انہیں وحشت سی ہونے لگتی۔ اور اپنی مرحوم بیوی کے زمانے کی چہل پہل اور رونق کو یاد کر کے ان کی وحشت اور بھی بڑھ جاتی۔ وہ تمام امیدیں اور توقعات جو انہوں نے کبھی دوسری شادی سے وابستہ کی تھیں۔ رفتہ رفتہ ناامیدی اور مایوسی میں بدلتی جا رہی تھیں۔ دراصل میاں بیوی کے درمیان عمر کا فاصلہ بہت زیادہ تھا۔ اور یہ عمر کی خلیج اس قدر وسیع اور گہری تھی کہ کسی قسم کا رشتہ یا بندھن اُسے پر نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بڑھاپے میں قدم رکھ چکے تھے۔ ان کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اور ان کی بیوی پچیس چھبیس کے لگ بھگ تھی۔ ان کے اپنے لڑکے سے صرف دو تین سال بڑی! ثریا ابھی بیسویں سال میں تھی۔ گو جسمانی لحاظ سے دونوں بہنیں جوان تھیں۔ اور مکمل عورتیں بن چکی تھیں۔ لیکن عقل اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے وہ ابھی تک بچپنے میں تھیں۔ ان کی تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ تھوڑا بہت اردو لکھ پڑھ لیتی تھیں۔ جو انہوں نے خاندانی روایات کے مطابق گھر پر ہی سیکھا تھا۔ تربیت میں بالکل معذور تھیں۔ گاؤں سے آئی تھیں۔ اس لئے وہی گنواروں جیسے طور طریق۔ وہی بول چال کا ڈھنگ ۔۔۔ نہ بات کا کرنے کا سلیقہ، نہ اُٹھنے بیٹھنے کی تمیز اور نہ گھر آئے مہمانوں کی خاطر مدارت کرنے کا شعور۔ یہی وجہ تھی۔ کہ ان کے گھر میں لوگوں کا آنا جانا بند ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں تو انہوں نے اپنی بیوی کی تربیت کی طرف کافی توجہ دی تھی۔ اُسے کپڑے پہننے کا ڈھنگ، اُٹھنے بیٹھنے کے آداب اور بات چیت کا سلیقہ وغیرہ سکھلانے کی کوشش کی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد مایوس ہو کر دل چھوڑ بیٹھے۔ وہ اس وقت بھی ان کے سامنے کرسی پہ آلتی پالتی مارے بیٹھی تھی۔ حالانکہ وہ اُسے بیسیوں مرتبہ اس طرح بیٹھنے سے منع کر چکے تھے۔ ایک تو اس عمر میں اسکول ماسٹری انہیں کچھ راس نہیں آئی تھی۔ اور دوسرا ان کی بیوی اس پختہ عمر میں پہنچ چکی تھی۔ جہاں پرانی عادتوں کو چھوڑنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اور زندگی کے سانچے میں ڈھلتے ڈھلتے ہی ڈھلتی

ہے ما انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا۔ لیکن کیا کرتے غلطی ایک بار ہو چکی تھی۔ اب اس کا خمیازہ بھگت رہے تھے۔ وہ اپنے جبر کو کے نباہ رہے تھے۔ بڑھاپے میں انہیں جس آرام و آسائش ہمدردی اور سہارے کی آرزو تھی۔ وہ چیزیں انہیں میسر نہ آسکیں۔ حالانکہ اسی مقصد کے پیش نظر انہوں نے دوسری شادی کی تھی۔ مگر وہ شاید یہ بھول گئے تھے کہ یہ چیزیں تو طویل رفاقت اور قربت کے بعد ہی پیدا ہوتی ہیں۔ دو مہینے یا دو سال میں نہیں۔ بڑھاپے اور جوانی کا یہ بے جوڑ میل انہیں راس نہیں آیا تھا۔

اور پھر ان کے درمیان کسی قسم کی ذہنی قربت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکی تھی۔ وہ عمر کی مزاجیت کو سمجھنے سے قاصر تھی۔ اور اس بچاری کا کوئی قصور نہیں تھا۔ وہ بڈھوں کی تلوّن مزاجی اور ان کے چونچلوں کو کیسے سمجھتی۔ اگر اسے اپنی کنگھی چوٹی اور بناؤ سنگار سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ اگر وہ اکثر بھول جاتی تھی کہ میاں صاحب کو علی الصبح چائے کی پیالی کے ساتھ تازہ کیا ہوا حقہ ملنا چاہیئے۔ یا یہ کہ نہاتے وقت ان کے کپڑے غسلخانے میں تیار موجود ہوں۔ اور قمیص کے سب بٹن صحیح سالم ہوں۔ یا ان کے جوتے ہر صبح پالش کئے ہوئے ہوں۔ تو یہ عین فطری بات تھی۔ وہ ان چیزوں کی عادی نہیں تھی۔ لہٰذا میاں صاحب کو تقریباً ہر صبح حقّے کی فرمائش کرنی پڑتی۔ اور جوتوں کی پالش کے لئے بار بار یاد دہانی کرانی پڑتی۔ اور وہ اس روز روز کی تاکید اور یاد دہانی سے چڑتے تھے۔ ایک کام جو روز کرنے کا ہے۔ اس کے لئے روز کہنے کی ضرورت کیوں پیش آئے! اس معاملے میں وہ بھی بے قصور تھے۔ کیونکہ وہ گزشتہ بیس سال سے ان چیزوں کے عادی ہو چکے تھے۔ ان کی پہلی بیوی کے زمانے میں یہ سب کام خود بخود اور بالکل انداز میں بغیر کہے سنے ہو جایا کرتے تھے۔ اس لئے اب جب کبھی اپنے ٹرنک میں سے خود ہی قمیص ڈھونڈ کر نکالتے اور پہننے کے بعد وہ اس کا کوئی بٹن ٹوٹا ہوا پاتے تو اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کر رہ جاتے اور اسی طرح قمیص پہنے کچہری چلے جاتے۔ ان کا دل بجھ سا گیا تھا۔ مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہو گیا تھا۔ جسے وہ کم گوئی کی آڑ میں چھپانے کی کوشش کرتے۔ گھر کی فضا انہیں اجنبی اجنبی سی معلوم ہونے لگی تھی۔ وہ گھر میں داخل ہوتے تو اس مہائیں مہائیں کرتے ہوئے احساس اور ویران ماحول کو دیکھ کر ان کے دل میں ایک ہوک سی اٹھتی اور پرانے دنوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اپنی غلطی کا احساس اور بھی شدید ہو جاتا اور وہ اس تکلیف دہ احساس کو زائل کرنے اور ان تلخ یادوں کو بھلانے کی خاطر اپنے دوست احباب کی محفل میں پناہ ڈھونڈتے۔

لیکن آج وہ گھر پر ہی رہے تھے۔ آج اس گھر کی سونی سونی مردہ فضا میں زندگی کی ہلکی سی لہر دوڑ گئی تھی۔ پرانے دنوں کی خفیف سی جھلک تھی۔ تو بیٹے کی آمد، اس کا لب و لہجہ، اس کے چہرے کے خد و خال انہیں بار بار اپنی مرحومہ بیوی کی یاد دلا رہے تھے۔ لیکن اس یاد میں نشتریت کم تھی۔ بلکہ مرہم کی آسودگی اور ٹھنڈک تھی۔ آج انہیں باتیں کرنے کے لئے کوئی مل گیا تھا۔ جس سے وہ اپنا دکھ سکھ کر سکتے تھے۔ جو ان کی باتوں کو سمجھ سکتا تھا۔ اور ان کے احساسات و جذبات کی قدر پہچانتا تھا۔ جس کے ساتھ وہ ایک قسم کی ذہنی اور روحانی یگانگت، ربط اور ہم آہنگی محسوس کر سکتے تھے۔ ان کے درمیان ایک مشترکہ ماضی تھا۔ ایک ماحول تھا۔ کچھ باتیں تھیں۔ چند واقعات تھے، یادوں کا ایک ذخیرہ تھا جس میں وہ دونوں برابر کے حصہ دار تھے۔ اور ان چیزوں میں دو عورتیں شریک نہیں ہو سکتی تھیں۔ وہ قربت و رفاقت کے اس طلسماتی دائرے سے خارج تھیں۔ باپ اور بیٹا باتوں میں اس قدر محو تھے۔ کہ ان عورتوں کی موجودگی کو بالکل بھول گئے۔ دونوں بہنیں اداس اداس، دھندلائی ہوئی آنکھوں سے تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد ان کی طرف دیکھ لیتیں اور پھر آپس میں کوئی بات کرنے کی ناکام کوشش کرتیں۔ انہیں اپنی علیحدگی کا احساس بری طرح ستا رہا تھا۔ بیگم نے ایک دو بار ان کی باتوں میں دخل اندازی کرنے کی کوشش کی بھی تو وہ اسے یوں نظر انداز کر گئے۔ جیسے بزرگوں کی باتوں میں بچے کوئی بے تکی بات کہہ دیں۔ بیگم کے دل میں جلن اور رقابت کے احساسات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ اپنے میاں سے جل رہی تھی۔ کیونکہ لڑکے کی تمام توجہ

توجہ اپنے باپ پر مرکوز تھی۔ باپ کی وجہ سے وہ انہیں بالکل نظرانداز کئے بیٹھا تھا۔ یہ کیوں؟ آخر میں بھی اتنی ہی توجہ کے قابل . . . غیر اس کی ماں نہ سہی اس کے باپ کی بیوی تو ہوں۔ میں کوئی اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میں اس سے کچھ نہیں مانگتی۔ کچھ نہیں چاہتی۔ صرف اتنا چاہتی ہوں کہ ہم سے بھی کچھ باتیں کرے۔ ہم سے بھی ہنسے بولے۔ ہم بھی آخر انسان ہیں۔ اسی گھر میں رہتے ہیں۔ اگر ہمارے گھر آیا ہے تو . . . . . " ثریا! ذرا کھانا تو دیکھ۔ دال کو دم آگیا ہے یا نہیں؟" ——— اور ثریا وہ پیڑھ سنبھالتی ہوئی اٹھ کر چلی گئی۔

زینی بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی۔ اس نے آنکھ اٹھا کر چھوٹی بی بی کے متفکر چہرے کی طرف دیکھا۔ اس نے ان اداس اداس مسکین سی آنکھوں میں جن میں ہر وقت ایک عجیب سی تیرتی رہتی تھی۔ جانے کیا دیکھا کہ سر جھکا کر آپ ہی آپ دھیرے دھیرے مسکرانے لگی۔ ثریا چاولوں کا معائنہ کر رہی تھی۔

——— "آج میاں صاحب بڑے خوش خوش نظر آرہے ہیں؟" زینی نے کہا ——— "ہوں" ثریا منہ ہی منہ میں گنگنائی ——— "چھوٹے میاں کے دن رہیں گے؟" ——— "پتہ نہیں" ——— "کتنی جماعت پڑھتے ہیں؟" ——— "مجھے کیا معلوم؟" وہ ترش روئی سے بولی ——— "ان کی طبیعت بڑی اچھی معلوم ہوتی ہے نا" ——— "ہوں" وہ منمنائی ——— زینی کچھ دیر خاموش گیلے آٹے میں انگلیاں مارتی رہی ——— "چھوٹی بی بی؟" ——— "کیا ہے؟" ——— اور ثریا کی تیوری پر بل دیکھ کر زینی کا منہ کھلتے کھلتے بند ہو گیا۔ ثریا نے کچھ دیر انتظار کیا۔ "جلدی جلدی آٹا گوندھ کے روٹی پکانی شروع کر۔ کھانے کا وقت ہو رہا ہے۔" اور باہر چلی گئی۔ زینی نے آٹا گوندھا اور چولہے پر توا رکھ کر روٹیاں پکانے بیٹھ گئی۔ پسینے کی لکیریں اس کے الجھے ہوئے خشک بالوں میں سے نکل نکل کر، اس کی کنپٹیوں پر سے ہوتی، پچکے ہوئے گالوں پر سے بہتی ہوئی اس کے گریبان میں جذب ہو رہی تھیں ——— کتنا بانکا اور سجیلا جوان ہے! اس نے اپنی ناک پر سے پسینے کا قطرہ جھٹکتے ہوئے سوچا۔ ضرور اپنی ماں پر گیا ہوگا ورنہ میاں صاحب تو اتنے خوش شکل نہیں۔ ان کے نقش تو بہت بھدے اور موٹے موٹے ہیں۔ سچ جب ہاتھ دھو کر آسمانی رنگ کی قمیص اور نیلی پتلون میں باہر نکلا تھا۔ تو نظر دل میں کھبا جا رہا تھا۔ ابھی تو چھوٹی بی بی بھی سچ سے گھبرائی گھبرائی شرماتی شرماتی سی پھر رہی ہے۔ چلو گھر میں کچھ دن تو رونق ہوئی۔ اچھی بھلی صورت دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی تھیں۔ چھوٹی بی بی سے اگر . . . . . . اور اسے اپنا خاوند یاد آگیا۔ جسے مرے ہوئے پانچ سال ہو چکے تھے۔ سوائے شراب پینے اور جوا کھیلنے کے اس میں اور کوئی عیب نہیں تھا۔ ٹکڑوں پر پلتا تھا۔ لیکن مزاج شاہوں کا سا تھا۔ دل کا اچھا تھا دل بہت بڑا تھا کہ اس میں دنیا کا ہر فکر، ہر غم اور ہر مصیبت یوں سما جاتی۔ جیسے سمندر میں پانی کا قطرہ۔ اس سے بڑا اچھا سلوک تھا۔ ایک رات اتنی چڑھا گیا۔ کہ برداشت نہ کر سکا۔ اگلے دن مر گیا۔ وہ تب سے بیوہ تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ مر نہ سکی۔ زیادہ موٹی ضرور ہو گئی۔ اب بھی کبھی کبھی راتوں کی تاریکی میں وہ اپنی شکستہ چارپائی پر لیٹے لیٹے کسمسانے لگتی۔ انگ انگ میں آگ سی سلگ اٹھتی۔ اور وہ اپنے اینٹھتے ہوئے جسم کو کھردری چارپائی سے رگڑ رگڑ کر کچھ تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتی۔ مگر آگ اور بھی سلگ اٹھتی۔ تشنگی اور بھی بڑھ جاتی۔ اس گھر میں آنے کے بعد مرد تو گویا اس کے لئے عنقا ہو گیا تھا۔ لے دے کے ایک میاں صاحب تھے۔ اور ایک ان سے بھی بوڑھا ملازم جو باہر کے کام کاج پر مامور تھا۔ ان دو کے علاوہ کسی دوسرے کی شکل دیکھنی بھی نصیب نہیں ہوتی تھی۔ چھوٹے میاں کی آمد نے اس کے عرصے سے سوئے ہوئے زنگ آلود احساسات اور خواہشات میں بھی حرکت پیدا کر دی تھی۔ موہوم اور مبہم امیدیں دبے پاؤں آکر اس کے دل میں ڈیرے ڈال رہے تھے ——— چلو اور نہیں تو کچھ دن شغل ہی رہے گا۔ چند دن کی دل لگی ہی سہی! ——— اس کے پتلے پتلے سیاہی مائل نیلے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

انہوں نے کھانا ختم کیا۔ میاں صاحب آرام کرسی پر نیم دراز ہو کر حقہ گڑگڑانے لگے۔ باقی لوگ سونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اقبال کوٹھی

حیرت ہوئی۔ گھر کا نظام بالکل بدل گیا تھا۔ جب اس کی ماں زندہ تھی۔ تو رات کے کھانے کے بعد وہ سب لوگ گھنٹہ آدھ گھنٹہ کے لئے باہر گھومنے جایا کرتے تھے۔ اس کے ماں باپ اور بہن بھائی قافلہ بنا کر گھر سے نکلا کرتے تھے۔ اور ان کے پیچھے پیچھے نوکروں کی پلٹن ——— چونکہ ان کا گھر قصبے کے ایک سرے پر تھا۔ اور رات کو اس طرف آمد و رفت بہت کم ہوتی تھی۔ اس لئے اس کی ماں اور بہن چادر اوڑھنے پر ہی اکتفا کر لیتیں۔ گو ایسے ان کے گھر میں پردے کی سخت پابندی تھی۔ لیکن اب تو اُسے ایسے نظر آرہا تھا۔ جیسے وہ لوگ سر شام ہی پڑ کر سو جائیں گے۔ وہ خود دوپہر میں بھی جی بھر کے سو چکا تھا۔ اس لئے اس کے لئے اتنی جلد سونا ناممکن تھا۔ اس نے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ وہ حقّے کی نے منہ میں لئے آنکھیں موندے کرسی میں نیم دراز تھے۔ "ابا جان آجکل آپ باہر گھومنے نہیں جایا کرتے؟" ——— انہوں نے آنکھیں کھول کر کچھ دیر اس کی طرف اداس اداس نظروں سے دیکھا اور دھیرے سے بولے "نہیں بھئی اب ہمت نہیں رہی۔ اور پھر؟" وہ اپنی آواز اور بھی دھیمی کرتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں بولے "اور پھر کسی کو شوق بھی تو ہو۔ کبھی کسی نے باہر جانے کی خواہش ہی ظاہر نہیں کی۔ تمہاری امّاں کو خدا بخشے اس کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ تو ڈنڈے کے زور سب کو ہانک کر لیجایا کرتی تھی۔" انہوں نے پھر آنکھیں بند کر لیں ——— "تو پھر میں ذرا باہر چلو لگا آؤں مجھے تو ابھی نیند نہیں آتی"۔ ——— "ہاں۔ ہاں ضرور ہو آؤ۔ اور ان لڑکوں سے بھی پوچھ لو اگر جانا چاہیں۔ تو ساتھ لے جاؤ۔ ذرا انہیں بھی گھما لاؤ"۔ ——— "بیگم بستر بچھا رہی تھی۔ باہر گھومنے چلو گی؟" اس نے با آواز بلند پوچھا ——— "ہا۔ آ۔ آ۔ ں۔ ں" وہ اپنے میاں کی طرف دیکھتے ہوئے ہچکچائی "اپنے ابا سے پوچھ لو" ——— "ہاں بھئی جاؤ۔ جاؤ۔ مجھ سے کیا پوچھنا" میاں صاحب اپنے مراقبے سے چونکتے ہوئے بول اُٹھے "ذرا چل پھر آؤ۔ ہاتھ پاؤں کھل جائیں گے"۔

وہ کچی سڑک پر پہلو بہ پہلو چلے جا رہے تھے۔ آسماں پر چھٹی ساتویں رات کا چاند تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کھیتوں اور جھاڑیوں میں سے جھینگروں اور مینڈکوں کے گانے کی مسلسل آواز آرہی تھی ماں کے پیچھے پیچھے زینی خاموش سائے کی طرح رینگتی ہوئی چلی جا رہی تھی۔ "آپ لوگ شام کے وقت کیا کرتے ہیں؟" اس نے طویل خاموشی توڑتے ہوئے پوچھا ——— "کچھ نہیں۔ بس کھانا کھایا اور لیٹ گئے"۔ بیگم کے لہجے سے بیزاری اور اکتاہٹ جھلک رہی تھی ——— "یہاں تو سینما بھی ہے۔ کبھی گئیں آپ؟" ——— "ہاں ایک بار گئی تھی۔ شروع شروع میں اب تو کوئی لے کر جانے والا ہی نہیں"۔ وہ شکایت آمیز انداز میں بولی "تمہارے ابا سارا دن کام کرنے کے بعد اس قدر تھک جاتے ہیں۔ کہ انہیں کھانا کھاتے ہی سونے کی سوجھتی ہے"۔ اُسے اُس کی بیزاری اور اکتاہٹ بھری زندگی پر بڑا ترس آیا ——— "چلئے کسی دن میں آپ کو سینما لے چلوں گا"۔ ——— "ہاں اگر تمہارے ابا جانے دیں تو . . . . ." ——— "ابا جان کیا کہیں گے!" اور وہ یونہی باتیں کرتے ہوئے بہت دور تک چلے گئے۔ جب وہ ریلوے لائن کے پھاٹک تک پہنچے تو اُسے دفعتاً خیال آیا کہ وہ بہت دور نکل آئے تھے۔ عورتوں کے پاؤں مشکل سے اُٹھ رہے تھے ——— "بھئی ہم تو تھک گئے"۔ آخر بیگم بول اُٹھی ——— "تو تھوڑی دیر یہاں سستا لیجئے"۔ وہ سڑک کنارے ایک چھوٹی سی پلیا کی دیوار پر بیٹھ گئے۔ بڑی بہن تو اس سے کافی گھل مل گئی تھی۔ اور مسلسل بے سر و پا باتیں کئے جا رہی تھی۔ لیکن چھوٹی بہن کے منہ میں شاید زبان تھی ہی نہیں۔ وہ ابھی تک چپ تھی۔ شاید وہ شرما رہی تھی۔ اس نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ "شرماتی ہے تو شرمانے دو"۔ اس نے سوچا "میری بلا سے!۔ عجیب لڑکی ہے!" جب وہ گھر پہنچے تو میاں صاحب باہر صحن میں پلنگ پر ——— ٹھنڈی ہوا میں پڑے منہ سے سو رہے تھے۔ دونوں بہنیں اس قدر تھک گئی تھیں۔ کہ جاتے ہی اپنے اپنے بستر پر دراز ہو گئیں۔ وہ اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کمرہ مکان کے پہلو میں تھا۔ اس کا بستر اور پلنگ ابھی تک کمرے میں تھے۔ ان کو ان کا بستر باہر نکلنے کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ وہ کپڑے بدل کر اپنا بستر باہر

نکالنے ہی والا تھا۔ کہ زینی دوڑی دوڑی آئی: "لائیے چھوٹے میاں آپ کا بستر باہر نکال دوں۔ آپ رہنے دیجئے" اس نے اس کا بستر بغل میں دبایا اور دوسرے ہاتھ سے چارپائی اٹھا کر باہر لے گئی۔ بستر بچھانے کے بعد وہ پھر اندر آئی: "اور کوئی چیز تو نہیں چاہئے؟" —— "نہیں" —— "پانی وغیرہ .....؟" —— "ہاں۔ ہاں پانی کا گلاس لا دو" —— وہ چلی گئی۔ اور کچھ دیر کے بعد گلاس اور صراحی لئے ہوئے لوٹی: "لیجئے میں صراحی بھی لے آئی ہوں۔ شاید رات پانی کی ضرورت پڑے۔" اس نے پانی پیا۔ وہ ابھی تک کھڑی رہی۔ منتظر مجسم تھی۔ "اور کوئی خدمت؟" —— "صبح چائے کب تیار ہوتی ہے؟" اس نے پوچھا —— "چھ بجے" —— وہ مطمئن ہو گیا —— "بس اب جاؤ" اور وہ چلی گئی۔ وہ بتی بجھا کر اپنے بستر پر آ لیٹا۔

"اقبال میاں!" اس نے آنکھیں کھولیں۔ بیگم سامنے کھڑی تھی —— "اٹھو چائے تیار ہے۔" وہ اٹھا اور منہ ہاتھ دھوئے بغیر چائے کی میز پر جا بیٹھا —— "کیوں میاں منہ ہاتھ نہیں دھوؤ گے؟" —— "چائے کی ایک پیالی پی لوں تو پھر ....." وہ جھینپتے ہوئے بولا۔ اس کا باپ پلنگ پر تکیئے سے ٹیک لگائے منہ میں حقے کی نے دابے بیٹھا تھا —— "کیوں اقبال سنا ہے کہ تم نے انہیں رات بہت گھمایا۔ بچاریوں کو تھکا دیا؟" —— "نہیں زیادہ تو نہیں۔ یہی دو تین میل کا چکر ہوگا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا —— "ایسے باپ رے! ان کے لئے تو ایک میل بھی بہت ہے۔ ثریا ٹھیک ہی تو کہتی ہے کہ اس کی ٹانگوں میں کھلیاں پڑ گئی ہیں۔ انہیں چلنے کی عادت تو ہے ہی نہیں" —— "عادت کیسے ہو۔" بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا لیکن اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ "کبھی گھر سے قدم باہر نکالا ہو تو ......" میاں صاحب نے ذرا منہ پھیر لیا۔ اور کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے مراقبے میں چلے گئے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ اسے ثریا نظر نہ آئی: "ثریا کہاں ہے؟" اس نے پوچھا۔ "نہا رہی ہے" —— "ناشتے" کے دوران میں اس نے ثریا سے مذاق میں پوچھا "سنا ہے تم نے میری شکایت کی ہے۔ کہ میں نے کل تمہیں بہت تھکا دیا؟" —— اس نے اپنی گھبرائی ہوئی بڑی بڑی آنکھوں سے اس کی طرف بڑی عاجزی سے دیکھا۔ اور شرماتے ہوئے بولی: "نہیں۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔ میاں صاحب نے اپنے پاس سے لگا دیا ہوگا" —— "کیوں بہت تھک گئی تھیں؟" —— "نہیں تو اتنی زیادہ بھی نہیں" —— آج وہ ناشتے سے پہلے ہی نہا دھو، بن سنور کر آ بیٹھی تھی۔ اس نے سرسری طور پر اس کا جائزہ لیا۔ قلعی کی ہوئی دیوار کا سا سفید، صاف ستھرا، سیدھا سادہ لمبوترا چہرہ۔ جس میں دو خنداروں کی سی دو بڑی بڑی آنکھیں جو گڑیا کی آنکھوں کی طرح ابھار اور گہرائی سے یکسر عاری تھیں۔ چغتائی کی عورتوں کی سی ستواں ناک جو پیشانی کے بالائی حصے سے شروع ہوتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ بے کیف، بے رس ہونٹ جن میں ہلکی ہلکی نیلاہٹ کا پرتو تھا۔ اور بے جان سی گول ٹھوڑی۔ چہرے میں کسی قسم کی کشش یا جاذبیت نہیں تھی۔ مگر لمبے چھریرے جسم میں وہ سب کچھ بدرجہ اتم موجود تھا جس کی بدولت وہ جوان نظر آتی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس کی بڑی بہن کے چہرے میں تھوڑی بہت کشش تھی۔ اس کا ناک چھوٹی بہن کی طرح گھسا ہوا نہیں تھا۔ اس کے ہونٹ اور گال بھرے بھرے تھے۔ اور ان میں تھوڑی بہت سرخی جھلکتی تھی۔ اس کا جسم بھی گداز اور سڈول تھا۔

ناشتے کے بعد میاں صاحب اپنے کام پر چل دیئے —— "آج پانی نہیں دیں گے؟" ثریا شرماتے ہوئے بولی۔ اس کی بہن نے چونکتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔ اقبال کو بھی اس کی اس جرأت اور حیا پر بڑی حیرت ہوئی۔ مگر ساتھ ہی اسے ایک مبہم سا اطمینان اور مسرت کا احساس بھی ہوا۔ اب راہ راست پر آ رہی ہے! اس نے اٹھتے ہوئے سوچا —— "چلو چلیں" وہ بولا —— "میں بھی تمہارا ہاتھ بٹاتی ہوں۔" بڑی بہن بول اٹھی۔ ان تینوں نے ایک ایک بالٹی بھری اور باہر صحن میں لے گئے۔ اور پودوں کو پانی

دینے لگے۔

اس کے بعد دن میں دو بار پودوں کو پانی دینا ان کا روز کا معمول ہو گیا تھا۔ صبح ناشتے کے بعد اور شام کی چائے کے بعد۔ تین چار روز میں ہی خشک پودوں میں جان پڑ گئی۔ پتوں کا رنگ نکھر آیا اور نئی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ نہ صرف خشک پودوں ہی میں زندگی پیدا ہو گئی، بلکہ اس اداس اور ویران مکان کے در و دیوار اور اس کے نیم مردہ، وبے جان مکینوں میں بھی زندگی کی لہر دوڑ گئی تھی جن آنکھوں میں پہلے اداسی اور افسردگی کی دھند چھائی رہتی تھی۔ اور مبہم انتظار کے دیئے جھلملایا کرتے تھے۔ ان میں ایک نئی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ چہروں پہ نکھار تھا۔ شگفتگی تھی۔ ہونٹ ہر وقت مسکرانے کا بہانہ ڈھونڈتے تھے۔ ان عورتوں کی زندگی کے بند جوہڑ کی ساکن سطح پہ ایک ہلچل سی مچ گئی تھی۔

پہلے وہ اپنے آپ ہی میں کھوئی رہتی تھیں۔ اب ان کے خیالات اور ان کی توجہ کا ایک مرکز بن گیا تھا۔ اب وہ اس کی خاطر تواضع اس کے آرام و آسائش اور دلچسپی کے لئے کوشاں رہتیں۔ انہیں ہر وقت یہ خدشہ لگا رہتا تھا کہیں وہ اکتا کر بھاگ نہ جائے۔ تینوں ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اس کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش کرتیں۔ اور اس جدوجہد اور بھاگ دوڑ میں وہ انجانے میں ایک دوسرے سے بھڑ جاتیں۔ ایک دوسرے کی راہ میں حائل ہو جاتیں۔ اندھوں کی طرح ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں۔ ہر ایک یہی سمجھ رہی تھی کہ اس کے دل کا بھید دوسروں سے مخفی ہے۔ اور وہ خود ان کے بھید سے واقف ہے۔ لیکن حقیقت میں سب کے دل کا بھید ایک ہی تھا اور سب ایک دوسرے کے دل میں چھپے ہوئے چور کو جانتے ہوئے بھی انجان بننے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ان کے درمیان رفتہ رفتہ ایک کھنچاوٹ پیدا ہو رہی تھی۔ ایک خاموش مقابلہ تھا۔ ایک دوڑ تھی۔ ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش تھی۔ ان کے دلوں میں رقابت اور جلن کی آگ دھیرے دھیرے سلگنے لگی تھی۔ جو بعض اوقات بھڑک کر شعلہ بن جاتی اور جس کی روشنی دور دور تک نظر آنے لگتی۔ تین مقناطیس ایک لوہے کے ٹکڑے کو اپنی اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن مضحکہ انگیز بات تو یہ تھی۔ کہ وہ لوہے کا ٹکڑا اس رسہ کشی سے بالکل بے خبر تھا اس پر اس کھینچا تانی کا کوئی اثر نہیں تھا۔ اُسے اس خاموش جدوجہد کا احساس ہی نہ تھا۔ جو ان تین عورتوں کے درمیان جاری تھی۔

اور یہ جدوجہد اس کے پہنچنے کے معاً بعد ہی شروع ہو گئی تھی۔ تیسری صبح جب اس نے آنکھ کھولی تو بیگم چائے کی پیالی لئے کھڑی تھی "میں نے سوچا شاید تمہیں بستر میں چائے پینے کی عادت ہو اس لئے پیالی یہیں لے آئی۔ تمہارے ابا تو یہیں پیالی بستر ہی میں پیتے ہیں" ـــــ "آپ نے خواہ مخواہ تکلیف کی۔" اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔ اور شکریہ ادا کرتے ہوئے اس کے ہاتھ سے پیالی لے لی۔ مگر اگلے دن جب ثمینہ چائے بنانے کی غرض سے میز پر پہنچی تو اس نے اپنی چھوٹی بہن کو چائے کی پیالی پکڑے اسے برآمدے کی طرف لیجاتے ہوئے دیکھا۔ اس نے اپنی مایوسی کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپا لیا۔ کوئی بات نہیں۔ اچھا ہے۔ آخر اس میں ہرج ہی کیا ہے۔ اس نے اپنے اندر پھیلتی ہوئی تلخی کو نظر انداز کرتے ہوئے سوچا اچھا ہے۔ خود ہی اس سے میل مل جائے۔ شاید وہ پرانی وضع کی لڑکیوں کو پسند نہ کرے۔ کوئی بُری بات تو ہے نہیں ملنے جلنے کی تھوڑی بہت آزادی ملنی ہی چاہئے۔ اور پھر اپنا آدمی ہے۔ کوئی غیر تھوڑی ہے۔ لیکن تلخی تھی کہ بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ ثریا چائے دیکر واپس آئی۔ اس کے چہرے پہ شگوفے کھل رہے تھے ـــــ "کیوں چائے دے آئی ہو؟" اس نے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ اوڑھتے ہوئے پوچھا۔ لیکن جلد ہی وہ مسکراہٹ کافور ہو گئی ـــــ "ہاں" ثریا نے نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔ بیگم نے اپنی بہن کے کنگھی کئے ہوئے بالوں کو دیکھا اس کے اچھے اُجلے کپڑوں اور نکھرے ہوئے تر و تازہ چہرے کو دیکھا۔ اور اسے اپنے بکھرے ہوئے بالوں اور میلے کپڑوں کا خیال آیا۔ تلخی اور بھی بڑھ گئی۔

زینی میاں صاحب کا حقہ تازہ کر رہی تھی۔ اس نے اپنی مالکن کے چہرے پر جذبات کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا۔ چھوٹی بی بی کے جھکے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی اور اس کی نسوانی حسیت جس نے اسے بہت کچھ بتا دیا۔ جسے وہ جاننا اور سمجھنا نہیں چاہتی تھی۔ مالکن آخر مالکن تھی۔ اور پھر اس کے ہاتھ کھیلی کودی تھی۔ وہ اس کے بارے میں ایسے ویسے نازیبا اور ناگوار خیالات کیونکر اپنے ذہن میں لا سکتی تھی! لیکن اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں۔ اور وہ کب تک اپنی آنکھوں کو جھٹلاتی۔ جہاں تک چھوٹی بی بی کا تعلق تھا۔ اُسے اس میں کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ ابھی کنواری تھی۔ اور آزاد تھی۔ اس کے کسی مرد سے متاثر ہونا یا اس میں دلچسپی کا اظہار کرنا کوئی معیوب بات نہیں تھی۔ کوئی جرم یا گناہ نہیں تھا۔ لیکن مالکن کے لئے!؟ ۔ وہ تو اس کے بیٹے کے برابر تھا۔ عمر کے لحاظ سے نہ سہی کم از کم رشتے اور رتبے کے اعتبار سے تو وہ اس کا بیٹا ہی سمجھا جاتا تھا مگر اس کی مالکن کا رویہ کچھ اور ہی ظاہر کر رہا تھا۔ چھوٹے میاں کی آمد کے بعد اس نے اپنی مالکن میں بڑھتی ہوئی تبدیلی کو محسوس کیا تھا۔ اور دیکھا تھا اس کے ذہن میں بہت برے برے اور بھیانک خیالات پیدا ہو رہے تھے۔ جنہیں وہ اپنانے اور قبول کرنے سے معذور تھی۔ خود اس نے کبھی اپنے اندر ایک نیا پن محسوس کی تھی۔ جب وہ چھوٹے میاں کو ان کے پاس بیٹھا دیکھتی تو اُسے اپنی علیحدگی، تنہائی اور کمتری کا احساس کاٹنے لگتا۔ اس سے پہلے اُسے اس قسم کا احساس اور اتنی شدت کے ساتھ کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ اپنی مالکن اور چھوٹی بی بی کو رشک اور حسد بھری نظروں سے دیکھنے لگی تھی۔ کیونکہ انہیں اس کی صحبت میسر تھی۔ اور وہ اس سے محروم تھی۔ وہ صرف نوکر تھی۔ اور نوکر اور مالک کے درمیان بڑا فاصلہ تھا۔ وہ اُسے برقرار رکھنا پڑتا تھا۔ وہ بس دور ہی دور سے اُسے دیکھا کرتی۔ اور آواز کا زیر و بم اس کی باتوں کا انداز اس کے اٹھنے بیٹھنے کے آداب اور کپڑے پہننے کا سلیقہ۔ یہ سب باتیں اس کے لئے نئی تھیں۔ اس کی ہر بات اور ہر ادا اس کے دل میں گھر کر چکی تھی۔ وہ دور ہی دور سے اُسے پرستش بھری نظروں سے دیکھتے دیکھتے مسحور سی ہو جاتی اور باورچی خانے کے جہنم میں سے نکل کر نہ جانے کس جہان میں پہنچ جاتی۔ وہ جانتی تھی کہ اُسے کیا ہو گیا ہے اور اُسے اس بات میں کوئی عیب یا قباحت نظر نہیں آ رہی تھی۔ وہ تو نوکرانی تھی۔ بھلا اُسے سماجی اور اخلاقی اقدار سے کیا واسطہ! مالک لوگوں کی خود ساختہ اقدار کا یہ وسیع اور پیچیدہ نظام نوکروں پر حاوی نہیں تھا۔ وہ اپنے آپ کو ان پابندیوں اور قیود سے آزاد سمجھتی تھی۔ بعض اوقات اس کی رشک بھری نظروں میں جلن اور رقابت کی چنگاریاں بھی سلگ اٹھتیں۔ جنہیں وہ چھپانے کی کوشش نہ کرتی۔ اس دوڑ میں اس نے اپنا قدم سست نہ ہونے دیا۔ گو مقابلہ مشکل تھا۔ اور شکست قطعی کیونکہ سوال آخر نوکر اور مالک کا تھا۔ لیکن وہ ثابت قدم رہی۔

اگلی صبح جب اس نے چائے تیار کی تو سب سے پہلے ایک پیالی بنا کر چھوٹے میاں کے پاس لے گئی۔ اس نے اُسے آہستہ سے جگایا۔ اور پیالی میز پر رکھ کر واپس آ گئی۔ کچھ دیر کے بعد چھوٹی بی بی اُٹھی۔ اس نے جلدی سے منہ ہاتھ دھویا اور چائے کی پیالی بنا کر مہمان کے پاس لے گئی۔ وہاں پہلے ہی سے خالی پیالی موجود تھی۔ وہ جل کر ہی تو رہ گئی۔ یہ آپا کی حرکت ہے۔ اس نے واپس آتے ہوئے سوچا اور اپنی بڑی بہن کے بستر کی طرف دیکھا۔ بستر خالی پڑا تھا۔ وہ اندر آئینے کے سامنے کھڑی بال بنا رہی تھی۔ "آج تو بہت سویرے اُٹھ گئی ہو؟" اس نے پوچھا ——— نہ جانے اس نے کیوں اس کی بات میں طنز کی تلخی محسوس کی ——— "ہاں آنکھ کھل گئی" اس نے نرمی سے جواب دینے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے دل میں بسی ہوئی تلخی اس کے لب و لہجے میں سرایت کر گئی تھی ——— آپا یہ کیا کر رہی ہے؟ ۔ اس نے برآمدے میں کھڑے ہو کر چائے پیتے ہوئے سوچا۔ آپا کو کیا ہو گیا ہے؟ ——— اس کے دل میں طرح طرح کے ڈراؤنے خیالات پیدا ہو رہے تھے جنہیں وہ دبانا چاہتی تھی۔ کچل دینا چاہتی تھی۔ لیکن وہ مچل رہے تھے۔ اُبھرنے پر بضد تھے۔ اور اس کے دل و دماغ میں زہر سا گھول رہے

تھے۔ ایک بہت واضح سا سوال اس کے سامنے ابھر رہا تھا۔ جس کا جواب بھی بالکل واضح تھا۔ لیکن وہ اس سوال سے آنکھیں ملانے سے گریز کر رہی تھی۔ آپا میری راہ میں کیوں حائل ہو رہی ہے؟ — میں تو آزاد ہوں۔ لیکن آپا . . . . . . آپا کا مقصد کیا ہے؟ وہ چاہتی کیا ہے؟ — وہ یہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ وہ آپا جس کو اس سے اتنا پیار تھا۔ جس نے بچپن میں اسے اتنا لاڈ دیا تھا۔ اس کی مدد کرنے کی بجائے اس کی راہ میں روڑے اٹکا رہی تھی۔ اس قسم کا خیال ذہن میں لانا بھی اس کے لئے گناہ اور حرام تھا۔ تو پھر ؟ — تو پھر ؟ — وہ سوال مصر تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے جان بوجھ کر خواب دیکھنے شروع کئے تھے۔ صرف راتوں کو ہی نہیں بلکہ دن میں بھی خواب دیکھنے لگی تھی۔ جاگتے جاگتے۔ بیٹھے بیٹھے وہ خوابوں کا سنہری جال بننے لگ جاتی۔ سڑکوں پہ کھو جاتی تھی۔ اور ان خوابوں سے چونک کر بیدار ہونا اُسے بہت ناگوار گزرتا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس نے خوابوں کی قدر و قیمت پہچانی تھی۔ وہ ایک ایک خواب موتیوں کی طرح چن چن کر اپنی یادوں کے نہاں خانوں میں محفوظ کرتی جا رہی تھی۔ کیا اس کی بہن اس حسین تانے بانے کو توڑنے پہ تلی ہوئی تھی؟ — نہیں۔ نہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ نہیں وہ اپنے خوابوں کے لئے تو . . . . اوہ خدایا! — نہیں۔ نہیں!! اس نے اندر ہی اندر کانپتے ہوئے انکار کیا۔

بڑی بہن نے بال بنا کر آنکھوں میں کاجل کی لکیر ڈالی اور آئینے میں اپنے آپ کو اچھی طرح سے دیکھتی ہوئی باہر نکل آئی۔ ثریا اس کی طرف پیٹھ کئے برآمدے میں کھڑی تھی — اب تو بڑی سویرے سے اٹھنے لگی ہے۔ بیری تو! اس نے میاں کے لئے چائے بناتے ہوئے سوچا۔ کہ صرف اسی لئے کہ کہیں مجھے چائے دینے کا موقع نہ مل جائے! اس کے ہونٹوں پہ ایک پھیکی سی تلخ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ارے بھئی سمجھا اس سے کیا؟ — میں تو سب کچھ اسی کی خاطر کر رہی ہوں۔ ورنہ مجھے اس سے کیا دلچسپی!؟ — بیچاری خواہ مخواہ مجھ پہ شک کرتی ہے۔ وہ چائے لے کر اپنے میاں کے پاس پہنچی — "ابھی اقبال اٹھا ہے۔ یا نہیں؟" انہوں نے چائے پیتے ہوئے پوچھا — — پتہ نہیں۔ ثریا ذرا دیکھنا تو اقبال ابھی تک سو رہا ہے۔ یا جاگ اٹھا ہے؟ اس نے طنز بھری مسکراہٹ سے کہا۔ ثریا نے بہن پر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی جس میں غصہ بھی تھا۔ اور التجا بھی۔ وہ چلی گئی۔ وہ جاگ اٹھا تھا۔ اور نہانے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ وہ کچھ دیر ادھر اُدھر کمروں میں بے مقصد گھومتی رہی۔ جب وہ غسلخانے میں چلا گیا۔ تو اس نے اس کا بستر لپیٹ، چارپائی اٹھائی۔ اور کمرے میں سے گئی۔ اس کا بستر دوبارہ لگایا اور کمرے میں بکھری ہوئی چیزوں کو سنبھال کر قرینے سے رکھا۔ اتنے میں بیگم آگئی۔ وہ کام کرتے کرتے مجرموں کی طرح یوں رک گئی۔ جیسے کوئی بہت برا کام کر رہی ہو — "ارے تم رہنے دیتیں۔ زینی سے کہہ دیا ہوتا۔ وہ جھاڑ پونچھ کر دیتی!" اسے بڑی بہن کا ایک ایک لفظ سوئی کی طرح چبھتا ہوا محسوس ہوا۔ اور وہ کوئی جواب دیئے بغیر باہر آگئی۔

وہ اب روزانہ رات کو گھومنے باہر جایا کرتے تھے۔ اقبال کو جلد ہی اس بات کا احساس ہو گیا تھا۔ کہ بیگم کے رویئے میں کسی قسم کا تصنع یا دکھاوا نہیں تھا۔ اس کی دلچسپی اور ہمدردی میں خلوص تھا۔ سچائی تھی۔ وہ اُسے اجنبی نہیں سمجھتی تھی۔ اور اس کے سلوک میں سوتیلے پن کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ اُسے اپنا سمجھتی تھی۔ اپنے عزیزوں سے بڑھ کر۔ اور اگر وہ واقعی اس کے قریب آنے کی آرزومند تھی۔ تو اُسے اس پر کیا اعتراض یا ہچکچاہٹ ہو سکتی تھی؟ وہ خوش تھا۔ آخر وہ اس کے باپ کی بیوی تھی۔ اور اُسے ماں کی سی ممتا حاصل تھا۔ اس کی قدر و عزت اس پر لازم تھی۔ وہ اس کے پیار اور محبت کی قطعاً حقدار نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ اس سے کسی قسم کی ہمدردی اور شفقت کی توقع کر سکتا تھا۔ لیکن اگر اس کے باوجود بھی وہ اپنی خوشی اور آرزو سے بن مانگے بن کہے اپنا بے لوث پیار اور شفقت اسے دینے پر مائل تھی۔ تو وہ بھی خلوص سے اس محبت اور شفقت کا جواب دے کر اپنی وسعت قلبی کا ثبوت دینا چاہتا تھا۔ اسی لئے جب بیگم نے ایک قدم اس کی طرف بڑھایا تو وہ دو

قدم اس کی طرف بڑھا اور بہت جلد ان کے درمیان جو اجنبیت کے پردے حائل تھے۔ اٹھ گئے۔ وہ رفتہ رفتہ اپنے آپ کو اپنے گھر میں اپنے لوگوں کے درمیان محسوس کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی طرح سے پھر وہی فضا قائم ہو جائے۔ وہی ماحول پیدا ہو جائے۔ پھر سے وہ کھلان زندگی کے بھرپور قہقہوں سے گونج اٹھے۔ پرانی گہماگہمی اور رونق لوٹ آئے۔ انہیں اس ماحول سے آشنا کرانے کے لئے وہ انہیں بچپن کے قصے، بہن بھائیوں کے لڑائی جھگڑے، ماں کی باتیں اور پڑوسیوں کے واقعات سناتا۔ اور اس کی باتیں سن کر، اس ماحول کا تصور کر کے انہیں اپنی زندگی کی ویرانی اور بے مائیگی کا اور بھی شدت سے احساس ہونے لگتا۔ اور وہ اپنی تنہائی کے خوف سے اس کے وجود سے جو وقتی طور پر ان کی زندگی کے خلا کو پُر کر رہا تھا۔ اور بھی شدت سے چمٹ جاتیں۔ اور بھی قریب ہو جاتیں۔ اور وہ انہیں دوبارہ سپنا دے کر گیا۔ بڑی بہن تو پہلے بھی ایک بار سپنا دیکھ چکی تھی۔ لیکن چھوٹی بہن کے لئے یہ بالکل انوکھا تجربہ تھا۔ جس کے بعد وہ اور بھی حسین خواب دیکھنے لگی۔ دونوں بار زینی گھر پر تنہا اپنی بے بسی اور بیچارگی پر آنسو بہاتی رہی اور اندر ہی اندر دونوں بہنوں سے جلتی رہی۔ جو اس وقت بڑے مزے سے اس کے پیکوں میں بیٹھیں سپنا دیکھ رہی تھیں۔

زینی نے اگلے روز صبح چائے کی پیالی بنا کر چھوٹے میاں کے سرہانے رکھدی۔ ثریا کی جب آنکھ کھلی تو اس کی نظر فوراً بڑی بہن کے بستر کی طرف گئی۔ صحن کے دوسرے سرے پر وہ مزے سے چادر تانے سو رہی تھی۔ وہ جلدی سے اٹھی منہ ہاتھ دھویا کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چائے کی پیالی بنائی اور لے کر پیلو والے برآمدے میں پہنچی۔ اقبال تکئے سے ٹیک لگائے چائے پی رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پیالی گرتے گرتے بچی وہ چپکے سے لوٹ آئی۔ اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی تھی۔ ہوں۔ ہو نہ ہو یہ اس کی حرکت ہے! اس نے دانت پیستے ہوئے سوچا۔ کمبخت زینی کی کارستانی ہوگی! چڑیل کہیں کی!۔ وہ باورچی خانے کی طرف گئی۔ وہ اس سے کیا کہیگی؟ کیسے کہے گی؟ اس نے جاتے ہوئے سوچا۔۔۔۔ زینی گھٹنوں پہ ٹھوڑی رکھے آگ میں گھور رہی تھی۔۔۔۔۔ "چھوٹے میاں کو چائے تو نے بنا کر دی ہے۔؟" اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔۔۔۔ "ہاں۔" اس کی آنکھوں میں ملکا رہتی۔ مدافعت تھی۔۔۔ "جبھی تو!" ثریا منہ بناتے ہوئے حقارت سے بولی: "ایسی گندی چائے بنا کر دی ہے!"۔۔۔۔ "گندی چائے؟" زینی نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے حیرت سے پوچھا۔۔۔ "ہاں اور کیا۔ جبھی تو انہوں نے وہ چائے پی نہیں۔ میں نے دوسری پیالی بنا کر دی ہے۔ تجھے کیا معلوم کہ وہ کیسی چائے پیتے ہیں! آئندہ تو چائے مت بنا کر جانا۔ سنا! میں خود دیا کروں گی!" اس کے لہجے میں دھمکی بھی تھی۔ اور حکم بھی۔۔۔ زینی نے اپنی الجھن بھری کھوئی ہوئی نظریں جھکا لیں۔ "آخر میں نوکر ہوں ٹھہری!" اس نے اپنے ہونٹ کاٹتے ہوئے سوچا۔ اور چھلکتی ہوئی آنکھوں کو ہاتھوں میں چھپا لیا۔

لیکن اس کے قدم نہ ڈگمگائے۔ اسی دن کچھ دیر کے بعد جب وہ میاں صاحب اور دونوں بہنوں کے بستر اندر لگا چکی۔ تو اس نے جلدی سے اقبال کا بستر بھی اٹھا کر اندر لگا دیا۔ وہ کمرے کی دوسری چیزوں کو ترتیب دے رہی تھی۔ کہ چھوٹی بی بی آدھمکی۔ "اری تو یہاں کیا کر رہی ہے!" اس نے جلے بھنے لہجے میں پوچھا: "اُدھر ناشتے کو دیر ہو رہی ہے۔ اور تو یہاں اپنی صفائیوں میں لگی ہوئی ہے۔ چل بھاگ یہاں سے اگر ان کی کوئی چیز ادھر ادھر ہو گئی تو! اگر تو نے آئندہ اس کمرے میں پاؤں رکھا۔ تو تیری ٹانگیں توڑ دوں گی!" زینی سہمی ہوئی چپ چاپ باہر نکل گئی۔ لیکن اس کے اندر ایک آگ سلگ اٹھی تھی۔ اُسے پہلی بار اپنی توہین کا احساس ہوا تھا۔ اور اس کے دل میں انتقام لینے کا جذبہ بیدار ہو رہا تھا۔ اس کے جانے کے بعد ثریا نے کمرے پر ایک نظر ڈالی۔ اُسے اور تو کچھ نہ سوجھا بستر کی چادر کہ جو ابھی تین چار دن ہوئے بچھائی تھی۔ سمیٹ کر اندر لے گئی۔ اور صندوق میں سے سفید دھلی ہوئی چادر نکال کر اس کی جگہ بچھا دی اور باہر آ کر خاموش بیٹھ گئی۔ اس کی بہن نے اُسے

چادر سے جاتے ہوئے دیکھا تھا اور وہ اُس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھ دیکھ کر جی ہی جی میں ہنس رہی تھی ——— "بچو!" میاں صاحب اندر کمرے میں سے چلائے: "ذرا گرم پانی تو لانا!" ——— وہ حجامت بنانے لگے تھے۔ حالانکہ انہیں روز گرم پانی کی ضرورت پڑتی تھی لیکن وہ روز بھول جاتی تھی۔ اور میاں صاحب کو روز پانی مانگنا پڑتا تھا۔ وہ پیالی میں پانی لے کر اندر گئی۔ میاں صاحب حجامت بنانے لگے تھے۔ اُسے کچھ خیال آیا۔ اس نے اپنا صندوق کھولا اور اس میں سے نیلے رنگ کی سلک کی چادر۔ تکیے کے غلاف اور میز پوش نکالے۔ وہ سیٹ اُسے جہیز میں ملا تھا۔ نیلے رنگ کی سلک کی چادر اور اس کے ساتھ غلاف اور میز پوش۔ اور یہ سیٹ ابھی تک استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ وہ ان چیزوں کو اٹھا کر اندر ہی اندر کمروں میں سے آخری کمرے میں لے گئی۔ اس نے بستر پر بچھی ہوئی سفید چادر کو اٹھا کر اس کی جگہ نئی چادر بچھائی۔ اور تکیوں کے غلاف اور میز پوش تبدیل کئے۔ اتنے میں اقبال بھی نہا کر آگیا۔ اس نے اپنے کمرے کا رنگ ہی بدلا ہوا پایا: "خوب ٹھاٹھ ہیں!" اس نے مسکراتے ہوئے کہا: "بھئی یہ سیٹ تو بہت خوبصورت ہے!" وہ سلک کی چادر کو ہاتھ میں لے کر دیکھتے ہوئے بولا ——— "نہیں چاہیئے؟" ——— "نہیں نہیں میں تو صرف اس کی تعریف کر رہا تھا!" ——— "کوئی بات نہیں چلو تم اُسے میری طرف سے تحفہ سمجھو۔ بالکل نیا ہے۔ پہلی بار باہر نکالا ہے!" ——— "نہیں نہیں۔ آپ تو زیادتی کر رہی ہیں۔ میں کوئی اجنبی تھوڑا ہوں۔ کہ آپ مجھے . . . . !" ——— "تو کیا اجنبیوں کو تحفے دیئے جاتے ہیں!" بیگم نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "تحفے تو اپنوں ہی کو دیئے جاتے ہیں!" اور وہ ممنونیت کے گراں بار بوجھ تلے دب کر رہ گیا: "بہت بہت شکریہ . . . . . " اس کے جی میں آئی کہ اُسے "آپی" کہے۔ لیکن یہ لفظ اُسے بہت نامناسب اور مضحکہ خیز معلوم ہوا۔ اور ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا۔ کہ کہیں وہ اُسے مذاق سمجھ کر برا نہ مان جائے۔ وہ چلی گئی۔ کچھ دیر کے بعد ثریا اُسے ناشتے کے لئے بلانے آئی (اُسے بیگم نے خاص طور پر بھیجا تھا!) اس نے بستر کی نئی چادر، نئے غلاف اور میز پوش کو دیکھا اور جل کر راکھ ہو گئی۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے ——— "دیکھو ثریا تمہاری آپا نے مجھے تحفہ دیا ہے!" اقبال نے معصومیت سے اُسے بتایا۔ اس کی بات نے آگ پر تیل کے چھینٹوں کا کام کیا۔ اس کے رگ و پے میں ایک پگھلتی ہوئی تلخی سرایت کر گئی۔ اور وہ دانت کچکچاتی ہوئی واپس آ گئی۔ اس کا جی چاہا تھا کہ اس کمرے کو اس گھر کو آگ لگا دے۔ اور کمینوں کو اس آگ میں جل بھن کر کباب ہوتے ہوئے دیکھتی رہے۔ اس نے اپنی بہن پر ایک قہر آلود نظر ڈالی اور منہ چڑھا کر بیٹھ گئی۔

دوسرے دن شدید گرمی پڑی۔ صبح ہی سے لو چلنے لگ گئی۔ اور دوپہر تک تو یہ عالم ہو گیا۔ کہ جیسے کسی بھٹی کا منہ کھل گیا ہو۔ اور ہوا اس جہنم ہی سے گزر کر آ رہی ہو۔ بند کمرے میں برف کی سلوں پر سے گزرتی ہوئی پنکھے کی ہوا بھی کچھ کم گرم نہیں تھی۔ باہر جسم کو جھلس دینے والی لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ اس دن میاں صاحب بھی جلد ہی کچہری سے لوٹ آئے تھے۔ وہ سب دن بھر کمرے میں بند رہے۔ جب دن ڈھلا تو ہوا بالکل بند ہو گئی۔ اس قدر حبس کہ سانس لینا بھی دشوار ہو گیا۔ لوگ بے بسی سے کبھی تو دھندلے دھندلے گدلے گدلے آسمان کی طرف دیکھتے تو کبھی ساکت و بے بس درختوں کی جھکی ہوئی بے جان شاخوں کی طرف۔ شام کے قریب مغرب میں گرد و غبار کا ایک ستون سا بلند ہوا۔ وہ ستون دیکھتے ہی دیکھتے آندھی بن گیا۔ اور اس قدر زور کی سیاہ آندھی آئی۔ کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ پیڑ جڑوں سے اکھڑ گئے۔ بجلی کے کھمبے گر گئے۔ تار ٹوٹ گئے۔ اور مکانوں کی چھتیں اڑ گئیں۔ آندھی کے دوران میں جب بجلی بند ہو گئی۔ تو انہیں لالٹین جلانے کا خیال آیا۔ لیکن اس اندھیرے میں لالٹین ڈھونڈنا بھی کار دارد تھا۔ لالٹین کہیں کسی کمرے میں پڑی تھی۔ اندھیرے میں کوئی اس سے ٹکرا گیا: "دیکھ کر بھئی!" اس نے کسی کو سنبھالتے ہوئے کہا ——— "اس اندھیرے میں تو کچھ سجھائی ہی نہیں دیتا!" بیگم نے اس کے بازو کا سہارا

لیتے ہوئے کہا اور تاریکی میں کھو گئی ——— کچھ وقفے کے بعد کوئی اس سے آکر چمٹ گیا "کون ہے بھئی؟" اس نے ہنستے ہوئے پوچھا دوسا ہاتھ اس کے چہرے کو ٹٹول رہے تھے۔ اس نے اقبال کی انگلی میں کاٹ لیا۔ اور ثریا "اوئی" کہہ کر دور ہٹ گئی۔ بیگم بڑی مشکل سے لالٹین ڈھونڈ رہی تھیں۔ زینی باورچی خانے میں ماچس کے لئے ٹامک ٹوئیے مار رہی تھی ——— "یہ رہی ماچس" وہ ماچس لے کر آئی ——— "کہاں؟" اس نے اندھیرے میں ہاتھ پھیلاتے ہوئے پوچھا "یہ لیجئے" زینی نے اس کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔ اور ماچس اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ اس نے بتی جلائی۔ کچھ دیر کے بعد جب آسمان صاف ہوا تو موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ وہ سب برآمدے میں بیٹھے بارش کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ زینی صحن میں کھڑی نہا رہی تھی۔ "آئیے بی بی جی آپ بھی نہا لیجئے" اس نے پرنالے کے نیچے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں عورتیں ہچکچائیں ——— "جاؤ بھئی جاؤ نہاؤ" میاں صاحب بولے "بدن کی گرمی نکل جائے گی" ——— "چلو تم بھی" بیگم نے ہنستے ہوئے اقبال سے کہا ——— چھینٹے۔ اور وہ تینوں بارش میں ٹہلنے لگے۔ ثریا کی نظر دو پودوں پر جا پڑی۔ ایک میں گلاب کے دو پھول کھلنے والے تھے۔ اور دوسرے میں موتیے کی کلیاں۔ وہ خاموش رہی۔ اور جب باقی لوگ ان پودوں کے قریب پہنچے تو وہ بڑے معصومانہ انداز میں پودوں کے سامنے اس طرح سے کھڑی ہو گئی کہ وہ اس کے پیچھے چھپ گئے۔

اگلی صبح موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہر چیز دھلی دھلائی نکھری نکھری، ترو تازہ نظر آ رہی تھی۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ اور آسمان پر اودے اودے بادلوں کے سست قافلے آوارگی کر رہے تھے۔ ثریا سب سے پہلے اٹھی۔ اور ہاتھ منہ دھوئے بغیر اس نے کیاریوں کا رخ کیا۔ جب وہ ان پودوں کے پاس پہنچی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہاں نہ تو گلاب کے پھول تھے۔ نہ موتیے کی کلیاں! وہ سر سے پاؤں تک سراپا آگ بن گئی اس کی آنکھوں میں کوندے سے لپکنے لگے۔ اس کے نتھنے پھڑپھڑا رہے تھے۔ ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ وہ سیدھی اپنی بہن کے کمرے کی طرف گئی۔ آج وہ ہاتھا پائی ہونے پر بھی تیار تھی۔ اس نے بہن کے کمرے میں جھانکا۔ میاں بیوی مزے سے سو رہے تھے اس کا پارہ دفعتاً کئی ڈگری چڑھ گیا۔ اچھا تو پھر یہ اس چڑیل کا کام ہو گا۔ حرامزادی کہیں کی! ——— وہ باورچی خانے کی طرف جانے سے پہلے دبے پاؤں اقبال کے کمرے کی طرف گئی۔ وہ سو رہا تھا۔ اس کے سرہانے میز پر چائے کی پیالی کے ساتھ دو گلاب کے پھول اور چند موتیے کی کلیاں پڑی تھیں۔ وہ دانت کچکچاتی، ہونٹ کاٹتی، مٹھیاں بھینچتی واپس آئی۔ آج تو اس بدبخت کو کچا ہی چبا جاؤں گی۔ وہ سیدھی باورچی خانے میں پہنچی "زینی وہاں سے پھول کس نے توڑے ہیں؟" ——— "میں نے۔ کیوں؟" ——— "کیوں کی بچی!" اس نے تڑاخ سے ایک طمانچہ اس کے گال پر رسید کیا "آگے سے بحث کرتی ہے۔ چڑیل!" ——— زینی گال سہلاتے ہوئے سہمی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔

"بی بی میں نے پھول توڑ لیا تو کونسا گناہ کیا؟" ——— "زبان بند کر حرامزادی! چھنال کہیں کی۔ بڑی آئی پھول توڑنے والی۔ ذرا صورت تو دیکھ آئینے میں۔ بھتنی کی بچی!" ——— "بی بی جی میں۔ میں نے . . . . ." ——— "بکواس بند کر" اس نے ایک اور طمانچہ رسید کرتے ہوئے کہا "ورنہ چٹیا سے پکڑ کر باہر پھینک دوں گی ——— اور میں نے تجھے منع کیا تھا کہ تو آئندہ چائے لے کر مت جانا۔ وہاں تو پھر . . . ؟" اور اس نے اسے پاؤں سے ٹھوکر لگائی۔ زینی گھٹنوں میں سر دیئے کر سسکیاں بھرنے لگی ——— "اب گئی ہے۔ ٹسوے بہانے مکار!" اس نے حقارت سے کہا ——— "کیا ہوا ثریا!" بیگم تو تو میں میں کی آواز سن کر جلدی سے آئیں ——— "کچھ نہیں جی" اس نے ملک امیز بے رخی سے کہا "جانے کمبخت کو کیا ہو گیا ہے۔ آگے سے جواب دیتی ہے" اور وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکل گئی۔ بیگم نے اپنی بہن کے بگڑتے ہوئے تیور دیکھ کر خاموش رہنا زیادہ مناسب سمجھا۔ وہ مہمان کی موجودگی میں گھر میں کسی قسم کا جھگڑا فساد نہیں چاہتی تھی بیگم

اسے اس بات کا احساس ضرور تھا۔ کہ کئی دن سے ثریا کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔ وہ کسی سے سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی تھی۔ خواہ مخواہ جھنجھلائے پھر رہی ہے۔ اس واپس جاتے ہوئے سوچا نہ جانے اتنی تنک مزاج کیوں ہو گئی ہے؟

بڑی پیاری رات تھی۔ نکھری نکھری، خنک، نم آلود چاندنی میں ایک لطیف سی مہک تھی۔ اقبال برآمدے میں کاغذ قلم لئے بیٹھا تھا۔ اس نے القاب و آداب کے بغیر لکھنا شروع کیا۔

"میں نے چلتے وقت تم سے وعدہ کیا تھا۔ کہ یہاں پہنچتے ہی تمہیں خط لکھوں گا۔ سو وعدہ پورا کر رہا ہوں۔ گو یہ دس دن کی دیر کے بعد!

اب کہ یہ اپنے گھر میں نئے لوگوں کا بسیرا ہے اور خواہ میرے ابا بھی گذشتہ دو سالوں میں بہت بدل گئے ہیں۔ میرے خیال میں یہ شادی شاید ان کو راس نہیں آئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے۔ جیسے وہ کچھ کھو بیٹھے ہوں بڑھاپے کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ لیکن میرے ساتھ ان کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا۔ بلکہ وہ تو میری قربت کے اور بھی بھوکے ہو رہے ہیں۔

اپنی "نئی ماں" سے مجھے شرف ملاقات حاصل ہوا باقاعدہ تعارف کرایا گیا تھا مجھ سے کوئی تین چار سال بڑی ہو گی۔ عام شکل و صورت کی۔ نیم گنوار اور جاہل مطلق!۔ کوئی مذاق نہیں کوئی شائستگی نہیں۔ محض عورت ہے! (معاف کرنا تمہاری صنف پہ چوٹ ہرگز مقصود نہیں) سمجھ میں نہیں آتا کہ ابا جان کو اس میں کیا خوبی نظر آئی ——— میں ایک عجیب کشمکش و پیچ میں مبتلا ہوں۔ اسے کیا کہہ کر پکاروں؟ ——— ماں کہنے سے تو رہا۔ آپا نہیں ——— لاحول ولا قوۃ! ——— پھر کیا کہوں؟ ——— خالہ جان؟ میرے خیال میں تو کوئی حرج نہیں۔ لیکن مجھ سے نہیں کہا جاتا

اس کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے یہاں۔ میری "خالہ" سمجھو۔ ثریا نام ہے۔ جہالت اور گنوار پن میں بڑی بہن سے بھی دو قدم آگے۔ حسین اور جاذب نظر اتنی کہ جیتی جاگتی کوئی دلربا۔ شروع شروع میں یوں گھبراتی تھی۔ مجھ سے جیسے کہا ہی تو جاؤں گا اسے۔ اب اُسے کچھ یقین ہو گیا ہے۔ کہ میں انسان ہوں کوئی جن بھوت نہیں ہوں ——— لیکن گھر کے مالکوں سے بہتر ان کی ملازمہ ہے۔ جو دن بھر اس بلا کی گرمی میں چولہا جھونکتی رہتی ہے۔ اور ایک بے بس و بے زبان جانور کی طرح چپ چاپ کام کئے جا رہی ہے۔ مجھے ان لوگوں کی بے حسی اور ظلم پر بڑا غصہ آتا ہے مگر کچھ کہنے کا حق نہیں رکھتا۔ سوچتا ہوں کہ جب ہماری شادی ہو جائے تو اُسے یہاں سے اغوا کر کے اپنے پاس لے جاؤں۔ کیوں کیا خیال ہے تمہارا؟!

میں نے ابھی ابا جان سے اپنے اور تمہارے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ موقع کے انتظار میں ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ انہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بلکہ ان کے لئے تو انتہائی خوشی کا مقام ہوگا۔ کیونکہ وہ بہت عرصے سے بہو دیکھنے کی تمنا رکھتے ہیں۔ (اور امی بھی یہ تمنا دل میں لئے چل بسیں بیچاری!)

گو یہاں میری توقعات کے خلاف میری بڑی خاطر تواضع ہو رہی ہے۔ لیکن بہت جلد لوٹ جانے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ دو تین دن اور گزار لوں تو چلا آؤں گا۔ صرف ابا جان کی وجہ سے رکا ہوا ہوں۔ ورنہ یہاں وہ پہلی سی بات کہاں! مجھے تو اب کبھی کبھی اس گھر سے وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ کچھ ویرانی سی ویرانی ہے۔ گھر کو دیکھ کر دشت یاد آ جاتا ہے۔

اور کیا لکھوں؟! تم بہت یاد آ رہی ہو اس وقت۔ یہ حسین چاندنی اور تنہائی۔ تم ہو کس حال میں خدا جانے ———" وہ خط بند کر رہا تھا کہ ثریا آ گئی ——— "اس وقت کیا لکھ رہے ہیں آپ؟" ——— "ذرا خط لکھ رہا تھا" ——— "کسے؟" ——— "ایک دوست کو" ——— وہ کھڑی رہی۔ وہ خط بند کر رہا تھا۔

"ثریا" اندر سے بیگم کی آواز آئی "آئی آپا" اس نے جھنجلاہٹ سے کہا۔ اور وہیں کھڑی رہی۔ چند منٹ کے بعد بڑی بہن بھی وہیں آن دھمکی "کیا کر رہی ہو یہاں؟" "کچھ نہیں" اس نے ترش روئی سے جواب دیا —— "آج آپ ابھی تک جاگ رہی ہیں؟" اقبال نے پوچھا "ہاں۔ آج تو رات اتنی پیاری ہے کہ سونے کو جی نہیں چاہتا"۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ثریا نے اس کی طرف قہر بھری نظروں سے دیکھا۔ جیسے اس نے اس کے منہ کی بات چھین لی ہو —— "تو چلیئے ذرا گھوم آئیں؟" —— "چلو لیکن کیچڑ ہوگی" —— "نہیں اب تک پانی خشک ہو گیا ہوگا۔ ٹارچ لے چلیں گے ساتھ" —— اور وہ زینی کو ساتھ لے کر باہر نکل گئے۔

میاں صاحب نے انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ باہر چاندنی میں آنکھیں موندے اپنے بستر پہ لیٹے دن کی آخری چلم ختم کر رہے تھے۔ گھر پہ مکمل خاموشی طاری تھی۔ گل شبو کی بھینی بھینی خوشبو میں بسے ہوئے ہوا کے جھونکوں سے قریب ہی پیپل کے پتے تالیاں بجانے لگ جاتے۔ اور دوسرے درخت سرگوشیوں میں مصروف ہو جاتے۔ میاں صاحب کے ذہن میں پرانی یادوں کا ایک سیلاب امنڈ پڑا اور اپنی موجودہ تنہائی اور سنجیدگی کے احساس سے ان کی آنکھیں پرنم ہو گئیں۔ صحن کی چار دیواری کے باہر مینڈکوں نے اپنا کورس شروع کیا۔ وہ لوگ اس وقت مزے سے ہنستے بولتے چلے جا رہے ہوں گے۔ میاں صاحب نے چاندنی میں پیپل کے جھلملاتے ہوئے پتوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا انہیں میرا خیال ہی نہیں آتا ہوگا۔ وہ سب جوان ہیں، ہم عمر ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے درمیان آہنگ اور ربط پیدا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں؟ —— میرا ان سے کیا تعلق؟ —— وہ میری تنہائی کو کیا جانیں۔ میری ضروریات کو کیا سمجھیں۔ میں تو بوڑھا ہوں۔ جوانی کے حلقے سے خارج ان کی دنیا سے باہر۔ میں ان کے درمیان اتنی ہی مضحکہ انگیز ہوں گی جتنی کہ بھیڑوں کے گلے میں اونٹ کی! —— ایک طرف تو وہ اس بات سے خوش تھے۔ کہ ان کا بیٹا ان نوجوان لوگوں سے گھل مل گیا تھا۔ کیونکہ شروع شروع میں انہیں یہ خدشہ تھا۔ کہ کہیں وہ اس اجنبی ماحول سے اکتا کر جلد بھاگ نہ جائے۔ لیکن اب انہیں ایک اور خدشہ ہونے لگا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں ان کی بیوی ان کے بیٹے کو ان سے چھین نہ لے۔ یہ نہیں کہ وہ ان کے معلوم تعلقات کو کسی قسم کے شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ بلکہ وہ تو صرف اس بات سے ڈر رہے تھے۔ کہ کہیں ان کا بیٹا انہیں بھول نہ جائے۔ اپنی نئی ماں کی طرف جھک کر انہیں نظر انداز نہ کر دے۔ کیونکہ وہ خود کو بیٹے کی محبت و الفت کا واحد حقدار سمجھتے تھے۔ جس میں وہ کسی رقیب یا شریک کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس اعتبار سے وہ اپنی بیوی کو رقیب کی نظروں سے دیکھنے لگے تھے —— میں تو اس کا باپ ہوں۔ میں اس سے پیار اور فرمانبرداری کا مطالبہ کر سکتا ہوں۔ لیکن وہ اس کی کیا لگتی ہے؟ کچھ نہیں! —— نہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ وہ میرا بچہ ہے۔ میرے ہی جسم و خون کا ٹکڑا —— وہ اتنا ناخلف نہیں ہے —— اور یونہی سوچتے سوچتے ہوا کی خنک تھپکیوں کے اثر سے نہ جانے وہ کب سو گئے۔

اگلی صبح اقبال کی تجویز پر وہ نہر کے کنارے پکنک پہ جانے کے لئے تیاریوں میں مصروف تھے کہ دفعتاً ساتھ والے گھر میں واویلا مچ گیا۔ عورتوں بچوں کے رونے چلانے کی آواز آنے لگی وہ سب وحشت زدہ نظروں سے ماتم کی آواز کو سننے لگے۔ میاں صاحب نے زینی کو پتہ کرنے کے لئے بھیجا۔ اس نے آکر بتایا کہ ساتھ والے گھر میں ایک بڑھیا چل بسی تھی۔ میاں صاحب کو بہت رنج ہوا۔ کیونکہ وہ بڑھیا ہمیشہ ان کے گھر میں آیا جایا کرتی تھی۔ اور ان کی مرحومہ بیوی نے تو اسے اپنی ماں بنایا ہوا تھا۔ "تم دونوں جا کر افسوس کر آؤ" میاں صاحب نے اپنی بیوی اور اس کی بہن سے مخاطب ہو کر کہا۔ وہ دونوں ہچکچائیں۔ وہ اپنی پکنک کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ میاں صاحب ان کی ہچکچاہٹ کو بھانپ گئے۔ "پڑوس کی بات ہے۔ ہمسائیگی کا حق ضرور ادا کرنا چاہیئے" انہوں نے قدرے دباؤ اور اصرار سے کہا —— دونوں بہنوں کے منہ لٹک گئے۔ اس بڑھیا

کمبخت کو بھی آج ہی مرنا تھا! ان دونوں نے سوچا۔ ان کی پکنک دھری کی دھری رہ گئی۔

۔۔۔۔۔ دونوں بہنیں ادھر ساتھ والے گھر میں چلی گئیں۔ اقبال وقت کاٹنے کی غرض سے ایک کتاب لے کر بیٹھ گیا۔ زینی باورچی خانے میں اپنے کام کاج میں لگ گئی گھنٹہ ڈیڑھ کے بعد زینی اس طرف آئی۔ اس نے نہا دھو کر اُجلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ تیل لگے ہوئے بالوں میں مانگ تھی۔ آنکھوں میں کاجل کی سیاہ چمک تھی۔ سانولے چہرے پر ایک نمکین ملاحت تھی۔ "بابی جی تو بہت دیر سے آئیں گی۔" وہ بولی ——— "کیوں؟" اقبال نے کتاب سے نظریں اٹھائے بغیر پوچھا ——— "جب تک میت گھر سے نہیں نکلے گی انہیں چھٹی نہیں ملیگی۔" ——— اقبال نے آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ اُسے اسوقت اس کے چہرے میں بڑی کشش اور جاذبیت نظر آئی ——— "اچھا؟" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور نظریں جھکا لیں ——— "چھوٹے میاں آپ کو بھوک تو نہیں لگ رہی؟" ——— "بھوک؟ ابھی سے؟" ——— "میں نے یونہی پوچھ لیا۔ ڈبل روٹی پڑی ہے۔ سوچا تھا، سوکھ کر ضائع ہو جائے گی۔" اقبال کو خیالی بھوک کا احساس ہوا۔ "مکھن بھی ہے؟" ——— "جی" ——— "اور شہد؟" ——— "جی" ——— "تو جاؤ مجھے تین چار ٹوسٹ بنا کر لا دو" ——— وہ چلی گئی اور کچھ دیر کے بعد پلیٹ میں پانچ چھ ٹوسٹ لے کر آئی۔ اس نے پلیٹ میز پر رکھ دی۔ اور خود فرش پر بیٹھ گئی ——— "بہت مزیدار ہے" اقبال نے ٹوسٹ میں دانت گاڑتے ہوئے کہا۔ "تو تم بھی کھاؤ" ——— "نہیں چھوٹے میاں" وہ گھبرا کر بول اُٹھی ——— "ارے کوئی بات نہیں۔ اس وقت دیکھنے والا کون ہے؟" ——— زینی نے جھجکتے ہوئے ٹوسٹ اٹھا لیا۔ اور اُسے غور سے دیکھنے لگی ——— "چھوٹے میاں آپ کو اُس دن میری بنائی ہوئی چائے پسند نہیں آئی تھی؟" ——— "کس دن؟" ——— "اُسی دن جب آپ نے میری بنائی ہوئی پیالی واپس کر دی تھی" ——— "کب؟" ——— "میں نے تو کوئی پیالی واپس نہیں کی۔ تم سے کس نے کہا؟" ——— "وہ کسی نے نہیں۔ یونہی میں نے سوچا کہ . . . ." اس نے گھبرا کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔ وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ٹوسٹ کو گھورنے لگی۔ اقبال نے اس کی طرف دیکھا: "کھاتی کیوں نہیں اسے؟" وہ مسکرا دی۔ اور اسے کھانے لگی۔ اقبال نے اس کے سفید سیپی جیسے دانتوں کو دیکھا تو حیران رہ گیا۔ "تمہارے دانت بڑے خوبصورت ہیں" ——— وہ شرما گئی۔ اور اس کے سانولے چہرے میں سرخی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ اس کے جھکے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا ——— "تم بیوہ ہو؟" ——— "ہوں!" اس نے سر ہلایا ——— "کتنے سال سے؟" ——— "پانچ سال" ——— اقبال کا دل رحم اور ہمدردی کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ کہاں کا جینا اور کیسی جوانی! بیچاری! ——— اس کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ اس کے لئے کچھ کرے۔ مگر کیا اور کیسے؟ ——— "میری طرف دیکھو" اس نے اس کی ٹھوڑی کو اپنی انگلی سے اونچا کرتے ہوئے کہا۔ اس کی انگلی کے لمس سے اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے اپنی سیاہ اور اداس آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔ آنکھوں کی اتھاہ گہرائیوں میں حیرت اور پرستش کے دیئے کانپ رہے تھے۔ اس نے اپنی انگلی سے اس کے سیاہی مائل پتلے پتلے ہونٹوں کو چھوا۔ اس کی انگلی اس کے پچکے ہوئے گال کی تنی ہوئی جلد پر سے ہوتی ہوئی، اس کے رخساروں کی ابھری ہوئی ہڈی پر سے گذر کر اس کے ماتھے پر رک گئی۔ اس دوران میں وہ ستار کے تار کی طرح تھرتھراتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ——— "ارے پگلی روتی کیوں ہے؟" ——— "کچھ نہیں" اس نے اپنے سر کی جنبش سے آنکھوں کو چھلکاتے ہوئے کہا ——— "دیکھو میرے ساتھ چلوگی؟" ——— "کہاں؟" ——— "میرے گھر جب میری شادی ہو جائے گی تو میں تجھے اپنے پاس بلاؤں گا، کیوں آؤ گی؟" ——— "اوہوں" وہ بھیگی ہوئی آنکھیں جھپکاتے ہوئے بولی اور اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھنے لگی جیسے اس کی باتوں پر یقین نہ آ رہا ہو۔ نہ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ کئی سالوں سے آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب یکبارگی ابل پڑا۔ نہ جانے وہ آنسو کن دبی گھٹی ہوئی خواہشات، کچلی ہوئی

تمناؤں اور تشنہ آرزوؤں کا اظہار کر رہے تھے۔ وہ اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اُسے چمکارتا رہا۔ دلاسا دیتا رہا۔ جب وہ جی بھر کے رو چکی تو اس نے اپنے رومال سے اس کے آنسو خشک کئے اور مسکرایا "بس!۔۔ رو دیا جی بھر کے؟" وہ بھی مسکرادی "آپ کی شادی کب ہو رہی ہے؟" ——— "بس تین چار مہینوں تک" ——— "تو آپ مجھے بلائیں گے نا" ——— "ضرور" ——— وہ کچھ دیر سوچتی رہی "آپ کس سے شادی کر رہے ہیں؟" ——— "ایک لڑکی سے" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ وہ بھی ہنس دی "یہ تو میں بھی جانتی ہوں۔ مگر کون ہے؟ کیسی ہے؟" ——— "نیک عورت ہے اور بہت اچھی ہے" ——— "چھوٹی بی بی سے بھی اچھی؟" ——— "ارے تمہاری چھوٹی بی بی اس کے مقابلے میں کیا ہے! ـ چھوٹی بی بی سے تو تم ہی اچھی ہو" ——— وہ شرمائی اور مسکرادی۔ اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ اور آنکھوں میں معزز چمک ——— "آپ کے بوٹ کتنے گندے ہو رہے ہیں۔ لائیے میں پالش کردوں" ——— "رہنے دو بھئی۔ کوئی خاص ضرورت نہیں" ——— "نہیں چھوٹے میاں لائیے" اس نے اس کی طرف پیار بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے اس کے بوٹ اتار لئے۔ وہ اٹھ کر جانے لگی ——— "ٹھہرو" اس نے کہا اور اپنے دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر اس کی آنکھوں میں گھورنے لگا۔ کتنی اداس تھی، کتنا غم تھا۔ کتنی تاریک گہرائی تھی ان آنکھوں میں۔ اس کا جی چاہا کہ ان آنکھوں کی ساری اداسی، سارا غم چوس لے ——— "جاؤ" اس نے کچھ دیر کے بعد اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ اور وہ مدہوش سی لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے واپس چلی گئی۔

دو تین روز کے بعد ایک صبح جب اس کا باپ ناشتے کی میز سے اُٹھ کر کچہری جانے لگا تو وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا "ابا جان آپ تو اب دیر کو ہی آئیں گے۔ میں دس بجے کی گاڑی سے جارہا ہوں" دونوں بہنیں پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگیں ——— "واپس؟" میاں صاحب نے حیرت سے پوچھا "ابھی سے؟" ——— "جی ہاں چھٹی ختم ہوگئی ہے۔ صرف ایک دن باقی رہ گیا ہے" ——— وہ دونوں خالی خالی نظروں سے اُسے تک رہی تھیں وہ جیسے جوان کی آنکھوں میں بہت دن سے جھلملا رہے تھے۔ ان کی دونیں لڑکھڑانے لگیں۔ میاں صاحب کی نظریں فرش پر جمی ہوئی تھیں "تو پھر کب آؤ گے؟" انہوں نے دھیمی آواز میں پوچھا ——— "دسمبر میں انشاء اللہ" ——— "اچھا تو میاں خدا حافظ!" انہوں نے گلوگیر آواز میں کہا۔ وہ ان کے ساتھ ساتھ ڈیوڑھی تک گیا ——— "ابا جان اب آپ میری شادی کر دیجئے" ——— میاں صاحب چلتے چلتے ڈیوڑھی کے درمیان میں رک گئے اور حیرت سے اپنے بیٹے کا منہ تکنے لگے آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر مسکراہٹ کی بیسیوں ننھی ننھی لہریں پھیل گئیں "بھئی میں تو کب سے کہہ رہا ہوں تم خود ہی تیار نہیں ہوتے" انہوں نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا ——— "جی اب تو میں تیار ہوں" ——— "تو مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔ صرف صرف ذرا لڑکی ڈھونڈھ لوں۔ ویسے تو بیسیوں لڑکیاں ہیں۔ لیکن میری نظر میں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" ——— "ابا جان۔ آپ تکلیف نہ کریں" اقبال نے بات کاٹتے ہوئے کہا "لڑکی میں نے ڈھونڈھ لی ہے" ——— میاں صاحب کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ان کے لئے تو یہ بالکل نئی بات تھی۔ وہ بیچارے نئی پود کے طور طریق کو کیا جانتے انہیں تو وہ دن یاد تھے۔ جب کہ ایک صبح باپ اپنے نورِ چشم اور راحتِ جان سے کہتا "ابے چل لونڈے چل ذرا بال وال کترا لے۔ آج شام تیری شادی ہو رہی ہے" اور بیچارہ لونڈا چپکے سے حجام کی دکان پر جا بیٹھتا۔ وہ اتنا پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کرسکتا تھا کہ وہ لڑکی کون ہے اور کیسی ہے؟ مگر اب تو زمانے کے انداز ہی بدل گئے تھے۔ لڑکا خود اپنے باپ کو حکم دیتا تھا "بابا میری شادی کرو فلاں فلاں لڑکی سے" ——— لیکن میاں صاحب آدمی سمجھدار تھے۔ ہوا کا رخ پہچان کر انہوں نے بھی جھٹ اپنا رویہ بدل دیا۔ وہ مسکرائے "یہ تو بہت ہی اچھا ہوا ورنہ میں اب کہاں لڑکی ڈھونڈتا پھرتا۔ نہ جانے تمہیں پسند بھی آتی یا نہیں اور پھر یہ کام تو عورتوں کو ہی زیب دیتا ہے۔ تمہاری اماں اگر زندہ ہوتی تو اسے کتنی خوشی ہوتی" ان کی آواز بھرا گئی۔ مگر وہ جلد ہی سنبھل گئے "کون ہے وہ لڑکی؟" ——— اقبال نے اس کے حسب نسب اور اس کے خاندان کے بارے میں دیگر تفصیلات بہم پہنچائیں سب لوگ اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اور آدھے سے زیادہ لڑکے

پاس ہی ہوتے تھے۔ میاں صاحب مطمئن ہو گئے۔ انہوں نے لڑکی کے بارے میں کچھ بھی نہ پوچھا۔ اس کی شکل و صورت اور تعلیم کے بارے میں کوئی سوال نہ کیا۔ ان کے لئے تو بس اتنا ہی کافی تھا۔ کہ وہ ایسے اچھے اشراف کھاتے پیتے گھرانے میں سے تھی۔ "تو پھر اب تک ارادہ ہے شادی کرنے کا؟" ——— "نومبر میں!" ——— "بڑا مناسب موقع ہے۔ تم فکر نہ کرو میں سب انتظام و انصرام کروں گا!" انہوں نے ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے: "اور دیکھو مجھے اپنے ہونے والے سسرال کا پتہ دیتے جاؤ!"

اقبال چلا آیا۔ وہ دونوں بہنیں سر جھکائے صحن میں بیٹھی تھیں۔ "تو تم واقعی آج جا رہے ہو؟" بیگم نے پوچھا ——— "جی" ——— "پہلے کیوں نہ بتایا۔ میں تمہارے لئے کوئی چھوٹی موٹی چیزیں تیار کر لیتی" ——— "چھوڑیے ان تکلفات کی کیا ضرورت ہے۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان پر گرد و غبار چھایا ہوا تھا۔ اور ہوا میں رفتہ رفتہ حدت پیدا ہو رہی تھی۔ "آج پھر لو چلے گی" ——— "ہاں" بیگم نے اداس نظروں سے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے آہ بھری۔ صحن میں گلاب اور موتیے کے پھول تشنہ اور منتظر نظروں سے پانی کا انتظار کر رہے تھے۔ بیگم آج کسی کو پانی دینے کا خیال ہی نہیں آیا تھا۔ اقبال اپنے کمرے میں جا کر اپنا مختصر سا سامان سمیٹنے لگا۔ زینی چپکے سے اس کے کمرے میں آئی۔ "آپ جا رہے ہیں؟" ——— "ہاں" وہ پاؤں کے انگوٹھے سے فرش کو کریدنے لگی۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ وہ ہونٹ چبا رہی تھی ——— "گھبراؤ نہیں میں تین چار ہفتوں تک تمہیں لے جاؤں گا" ——— "نہیں آپ مجھے بھول جائیں گے۔" وہ سسکتے ہوئے بولی۔ "میں ایک حقیر چیز ہوں۔ نوکر ہی تو ہوں" ——— "ارے نہیں بھئی ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔" اس نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے پیار سے کہا۔ "اور دیکھو رونا مت۔ تمہاری بی بی نے دیکھ لیا تو . . . . . ." ——— "واہ کیا مجھے رونے کی اجازت بھی نہیں؟!" اس نے تلخی اور نفرت سے کہا ——— اس نے اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ اور اس کی آنکھوں میں گھورتے ہوئے بولا "جاؤ۔ اب بھاگ جاؤ۔ کوئی آ گیا تو تمہاری شامت آ جائے گی۔" اور وہ ہچکچاتے ہوئے قدموں سے واپس چلی۔

کچھ دیر کے بعد وہ باہر نکلا دونوں عورتیں بدستور میز پر خاموش بیٹھیں ڈبل روٹی کے ٹکڑے چن رہی تھیں۔ انہوں نے شاید ابھی تک ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی تھی ——— "ذرا تانگہ تو منگوا دیجئے" ——— "کیں چل دیئے؟" بیگم نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے انتہائی بے بسی اور مایوسی سے پوچھا ——— "جی ہاں۔ ساڑھے نو بجنے والے ہیں" ——— "زینی ذرا بھاگ کے تانگہ تو پکڑ لا۔" زینی نے صحن میں سے گزرتے وقت مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور باہر نکل گئی۔ وہ برآمدے میں کھڑا انتظار کرنے لگا۔ اس نے اپنے چہرے پر گرم ہوا کی جلن کو محسوس کیا۔ بیگم اس کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ ثریا سر جھکائے میز پوش پر خیالی نقش و نگار بنا رہی تھی ——— "پھر کب آؤ گے؟" بیگم نے پوچھا ——— "شاید دسمبر میں آؤں۔" پھر بوجھل خاموشی چھا گئی۔ جس میں کتنی ہی ان کہی باتوں کی گونج تھی۔ اور کتنے ہی خیالات کی بھنبھناہٹ تھی۔ جو زبان پر نہ آ سکے تھے۔ تانگہ آ گیا۔ زینی اس کا سوٹ کیس اٹھا کر باہر لے گئی۔ وہ دونوں اس کے ساتھ باہر دروازے تک گئیں۔ زینی باورچی خانے کی کھڑکی کی جالی سے ناک چپکا کر کھڑی ہو گئی۔

اس نے دونوں کو سلام کیا ——— "خدا حافظ!" بیگم نے خشک گلے میں پھنسی ہوئی آواز نکالی۔ تانگہ چل دیا۔ باہر لو کے جھکڑ چل رہے تھے۔ ایک گرم ہوا کا بگولا اپنے دامن میں گرد و غبار، کاغذ کے ٹکڑے اور خشک پتے سمیٹتا ہوا تانگے کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ تانگہ دھول کے بادل اڑاتا ہوا بکائن اور لسی کے درختوں کے بیچوں بیچ چلا جا رہا تھا۔ وہ دونوں خشک، جلتی ہوئی آنکھوں سے تانگے کے اڑائے ہوئے گرد و غبار کو دیکھ رہی تھیں۔ اور خوف کے عالم میں اس لمحے کا انتظار کر رہی تھیں۔ جب تانگہ نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ وہ دونوں تنہا رہ جائیں گی۔ اور انہیں پھر کو ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گزشتہ دنوں کا حساب کتاب چکانا پڑے گا!!!—

○

عزیز اثری

بگی

بگی ہر روز صبح کا سہانا پیغام بن کر آتی تھی۔ اُس کے آتے ہی گھر بھر میں رونق، زندہ دلی اور معصومیت کی لہر دوڑ جاتی۔ وہ دروازے میں داخل ہوتے ہی کہتی:۔

"نانی ماں! دیکھو میں نئے کپڑے پہن کر آئی ہوں۔ میلا بیاہ ہو گیا ہے۔ اب میلی بالات آئے گی" پھر وہ ہمارے گھر کے ایک ایک فرد کے بارے میں پوچھتی۔ چھوٹے ماموں کہاں ہے نسیم؟ ناناابا جال گئے ہیں۔ ہیں ــــ باجال سے کیا لانے گئے ہیں؟ ماموں ابھی تک سوئے پڑے ہیں" پھر وہ میرے کمرے میں آجاتی مجھے لیٹے ہوئے دیکھ کر کہتی۔ ــــ ماموں جی آپ ابھی تک سوئے ہوئے ہیں۔ اب تو لات بھی ختم ہو گئی دیکھو اب تو دھوپ بھی آگئی ہے۔ ماموں جی ـــ اے ماموں جی ــــ اور میں اٹھ کر اُسے بستر پر کھینچ لیتا۔

"دیکھو یہ نئے کپلے پہنے ہیں۔ ہیں ماموں جی ــــ میلا تو بیاہ ہو گیا ہے نا"۔ وہ ہنس کر کہتی ــــ "ہیں۔ اب میلی بالات آئے گی" اور وہ مجھے اپنے دھلے ہوئے کپڑے بڑے شوق سے دکھانے لگتی۔

ساڑھے تین سال کی بگی ـــ بھورے بالوں والی گڑیا سی بچی ایک ہمارے کلرک کی بیٹی تھی۔ کلرک کی بیوی سے میری ماں کو اتنی محبت تھی کہ میری ماں اُسے اپنی بیٹی کہتی تھی۔ یہ لوگ ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ تقسیم کے بعد بگی کے باپ نے یہاں آکر ایک دفتر میں کلرکی کر لی تھی اُسے اسی پچاسی روپے ماہوار ملتے تھے لیکن اس سے ان کا گزارہ بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ کیونکہ اُن کے گھر کے چار افراد تھے۔ یعنی میاں بیوی کے علاوہ دو بیٹیاں تھیں۔ ایک سات سالہ لڑکی اور دوسری بگی۔ اس کے علاوہ بگی کے باپ کو اپنی دو بیوہ بہنوں، ایک بھائی اور بوڑھے ماں باپ کو جو پنجاب کے کسی گاؤں میں کاشتکار تھے کچھ روپے ہر ماہ بھیجنا پڑتے تھے۔ ہمارے دو گھرانوں کا آپس میں بڑا میل جول تھا۔ اس لئے بگی ہم سب سے مانوس تھی۔ ہم اُس کی دلچسپ اور پیاری باتیں سن کر ہنستے رہتے۔ ہمارے گھر میں گذشتہ دس بارہ سال سے کوئی چھوٹا بچہ نہ تھا۔ اور اس سے بگی ہمارے گھر میں بڑی اہمیت رکھتی تھی اور ہم بڑے چھوٹے سب اُس سے انتہائی پیار کرتے تھے۔ بگی پیاری پیاری مزے دار باتیں کرنے کے علاوہ بلا کی ذہین بھی تھی۔ وہ کوئی واقعہ راہ چلتی بھی دیکھ لیتی تو ایک عرصے تک اُسے پوری طرح سے یاد رکھتی۔ ماں باپ اور بڑی بہن سے سنی ہوئی باتیں ننھے سے ذہن میں محفوظ کر لیتی۔ اور تو اور اپنی گلی میں لڑتی ہوئی عورتوں کی رنگا رنگ گالیاں اور اشارے تک اُسے فوراً یاد ہو جاتے۔

چھ سات ماہ پہلے بگی کا ایک سالہ بھائی کچھ دن بیمار رہ کر مر گیا تھا۔ اُس کی پیدائش سے لے کر موت تک کا ہر واقعہ بگی کو یاد تھا۔ بگی کئی بار اپنے ننھے سے ہونٹوں کو پھیلا کر اور منہ بنا کر ہمیں بتاتی۔

"کاکا اس طرح سے دودھ پیتا۔ غوں غوں کر کے باتیں کرتا"۔ وہ کئی بار چپ چاپ چارپائی پر چڑھ کر لیٹ جاتی۔ اپنی آنکھیں بند کر کے کہتی ــــ "دیکھو نانی ماں! دیکھو ماموں جی! کاکا یوں آنکھیں بند کر کے مر گیا تھا۔ میں بھی اچھی طرح مر جاؤں گی۔ ہیں۔ پھر میں اللہ میاں کے پاس چلی جاؤں گی۔ ہے نا ماموں جی!" بچے کی موت کا حادثہ شاید بگی کے ذہن پر بری طرح نقش تھا۔ اور اس کا اس کے ننھے دل پر بڑا اثر تھا۔ رفتہ رفتہ وقت نے اس اثر کو زائل

رہا۔ اور بگی سے ہمارا پیار روز بروز بڑھتا گیا۔ وہ کبھی اپنی ماں اور کبھی بہن کو ساتھ لے کر ہمارے ہاں آجاتی۔ اور دن کا اکثر حصہ یہاں گزار دیتی۔ پھر بگی کا آنا کم ہوگیا۔ معلوم ہوا کہ اُس کی ماں سخت بیمار ہے۔ اُس کی ماں کو تپِ دق ہوگئی تھی۔ جو آہستہ آہستہ آخری منزل کو پہنچ رہی تھی۔ ڈاکٹر نے کئی بار بگی کے باپ سے کہا تھا کہ وہ بیوی کو کسی صحت افزا مقام پر لے جائے۔ لیکن یہاں تو ان لوگوں کے پاس پیٹ بھرنے کو بھی نہ تھا۔ اتنا خرچ کہاں سے لاتے ؟ نتیجہ وہی ہوا جو اس بیماری کا ہوا کرتا ہے۔ بگی کی ماں مرگئی۔ بگی کئی روز ہمارے ہاں نہیں آئی۔ ماں کی موت کے وقت بگی بھی اپنی بڑی بہن کی طرح ماں سے لپٹ کر بیچ بیچ کر روتی رہی اور بگی کو بمشکل ایک ہمسائے کے گھر لے جا کر اُس کی ماں کا جنازہ اٹھایا گیا۔ اب اُس کی ماں کی بڑی بہن جو خود ایک عرصے سے بیمار چلی آتی تھی۔ دونوں کی خاطر یہاں آگئی۔ میری بیوی بڑی دقت سے بگی اور اُس کی بہن نسیم کو ہمارے گھر لے کر آئی تھی۔ وہ دونوں بہت پریشان اور اداس رہتیں۔ اُن کی خالہ جو آج تک اپنی بیماری اور گھریلو حالات کے باعث شادی نہیں کر سکی تھی۔ اکثر بستر پر پڑی رہتی اور خدا کی عبادت میں وقت گزارتی تھی۔ بہن کی موت کے غم نے اُس کے دوروں کو شدید کر دیا تھا۔ بچیوں کی پرورش اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ بگی کا باپ بھی بہت دن پریشان رہا۔ وہ دونوں وقت خود کھانا پکاتا۔ اور گھر کا کام کرتا۔ اور بگی کی دیکھ بھال کا تمام بوجھ اُس کی بہن نسیم پر آ پڑا۔

ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نسیم کو یک دم یہ احساس ہوگیا ہے۔ کہ اب وہی بگی کی ماں اور بہن ہے۔ اب اُس نے ماں کی یاد میں بگی کے سامنے رونا چھوڑ دیا وہ دکھ کے احساس کو بگی کے ننھے ذہن سے دھونے کی دن رات کوشش کرنے لگی۔ وہ رات کو بگی کو اپنے ساتھ سلاتی۔ اُس کی ہر ضرورت کا خیال رکھتی۔ اُس کے میلے کپڑے دھوتی۔ اُسے کھانا کھلاتی، نہلاتی دھلاتی، اُس کے بال سنوارتی، آنکھوں میں سرمہ ڈال کر پہلو میں اُٹھائے اٹھائے پھرتی۔ بگی ذرا سا بھی پریشان ہوتی تو نسیم کی جان پر بن جاتی۔ نسیم کی صحت پہلے سے اچھی نہ تھی۔ لیکن ماں کی موت کے بعد بگی کی دیکھ بھال کی ذمہ داری نے اُسے اور بھی دبلا کر دیا۔

وقت جتنے بڑے دکھ دیتا ہے۔ اُتنی ہی جلدی انہیں اچھا بھی کر دیتا ہے۔ اور بچوں کے دلوں سے تو زخم جلدی ہی دھل جاتے ہیں۔ ان دونوں بہنوں کا غم بھی آہستہ آہستہ مٹنے لگا۔ اب دونوں زیادہ تر ہمارے گھر رہنے لگیں۔ لیکن شروع میں بگی کا دل نہیں بہلتا تھا۔ وہ بہن کو بار بار اپنے گھر جانے کے لئے کہتی۔ اور وہاں سے پھر اُسے ہمارے گھر لے آتی۔ جب بگی کی طبیعت میں سکون پیدا ہوگیا تو ہمارے گھر میں بھی پہلی سی چہل پہل ہونے لگی۔ اب ہم اُسے کوئی تکلیف نہ ہونے دیتے اور وہ بھی پہلے کی طرح کبھی گھر کے ایک ایک فرد سے باتیں کرتی، ہر ایک کو چھیڑتی اور پیار سے لپٹ جاتی۔ غرض دن بھر وہ ہمارے گھر میں کھیلتی اور اپنی پیاری باتوں سے گھر بھر میں اُجالا کئے رکھتی۔

وہ عادت کے مطابق صبح ہی صبح ہمارے ہاں آجاتی۔ منڈیر پر اور صحن میں پھدکتی ہوئی چڑیوں اور کوؤں کے پیچھے تالیاں بجا کر بھاگتی۔ وہ گملے کے پھولوں سے چھیڑ چھاڑ اور پیار کرتی۔ کبھی گانے لگتی۔ کوئی خالی ڈبہ لے کر ڈھولک بجاتی ساتھ ہی گانا گاتی۔ کبھی برآمدے میں کھڑی ہو کر آنکھیں مٹکاتی اور چٹکیاں بجا بجا کر ناچنے لگتی۔

اس اثنا میں جب کبھی اُس کی بہن کسی کام سے باہر چلی جاتی تو بگی کی زندہ دلی ختم ہو جاتی ــــ وہ اُسے کبھی برآمدے کبھی صحن کبھی ایک کمرے کبھی دوسرے کمرے میں ڈھونڈتی اور زور زور سے آوازیں دیتی ــــ "چھیم اے چھیم"! جب نسیم نہ ملتی تو رونے لگتی۔ بعض اوقات اُس کی بہن جان بوجھ کر ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے آئینے کے پیچھے جا کر چھپ جاتی۔ اور بگی اُسے تلاش کرتے کرتے جب آئینے کے پیچھے جا کر پکڑ لیتی تو تالی بجا کر زور سے ہنستی اور کہتی ــــ

"میں سمجھی چھیم کہیں گم ہوگئی ہے۔ میں اب آپ کو کہاں ڈھونڈوں گی۔ تم یہاں چھپی ہوئی تھیں ــــ ہیں چھیم! اور وہ بہن سے چمٹ کر خوب

قہقہے لگاتی۔ نسیم دراصل گگی کی بہن، ماں اور خالہ، سبھی کچھ تھی۔ جب کبھی نسیم اُسے نہلا دھلا کر صاف کپڑے پہنا کراتی تو گگی بہت خوش ہوتی۔ وہ ہنستی ہوئی ہر ایک کمرے میں گھومتی پھرتی۔ ہم سب کو اپنے کپڑے دکھاتی اور جب وہ نئے کپڑے پہن لیتی، اُس کے پاؤں گویا زمین پر نہ ٹکتے۔ وہ جاتے گھر میں داخل ہوتے ہی سب کو پکارتی۔ آئینے اٹھا اٹھا کر خود کو گھورتی پھر بیٹھک میں بڑے آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی، اور اپنے کپڑوں اور اپنے آپ کو دیکھتی رہتی۔ بڑے آئینے سے تو گویا اُسے عشق تھا۔ اُس کی بہن اگر باہر چلی جاتی اور گگی ضد کرنے لگتی۔ تو ہم اُسے اٹھا کر بڑے آئینے کے سامنے لے آتے وہ فوراً چپ ہو جاتی۔ اور بہن کا خیال بھول کر آئینے میں خود کو دیکھتی رہتی۔

ننھی گگی کے دل میں بہت سے شوق تھے۔ اُسے اچھے کھلونوں، تصویروں اور کپڑوں سے بڑا پیار تھا۔ وہ کئی بار میرے پاس آ کر کتابوں اور رسالوں میں تصویریں ڈھونڈنے لگتی۔ ویسے تو ہم سب سے گگی بہت مانوس تھی، لیکن میں چونکہ بچوں ہی کی طرح اُس کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا۔ اس لئے وہ بار بار میرے پاس آ جاتی۔ کبھی پیچھے سے آ کر میری دونوں آنکھیں بند کر لیتی۔ میں پوچھتا —— "تم کون ہو؟" وہ جواب دیتی —— "میں چھیم ہوں۔" میں کہتا —— "تم نسیم ہو تو گگی کہاں گئی ہے؟"

"گگی اپنے گاؤں گئی ہے۔ وہ گاڑی میں بیٹھ کر گئی ہے۔ گاڑی چھک چھک کر کے چلتی تھی۔" میں جب اُس کے ہاتھ ہٹا کر اُسے دیکھتا تو وہ قہقہہ مار کر مجھ سے لپٹ جاتی۔ میں کہتا ——

"گگی تم تو گاؤں گئی تھیں وہاں کس کے پاس گئی تھیں؟"

"میں پھوپھی پیارے پاس گئی تھی۔ وہاں میں نے گنے کھائے گاجریں کھائیں —— ہیں۔ ماموں جی پھل میلی پھوپھی نے مجھے بڑے اچھے کھلونے دیئے۔ نئے نئے کپڑے بھی ماموں جی! میں پھل نئے کپڑے پہنوں گی —— میلا بیاہ ہو جائے گا —— ہیں ناماموں جی! پھل میلی بالات۔۔۔"

کبھی کبھی میں گگی سے جان بوجھ کر روٹھ جاتا۔ اس وقت وہ میرے چھوٹے بھائی کی گود میں جا بیٹھتی۔ اور مجھے چڑانے کے لئے میری طرف اشارہ کر کے ناک چڑھا کر کہتی ——

"وہ ماموں تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ میلا ماموں تو چھوٹا ماموں ہے۔ یہ بلا اچھا ماموں ہے میلا۔" کچھ دیر کے بعد وہ مجھے منانے آتی جب میرے پاس آتی۔ اور میں اُسے کوئی جواب نہ دیتا۔ تو چپکے سے پاس کھڑی ہو جاتی پھر آہستہ سے کہتی ——

"ماموں جی! آپ ناراض ہو گئے ہیں۔ وہ چھوٹا ماموں تو مجھے بالکل اچھا نہیں لگتا۔ میلے ماموں تو آپ ہیں۔ ہے ناماموں جی —— !" میں اس پر بھی نہ بولتا۔ تو وہ خود ہی چارپائی پر چڑھ کر میرے قریب ہو کر کہتی ——

"ماموں جی! اے ماموں جی۔ میرے چن ماموں آپ تو بڑے اچھے ہیں۔" یہ کہتے ہی وہ مجھ سے لپٹ جاتی۔ میں اُسے گود میں لے لیتا۔ اور وہ باتیں شروع کر دیتی۔

وقت نے ایک اور رخنہ ڈالا۔ گگی کے باپ کی ملازمت جاتی رہی۔ وہ چھانٹی میں آ گیا تھا۔ گگی کی ماں کی بیماری پر وہ کافی قرض لے کر خرچ کر چکا تھا۔ ادھر اب ملازمت جاتی رہی وہ بے حد پریشان ہو گیا۔ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلا۔ اُس کے گھرانے کو اب کھانے پینے اور کپڑوں تک کے لالے پڑ گئے۔ کبھی اڑوس پڑوس والے جن کے بچے گگی کی خالہ سے پڑھتے تھے۔ کچھ کپڑے وغیرہ دیتے یا ہم لوگ کچھ مدد کر دیتے تھے۔ گگی کی زندگی پر اگرچہ کافی اثر پڑ رہا تھا۔ تاہم اُسے ان حالات کا شعور نہ تھا۔ اُسے صرف اتنا معلوم تھا۔ کہ پہلے اُس کے ابا دفتر جاتے تھے۔ اب گھر پر رہتے ہیں۔ پھر کئی لوگوں کے مشورے سے اُس کے باپ نے دوسرے شہروں میں پھر کر ملازمت ڈھونڈنی شروع کی۔ اُس سے ان کا خرچ اور بھی بڑھ گیا۔

گگی کی ماں کو مرے ایک سال سے کچھ عرصہ اوپر ہو چکا تھا۔ انہی دنوں گگی کی پانچویں سالگرہ پڑتی تھی۔ ہم نے اپنے گھر میں اُس کی سالگرہ منانے کی تیاری شروع کر دی۔ اُس کے لئے کچھ کپڑے بنائے۔ میں نے کچھ کھلونے خرید ے۔ گگی ہمارے گھر میں اپنے کپڑے سلتے دیکھ کر بے حد خوش ہوتی وہ میری بہنوں کے پاس جا اس کے کپڑے سی رہی تھیں، کتنی دیر تک مبیٹھی کئی طرح کے سوال کرتی رہتی۔ اور مجھ سے بار بار آکر پوچھتی۔

"ماموں جی سچ مچ ماموں جی اب میلا بیاہ ہو جائے گا نا۔ میں نئے کپڑے پہنوں گی ہیں ——— پھل . . . . . . " لیکن اپنی سالگرہ سے چھ روز پہلے گگی بیمار پڑ گئی ——— ہمارے گھر اُس کا آنا بند ہو گیا۔ اُس کے بغیر گھر سُونا سونا نظر آنے لگا۔ ساری رونق اُس کے دم سے تھی۔ دن میں ایک آدھ بار اُس کی بہن آجاتی یا میری ماں اور بہن گگی کے گھر چلی جاتیں۔

ایک روز بڑے زور کی بارش ہو رہی تھی جس سے سردی شدید ہو گئی تھی۔ ہم لوگ صبح کے وقت آگ کے پاس بیٹھے گگی کی باتیں کر رہے تھے۔ کہ اتنے میں نسیم داخل ہوئی۔ اس کے کپڑے بارش کے پانی سے شرابور تھے۔ اُس کے ہاتھ میں دوائی کی شیشی تھی۔ اور وہ سردی سے کانپ رہی تھی۔ اُس نے بتایا کہ رات گگی کا بخار تیز ہو گیا تھا اور وہ ہسپتال سے گگی کے لئے دوا لے کر آئی ہے۔

"تم نے سویٹر بھی نہیں پہن رکھا۔ دیکھو کس بری طرح سے کانپ رہی ہو" ——— میری ماں نے بڑے دُکھ سے اُسے کہا۔

"گگی کو بہت سردی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنا سویٹر بھی اُسے پہنا دیا۔ ابا جی ابھی تک نہیں آئے ——— میری گگی کا بخار تیز ہو گیا ہے . . . . اور نسیم رونے لگی۔

ہم نے اُسے کہا کہ وہ گیلے کپڑے فوراً اتار دے اور آگ پر ہاتھ پاؤں تاپ لے۔ میری ماں اُس کیلئے چائے بھی بنانے لگی لیکن نسیم نہیں مانی۔

"میری گگی کا بخار تیز ہو گیا ہے میری گگی کا . . . . . " وہ کہتے کہتے چلی گئی۔

شام کو گگی کا بخار اُتر گیا لیکن نسیم بیمار پڑ گئی۔ اور صبح ہوتے ہوتے نسیم مر گئی۔ اُسے ڈبل نمونیا ہو گیا تھا۔ اُس کی موت سے ہم بے حد دکھی اور اداس ہو گئے۔ ہمارے گھر میں دن بھر سناٹا رہا۔ میں نے صبح سے کھانا بھی نہیں کھایا میری ماں اور بہنیں سارا دن گگی کے گھر رہیں۔ اُس کی بیمار خالہ کو رات کئی مرتبہ دورہ پڑا تھا۔

تین روز گزر گئے۔ آج گگی کی سالگرہ تھی۔ آج بڑی مشکل سے میری ماں اُسے اپنے ساتھ لائیں۔ گگی کے چہرے پر دُکھ، بے بسی اور تنہائی کا بھیانک کرب اور افسردگی تھی۔ ہم نے اس کی سالگرہ کے کپڑے اور کھلونے اُس کے سامنے ڈھیر کر دیئے۔ میں نے اُسے گود میں لے لیا۔ اور پیار کرتے ہوئے کھلونے اُسے دیئے۔ میں نے کہا ——— "دیکھو گگی! یہ انجن ہے یہ گاڑی ہے۔ ہم اس میں بیٹھ کر پھوپھی پھپھی کے پاس جائیں گے۔ وہاں ہم گنے اور . . . . " گگی نے بیزاری سے منہ پھیر لیا۔ میری بہنوں نے اُس کے نئے کپڑے اُس کی طرف بڑھائے۔

"یہ نئے کپڑے ہیں گگی! ہے نا تم انہیں پہنو گی۔ چل نہا لے بیاہ . . . . " اُس نے اپنی طرف بڑھے ہوئے کپڑے پرے ہٹا دیئے۔ اور اُس طرح کھوئی کھوئی پریشان چپ چاپ رہی۔ پھر میری بہنوں نے اسی حالت میں اُس کا منہ ہاتھ دھو کر نئے کپڑے پہنا دیئے۔ اور میں اُسے مٹھائی دینے لگا۔ تاکہ وہ بڑے آئینے میں خود کو دیکھ کر شاید خوش ہو جائے اپنا غم بھول جائے۔ میں نے اُسے گود سے اتار کر آئینے کے سامنے کھڑا کر دیا۔ وہ ایک دو لمحے گم سم سی خود کو دیکھتی رہی پھر جلدی سے آئینے کے پیچھے گئی۔ اور ننھے ہاتھ پھیلا کر خالی جگہ کو ٹٹولنے لگی جیسے کسی کو ڈھونڈ رہی ہو ——— "گگی! تم کسے ڈھونڈ رہی ہو؟" میری بہن نے ہولے سے اُسے کہا لیکن وہ جواب دیئے بغیر صحن میں نکل آئی۔ اور تیزی سے باہر کے دروازے کی طرف لپکی۔ میں اُس کے پیچھے آیا تو وہ گلی میں گھر کی طرف بھاگتی ہوئی زور زور سے چیخ رہی تھی ——— "نسیم ——— اے نسیم ——— اے نی نسیم ——— !" ——— پھر وہ گلی کے موڑ پر پہنچ کر رک گئی۔ اور بے بسی سے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

میزانِ ادب

بہن

(تمثیل ایک باب میں)

افرادِ تمثیل

نزہت ———— جمیلہ کی سہیلی

جمیلہ ———— ایک نرس

ساجدہ ———— نرس

ایلس ———— نرس

شمیم ———— نرس

پروین ———— نرس

گوری ———— ملازمہ

منظر (نرسز ہوم)

جمیلہ کا کمرہ صاف ستھرا اور سادہ جیسا کہ ایک نرس کا ہونا چاہیئے۔ آنے جانے کے لئے صرف ایک دروازہ جو جنوبی دیوار میں ہے۔ اور جس پر نیلے رنگ کا پردہ لٹک رہا ہے۔ دو کھڑکیاں سامنے کی دیوار میں۔ دونوں پٹ کھلے ہوئے۔ کھڑکیوں میں سے دُور افق کے نیچے درختوں کی ایک مُسلسل قطار چلی گئی ہے۔

جس وقت پردہ اُٹھتا ہے جمیلہ سامنے کی دیوار سے سہارا لگائے پلنگ پر بیٹھی ہوئی نظر آتی ہے۔ عمر تیس سال کے لگ بھگ چہرے پر جا بجا چیچک کے نشان، رنگ سیاہی مائل۔ پلنگ کے پاس تپائی کے اُوپر چائے کی ٹرے پڑی ہے — اس کے علاوہ دو کرسیاں بھی ہیں جو پلنگ کے قریب اس طرح رکھی گئی ہیں کہ ان پر بیٹھنے والوں کے چہرے ایک دوسرے کے سامنے رہتے ہیں۔

وقت۔ دن کا تیسرا پہر۔

جمیلہ دروازے کی طرف اس طرح دیکھ رہی ہے جیسے کسی کی منتظر ہو۔ کمرے کے باہر نرسوں کی آوازیں، سیٹیاں اور قہقہے گونج رہے ہیں۔

نزہت آتی ہے۔ اُونچے متوسط طبقے کی لڑکی۔ لباس بھڑکیلا، جمیلہ کی ہم عمر، ہاتھ میں پرس، چہرہ پوڈر اور لپ سٹک سے آراستہ۔

نزہت: (کمرے میں داخل ہوتے ہی) چہ خوب، حضور ابھی تک بستر پر دراز ہیں ــــ کیوں خیر تو ہے پلنگ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتیں تم!

جمیلہ: خراب ہے طبیعت، دو ایک روز میں ٹھیک ہو جائے گی۔

نزہت: ہوسپیٹل سے ہو کر آ رہی ہوں۔ میں نے سمجھا ڈیوٹی پر چلی گئی ہو۔

جمیلہ: چلی جاؤں گی ڈیوٹی پر بھی۔ بیٹھو۔ اتنے دنوں کے بعد آئی ہو؟

نزہت: (کرسی پر بیٹھتے ہوئے بیزاری سے) کیا کروں ناک میں دم آگیا ہے۔ کراچی سے بہن آگئی ہے۔ خیر اسے تو آنا ہی چاہئے تھا۔ مگر ساتھ بچوں کی فوج بھی آگئی ہے۔ شیطانوں نے وہ اودھم مچا رکھا ہے کہ توبہ ہی بھلی۔ سارا سارا دن میرے کمرے میں گھسے رہتے ہیں۔ شاید ہی کوئی چیز سلامت رہے گی ان کے ہاتھوں۔

جمیلہ: (لہجے میں اشتیاق) بہن آئی ہے ــــ بڑی چہل پہل ہو گی۔

نزہت: چہل پہل کیا ہو گی۔ میں تو پریشان ہو گئی ہوں جمیلہ! جانے یہ طوفان کب جائے گا۔

جمیلہ: طوفان کیسا؟ یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، اپنی سگی بہن ــــ اور وہ بھی ایک عرصے کے بعد ملے۔ تم تو یونہی چڑا کرتی ہو۔ خوب باتیں ہو رہی ہیں بہنوں میں آج کل ــــ ہیں نا؟

نزہت: باتیں کیا خاک ہوں گی۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس دنیا میں کیا کچھ ہوتا رہتا ہے۔ لوگ دوسروں کی نیکی سمجھتے ہی نہیں۔

جمیلہ: (آہ بھر کر) مجھ سے زیادہ کون سمجھے گا اس بات کو؟ ــــ ثریا کو جانتی ہو ــــ ثریا کہ ــــ

نزہت: (بے تابی سے جمیلہ کے الفاظ کاٹ کر) میرے بس میں ہو تو کہیں دور بھاگ جاؤں۔ جہاں یہ رشتہ داریاں اور ان کا جھنجھٹ نہ ہو۔ تم جانتی ہو نا رفیعہ کی نند کے چھوٹے بھائی کا رشتہ آیا تھا۔ اپنی اصغری کے لئے مجھے تو یہ رشتہ ہرگز پسند نہیں مگر رفیعہ سمجھتی ہے اس سے بہتر رشتہ کہیں مل ہی نہیں سکے گا۔ بس یہ جھگڑا ہے۔ اور اسی لئے وہ کراچی سے آئی ہے۔ ہمیں سمجھانے کے لئے۔ واہ نہ۔ ہمیں سمجھائے گی!

(ساجدہ آتی ہے۔ نرس کی یونیفارم میں ملبوس)

ساجدہ: کہو جمیلہ! کیا حال چال ہے۔ بھئی اٹھو بیٹھو نا۔

نزہت: یہ یوں نہیں اٹھے گی زبردستی اٹھانا پڑے گا اسے

ساجدہ: سچی بات یہ ہے اس نے یہ بیماری خود مول لی ہے ــــ یہ حال نہ ہوتا تو اور کیا ہوتا۔ نرس کو Humanism کی خدمت کرنی چاہئے پر خود کو قربان تو نہیں کر دینا چاہئے۔

جمیلہ: ثریا کے بارے میں کہہ رہی ہو؟ ــــ معلوم ہے اس نے کیا کہا تھا؟

ساجدہ: ہزار بار سن چکی ہوں بس چپ رہو۔ بالکل Hopeless ہو۔

نزہت: ہوا کیا ہے؟

ساجدہ: (بظاہر ہمدردی سے) دیکھو نزہت! یہ بھی کوئی بات ہے کہ ایک Humanism تمہیں بہن کہہ دے اور تم اس کے لئے تین بار

اپنا ملاحظہ دے دو۔ شکر کرو ایم ایس کو یہ بات معلوم نہیں ہوئی ورنہ — تم جانتی ہو نا کتنی سخت طبیعت ہے اس کی!

نزہت، تین بار ملاحظہ دیا؟ اندھیر ہے (طنزاً) اپنی صحت جو انشا اللہ نہایت اچھی ہے۔

ساجدہ، صرف یہی نہیں بلکہ آج تو مُرے کو بھی اس کی خدمت کرتی رہی۔

جمیلہ، (آواز میں درد) او، ساجدہ! تو یا نے گھر پہنچ کر جو کچھ کیا ہے وہ —

ساجدہ، بالکل پرسنلی ہوں۔ (رسٹ واچ دیکھ کر) اچھا — چیریو۔

(ساجدہ چلی جاتی ہے)

جمیلہ، (اپنے خیال میں) میں نے اسے اپنی بہن سمجھا تھا — اس نے مجھے بہن کہہ کر بلایا جو تھا۔ مگر —

نزہت، پھر بہن — اُف خدا — کبھی دیکھا بھی ہے بہنوں کو۔ رقیبہ بہن ہی تو ہے مگر کیا مجال جو اُسے اپنے گھر والوں سے ذرہ برابر بھی دلچسپی ہو۔ ماما اس کی نند کا بھائی ولایت سے انجینئرنگ کی ڈگری لے کے آیا ہے لیکن ان لوگوں کے پاس نہ تو اپنا بنگلہ ہے اور نہ کار ہے۔ اصغری اس گھر میں کیونکر جا سکتی ہے۔ خود غور کرو کتنی بڑی مصیبت ہے میرے لئے۔ بہرحال میں اصغری کو تو وہاں ہرگز نہیں جانے دوں گی۔ بنگلے اور کار کے بغیر بھی کوئی زندگی ہے آج کل! —

جمیلہ، اور اس مصیبت کا بھی اندازہ کرو نا — میں نے —

نزہت، (جلدی سے) ایک مصیبت ہو تو کوئی کہے بھی۔ اب سنو، ایک اور مصیبت نازل ہو گئی ہے۔ خالہ جان بیٹھے بٹھائے بیمار ہو گئی ہیں۔ اور مصیبت یہ ہے کہ ہماری کوٹھی میں ہی رہتے ہیں۔ زرینہ کے ساتھ مری جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ اللہ جانے یہ پروگرام کب پورا ہوگا۔ پورا ہوگا بھی یا نہیں (آہ بھر کر) کتنی خوش قسمت ہو تم سب سے الگ تھلگ بیٹھی ہو۔

جمیلہ، نزہت! (آہ بھر کر) تمہیں کیا خبر —

نزہت، مجھے سب کچھ خبر ہے۔ زندگی سے سکون اور اطمینان رخصت ہوتا جا رہا ہے۔ بہن بہن کی نہیں سنتی — بس صبح شام یہی رٹ لگا رکھی ہے کہ لڑکا نہایت شریف اور محنتی ہے — کوئی پوچھے اس سے جا کر ہم کسی کی شرافت کو چاٹیں شہد لگا کر — عائشہ کا بھائی کتنا اچھا ہے۔ جانتی ہو نا — پر تم نے کہاں دیکھا ہوگا — باپ گورنمنٹ کنٹریکٹر ہے۔ پرسوں کہنے لگے عائشہ کو ولایت بھیجنے کا ارادہ ہے۔ کہو تو تمہارے لئے بھی انتظام کر دیں — (آہ بھر کر) ہائے ولایت۔ مہذب سوسائٹی۔ نئی دُنیا میں تو ضرور جاؤں گی۔ یہاں کی زندگی سے میری طبیعت سخت بیزار ہو گئی ہے۔

(گونگی آتی ہے)

گونگی، (جمیلہ سے مُرے کی طرف اشارہ کر کے) آں — آں۔ آں۔

جمیلہ، (ہاتھ کے اشارے سے) سے جاؤ۔ میں نہیں پیوں گی۔

گونگی، (نفی میں سر ہلاتے ہوئے جیسے کہہ رہی ہو پیو گی نہیں۔) آں۔ آں،

جمیلہ، نہیں بابا (ہاتھ کے اشارے سے) جاؤ۔ نہیں چاہیئے چائے (گونگی مُرے اُٹھا کر چلی جاتی ہے)

نزہت، یہ جانور کہاں سے پکڑ لائے ہو تم لوگ۔

جمیلہ : یہ گونگی — بیچاری محتاج ہے۔ چند روز سے ملازم ہوئی ہے — تو میں کہہ رہی تھی اس ثریا —

نزہت : ارے ہاں یاد آگیا — جمیلہ! تمہیں یاد ہوگا پچھلے مہینے سوٹ کا کپڑا کس دکان سے خریدا تھا۔ ساری انارکلی گھوم چکی ہوں، مگر وہ کپڑا نہیں ملا۔ شمیدا وغیرہ نے یہ بہت پسند کیا ہے۔ سوچتی ہوں ایک سوٹ کا اور لے لوں۔ تمہیں یاد ہوگی، دکان — ضرور یاد ہوگی!

جمیلہ : (لہجے میں کسی قدر بیزاری) نہیں! مجھے کیا معلوم!

نزہت : ہائے میرے اللہ! تمہیں بھی یاد نہیں رہی۔ اب کیا ہوگا۔ عجیب مصیبت ہے۔

(کمرے کے باہر سے "را را را — را را را" کی آواز آتی ہے۔ ایلس پردہ ہٹا کر جھانکتی ہے)

ایلس : Hello Darling, How do you do

جمیلہ : خراب ہے حالت!

ایلس : خراب ہے۔ That's nonsense —

جمیلہ : come in

ایلس : فرصت نہیں — sorry

جمیلہ : اچھا

ایلس : O.K. — را را را — را را را — را را —

(ایلس چلی جاتی ہے۔ شمیم دروازے پر آتی ہے)

شمیم : اے جمیلہ! میں نے کہا چلو گی باہر ذرا!

جمیلہ : نہیں۔ طبیعت اچھی نہیں!

شمیم : طبیعت اچھی نہیں۔ what a wonderful thing — تو نہیں چلو گی۔ — ہاں کیا حال ہے تمہاری منہ بولی بہن ثریا کا۔

جمیلہ : بتاتی ہوں۔ اس نے جو کچھ کیا ہے۔ اندر آؤ۔ ایک منٹ کے لئے — دروازے پر کیوں کھڑی ہو؟

شمیم : ضرور بیٹھتی اندر آکر مگر کیا کروں، زبیدہ کمبخت نے پکچر کا پروگرام بنا رکھا ہے — میں تو کہتی ہوں تم بھی چلو۔ خوب [illegible] کریں گے۔

جمیلہ : آج تمہاری ڈیوٹی تو نہیں۔ آؤ گی — باتیں کرنا ہیں۔

شمیم : کمبخت زبیدہ نے اپنے فرینڈ کو بھی بلا رکھا ہے — پکچر کے بعد ہوٹل میں جانا ہوگا — آؤں گی — پھر۔ فرصت کے وقت! اچھا — چیریو۔

(شمیم چلی جاتی ہے۔ گونگی ایک مرتبہ پھر آتی ہے)

گونگی : (جمیلہ کو ایک رقعہ دیتے ہوئے اوپر کی طرف اشارہ کرکے) آں۔ آں — ں!

جمیلہ، بدر نے دیا ہے (رقعہ کھول کر پڑھتی ہے) اچھا۔
نزہت، کیا ہے؟
جمیلہ، میں نے بدر سے کہا تھا۔ ذرا نیچے آکر میرے پاس بیٹھو۔
نزہت، تو —— !
جمیلہ، شاپنگ کے لئے جا رہی ہے۔
نزہت، میں کہتی ہوں جمیلہ! یہ نرسیں بڑی خود غرض ہوتی ہیں۔ اچھا بھئی —— میری اچھی بہن! ذرا حافظے پر زور دو نا —— کہاں ہے وہ دکان ——
جمیلہ، میں کیا کروں؟ خواہ مخواہ پریشان کر رہی ہو۔
شمیم، ہائے تم نہیں جانتیں، مجھے کتنی پریشانی ہوگی۔ عذرا بھی ڈھونڈنے نکلی ہوگی۔ تمہیں یاد ہے نا دکاندار کے پاس صرف دو سوٹوں کا کپڑا تھا۔ کتنی غلطی کی۔ اسی وقت سارا کپڑا خرید لیتی۔ یہ بات تمہیں بھی نہ سوجھی۔ میرا خیال ہے نیلے گنبد کے اس طرف ——
جمیلہ، میں کہتی ہوں کچھ بھی یاد نہیں۔
نزہت، کتنا کمزور ہے تمہارا حافظہ۔

(ساتھ کے کمرے میں ریکارڈ بجتا ہے)

اور سنو! مصیبت اکیلی نہیں آتی۔ رضیہ کے سب سے چھوٹے شیطان نے میرا ریڈیو سیٹ خراب کر دیا ہے۔ آج رات کراچی میں ایک بڑا شاندار مشاعرہ ہو رہا ہے۔ کیسے سن سکوں گی۔ کیا مصیبت ہے۔ یہ رضیہ کی بچی نہ آتی تو کیا اچھا ہوتا۔

(ریکارڈ کے ساتھ قہقہوں کی آواز بھی بلند ہوتی ہے)

جمیلہ، توبہ! (بیزاری اور مایوسی کے عالم میں اپنا سر دیوار سے لگا دیتی ہے)
نزہت، کیا ہوا؟
جمیلہ، کچھ نہیں۔

(پروین پردہ ہٹا کر آتی ہے)

پروین، جمیلہ! طبیعت کیسی ہے؟ سنا ہے ابھی تک نصیبِ دشمناں —— ہے کچھ ایسی بات۔ میرا مطلب ریکارڈ ——
جمیلہ، (بیزاری سے) نہیں کوئی حرج نہیں۔ یہاں تک تو آواز آتی بھی نہیں —— (دیوار سے سر ہٹا لیتی ہے)
پروین، آواز تو آتی ہے —— میں تو لگانے کے لئے تیار نہیں تھی۔ یہ ایک فرینڈ آگئی ہے۔
جمیلہ، کوئی بات نہیں۔
نزہت، نئے ریکارڈ ہیں۔
پروین، شوق ہے تو آئیے۔
نزہت، اچھا دو ایک منٹ بیٹھ جاتی ہوں۔ پھر کپڑے کی دکان ڈھونڈنی ہوگی ... اچھا جمیلہ!

جمیلہ ، اچھا ـــ

(نزہت اپنا پرس اٹھا کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہے ۔ اب کمرے میں جمیلہ کے
سوا اور کوئی نہیں ۔ ساتھ کے کمرے سے ریکارڈ کی آواز آ رہی ہے باہر سے سیٹیوں
اور قہقہوں کی جھنکار بھی وقفوں کے بعد آ جاتی ہے ۔
جمیلہ پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہے اور مایوسی کی شدت میں آنکھیں بند کر لیتی ہے ۔
گونگی آتی ہے جمیلہ کو اس حالت میں دیکھ کر ٹھٹھک جاتی ہے ۔ مڑنے لگتی ہے مگر
پھر رُک جاتی ہے ۔ اب شام ہو چکی ہے ۔ کمرے کا وہ حصہ نسبتاً روشن ہے ۔
جہاں پلنگ بچھا ہے کیونکہ کھڑکیوں کے باہر میونسپلٹی کا بلب روشن ہے ۔
گونگی آہستہ آہستہ جمیلہ کی طرف آ رہی ہے ۔ دروازے کے باہر کوئی نرس گاتے
ہوئے گزرتی ہے ۔

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں ، مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

آخری لفظ بلند ہانگ " زباں ما ـــ " زباں " میں ڈوب جاتا ہے ۔ ساتھ کے کمرے
سے قہقہوں کی جھنکار آتی ہے ـــ جمیلہ پریشان ہو کر اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس
لیتی ہے ۔ گونگی دروازہ بند کر دیتی ہے ۔ اور جمیلہ کی طرف بڑھتی ہے ۔ آواز مدھم
ہو جاتی ہے ـــ جمیلہ آنکھیں کھول دیتی ہے ۔ گونگی کی طرف دیکھتی ہے ـــ گونگی
آنکھیں جھکائے خاموش کھڑی رہتی ہے)

جمیلہ ، کیا بات ہے ۔ (گونگی نگاہیں جھکائے خاموش کھڑی رہتی ہے)

دروازہ تمہیں نے بند کیا ہے ـــ ؟ بہت اچھا کیا ہے (لہجے میں مایوسی) یہاں کون آئے گا اب ۔ کس کو یہاں آنے کی فرصت ہے
کوئی نہیں ، کوئی نہیں ۔ اس وسیع کائنات میں ہر شخص مصروف ہے ، کسی کو بھی دوسرے کا دُکھ درد سننے کی فرصت نہیں ، کوئی محرم
ـــ (آہ بھر کر خاموش ہو جاتی ہے) ـــ وقفہ ـــ کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں !

(جمیلہ شدتِ تاثر سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہے ۔ گونگی ہاتھ بڑھا کر اس کا سر دبانے لگتی ہے)

نہیں نہ ـــ میرا سر نہ دباؤ ـــ مگر تم ـــ

(جمیلہ آنکھیں کھول لیتی ہے اور اس کی طرف دیکھتی ہے)

ـــ تم کیا کرنے آئی ہو میرے پاس ۔ کیا تمہارا کوئی پروگرام نہیں ہے ؟ تمہیں اتنی فرصت کیسے مل گئی ہے ؟ ؟

(دونوں چند لمحے چُپ چاپ ایک دوسرے کو دیکھتی رہتی ہیں ۔ گونگی کی نگاہوں میں ہمدردی
ہے اور جمیلہ کی آنکھوں میں ایک بُجھی بُجھی سی کیفیت)

میں نے چاہا تھا ـــ کتنا چاہا تھا کہ کوئی آئے میرے پاس آ کر بیٹھے ۔ میرے دل میں جھانکے ۔ میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بہن کی سی ہمدردی

نظروں سے مجھے دیکھے ــــ مگر

(شدّتِ احساس سے دوبارہ آنکھیں بند کر لیتی ہے۔ گونگی اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیتی ہے۔ جمیلہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ اب آخر تک جمیلہ جو کچھ کہے گی کبھی آہستہ آہستہ کہے گی ــــ اور کبھی تیزی سے۔ باہر سے موسیقی کی مدھم آواز آتی رہے گی اور وقفوں کے بعد قہقہے بھی)

یہ دُنیا کتنی عجیب ہے! ــــ کتنی عجیب ہے!

(گونگی اس کے اور قریب ہو جاتی ہے اور بڑی ہمدردی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگتی ہے)

کوئی بھی کسی کے دُکھ درد کو نہیں سمجھتا ــــ کوئی بھی دوسرے کی آنکھوں میں نہیں جھانکتا۔ اس وسیع آبادی میں کتنی اجنبیت ہے۔ کتنی بیدردی، کتنی بے رُخی ہے۔ اگر آج کوئی میرے دل کو ٹٹولتا تو دیکھتا اس کی گہرائیوں میں کتنا بڑا طوفان برپا ہے۔ کتنی ہلچل مچی ہے ــــ اور میں آپ بتاتی

(دو تین لمحے خاموشی)

میں اُسے کیسی درد انگیز کہانی سناتی ــــ! یہ کہانی کوئی بھی نہ سن سکا ــــ کوئی بھی نہیں سن سکا۔ میرا دل اپنا دُکھ کہنے کے لئے کتنا بیقرار تھا ــــ کس قدر بے قرار ہے ــــ اگر کوئی میرے پاس آتا تو میں کہتی دیکھو بہن! آج انسانوں کو کیا ہو گیا ہے۔ ان کے دل کس قدر کٹھور ہو گئے ہیں۔

میں نے ــــ ثریا کو اپنی بہن سمجھا تھا! میں اس کیلئے اپنی جان بھی خوشی سے قربان کر دیتی۔ کیونکہ ایک دن اس نے کہا تھا ــــ "بہن! میں تمام عمر تمہاری ممنون رہوں گی ــــ تم جو کچھ کر رہی ہو وہ ایک سگی بہن بھی اپنی بہن کے لئے نہیں کر سکتی!"

(وقفہ)

میں جان گئی ــــ یہ ایک بہن کی آواز تھی۔ یہ آواز میری رگ رگ، نس نس میں گونج اٹھی ــــ مگر (آواز میں درد ــــ جیسے آواز بھرا گئی ہے) جاتے ہوئے اسے اتنی فرصت بھی نہ ملی کہ مجھ سے مل کر جاتی ــــ اور پھر ــــ پھر (آواز تیز ہو جاتی ہے) اس نے یہ کتنا بڑا ظلم کیا کہ اپنے نوکر کے ہاتھوں نوٹوں کا ایک بنڈل بھیج دیا۔ "میں آنے سے قاصر ہوں ــــ میری طرف سے یہ ناچیز ہدیہ قبول کرو ــــ" (آواز میں درد کی شدّت) ہائے یہ کتنی بے دردی ہے ــــ کیسی دُکھ دینے والی بات ہے۔ ایک بہن کے پیار ــــ ایک بہن کے آنسوؤں کی قیمت نوٹوں میں ادا کی جاتی ہے ــــ ثریا کو کیا ہو گیا تھا۔ ثریا نے کیا سمجھا تھا۔ ایک نرس ــــ صرف ایک نرس!

(جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ گونگی دوپٹے کے دامن سے اس کے آنسو پونچھتی ہے)

سگی بہن ــــ سگی بہن ہی ہوتی ہے ــــ پرائی بہن ــــ اوہ میرے اللہ! ایسا کیوں نہ ہوا۔ ایسا کیوں ہوا ہم دونوں بہنیں تھیں۔ دونوں نے ایک ہی ماں کی آغوش میں پرورش پائی تھی ــــ ایک ہی باپ کے بازوؤں میں جھولا جھولا تھا ــــ پھر کیا ہوا ــــ شکیلہ خوبصورت تھی ــــ اور میرے چہرے کو چیچک نے تباہ کر دیا تھا۔ میں بدصورت ہو گئی تھی ــــ پر اس میں میرا قصور تھا۔ اس معصوم زمانے میں میں نے کونسا جرم کیا تھا ــــ پھر اس کی سزا مجھے اتنی شدید کیوں ملی؟ ــــ آخر مجھے کس جرم کی پاداش میں اتنا دُکھ اُٹھانا پڑا۔

ابا شکیلہ کو گود میں اُٹھا کر بڑے فخر سے اپنے دوستوں کے پاس لے جاتے تھے۔ اور میں ــــ کمرے کے اندر ہی پڑی رہتی

تھی۔ اماں مجھے گود میں اُٹھا کر پیار کرنے لگتیں۔ میں جانتی تھی یہ محبت نہیں رحم ہے۔ صرف رحم ہے۔ اور میرے سینے میں ایک کانٹا سا چبھنے لگتا تھا۔ اور پھر سکول میں ۔۔۔ وہاں بھی شکیلہ کو ڈراموں میں پارٹ دیا جاتا تھا اور مجھے بالکل نظرانداز کر دیا جاتا تھا ۔۔۔!

مجھ پر ہر بات کا ۔۔۔ ہر چیز کا اثر چپکے چپکے ہوتا رہتا تھا۔ شکیلہ مغرور ہو گئی تھی اور میں ۔۔۔ میرے دل میں حسد کا جذبہ چپ چاپ پرورش پا رہا تھا!

اور پھر یہ واقعہ ہوا ۔۔۔ شکیلہ کے لئے ایک چھوڑ بیسیوں رشتے آئے اور میرے لئے صرف ماں کی آہیں اور باپ کے اندیشے۔ انجام یہ ہوا کہ ہم دونوں بہنیں ذرا ذرا سی بات پر ایک دوسرے سے جھگڑ پڑتیں ۔۔۔ اور کئی کئی دن تک گفتگو نہ کرتیں ۔۔۔ ہائے ہمیں کیا ہوتا جا رہا تھا ۔۔۔ ہمارے دلوں میں عداوت کا زہر کیوں بھر گیا تھا ۔۔۔

(وقفہ ۔۔)

میری بدصورتی نے مجھے ندامت پر شکست دی اور ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے سے دُور ہوتی چلی گئیں ۔۔۔ کبھی کبھی تنہائی میں میرا دل بے اختیار چاہتا تھا ۔۔۔ کاش! شکیلہ چپ چاپ یہاں آ جائے اور میں سارا زہر ۔۔۔ ساری گندگی آنسوؤں کے سیلاب میں بہا کر کہوں۔ شکیلہ! ہم بہنیں ہیں ۔۔۔ ہماری رگوں میں ایک ہی خون گردش کر رہا ہے ۔۔۔ ہم کیوں بیکار کڑھتی رہتی ہیں ۔۔۔ ہم کیوں پاگل ہو گئی ہیں ۔۔۔ لیکن شکیلہ کے غرور نے اسے کبھی تنہائی میں میرے پاس آنے کی اجازت ہی نہ دی ۔۔۔ وہ کبھی میرے دل کے دروازے پر دستک نہ دے سکی ۔۔۔! میں یہ سوچ کر رو پڑتی ۔۔۔ اور دیر تک روتی رہتی۔

شکیلہ کی شادی ہو گئی اور وہ اپنے دولت مند شوہر کے ہمراہ ایران جانے لگی ۔۔۔ میں نے چاہا آخری بار ہی اپنے دل کی حسرت نکال کر اُسے گلے سے لگا لوں۔ پر یہ حسرت بھی پوری نہ ہو سکی ۔۔۔!

۔۔۔ شکیلہ چلی گئی اور میں ایک دائم المرض شخص سے بیاہ دی گئی ۔۔۔ پھر ابا اور اماں ۔۔۔ ہمیشہ کے لئے رُخصت ہو گئے۔ وقت گذرتا گیا ۔۔۔ گذرتا چلا گیا۔ میرا شوہر بھی مر گیا ۔۔۔ اور مجھے زندہ رہنے کے لئے ہسپتال میں نوکری کرنی پڑی۔ پھر ایک سال اور گذر گیا اور ۔۔۔

(جمیلہ کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگتے ہیں۔ اس کی آواز بھرّا جاتی ہے
گونگی دوپٹے سے اُس کے آنسو پونچھتی ہے۔ اس کی اپنی آنکھیں نم آلود
ہو گئی ہیں)

پھر شکیلہ کا طویل خط آیا۔ اُس نے لکھا تھا ۔۔۔ میں مرنے والی ہوں۔ آخری وقت میں میری حسرت ہے کہ تم کو گلے سے لگا کر اپنی بدسلوکیوں کی معافی مانگ لوں۔ میں نے ہمیشہ تم سے بدسلوکی کی ہے ۔۔۔ مگر تنہائی میں مجھے ہمیشہ افسوس ہوتا رہا ہے۔ اگر تم کسی دن تنہائی میں میرے پاس آ جاتیں تو میں ضرور تمہیں گلے لگا لیتی ۔۔۔ پر تم مجھ سے دُور دُور رہیں۔ ہائے میں سمجھتی رہی تم حاسد ہو اور چاہتی ہو کہ میں بھی تمہاری طرح بدصورت ہو جاؤں ۔۔۔ کاش اس وقت تم میرے پاس ہوتیں اور میں تم سے معافی مانگ کر دُنیا سے رُخصت ہوتی ۔۔۔ کاش ۔۔۔

(وقفہ)

یہ شکیلہ کے الفاظ تھے اور ایک دم مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے میری رگ رگ میں ایک طوفان سا برپا ہوگیا ہے' میرا جی چاہتا تھا کہ میرے پر لگ جائیں اور میں اڑ کر بہن کے پاس پہنچ جاؤں۔ پر ——

(وقفہ)

بہن انتظار نہ کرسکی —— وہ چلی گئی۔ اور میرے دل میں طوفان برپا رہا۔ برپا رہا

(وقفہ)

میرے دل میں کتنی حسرت تھی کہ کوئی بہن بن کر میری زندگی میں داخل ہو —— کوئی بہن کہہ کر مجھے پکارے —— کوئی بہن سمجھ کر میرا دُکھ درد بٹائے. کوئی ——

(گونگی اپنا چہرہ اس کے اور قریب لے آتی ہے۔ دونوں آنسو بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگتی ہیں۔ وقفہ۔ گونگی کا چہرہ بالکل قریب چلا آجاتا ہے —— آنسوؤں سے اس کے رخسار گیلے ہوگئے ہیں —— جمیلہ بیتاب ہوکر اپنے بازو اس کی گردن میں حمایل کردیتی ہے)

بہن! —— میری بہن!

گونگی: آں —— آں —— م —— م —— ماں!

(ساتھ کے کمرے سے سازوں کا ریکارڈ بجتا ہے —— دونوں کی سسکیوں کی آواز ساز میں ڈوب جاتی ہے)

ڈاکٹر مسعود حسین

دکھ درد کو حیواں سے کہو کیا حاصل
غم اپنا بیاباں سے کہو کیا حاصل
جس نے کسی انساں کی پرستش ہی نہ کی
اس طور کے انساں سے کہو کیا حاصل
جس سے نہ پڑے دل پہ اک ہلکی سی پھوار
اس خندۂ خوباں سے کہو کیا حاصل
شبنم کا مقدر نہ بدل جائے جب
ان انجمِ نگراں سے کہو کیا حاصل
جو چہرۂ مفلس کو نہ کر دے گلرنگ
اس گنبدِ ایواں سے کہو کیا حاصل
دل رکھ بھی دیں ہم نوک پہ سوزن کی مگر
اس مشکلِ آساں سے کہو کیا حاصل
یہ زخم نہ بھر پائے گا کوئی جا کہ
اس زرد و پشیماں سے کہو کیا حاصل

آنکھیں تو فروزاں ہی رہیں گی مسعود
پھر درد کے درماں سے کہو کیا حاصل

زہرا نگاہ

ساقی بھی نہیں، اور مے بھی نہیں کچھ شوق کے ساماں بدلے ہیں
صد شکر زمانے کی گردش! وہ شوخ نگاراں بدلے ہیں

رنگوں کی دمک پھیکی پھیکی، پھولوں کی مہک ہلکی ہلکی
کتنے ہی جگر جب خون ہوئے، تب رنگِ گلستاں بدلے ہیں

بلبل کی کہانی ختم ہوئی، گلچیں کا فسانہ جاری ہے
نالوں میں نہیں اب شکوۂ گل، اندازِ بہاراں بدلے ہیں

ہم ہوش و خرد کے سودائی، کیا کھاتے زمانے کی چوٹیں
انداز تھا جن کا نازِ جنوں، وہ چاک گریباں بدلے ہیں

راتوں کا مسلسل اندھیارا سایہ ہے ڈوبے سورج کا
ہیں جن کے اندھیرے مرگِ نظر، ہم نے وہ شبستاں بدلے ہیں

مسعود قریشی

حالِ دل حرف و حکایت سے بیاں کیا ہو گا
رازِ دل دل سے بھی پنہاں ہے عیاں کیا ہو گا

اب نہ قربت ہے کرم اور نہ فرقت ہے ستم
اور تکمیلِ محبت کا نشاں کیا ہو گا

دل نے بے فیض بہاروں کے ستم جھیلے ہیں
دل پہ اب اور گراں جورِ خزاں کیا ہو گا

ہر نظر نور فشاں، ہر نفس الہام رساں
یہ ہیں رندانِ مغاں! پیرِ مغاں کیا ہو گا!

ہر قدم سجدۂ مستانہ، نظر موجِ شراب
اور معراجِ صبوحی زدگاں کیا ہو گا؟

حافظ لدھیانوی

کہاں سے لے آگئی ہے مجھے گردشِ زمانہ
نہ نوائے دردمنداں، نہ ادائے دلبرانہ

تھے عجیب حشر ساماں دلِ پُرسکوں کے لمحے
مجھے اور یاد آیا ترے ہجر کا زمانہ

جو حرم کے پاسباں تھے وہ گدائے میکدہ ہیں
تھی کمال فتنہ پرور وہ نگاہِ کافرانہ

مری داستانِ غم میں کئی رنگ بھر گیا ہے
ترا عذرِ کیف پرور، ترا دلنشیں بہانہ

کہیں بوئے گل نہ ٹھہری کہیں رنگِ گل نہ نکھرا
مجھے چھوڑ کر اکیلے ہوا کارواں روانہ

اسی موجِ بےخودی میں ہمیں کل ملا تھا حافظ
وہی ہر قدم پہ لغزش وہی رنگِ شاعرانہ

جمیل الدین عالی

نہ میں بیاضِ سحر ہوں نہ میں سوادِ شبی!
بس ایک آہ مگر وہ بھی آہِ زیرِ لبی

چھلک سکا ہے نہ اب تک جو اشکِ نیم شبی
اسی میں ہیں تہ سے سب ہائے زیرِ لبی

سمجھ میں کچھ نہیں آتا یہ رازِ مسلکِ شوق
کبھی وفا طلبی ہے کبھی جفا طلبی

رہے سب ان کی شرابِ نگاہ کے قائل
کوئی سمجھ نہ سکا میرا رازِ تشنہ لبی

سخن میں تمکنت و ضبطِ شوق کے احکام
مگر نظر میں وہی شوخی و خطا طلبی

سُنا نہیں کبھی غالبؔ کا حال اے عالیؔ
یہی ہوا ہے ہمیشہ مآلِ خوش ادبی

اخلاق زیامی

پرویز وہی، ظلم کا معیار وہی ہے فرہاد وہی جذبۂ ایثار وہی ہے

نخچیرِ ہوس آج بھی ہے حسن کا جادو یوسف کیلئے مصر کا بازار وہی ہے

سنتے تھے کہ حالات بدل جائینگے لیکن بدلے ہوئے حالات کی رفتار وہی ہے

تابِ تبِ احساس کہ ہو جرأتِ اظہار ہر رنگ میں یاں سلسلۂ دار وہی ہے

بے رونقیِ انجمنِ ناز کہوں کیا بے رنگیِ چشم و لب و رخسار وہی ہے

ہر گام پہ آسودگیٔ شوق کے بدلے کم مائگیٔ حسرتِ دیدار وہی ہے

کہنے کو بہار آئی مگر اپنے چمن میں صیاد وہی کوششِ آزار وہی ہے

اک جنسِ تجارت ہے ابھی آبروئے زن

غارت گریٔ درہم و دینار وہی ہے

امین راحت چغتائی

مجھے تردد نہیں وفا کے نقوش کیسے نکھر سکیں گے
فقط بتا دو کہ پرسشِ غم سے زخمِ ہستی کے بھر سکیں گے؟

بزعمِ خود زندگی کی خاطر جو دور رہنے لگے ہیں ہم سے
اک ایسا بھی آئے گا زمانہ، وہ جی سکیں گے نہ مر سکیں گے

لپک رہے ہیں وہ گل کی جانب، سلگ رہا ہے دماغ اپنا
کہ خارزاروں سے آج کیسے بچا کے دامن گذر سکیں گے

لبوں پہ مہریں لگانے والو اسے قابلِ غور یہ بھی پہلو
نگاہیں اپنی کریں گی باتیں، اگر لبوں سے نہ کہہ سکیں گے

کہاں کے گوہر یہ سنگ ریزے ہی چوم لو، آج تو زنانہ
کچھ ایسی گہرائی میں گئے ہیں کہ اب نہ شاید ابھر سکیں گے

حضورِ احباب ذکرِ ظلم و ستم یونہی چھڑ گیا تھا، ورنہ
کسے خبر تھی نظر ملا کر وہ بات تک بھی نہ کر سکیں گے

کشاکش و حادثاتِ طوفاں سے اعتمادِ نظر نہ کھونا
جو ڈوبنا جانتے ہیں راحتؔ وہی سفینے ابھر سکیں گے

نشاط عزیز

اشارے

امتیاز جبیں ایم اے

انگریزی تعلیم رائج ہو جانے کے کچھ عرصہ بعد نوجوان لڑکوں کی بعینہ یہی حالت تھی۔ جو آجکل امتیاز جبیں ایم اے کی ہے ـــــ بہرحال کالج کا سکول لڑکا یہ توقع لے کر جاتا کہ بی اے کر لینے کے بعد اس کے وارے نیارے ہو جائیں گے ـــــ نسلوں کی کلفت دھل جائے گی۔ اور صدیوں کی مصیبتوں کا مداوا ہو جائے گا ـــــ والدین محنت مزدوری کر کے ـ قرضے لے کر ـ سامان بیچ بیچ کر لڑکوں کو پڑھاتے۔ ماں مصیبت کے دن یہ کہہ کہہ کر کاٹتیں کہ اب چند دن کی سختی اور ہے ـــــ میرا بیٹا بی اے کر لے ـــــ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور چودہ سال کی محنت کے بعد ـــــ لڈو مٹھائیاں بٹنے کے بعد ـــــ جب لڑکے دفتر بہ دفتر جوتیاں چٹخاتے پھرتے اور ہر طرف سے "جگہ نہیں" "جگہ نہیں" کی گردان سنتے ـــــ تو دکھ اور مایوسی کے پہاڑ ان پر ٹوٹ پڑتے ـــــ چنانچہ اگر دس بارہ برس پہلے کے مقبول رسائل اٹھا کر دیکھے جائیں ـــــ تو ان میں اکثریت ان کہانیوں کی ہو گی ـــــ جن کا موضوع اس قسم کی مایوسی اور دکھ ہے ـــــ حالات ابھی تبدیل نہیں ہوئے ـــــ نچلے متوسط اور متوسط طبقے کے لڑکوں کو تعلیم کے لئے بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے ـــــ لیکن ماضی کے تلخ تجربات نے اس نسل کی توقعات کو بڑی طرح متاثر کر رکھا ہے ـــــ اور انہوں نے کولہو کے بیل کا یہ چکر "تہہ دہ دیش بر جانِ درویش" قبول کر لیا ہے۔ کہ پیٹ کاٹ کر پڑھو ـــــ پھر سو لیک سو بیس کی کلرکی کرو ـــــ اور دنیا کو چند اور کلرک چند اور کلرکوں کی بیویاں سونپ کر اللہ تو تعلق کر اور چور چور ہو کر دنیا سے رخصت ہو جاؤ ـــــ

تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے شاید اسی لئے جو پاپڑ معذرحسین بی اے کو بیلنے پڑے تھے۔ وہ اب امتیاز جبیں ایم اے بیل رہی ہے ـــــ تعلیم نسوان کے رائج ہونے سے پہلے لڑکیوں کا شعور ابھی بیدار بھی نہیں ہونے پاتا تھا۔ کہ انہیں ازدواجی زندگی میں دھکیل دیا جاتا تھا ـــــ شروع شروع میں وہ نئے کپڑے پہن کر خوش ہو جاتیں بعد میں گھر اور بچوں کی محبت انہیں ڈالنے والے حساب میں اس طرح الجھتیں۔ کہ مرتے دم تک انہیں فرصت ہی نہ ملتی ـــــ کہ وہ ایک نظر اپنی زندگی پر ڈال کر "کیا؟ اور کیوں؟" کے متعلق غور کر سکیں ـــــ پھر زمانے کے تقاضے اور مغربی تہذیب کے اثر سے تعلیم عورتوں میں بھی عام ہونے لگی ـــــ لڑکیاں گھر کی چار دیواری سے نکل کر سکول پہنچیں سکول سے کالج۔

اور کچھ عرصے کے بعد کالج سے یونیورسٹی ـــــ اور کولہو کے اندھے بیلوں کی جگہ آہستہ آہستہ دیکھنے سننے والے باشعور انسان جنم لینے لگے ـــــ یہاں تک تو سب کچھ ٹھیک تھا ـــــ لیکن مشکل یہ آن پڑی ـــــ کہ بیل تبدیل ہو گئے ـــــ کولہو ہوں کے توں رہے ـــــ

پروفیسر علی حماد عباسی "امتیاز جبیں ایم اے" میں اسی جیتی جاگتی لڑکی کے مسائل بیان کرتے ہیں۔ جس سے انجام کار گھر میں جینے کی توقع کی جاتی ہے۔ ——— ایک طوفانی رات کی صبح وہ اپنے دریچے میں کھڑی اپنی زندگی کا جائزہ لیتی ہے ——— رات کے طوفان سے گل مہر کا وہ درخت ٹوٹ چکا ہے ——— جس کے نیچے اس نے سہانے خواب دیکھے تھے ——— اور یہ گویا علامت ہے اس کی زندگی میں مایوسی کی مکمل فتح کی! ——— اپنے سامنے خاموش لمبی لمبی سڑک کا تھکا تھکا لامتناہی سفر دیکھ کر اسے اپنی زندگی کے مختلف دور یاد آ جاتے ہیں۔ سکول کے زمانے کا لاابالیانہ پن اور اطمینان کالج کا ٹھہراؤ اور بیداری ——— جس میں اس کا شعور بیدار ہوا ——— اس کی انفرادیت کی تکمیل ہوئی ——— اس کی زندگی کا ہر گوشہ اس کے ذہن میں تھا ——— یونیورسٹی کا زمانہ جہاں امید میں مایوسی اور تحصیل کے سنگم پر تھیں ——— اور اس طویل جدوجہد کا انجام بالآخر خود طبیعت ... روپے کی نوکری پر ہوا ——— پریوں کی کہانی ختم ہو چکی تھی ——— ایک بڑی ہی خشک صبح کا آغاز ہو رہا تھا۔ ——— پہلی دفعہ امتیاز جبیں نے زندگی کو تصورات کے رنگین شیشے چڑھائے بغیر ننگی آنکھوں سے دیکھا ——— اور سوچا ——— "آخر اس زندگی کا انجام کیا ہے ——— سوائے قبر ... اور ... ہے ——— بلاشبہ وہ پڑھا رہی تھی ——— اور یہ بھی زندگی کا مقصد بنایا جا سکتا ہے ——— لیکن غیر شعوری طور پر اسے معلوم تھا کہ اس دنیا میں مسرت بڑھانے کی بجائے وہ چند سال بعد اپنی ہی طرح کی سو دو سو اور لڑکیوں کو سہانے خواب دیکھنے کا موقع دے کر جو دہ معاشرے میں زندگی کی تلخیوں اور ناامیدیوں کے حوالے کر دے گی ——— شادی کے خیال سے اسے سکون نہیں ملتا تھا۔ کیونکہ مردوں کو بیویوں سے پہلے تعلیم یافتہ بیوی کی خواہش ہے اکثر ... والدین کو اپنی لڑکیاں کالج بھیجنے پر مجبور کر دیا تھا ——— اب اچانک محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ گھریلو بیویاں بہتر ہوتی ہیں ——— جن کی تعلیم "بہشتی زیور" تک محدود ہے ——— اور اسے اگر کوئی رشتہ مل بھی سکتا تھا ——— تو ایسا جو اس کے خوابوں سے کوسوں دور تھا۔

موضوع کے لحاظ سے پروفیسر عباسی کا افسانہ ایک اہم مسئلے کو محیط ہے ——— فنی نقطہ نظر سے البتہ افسانے میں چند خامیاں ہیں ——— امتیاز جبیں کے ذریعے وہ ایک اوسط درجے کی تعلیم یافتہ لڑکی کے مسائل بیان کرنے میں اس قدر محو ہو گئے ہیں ——— کہ امتیاز جبیں میں کوئی انفرادیت نہیں رہی۔ نہ ——— اس کی کالج کی زندگی۔ اس کی یونیورسٹی کی زندگی کی کوئی واضح تصویر ذہن میں ابھرنے نہیں پاتی ——— نہ اس کے انفرادی معیار زندگی کا کچھ اندازہ ہو پاتا ہے ——— اسی طرح اس کا پس منظر بھی بے حد دھندلا ہے ——— اس کی صورت چال ڈھال کے متعلق بھی کوئی خاکہ ذہن میں نہیں ابھرنے پاتا۔ وہ لڑکا جو امتیاز کو یونیورسٹی میں چھیڑا کرتا تھا اور جس کی طرف امتیاز بھی ملتفت تھی ——— اس کی خوابوں کی دنیا کا باشندہ ——— کوئی شہزادہ ——— تو نہیں ہو سکتا ——— کیونکہ آخر میں وہ سوچتی ہے ——— "نجانے کہاں ہوگا بیچارہ ——— اس وقت کس حال اور کن مصیبتوں میں ہوگا ——— ہو سکتا ہے کہیں کلرکی کر رہا ہو۔ یا اس کی طرح کسی سکول یا کالج میں اپنے بیکار دن گزار رہا ہو ——— اس لئے افسانہ ختم کرتے وقت اتنی شدید تعجب اور ہمدردی کا احساس ہوتا ہے ——— کہ وہ ابھی تک اپنی رومانیت سے رہائی حاصل نہیں کر سکی ——— شرارتی لڑکے کی کلائی کا خیال کر کے فوراً وہ سوچتی ہے ——— کاش ان تپکتے ہوئے بادلوں کے سائے میں ان ٹھنڈی ٹھنڈی ہواؤں کے ارغنوں کے ساتھ وہ آ جائے ——— وہ آ کر اسے خوابوں میں پکارنا شروع کر دے ——— تو پھر زندگی کی سوکھی ٹہنیوں میں پھر سے کونپلیں پھوٹ نکلیں۔ اور زندگی کے ویران رستے پھر سے سنور جائیں ———" وہ ابھی تک اس حقیقت کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکی ——— کہ جس معاشرے نے المیہ وہ خود اس کے خوابوں کو شکست دی ——— وہ اچانک پلٹا کھا کر پریوں کی دنیا کس طرح بن جائے گی ———؟

عظیم مرتضیٰ

منظر و پس منظر

فلم میں وقت اور فاصلے کا تصور

ابتدائی دور میں جب ابھی اسے ایک باضابطہ فن کا درجہ میسر نہیں ہوا تھا۔ فلم کی حیثیت محض متحرک عکاسی کی تھی، دورِ آغاز کی مختصر فلموں سے قطع نظر جو صرف چند ایک مناظر کی عکاسی سے عبارت تھیں۔ اور جنہیں صرف حرکت کا عنصر معمولی سے ممتاز کرتا تھا۔ بعد کی فلمیں بھی متحرک عکاسی کی حدود سے نکل کر آگے نہ بڑھ سکیں اس لئے کہ ابھی فلم کے وہ مخصوص تکنیکی ذرائع دریافت نہیں ہوئے تھے۔ جن کی بنا پر فلم کو بعد میں ایک منفرد اور باضابطہ فن کی حیثیت ملی اور جو فلم اور تھیٹر میں وجہِ امتیاز ثابت ہوئے اس وقت تک فلم سازی کی نوعیت تھیٹریکل پیش کش سے کچھ ایسی مختلف نہ تھی، ڈراموں کو بعینہٖ اسی انداز اور ترتیب سے فلموں میں منتقل کر دیا جاتا تھا جس انداز اور ترتیب سے وہ سٹیج پر کھیلے جاتے تھے، تھیٹر اور فلم کا فرق اس سے آگے نہ بڑھ پایا تھا۔ کہ تھیٹر میں اداکار بذاتِ خود موجود ہوتے تھے اور فلم میں صرف اُن کی تصویریں ہوتی تھیں بعد ازاں جب ابتدائی مراحل طے ہو جانے پر فلم کے امکانات وسیع تر ہوتے گئے تو اس بات کا احساس بھی کیا جانے لگا کہ فلم نہ صرف حالات و واقعات کی محض عکاسی ہی کر سکتی ہے بلکہ حالات و واقعات کو ایک ایسے مخصوص انداز سے بھی پیش کر سکتی ہے جو سٹیج پر ممکن نہیں۔

سٹیج پر ڈرامے کا تسلسل، وقت اور فاصلے کے تعین سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر ایک اداکار کو سٹیج کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک پہنچنے کے لئے ایک مخصوص وقت میں ایک مخصوص فاصلہ طے کرنا پڑتا ہے اور یہ وقت اور یہ فاصلہ اصل وقت اور اصل فاصلہ ہوتا ہے۔ جس میں سے کسی درمیانی وقفے کو خواہ وہ ڈرامائی نقطۂ نظر سے کتنا ہی غیر ضروری کیوں نہ ہو حذف نہیں کیا جا سکتا، اس میں شک نہیں کہ ڈرامے میں ایسے طویل وقفوں کو حذف کرنے کے لئے ایکٹ اور منظر کی تبدیلی سے کام لیا جاتا ہے جس کی مدد سے ایک منظر سے دوسرے منظر اور بالخصوص ایک ایکٹ سے دوسرے ایکٹ تک پہنچنے میں تماشائی کو ایک خاص مدت گزر جانے کا احساس دلایا جاتا ہے (ڈرامے کے پلاٹ کی تشکیل اور اس کی مختلف ایکٹ اور مناظر پر تقسیم دراصل وقت اور فاصلے کے انہی تقاضوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے) لیکن ایک ہی منظر کے دوران میں ایسا نہیں کیا جا سکتا، اس کے برعکس فلم میں تدوین کی بدولت واقعات کا وقت اور فاصلے کے فطری تقاضوں کا پابند ہونا ضروری نہیں اور یہ آزادی فلم میں نہ صرف ایک تکنیکی سہولت بہم پہنچاتی ہے بلکہ اس کی تکنیک کا ایک بنیادی جزو بھی ہے، فلم میں واقعات کے تسلسل کا انحصار اس ترتیب پر نہیں ہوتا جس ترتیب سے وہ دراصل وقوع پذیر ہوں بلکہ اس کا دار و مدار فلم کے متعلقہ ٹکڑوں کے انداز ترتیب یا تدوین پر ہوتا ہے۔ اصل واقعہ اور اس کی فلمی صورت میں ایک خاص فرق ہوتا ہے۔ اور یہی فرق فلم کو محض متحرک عکاسی کی بجائے ایک منفرد فنی حیثیت دیتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر ایک کردار کو کسی بلند عمارت سے گرتے ہوئے دکھانا مقصود ہو تو اس کی صورت کچھ اس طرح ہو گی۔ پہلے اس کردار کے عمارت کی چوٹی سے کسی

جال وغیرہ میں گرنے کا منظر فلمایا جائے گا۔ لیکن اس انداز سے کہ جال نظر نہ آئے اس کے بعد اُسے زمین کی سطح سے کچھ اوپر سے گرتے ہوئے دکھایا جائے گا۔ اور جب یہ دونوں ٹکڑے یکے بعد دیگرے سکرین پر پیش کئے جائیں گے تو تماشائی کو اس بات کا احساس تک نہ ہونے پائے گا کہ منظر اصل واقعہ کے صرف آغاز اور آخری حصے سے عبارت ہے اور یہ کہ یہ حادثہ دراصل وقوع پذیر نہیں ہوا بلکہ محض سکرین پر ایسا ہوتے دکھایا گیا ہے۔ عمارت کی چوٹی اور زمین کی سطح سے کچھ اوپر کے درمیانی فاصلے کو حذف کر دینے کی تکنیک بہت حد تک وہی ہے جس سے ڈرامہ میں ایک ایکٹ سے دوسرے ایکٹ تک پہنچنے میں کئی ایک سال گزر جانا فرض کر لیا جاتا ہے۔

فلم کی اس مخصوص تکنیک سے جسے فنی اصطلاح میں تدوین کہتے ہیں واقعات اصل وقت اور فاصلے کے اصول کے پابند نہیں رہتے۔ بلکہ اس سے وقت اور فاصلے کا ایک علیحدہ منفرد وجود میں آتا ہے جسے فلمی وقت اور فلمی فاصلہ کہنا چاہئے، عمارت سے گرنے کی جو مثال دی گئی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ سکرین پر اس واقعے کے وقوع پذیر ہونے کا عرصہ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو اسے درحقیقت پیش آنے میں درکار ہوگا۔ اسی طرح سکرین پر جاتے میں جو فاصلہ طے ہوتے ہوئے دکھایا جائے گا وہ یقیناً اتنا نہیں ہوگا جو عمارت کی چوٹی سے زمین کی سطح تک حائل ہے۔

ایک اور مثال سے شاید یہ فرق واضح تر ہو سکے، فرض کریں ایک منظر میں ایک شخص کو باہر کھڑکی سے کمرے میں کسی کو گولی مارتے، دوسرے منظر میں زخمی کو فرش پر گرتے اور تیسرے میں قاتل کو بھاگ کر گلی سے نکلتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، اب یہ تینوں منظر مختلف مقامات پر بھی لئے جا سکتے ہیں لیکن سکرین پر ان کے یکے بعد دیگرے نمودار ہونے سے مقامات کا اختلاف ظاہر نہیں ہونے پائے گا باوجود اس کے کہ تماشائی کے نزدیک جس مقام پر یہ واقعہ پیش آئے گا۔ اس خاص مقام کا مجموعی صورت میں سکرین سے قطع نظر کوئی وجود نہیں ہوگا، اسی طرح یہ فلمی واقعہ اصل واقعہ کی بجائے صرف اس کے اہم ترین حصوں کی فلم بندی سے عبارت ہے جس میں سے کچھ حصے اور اُن کی درمیانی مدت کو اس انداز سے حذف کر دیا گیا ہوگا کہ تماشائی کو اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔

فلمی وقت اور فلمی فاصلے کا اصل وقت اور اصل فاصلے سے یہ اختلاف فلم کی ایک بنیادی خصوصیت ہے جو فلم ساز کو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تاثر پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے، صرف مکالمات کی ادائیگی کا دوران ہی ایک ایسا مرحلہ ہے جہاں اس تکنیک کی سہولت سے فائدہ نہیں اٹھایا جا سکتا اس لئے کہ گفتگو کا عرصہ فلم میں بھی وہی رہے گا جو درحقیقت ہوتا ہے، دورانِ مکالمہ میں فلم "قیدِ زماں" سے آزاد نہیں ہو سکتی۔

جائزے

غم کاکل — مصنف سیف الدین سیف ۔ کتابت و طباعت ، نہایت خوبصورت ، قیمت چار روپے ۔ ناشر ، مکتبۂ کاروان لاہور

زندگی ہر سمت ، ہر جگہ ہر کہیں پھیلی ہوئی ہے ، اسے دیکھنے کے مختلف زاویے ہیں ، ہر شخص اپنے مقام سے دیکھتا ہے ، آنکھیں سب کی اپنی اپنی ہیں ، ہر شخص زندگی کے ہر مسئلے پر نہیں سوچتا ، ہر بات ہر شخص پر عیاں بھی نہیں ، قطرے میں سب کو دجلہ اور جزو میں ہر کسی کو کل موجود دکھائی نہیں دیتا اگر سنگ میں نقش بتان آذری ہم نہیں دیکھ سکتے ، غالب دیکھتا ہے اور ہمیں دکھاتا ہے ، ہم اس کے دیکھے ہوئے یا دکھائے ہوئے کو دیکھتے ہیں ۔ غالب نے جو کہا تھا کہ "کھیل بچوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا" تو یہ بھی اسی بات کے ایک پہلو کی طرف اشارہ ہے (اصحاب کہتے کا یہ انداز بھی غالب کا اپنا انداز ہے !!!) ورنہ یوں نہ ہوتا کہ غالب کسی سے متاثر ہوا نہ کوئی اس سے الگ اور مختلف ہو ۔

سیف نے اس وسیع و عریض دنیا سے ، ہر سمت ، ہر جگہ اور ہر کہیں پھیلی ہوئی بیکراں زندگی سے اپنے لئے گیسوؤں کے سائے اور زلفوں کی چھاؤں انتخاب کر لی ہے ۔ اُسے یہی مقام ہر طرح کے مسائل اور دور دراز کے گوناگوں ، پیچ در پیچ اندیشوں اور افکار سے ہٹا ہوا اور بچا ہوا ایک گوشۂ عافیت نظر آتا ہے ، جہاں دنیا جہان کے ستائے ہوئے ہراساں و پریشان غمزدہ دل آ کر دم لیتے ہیں ، اُنہیں پناہ ملتی ہے ۔ یہ مقام اُسے بہت عزیز ہے ، اور ہونا بھی چاہئے ، اپنا گھر ہر کسی کو پیارا ہوتا ہے ، یہاں نہ گلیوں اور شہروں کے ہنگامے اور ہما ہمی ہے ، نہ انسانوں کا شور و شر ہے ، نہ کشت و خون ، نہ کوئی اور فساد !! —— ہاں کبھی کبھی کوئی آہٹ اس کے گھر کی دیواروں کے نیچے تک پہنچ جائے اور سیف کو سنائی بھی دے جائے ۔ تو وہ غم کاکل کی اوٹ سے باہر جھانکنے پر بعض اوقات مجبور ضرور ہو جاتا ہے (اور وہ بھی اسی لئے کہ اُسے اپنا گھر بہت پیارا ہے اور اس میں کوئی خلل گوارا نہیں ، یہاں یہ عرض کر دوں کہ جھانکنے ، دیکھنے اور سوچنے میں فرق ہے ، ان تینوں لفظوں کے درمیان بڑے بڑے فاصلے ہیں ۔ —— !!

یہ کہنے کو تو کوئی میر یا حافظ کے ایک شعر کے تحت آئین سٹائن کا نظریۂ اضافیت ، اور کارل مارکس کا تمام داس کیپٹل بھی کھینچ کے رکھ دے کوئی اُسے کیا کہہ سکتا ہے ، لیکن زیادتی بہر صورت زیادتی ہے ۔ میر حافظ بیچاروں نے آئین سٹائن اور کارل مارکس کا نام کب سنا ہوگا ۔ فرائڈ اور غالب دونوں عظیم انسان ہیں ، غالب بھی خواب اور خیال کا ذکر کرتا ہے اور فرائڈ بھی illusions کا اور جنت اور دوزخ کے تصور پر خیال آرائی کرتا ہے لیکن غالب اور فرائڈ دو الگ الگ شخصیتیں ہیں ۔

سیف ایک غزل گو شاعر ہے اور بڑے خلوص سے بڑی محبت سے غزل کہتا ہے ، اگر کوئی اس میں اندیشہ ہائے دور دراز ڈھونڈنا شروع کر دے گا ، تو غزل ختم ہو جائیگی ، شعر مر جائیگا ، اور اندیشہ بھی باقی نہ رہے گا ، پھول سائنس کی تجربہ گاہوں اور شہر کی پر شور گلیوں میں جا کر زندہ نہیں رہ سکتا اس لئے کہ وہ وہاں کی چیز نہیں ! وہ جو کچھ ہے ، جیسا ہے اپنی شاخ پر ہے !! اپنی فضا میں ہے ۔

اللہ اللہ وہ ستمگر بھی یہی کہتا ہے   ہم سے یہ ڈر کے مارے نہیں دیکھے جاتے

دھجیاں دیکھ کے ہنستے ہیں گریبانوں کی   اُن سے یہ دل بھی ہمارے نہیں دیکھے جاتے

میں ان اچھے بھلے غزل کے اشعار کو کسی ملک کے معاشی و اقتصادی اور عمومی مسائل کا آئینہ نہیں کہہ سکتا ، اور نہ کبھی یہ سوچتا ہوں کہ سیف نے کسی پبلک ہسپتال میں مریضوں کی چیخیں اور ڈاکٹر کی بے رخی اور بے بسی دیکھ کر یہ شعر لکھے ہوں گے ، کیونکہ اس طرح "غزل" ضائع ہو جائے گی ۔

"خیمِ کامل" سیف کی غزلوں کا مجموعہ ہے۔ اس کی ہر غزل کو غزل کی طرح دیکھنا چاہیئے۔ اس میں اچھی اچھی غزلیں ہیں، اور تقریباً ہر غزل میں اکثر اشعار اچھے ہیں۔ اس میں چند قطعے نظمیں اور گیت بھی شامل ہیں، لیکن اُن میں بھی تغزل زیادہ ہے۔ اس لئے کہ سیف بنیادی طور پر ایک غزل گو ہے۔ وہ دین و حکمت، سائنس یا فلسفہ کا طالب علم ہرگز نہیں، اور نہ ہی وہ حالاتِ حاضرہ پر اخباروں کے کالم یا معاشیات پر کتابیں لکھتا ہے۔

(سید یعفی ترمذی)

پانی کا درخت ——— مصنف: کرشن چندر۔ کتابت و طباعت عمدہ۔ قیمت تین روپے۔ ناشر: پائنیر پبلشنگ ہاؤس لاہور

برعظیم کی تقسیم کے بعد کرشن چندر کے افسانوں کا یہ پہلا مجموعہ ہے جو پاکستان میں شائع ہوا ہے بعض نقادوں کا خیال ہے کہ کرشن چندر آجکل جو کچھ لکھ رہے ہیں ان میں افسانے کی فنی خصوصیات برقرار نہیں رہ سکیں اور یہ افسانوں کی بجائے سیاسی مضامین ہو کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات بالکل غلط نہیں ہے تاہم اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان دوستی کا وہ شدید جذبہ جو کرشن چندر کی ہر تخلیق میں رواں دواں ہے اور انداز بیان کی وہ روانی اور صد رنگی جس سے کرشن چندر کی کوئی ذہنی کاوش محروم نہیں رہتی۔ یہ دونوں چیزیں یہاں بھی موجود ہیں اور پڑھنے والوں کو ہر جگہ اس کا احساس رہتا ہے کہ جو کچھ وہ پڑھ رہا ہے اس کے پس منظر میں ایک بہت وسیع' انسانوں سے سچی محبت کرنے والا اور رنگ و نسل سے بے نیاز ہو کر ہر انسان کے لئے تڑپنے والا دل پوری شدت کے ساتھ دھڑک رہا ہے۔ کرشن چندر کی یہ خصوصیت انکی تخلیقات کی سب سے بڑی اور سب سے نمایاں خصوصیت ہے اور اس خصوصیت کی بنا پر وہ دوسروں سے بالکل الگ نظر آتے ہیں۔

اس مجموعے میں ایک مضمون بھی ہے مرحوم ایکٹر شیام کے متعلق۔ اسی ایکٹر کے متعلق سعادت حسن منٹو کا بھی ایک طویل مضمون شائع ہو چکا ہے۔ دونوں مضمونوں کا مطالعہ دونوں فنکاروں کے دو مختلف زاویۂ نگاہ واضح کرتا ہے۔ کرشن چندر کا شیام ——— خلیق اور انسان دوست ایکٹر ہے ——— کرشن چندر کا محبوب کردار۔ مگر منٹو کا شیام خلیق ہونے کے علاوہ اور بھی بہت کچھ ہے اور یہی بہت کچھ منٹو کی "ننگی تنگ دو" کا محور ہے۔ کرشن چندر کے ہاں جو شخص شیام کا روپ دھارتا ہے وہ محض ہنسنے والا' دوستوں سے محبت کرنے والا' کتابیں پڑھنے والا' شادی کے معاملے میں بغاوت کرنے والا اور ترقی پسند قوتوں میں دلچسپی لینے والا نوجوان ہے۔ اس کے برعکس منٹو نے جس شیام کے خد و خال واضح کئے ہیں وہ ایک ایسا نوجوان ہے جس کی محبت کو کہیں بھی قرار نہیں ——— جو یکے بعد دیگرے محبت کئے جاتا ہے۔ لڑکیاں ایک ایک کر کے اس کی زندگی میں داخل ہوتی ہیں اور پھر ایک دن سب کی سب غائب ہو جاتی ہیں ——— ! بہرحال دونوں مضمونوں کا مطالعہ دلچسپی کا کافی سامان اپنے پہلو میں لئے ہوئے ہے ! (م - ل)

بڈھا گوریو ——— مصنف: اونورے دبالزاک — مترجم: سیدہ نسیمہ ہمدانی

کتابت و طباعت: عمدہ، ضخامت: ۴۴۲، قیمت: — ناشر: مکتبہ جدید لاہور

مکتبہ جدید دنیا کے عظیم ناولوں کا اردو ترجمہ شائع کر کے ایک بڑا قابلِ قدر کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ یہ ناول "بڈھا گوریو" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

بالزاک کے بارے میں عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ اسکی تخلیقات میں انیسویں صدی کا زوال آمادہ فرانسیسی معاشرہ اس طرح سانس لے رہا ہے کہ اس کی ساری کی پوری تصویر ہماری آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے چنانچہ اس ناول کے تمام کردار بھی انداز میں اور زندگی کی ان قدروں کی نمائندگی کرتے ہیں جو بالزاک کے فرانس کی روح رواں بن گئی تھیں۔ یہ ناول پڑھ کر ہمیں بے اختیار شکسپیئر کے المیہ "بادشاہ لیئر" کا خیال آ جاتا ہے۔ لیئر بھی اپنی بیٹیوں سے بے پناہ محبت کرتا ہے اور پے در پے صدمات اٹھا کر انتہائی حسرت و یاس کے عالم میں دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔ یہی حال بڈھے گوریو کا بھی ہے۔ یہ شخص تمام عمر اپنی دونوں بیٹیوں کیلئے اپنا سب کچھ قربان کرتا رہا ہے اور جب مرنے لگتا ہے تو اس بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسکی دونوں بیٹیاں دم واپسیں بھی اسکے پاس نہیں پہنچتیں اور بد نصیب بڈھا سخت حسرتناک حالت میں مر جاتا ہے ——— انیسویں صدی کا فرانسیسی معاشرہ زندگی کی سچی حرارت سے کس قدر محروم ہو کر کس درجہ کھوکھلا اور انسانیت کی بنیادی قدروں سے کتنا دور ہو چکا تھا ——— یہ ناول اسکی واضح مثال ہے ——— ترجمہ بہت کامیاب ہے۔ سیدہ نسیمہ صاحبہ نے کتاب کی اصل فضا کو بڑی خوبی سے برقرار رکھا ہے۔ نام اور مقامات بھی وہی ہیں جو اصل ناول میں موجود ہیں کاش ہمارے دوسرے مترجم بھی اس چیز کو مدِ نظر رکھا کریں کہ ناموں اور مقاموں کے بدل دینے سے کتاب کی صحیح فضا مجروح ہو جاتی ہے اور یہ مترجم کی کمزوری ہے۔ (م - ل)

بچّوں کے لئے

(سکولوں کے لئے منظور شدہ کتابیں)

پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے پنجاب بُک ڈپو . . . کی مندرجہ ذیل مطبوعات کو بمطابق سرکلر نمبر ۱۷۷۶۰/C مورخہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۱ء منظور کردیا ہے۔ ذیل کی کتابوں کے متعلق پنجاب ایڈوائزری بورڈ نے ان الفاظ میں پُرزور سفارش کی ہے :

"یہ کتابیں آسان اور بامحاورہ زبان میں لکھی گئی ہیں۔ طلبہ کے لئے ان میں مفید اور دلچسپ مواد فراہم کردیا گیا ہے۔"

کتاب	مصنف	پائی / آنے	کتاب	مصنف	پائی / آنے
سیاحوں کے حالات	سید شریف حسین	۱۲/۶	ایک مسافر	میرزا ادیب	۱۱/۶
خالد بن ولید	شاہد حمید	۶/۳	منظور شدہ ڈائرکٹر تعلیم پنجاب بموجب سرکلر نمبر		
صلاح الدین ایوبی	شاہد حمید	۶/۳	۱۶۲۴۵/C مورخہ ۱۶		
اتاترک	سیم چودھری	۸/۹	اخلاقی نظمیں		۵/-
سلطان ٹیپو	عشرت رحمانی	۲ ،	سبق آموز کہانیاں		۱۰/
طارق بن زیاد	عبدالسلام خورشید	۳ ،	اخلاقی کہانیاں	شیر محمد اختر	۸/۹
سعد زاغلول پاشا	عبدالسلام خورشید	۳ ،	بہادر بچے	شیر محمد اختر	۸/-
معلوماتِ دنیا	لطیف فاروقی	۶/۳	منظور شدہ ڈائرکٹر تعلیم پنجاب بموجب سرکلر نمبر		
جادو کی بانسری	عبدالمجید بھٹی	۵/۶	۲۳۳۰۷/C مورخہ ۲۸/۱۰/۴۶		
جادو کی چکی	راجہ مہدی علی خاں	۷/۳	نیکی کا پھل	منشی فضل الدین خاں	۵/-
سنہری پرندہ	عبدالمجید بھٹی	۵/۳	آج کل	منشی فضل الدین خاں	۴/-
یونان کا بادشاہ	سید شریف حسین	۸/۹	طوطوں کی پکار	منشی فضل الدین خاں	۴/-
تین بہنیں	عبدالمجید بھٹی	۵/۶	مٹی کے کھلونے	عبدالمجید بھٹی	۳/-
بصرے کا سوداگر	سید شریف حسین	۵/۶	تب تم اچھی بچی ہو	عبدالمجید بھٹی	۳/-
چچا چھکو	عشرت رحمانی	۷/۳	غریب طالب علم	منشی فضل الدین خاں	۴/-
چالاک جاٹ	راجہ مہدی علی خاں	۸/-			

پنجاب بُک ڈپو لاہور

ہفت روزہ سات رنگ لاہور

کا

نیا دوَر

زیرِ ادارت ـــــــ منیر نیازی ، منظور ممتاز

* ـــ جو ۱۹۵۰ء سے منٹگمری سے نکلتا رہا ہے۔
جواب منٹگمری کی بجائے لاہور سے شائع ہو رہا ہے۔
* ـــ جسے ہر نئے اور پرانے لکھنے والے کا تعاون حاصل ہے۔
* ـــ جو ادب اور سیاست میں سنگِ میل ہو گا۔
* ـــ جو آپ کو دوسرے ہفتہ وار رسالوں سے بے نیاز کر دیگا۔
* ـــ جس کے مستقل کالم "آس پاس" "پاک لینڈیارڈ" اور "تراشے" اُردو ادب میں خاص حیثیت حاصل کر چکے ہیں۔

ملنے کا پتہ ۔ دفتر سات رنگ ۱۴/۸۱ جِدی مال لاہور

(چودھری افتخار علی پرنٹر پبلشر نے اردو پریس ۸۸ میکلوڈ روڈ لاہور سے چھپوا کر مکتبہ اردو سے شائع کیا)